

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

اگست 2017

شعاع



بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

نخلہ و کتابت کا پیٹہ

ماہنامہ شعاع

37 - ارنو بازار، کراچی

باقی مدیر لکلی محمود ریاضی

مدیر — رخصتہ جمیل

مدیر تنظیم — اندر ریاض

مدیر قاعدہ — امستہ المیون

فہرشی گزن — شاہین کشید

ادھارکن — کمالہ جیلانی

MEMBER
APNS
CPNE
دکن آل پاکستان ندر ہجر رسوسائی
دکن کول آل پاکستان ندر ہجر زالمہ راز

زوسالارہ باب کیمرہ کسری
پاکستان (سالانہ) — 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ — 8000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا — 7000 روپے





پہلی شعاع،
حمید
نعت
نبی کی باتیں

78 مایہ بخاری
198 خوشبو بھری ساتیں
خواہشوں کی مسافت

10 رضیہ جمیل
11 زاہد قاسمی
11 زاہد قاسمی
12 ادارہ



148 عطیہ خالد
67 قرة العین خرم
93 ماہ و ش طالب
195 شانہ لطافتی
55 قرة العین سکندر
217 نیئر کاشف

دل کے رشتے
یارش کے پار
ستاروں کا آئینہ
ایک تھی ملکہ
قسمت
پس آئینہ

17 سیر حمید
21 ادارہ
28 مصطفیٰ قریشی
282 شاہین رشید
32 ح - الف



36 شہزاد



262 قتیل شنائی
261 شکیب جلالی
261 ساحر لدھیانوی
262 یاسین کنول

غزل
غزل
نظم
غزل



154 آسیہ رزاقی
100 ام طیفور
220 سلوی سیفانہ

یہی حقیقت ہے
پیاملین کی ریت
ستہری دھوپ

اعتبار: ہمارا شعاع و اجساد کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی ٹھیکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔



شعاع کا اگست کا شمار سالگرہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

32 واں سالگرہ نمبر۔
رب کریم کے حضور سر بہ سجود ہیں۔ یہ اس کا کرم اودا احسان ہے کہ شعاع 32 سال کی مسافت کامیابی سے طے کر کے 33 ویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔
اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ دنیا کی آبادی کا نصف حصہ جو شعور بھی رکھتا ہے ادا بھی جس کے پاس ہنر بھی ہے اور بصیرت بھی۔ جو کمر بھی سنہا لیا ہے اور معاشی محاذ پر بھی نبرد آزما ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نسل انسانی کی پس دانش اور تربیت کی ذمہ داری بھی سنبھالے ہوئے ہے۔
اس کا حق ہے اس کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع بھی ملنا چاہیے۔ اس کی تفریح طبع کا ایسا اہتمام ہونا چاہیے جو اسے شعور آگاہی دینے کے ساتھ ساتھ فراغت کے فرائض میں اسے ذہنی تفریح بھی دیتا کر سکے۔
یہی سوچ تھی جسے سامنے رکھ کر محمود یاس صاحب نے خواتین کا اجراء کیا۔ اس کے بعد کرن ادریم شعاع کے اجراء کا بھی یہی مقصد تھا کہ خواتین کو ایسا پلیٹ فارم دیا گیا جہاں وہ اپنے تحقیقی ہنر کو سامنے لاسکیں۔

یہیں خوشی ہے کہ شعاع نے یہ فریضہ بہ خوبی ادا کیا۔ بہت سی خواتین کی تخلیقی صلاحیتیں سامنے آئیں۔
شعاع کی کامیابی میں ہماری معصیتیں کا بڑا حصہ ہے۔ ان کی مثبت سوچ نے قارئین کی رہنمائی کی۔ ہم تہہ دل سے ان کے متون ہیں۔
ہماری بہت سی معصیتیں آج اس دنیا میں نہیں ہیں، ہم ان کے لئے دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنت فوٹے ہیں۔ ہم اپنی قاریوں کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے جوش بہاری حوصلہ افزائی کی۔ ہم اپنے قیمتی مشوروں سے فائدہ شعاع کے مستقل سلسلے ان کی ذہانت کے آئینہ دار ہیں۔
اگست کا مہینہ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک روشن باب - 44۔ اگست 1947ء وہ دن جب ہمیں آزادی کی نعمت نصیب ہوئی اور ایک طغیہ وطن کا حقہ ملا۔
قارئین کو جیسی آزادی مبارک۔
اللہ تعالیٰ ہمارے پیارے وطن کو قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- 1۔ جی حقیقت ہے۔ آسیر و ذاتی کا مکمل ناول، ، پیامن کی رست۔ سام طبع کے ناول کا دوسرا اور آخری حصہ،
 - 2۔ سنہری دھوپ۔ سلوی سیف اللہ بٹ کا مکمل ناول، ، عالیہ بخاری اور عمرہ بخاری کے ناول،
 - 3۔ قرۃ العین خرم ہاشمی، ماہوش طالب، عطیہ خالد، شازیہ الطاف، اسمی، قرۃ العین سکندر اور منیر کاشف کے افسانے،
 - 4۔ شہر زاد۔ صائمہ اکرم کا ناول، ، یہ جو ورق ہیں شعاع شعاع۔ سالگرہ نمبر کے لیے سیر احمد کا مضمون،
 - 5۔ مہ وصال آشنائی۔ سالگرہ نمبر کا خصوصی سروے، ، مصطفیٰ قریشی اور عدینہ قریشی کا بندھن،
 - 6۔ دستک۔ معروف شخصیات سے گفتگو،
 - 7۔ چارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری باتیں اور دیگر متعلق سلسلے شامل ہیں۔
- شعاع کے بارے میں آپ کی رائے جاننے کا ایک بڑا اور اہم ذریعہ آپ کے خطوط ہیں۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔



کعبہ میں آیا بن کے سوالی
رکھتا بھرم ہے تیری شان مالی

شانِ کرم تیری سب سے نرالی
کوئی نہ لوٹا تیرے دے خالی

مجھے درد ہے اپنے بلالیا، یہ کرم نہیں تو کیا ہے
میرا سو یا بھاگ جگا دیا، یہ کرم نہیں تو کیا ہے

سارا زمانہ جھکتا ہے درد پر
تیری ذات یکتا، تیری ذات مالی

میں جھنگد ہاتھ ادر ادر کبھی اس نگر کبھی اس نگر
مجھ پر ہمارے کھا دیا، یہ کرم نہیں تو کیا ہے

کھڑے ہو گئے سب صفوں میں غازی
جیسے ہی گونگی اذانِ بلالی

لودی دل کی ہو گئی آرزو، رہی لود کئی نہ جتھو
مئے عشق مجھ کو پلا دیا، یہ کرم نہیں تو کیا ہے

طوافِ حرم تو ازل سے ہے جاری
پھر اس چار سو، ہی حرم میں سوالی

یہ میرے نبی کا ہے عجز، نہ نمازِ حصر ہوئی قضا
کیا شمس پھر سے لوٹا دیا، یہ کرم نہیں تو کیا ہے

یہ بلانِ رحمت برقی ہے سب پر
معافی گناہوں کی ہر اک نے پالی

بھی منکروں کی تھی استدعا، انہیں کب کھتا تھا یہ معجزہ
شق اس قمر کو بھی کر دیا، یہ کرم نہیں تو کیا ہے

میترا ب رحمت سے بوندیں چنیں
ہر اک بوند دامن پہ اپنے سے ڈلی

کروں ناز زار ہے نوا تیں دکھا ایسا کوئی جہل
مجھ صرف طیبہ ہی بھاگیا، یہ کرم نہیں تو کیا ہے

آیا ہے زاہد پھیلانے دامن
بھرم اس کار کھ لوجھانوں کے والی

زاہد قاسمی

زاہد قاسمی



مہربان

میں تخفیف اس کی فوری ضرورت تھی اور اس کا فائدہ یقینی تھا۔

4۔ اس میں بندوں کا لفظ عام ہے جس میں مومن اور کافروں شامل ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ اللہ کی رحمت دنیا میں عام ہے جس سے مومن و کافروں ہی یکساں فیض یاب ہو رہے ہیں۔ لیکن آخرت میں یہ رحمت صرف اہل ایمان کے لیے خاص ہوگی اور کافر عذاب ہی سے دوچار ہوں گے کیونکہ عدل کا تقاضا یہی ہے۔

اللہ کی رحمت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو اس نے اپنی اس خاص کتاب میں جو اس کے پاس عرش پر ہے لکھ دیا کہ میری رحمت میرے غصے پر غالب ہوگی۔“ اور ایک اور روایت میں ہے ”میرے غصے (غضب) پر غالب ہے۔“

ایک اور روایت میں ہے ”میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

- 1۔ امام خطابی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ کتاب سے مراد یا تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے جو اس نے کیا ہوا ہے یا پھر اس سے مراد لوح محفوظ ہے جس میں اس نے سب کچھ لکھ رکھا ہے۔
- 2۔ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے اور یہ کتاب بھی اس کے پاس ہے، اس کی حقیقت و کیفیت کو جاننے سے ہم

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ قیدی آئے۔ (آپ نے دیکھا کہ ان میں سے ایک عورت (اپنے بچے کی تلاش میں) دوڑتی پھرتی ہے۔ جب قیدیوں میں وہ کوئی بچہ پاتی تو اسے پکڑ کر اپنے سینے سے چمٹا لیتی اور اسے دودھ پلانے لگتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں پھینک دے گی؟“

ہم نے کہا: ”نہیں اللہ کی قسم!“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”یقیناً“ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے جتنی یہ عورت اپنے بچے پر ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1۔ جن چیزوں کا عقل اور حواس کے ذریعے سے ادراک ممکن نہیں، انہیں سمجھانے اور انسانی فہم کے قریب کرنے کے لیے مثال دینی جائز ہے، جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی رحمت کی وسعت کو سمجھانے کے لیے ”جس کو عقلا“ سمجھنا ممکن نہیں ہے، اس عورت کی حالت کو بطور مثال پیش فرمایا۔

- 2۔ اس میں نقصان دہ چیزوں میں سے کم تر نقصان دہ چیز کو اختیار کرنے کا بھی جواز ہے کیونکہ اس عورت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کو دودھ پلانے سے منع نہیں فرمایا، جب کہ یہ احتمال موجود تھا کہ بڑے ہو کر یہ آپس میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائیں اس لیے کہ یہ صرف احتمال ہی تھا، جب کہ عورت کے دودھ

قاصر ہیں۔ تاہم — اس کی کیفیت جانے بغیر اس پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔

شفقت و رحمت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سوجھے کیے، ان میں سے ننانوے اپنے پاس محفوظ رکھ لیے اور ایک حصہ زمین پر بھرتا رہا۔ اسی ایک حصے کی وجہ سے اللہ کی تمام مخلوق ایک دوسرے پر رحم کرتی ہے، یہاں تک کہ ایک جانور بھی اپنا کھڑ اپنے بچے سے ہٹا لیتا ہے کہ کہیں اسے تکلیف نہ پہنچے۔“

ایک اور روایت میں ہے۔ ”اللہ کے پاس سو رحمتیں ہیں۔ اس نے ان میں سے ایک رحمت جنوں انسانوں، چوپایوں اور کیرے مکوڑوں کے درمیان اتاری ہے۔ اسی ایک حصہ رحمت کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر نرمی کرتے اور رحم سے پیش آتے ہیں اور اس کی وجہ سے وحشی جانور اپنے بچے پر مہربانی کرتا ہے۔ اور اللہ نے ننانوے رحمتیں پیچھے رکھ چھوڑی ہیں جن کے ساتھ وہ قیامت والے دن اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔“ (بخاری و مسلم)

اور ایک روایت میں ہے۔ ”بے شک اللہ تعالیٰ نے جس روز آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا، سور رحمتیں پیدا کیں۔ ہر رحمت (اگر اس کا جسمانی وجود ہو تو اتنی ہے کہ) آسمان و زمین کے درمیان خلا کو پُر کر دے، پھر ان میں سے ایک رحمت کو اس نے زمین میں رکھ دیا۔ اس کی وجہ سے نمل اپنے بچے پر اور وحشی جانور اور پرندے ایک دوسرے پر شفقت کرتے ہیں۔ چنانچہ جب قیامت کا دن ہو گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کو اس (دنوی) رحمت کے ساتھ ملا کر مکمل فرمائے گا (اور پھر اس کے ساتھ اپنے بندوں پر رحمت کرے گا)۔“

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک دوسرے پر رحم و

شفقت کا معاملہ کرنا اللہ کو پسند بھی ہے اور اس کا فضل و کرم بھی، اس لیے اس نے رحمت کا یہ ایک حصہ دنیا میں نازل فرمایا ہے۔ اور جو شخص اتنا سنگ دل ہو کہ وہ رحم و شفقت کے جذبات ہی سے نا آشنا ہو تو یہ ایک نہایت ہی نا پسندیدہ چیز ہے۔ علاوہ ازیں اللہ کے فضل و کرم سے محرومی کی علامت بھی ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن سورتوں کے ساتھ اپنے بندوں سے معاملہ فرمائے گا، اس میں یقیناً بندوں کے لیے بڑی امید اور زبردست خوش خبری ہے لیکن جو اس بنیاد پر اس کی مخالفت کو اپنا شیوہ اور اس کی حدود کی پامالی کو اپنا وسیلہ بنالے، اس کے لیے اس کا غضب بھی اس روز نہایت شدید ہو گا، اس لیے ترک فرائض اور اعراض و استکبار کے ساتھ رحمت الہی کی امید، کمرٹوٹے پھل کی کاشت کر کے کسی سیٹھے پھل کی پیدوار کی امید رکھنے کے مترادف ہے۔

گناہوں کی معافی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کا قول نقل فرماتے ہیں۔ ”کوئی بندہ گناہ کر کے پھر کہے، اے اللہ میرا گناہ بخش دے تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے۔

میرے بندے نے گناہ کیا اور وہ جانتا ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ بخشا ہے اور گناہ کی پاداش میں مواخذہ بھی کرتا ہے، پھر وہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور کہتا ہے: اے میرے رب! میرا گناہ معاف فرما دے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے گناہ کیا ہے اور اسے علم ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ معاف کرتا ہے اور گناہ کی وجہ سے گرفت بھی فرماتا ہے۔ پھر وہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور کہتا ہے: اے میرے رب! میرا گناہ معاف فرما دے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے پھر گناہ کیا اور وہ جانتا ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ کو بخش بھی دیتا ہے اور اس کی وجہ سے گرفت بھی کرتا ہے۔ یقیناً میں نے اپنے بندے کو بخش دیا، تو وہ جو چاہے کرے۔“

(بخاری و مسلم)

ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو گناہ کریں گے، پھر اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی مانگیں گے اور وہ انہیں معاف فرما دے گا۔“ (مسلم)
فوائد و مسائل :

1- غلطی اور گناہ ہو جانا انسان کی فطری کمزوری ہے لیکن غلطی کو تسلیم کرنے کے بجائے اس پر اصرار کرنا بہت بڑا جرم ہے۔

2- اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ گناہ کر کے گناہ پر اصرار کرنے کے بجائے توبہ و استغفار کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے حتیٰ کہ اگر ایسے لوگ ٹہید ہو جائیں کہ جن سے نہ گناہ کا صدور ہو اور نہ وہ توبہ کریں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگ پیدا فرما دے گا جو اس طرح کریں گے۔

اس کا یہ مطلب قطعاً ”نہیں ہے کہ وہ گناہوں کو پسند فرماتا ہے اور گناہ گار اس کے محبوب ہیں“ بلکہ وہ توبہ و انابت کو پسند فرماتا ہے اور ایسے ہی لوگ اسے محبوب ہیں اور یہی اس حدیث کا مطلب ہے۔

3- توبہ کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ اس سے ہر قسم کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

توبہ

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ ایسی مخلوق پیدا فرماتا جو گناہ کرتی اور استغفار کرتی، لہذا وہ انہیں بخش دیتا۔“ (مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے قول کی تلاوت فرمائی جو ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ہے۔

”اے میرے رب! انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا، پھر جس نے میری پیروی کی، وہ مجھ سے ہے۔“ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول۔
”اگر تو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں

”تو وہ جو چاہے کرے۔“ کا مطلب ہے کہ جب تک وہ اس طرح کرے گا کہ گناہ کر کے توبہ کرتا رہے تو میں اسے بخشا رہوں گا، اس لیے کہ توبہ اپنے ما قبل کے گناہ ختم کر دیتی ہے۔
فوائد و مسائل :

1- اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جب تک ایک بندہ مومن کا دل احکام و فرائض الہی کے بارے میں اعراض اور استکبار سے پاک ہے، لیکن اس سے باریاب گناہ کا ارتکاب ہو جاتا ہے اور وہ ہر دفعہ گناہ کے بعد بارگاہ الہی میں گڑگڑاتا اور استغفار کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرماتا رہتا ہے کیونکہ وہ توبہ و استغفار کر کے اصرار سے گریز کر رہا ہے اور مواخذہ الہی سے لرز رہا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی عظمت و جلالت سے اس کا دل لبریز ہے اور اس کے سامنے اظہار بندگی میں اسے کوئی عار نہیں ہے اور بندے کی یہ خبی ایسی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے پسند فرماتا ہے، اس لیے وہ فرماتا ہے کہ بندہ جب تک عاجزی سے میرے سامنے جھکنا رہے گا میں اسے معاف کرتا رہوں گا۔

2- اس کے برعکس ایک بندہ وہ ہے جو بار بار گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، پھر نہ توبہ و استغفار کرتا ہے اور نہ اللہ کے مواخذے کا کوئی اندیشہ اس کے دل میں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شخص مذکورہ بندہ مومن سے یکسر مختلف ہے، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی اس سے مختلف ہو گا۔ پہلا کردار ایک بندہ مومن کا ہے جس پر اللہ تعالیٰ گناہ کے باوجود اپنی خوشی کا اظہار فرماتا ہے اور دوسرا کردار ایک باغی اور سرکش کا ہے جس کے لیے اس نے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

استغفار

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”میں ہر اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں ختم کر کے

گدھے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھا، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا۔
 ”اے معاذ! کیا تم جانتے ہو اللہ کا حق اس کے بندوں پر کیا ہے اور بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟“
 میں نے کہا: ”اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔“
 آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”بے شک بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ (صرف) اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور اللہ پر بندوں کا حق یہ ہے کہ وہ اس کو عذاب نہ دے جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو۔“

میں نے عرض کیا۔
 ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میں لوگوں کو خوش خبری نہ دوں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”انہیں خوش خبری مت دو، وہ پھر اسی (ایمان) پر بھروسہ کر لیں گے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ :

مطلب یہ ہے کہ عام لوگ جو بات کو اس کے سیاق و سباق کے مطابق سمجھنے سے بالعموم قاصر ہوتے ہیں، وہ یہی سمجھ لیں گے کہ نجات کے لیے توحید و رسالت کا زبانی اقرار کر لینا ہی کافی ہے، ان کے عملی تقاضوں کو بروئے کار لانا ضروری نہیں اور پھر وہ اسی پر اعتماد کر کے عمل سے غافل ہو جائیں گے۔ حالانکہ اقرار باللسان سے ایک مومن کو یہ تحفظ تو یقیناً حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا، بالآخر وہ جنت میں چلا جائے گا لیکن عام لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مومن چاہے کتنا بھی بے عمل یا بد عمل ہو، سرے سے جہنم میں جائے گا ہی نہیں اور پہلے مرحلے میں وہ مومنین کا ملین کی طرح جنت میں چلا جائے گا جب کہ دیگر دلائل شرعیہ کی رو سے ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

اور اگر تو انہیں بخش دے تو یقیناً ”غالب“ حکمت والا ہے۔“
 اس کے بعد آپ نے اپنے ہاتھ (دعا کے لیے) اٹھائے اور فرمایا۔
 ”اے اللہ! میری امت! میری امت!“ اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

اللہ عزوجل نے فرمایا۔ ”اے جبریل! محمد کے پاس جا، اور تیرا رب خوب جانتا ہے، اور ان سے پوچھ، وہ کیوں روتے ہیں؟“
 چنانچہ جبریل آپ کے پاس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں وہ بتلایا جو آپ نے (اپنی امت کے بارے میں) فرمایا تھا، حالانکہ اللہ اسے خوب جانتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”اے جبریل! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف (پھر) جا اور ان سے کہہ ہم آپ کو آپ کی امت کے بارے میں خوش کر دیں گے، آپ کو عمیقین نہیں کریں گے۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل :

1- اس میں ایک تو اس شفقت و رحمت کا بیان ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اپنی امت کے لوگوں کے لیے تھی اور جس کا کامل اظہار قیامت والے دن ہو گا۔ دوسرا اللہ کی اس محبت کا تذکرہ ہے جو اللہ کو اپنے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور ان دونوں باتوں کا فائدہ امت محمدیہ کے اہل ایمان کو ہو گا کہ قیامت والے دن وہ اس کی وجہ سے اللہ کی رحمت و مغفرت سے شاد کام ہوں گے۔

2- علماء انبیاء کے وارث ہیں، انہیں امت کا اسی طرح درد اور احساس ہونا چاہیے جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا۔

اللہ کا حق

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں

فوائد و مسائل :

1- کافر بھی دنیا میں بہت سے ایسے عمل کرتے ہیں جن کا تعلق رفقاء عامہ سے یا بھلائیوں سے ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان حسنات کا صلہ انہیں دنیا کے مال و اسباب کی صورت میں یا ان سے کوئی ابتلا ٹال کر دے دیتا ہے کیونکہ اخروی اجر و ثواب کے لیے تو ایمان ضروری ہے اور کافر ایمان سے محروم ہوتا ہے، اس لیے وہ آخرت کے ثواب سے بھی محروم رہے گا۔

2- اس سے معلوم ہوا کہ ایمان اور عقیدہ ہر عمل کی بنیاد اور عند اللہ قبولیت کے لیے شرط اور مدار ہے۔

پانچ نمازیں

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”پانچ نمازوں کی مثال اس لبالب جاری نہر کی طرح ہے جو تم میں سے کسی کے دروازے پر ہو، وہ اس سے روزانہ پانچ مرتبہ غسل کرے۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل :

1- اس میں باندی سے نماز پنجگانہ پڑھنے کے فوائد کا بیان ہے کہ جس طرح روزانہ پانچ مرتبہ نہانے والے کا جسم میل پچیل سے پاک صاف رہتا ہے اسی طرح نمازی کے بھی صغیرہ گناہ، نماز سے معاف ہو جاتے ہیں اور کبیرہ گناہ سے توبہ کر لے تو وہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔

2- اول تو فرائض، یعنی نماز وغیرہ کا پابند کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور اگر بھی ارتکاب ہو جائے تو اس پر اصرار اور دوام نہیں کرتا، بلکہ فوراً توبہ و استغفار کر لیتا ہے اور اس کے صغیرہ گناہ نماز سے معاف ہوتے رہتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

قبر میں سوال

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”مسلمان سے جب قبر میں سوال کیا جاتا ہے تو وہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ اور یہی مطلب اللہ کے اس قول کا بھی ہے۔

”اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو دنیا کی زندگی میں بھی مضبوط بات کے ساتھ ثابت قدم رکھتا ہے اور آخرت میں بھی رکھے گا۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1- یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے فرمان بشت اللہ الذین امنوا الاہم (براہیم 27:14) کی تفسیر ہے۔

2- دوسری بات اس حدیث میں یہ ہے کہ اس میں کلمہ اسلام کے دونوں جز اکٹھے بیان ہوئے ہیں، یعنی لا

الہ الا اللہ اور محمد الرسول اللہ۔

بہر حال قبر میں سوال جواب حق ہے اور مومن اللہ کی توفیق سے صحیح جواب اور توحید و رسالت کی گواہی دے گا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میت کو دفنانے کے بعد اس کی قبر پر اس کی ثابث قدمی کے لیے دعا کی اسی لیے تاکید کی ہے۔

نیکی کا صلہ

ایک اور روایت میں ہے۔

”اللہ تعالیٰ کسی مومن پر اس کی نیکی کے معاملے میں ظلم نہیں کرتا اسے اس کی نیکی کا صلہ دنیا ہی میں دیا جاتا ہے اور آخرت میں بھی اسے بدلہ دیا جائے گا۔ لیکن کافر کو اس کی ان اچھائیوں کا صلہ جو وہ اللہ کے لیے کرتا ہے، دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کے پاس کوئی نیک عمل ایسا نہیں ہوگا جس پر اسے بدلہ دیا جائے۔“ (مسلم)

یہ جو اوراق ہیں شعاع شعاع

سمیع الحق

”جس عورت کو اتنی اجازت نہیں کہ اپنی مرضی سے گھر میں گوشت کا سالن بنالے، اس گھر پر جتن کو تم یہ رسالہ بیچنا چاہتے ہو۔ جن سے پائی پائی کا حساب لیا جاتا ہے، وہ پائی پائی جو ڈکریہ خریدیں گی؟“

”یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔“

”بعد کا نقصان، پہلے حساب کتاب لگا کر بچالو۔ تم ایک ایسا رسالہ نکالنا چاہتے ہو جو کتاب کے سائز کا ہو اور بک شیفٹ میں آسکے ہماری دلی مارکیٹ ایسے رسالے کی شکل سے انجان ہے۔ وہ اسے عجوبہ تو سمجھے گی، لیکن اس عجوبے کو کسی خاطر میں نہیں لائے گی۔“

”ہر ناکام عجوبہ ہی ہوتا ہے۔“

”تم اس رسالے میں دس بیس مختلف طرح کی کہانیاں دینے جا رہے ہو۔ کون لکھے گا یہ بیس کہانیاں؟ جہاں پڑھنے کی آزادی نہیں وہاں لکھنے کی کیسے ہوگی؟ بھائی یہ مغرب نہیں ہے جہاں عورتیں گھروں سے باہر نکلیں گی، بک اسٹال یا شاپ تک جائیں گی اور اپنی پسند سے کچھ بھی خرید لیں گی۔“

وہ خاموش رہے۔

اپنا کام کرتے رہے اور ایک کتاب کے سائز کا رسالہ تیار کر لیا۔ بیس کہانیاں تھیں، بیس لکھنے والیاں نہیں تھیں۔ کچھ نئی لکھنے والیاں تلاش کیں کچھ پرانی لکھنے والیوں سے لکھوایا۔ کچھ کو لکھنے کی ترغیب دی، کچھ وسائل فراہم کیے۔

ڈائجسٹ تیار ہو گیا۔

پہلا شمارہ پہلا معرکہ۔

”فیصلے تک پہنچنا سفر کا پہلا قدم ہے۔ جب کوئی فیصلہ کرتا ہے تو دراصل طوفانی لہروں میں چھلانگ لگاتا

”تم مجھے اچھی مائیں دو، میں تمہیں اچھی قوم دوں گا۔“

نیپولین ”ایک اچھی ماں“ کے بعد اگر اگلا مطالبہ کرتا تو شاید۔ ایک اچھے استاد کا، ایک ذہین، ایک دانا، ایک دور اندیش شخصیت کا۔ شاید محمود ریاض کا۔

ادارے ہر اکھ پہ چلتے ہیں۔ ان کی بنیاد میں فلاح کے بیج ڈالے جاتے ہیں۔ یہ محنت اور حقیقی لگن سے پنتے ہیں۔ زیادہ جنون، بہت زیادہ روشن خیالی اور بے انتہا دانائی سے۔ قلم، کتاب، فکر، قوم کی فلاح کے معتبر ذرائع ہیں۔ یہ رسالوں میں کہانی کے ذریعے ہوں یا نصاب کے ذریعے، محترم ہوتے ہیں۔ ایسا تو ہو سکتا ہے کہ کہ کتابیں، کہانیاں، افکار، پڑھے بغیر کوئی بھی قوم اپنی حالت سدھارے، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کتابوں، کہانیوں میں دی جانے والی سوچ، دانائی، خیال، فکر، کسی بھی قوم کی سوچ کا انداز نہ بدلے۔ معاشرے میں تبدیلی نہ لائے جاہلیت کو روشن خیالی میں نہ بدلے۔

”اس رسالے کے ذریعے تم خواتین کو سلامتی، کڑھائی، امور خانہ داری سکھانا چاہتے ہو؟“

”کیا خواتین صرف اسی کام کے لیے بنی ہیں؟ علم و ادب بران کا کوئی حق نہیں؟“

”ایک عام سے ڈائجسٹ میں تم انہیں کیا ادب دو گے محمود؟“

”کچھ ادب، کچھ تخلیق کرنے کا موقع، کچھ سوچ، بہت زیادہ شعور۔“

”یہ دیوانے کا خواب ہے۔“

”میں دیوانہ ہوں۔“

”تمہیں ہماری نقصان ہو گا۔“

”میں تیار ہوں۔“

ہیں اسے کھرے ہی نکال دیا جاتا ہے۔ تم کیا چاہتے ہو کہ عورت ”سودانی“ بھی لکھے پھر بھی اسے ادب کی لکیر کے اس پازہی رکھا جائے عورت ”اگ کادریا“ بھی پار کر لے پھر بھی ٹالٹالی کے درجے پر نہ پہنچے۔
 ”تو تم نے عورتوں کو ادب بتانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ جو آنکھ کھڑکی کی دلیں سے باہر نہیں نکلی، جو شعور زنگ آلود ہے اس سے تم کیا توقع رکھتے ہو؟ ٹھیک ہے تمہارا رسالہ ہاتھوں ہاتھ بک رہا ہے، لیکن تمہیں لگتا ہے یہ زیادہ دیر تک چلے گا۔ وی سی آر کے آتے ہی سینما ہالوں میں الو بولنے لگے ہیں۔ لی وی کے آتے ہی ریڈیو بند ہو گئے۔ ایک دو سال کی بات ہے، کچھ اور

”کیا تو یہ بھی۔“

”میں مستقبل کے اندھیرے سے خائف ہو کر“
 آج اپنا چراغ پھونک مار کر نہیں بجھا سکتا۔ میرا کام ”آج“ کا ہے۔ چراغ میں تیل ڈالتے رہنا اور اس کی لو کو روشن رکھنا آنے والوں کا کام ہو گا۔“

شہوں سے نکل کر یہ ڈائجسٹ دہاتوں، قصوں اور چھوٹے شہروں تک پہنچ گیا۔ کم پڑھی لکھی خواتین نے اسے پوری آنکھ سے پڑھا، ادھورے شعور سے سمجھا۔ جہاں لائینیں اور چراغ جلتے تھے، وہاں الفاظ روشنی دیتے لگے۔

”سلام! میں فیصل آباد اپنی نند کے گھر گئی تو وہاں آپ کا یہ رسالہ پڑا ہوا ملا۔ جب اسے کھولا تو پہلی ہی کہانی میری نکلی۔ میں تو برا حیران ہوئی تھی۔ باجی جی! میں بھی پانچ جماعت پڑھی ہوں اور گلوں میں رہتی ہوں۔ چھوٹی سی تھی جب خسرو نکلی تھی۔ بڑا دم درود کروایا، لیکن افادہ نہیں ہوا۔ اب لنگڑا کر چلتی ہوں۔ کاش میری ماں کو بھی پتا چل جائے کہ دم درود کے ساتھ ساتھ علاج بھی کروانا تھا۔“

”آپ خوش ہیں کہ آپ ہر عورت کی نمائندگی کرتی کہانی چھاپ رہے ہیں؟“

”میں مطمئن ہوں کہ کہانیوں میں ہر عورت کو اپنا عکس نظر آ رہا ہے۔ وہ دیکھ رہی ہے کہ کہاں وہ غلط ہے اور کہاں دوسرے۔ کہاں کہاں انہیں ٹھیک ہونا ہے

ہے جو اسے ایسی جگہوں تک پہنچا دیتی ہیں جہاں سے اس کا زہر اس سے پہلے کبھی نہیں ہوتا۔“ (پاولو کوئیل)

سر ابا گیا، پذیرائی ملی، خطوط کے ذریعے، فون کے ذریعے مختلف طبقات لوگوں کی آرا سامنے آئیں۔

”میرے شوہر نے مجھے رسالہ لا کر دیا کہنے لگے ایک دکان پر دیکھا ”خواتین“ لکھا تھا، سوچا عورتوں کے کام کا لگتا ہے، بیگم کے لیے لے چتا ہوں۔ میں نے پڑھا، مجھے تو بہت مزا آیا۔ اپنی سیلیوں کو بھی دیا اور بہنوں کو بھی۔ پھر سب نے مل بیٹھ کر ایک کہانی پر تبصرہ کیا۔ کہانیاں سب ہی بہت اچھی تھیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ رسالہ مجھے ہر مہینے پڑھنے کے لیے ملے گا۔“

”میری چچری بہن آمنہ انڈیا میں رہتی ہیں۔ اس سال پاکستان آئیں تو میرے گھر میں رسالے دیکھ لیے جاتے ہوئے اپنے دائر کورلر میں بھر کر لے گئیں۔ وہاں پہنچ کر یہ خط لکھا ہے۔“

”پاور پار ہوا تو میری سانس بحال ہوئی کہ شکر خدا! رسالے بھی پار ہو گئے۔ دل ہر نبض میں دھڑک رہا تھا۔ بہن سعیدہ اب تو اس کے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اس برس والوں کو بھی لت لگ چکی ہے۔ کچھ بھی کر کے مجھے تو یہاں بھجوا دیا کرو۔ ہمیں تو یوں لگتا ہے جیسے اب کہیں جا کر سانس آنے لگا ہے۔“

جب کوئی امیر ہونا چاہتا ہے تو وہ تجارت کرتا ہے، کاروبار کرتا ہے، جب کوئی عظیم ہونا چاہتا ہے تو وہ اپنی ”قوم“ کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔

”آئے، تمک، مرجی کی کہانیاں کس بھاؤ کی ہیں، ابلی حلقے تو بہت ناک بھوں چڑھا رہے ہیں۔“

”وہ ابلی حلقے جو ”عورت“ کو ادب نہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ جس نے ہر عورت مصنفہ پر کسی مرد مصنف کی نقل یا پیروی کرنے کا الزام لگایا ہے۔ ہر شاعر کے اشعار کو زبان زد عام ہونے سے جی جان سے روکا ہے۔ منہ کو جیسے تیسے سر آنکھوں پر بٹھالیا ہے، لیکن جس رسالے میں ”تخصمت چغتائی“ موجود ہوئی



اور کہاں انہیں ٹھیک کرنا ہے یہ دیکھو ایک لڑکی کاٹونی پھولی اردو میں لکھا ہوا خط آیا ہے وہ اپنے شوہر سے طلاق لینے والی تھی، لیکن راسخ کے شمارے کی کہانی پڑھ کر اس نے اپنا فیصلہ بدلی دیا۔ اس نے لکھا ہے کہ ”میں سمجھ گئی ہوں کہ اگر مجھے اپنا گھر سنانا ہے تو مجھے اپنی زبان کی کٹ کو کند کرنا ہو گا۔ اپنے شوہر کی کہانی کو اپنے بہن بھائیوں پر لٹانے سے باز رہنا ہو گا۔ صبر، شکر، برداشت، صلہ جوئی اور شوہر کی عزت کی پاس داری کا نیک ناکا جوڑ کر گھر بنانا ہو گا۔“

سوچ میں تبدیلی لانا مشکل اور برداست روی کا کام ہے، لیکن اگر رانی کے دانے کے برابر بھی فرق آجائے تو کافی ہے۔“

خطوط کے بلندے میں اب کہانیوں کے بلندے کا اضافہ بھی ہونے لگا تھا۔ کہیں ٹی پھولی اردو، کہیں غیر واضح خیالات، کچھ منتشر کہانیاں، کچھ اعلیٰ دانے کے فن پارے، کچھ ادب میں نئی طرز کے خالق، کچھ کہانیوں میں نئے انداز کے قلم کار۔

”لیکن یہ کہانی تو بالکل ہی بے کار ہے مرکزی خیال تو اچھا ہے، لیکن لکھنے کا انداز بہت ناچختہ ہے۔“

”کہانی بے کار ہوگی، لیکن لکھنے والے کی کوشش نہیں۔ یہ کہانی ایک دور دراز کے گاؤں سے آئی ہے۔ اس بہن نے کیسے قلم سہا ہی، کتنے کا نظام کیا ہو گا، پھر وہاں تو بجلی بھی نہیں ہوتی۔ گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر رات کے اندھیرے میں شاید چھپ کر چراغ کی لو میں کہانی لکھی ہوگی۔ کتنے جتنوں سے ہمیں

پوسٹ کروائی ہوگی۔ اگر تھوڑی بہت کانٹ چھانٹ سے یہ کہانی کسی لائق ہو سکتی ہے تو میں وہ کانٹ چھانٹ کر لے لے۔“

”اس طرح تو سب ایسی ہی کہانیاں لکھ لکھ کر ہمیں بھیجنے لگیں گے، ہم سب کی کانٹ چھانٹ کرتے رہیں گے۔“

”ہمیں ایسا کرنا ہی ہو گا۔ تراشنے کا کام بہر حال جوہری کا ہی ہوتا ہے۔ پہلے قلم سے، پہلی کوشش سے کوئی بھی شاہکار تو لکھنے سے رہا۔ ان سب بہنوں نے

ادب کے نام پر بڑھا ہی کیا ہے جو لکھنے میں انہیں مدد ملے۔ لکھنے میں بھی ہمیں ان کی تربیت کرنی ہے۔ جب یہ اپنی کہانی کی کانٹ چھانٹ دیکھیں گی تو سمجھ جائیں گی کہ اگلی بار انہیں کیسے کہانی لکھنی ہے کہیں کہیں اپنی اصلاح کرنی ہے۔ امید ہے ہم نے انہیں دینی ہے، یقین یہ خود حاصل کر لیں گی۔“

”یہ کوئی تربیتی ادارہ تو نہیں۔“

”جب ادارہ بنالیا ہے تو تربیت دینے میں کیا حرج ہے۔ ملک میں خواتین راسخ نہیں گی۔ کچھ مسائل لکھیں گی، کچھ مسائل کا حل دیں گی۔ احساسات و جذبات کی جو نمائندگی ایک عورت کا قلم کر سکتا ہے وہ

مرد کا نہیں کر سکتا۔ مجھے انہیں یہ آزادی دینے دو۔“

”میرا نام عبدالغفور ہے اور میں ایک پرائیویٹ محکمہ میں ملازم تھا۔ شادی کے وقت میری بیوی نے مجھ سے ایک ہی اجازت لی تھی کہ میں اسے رسالے پڑھنے کی اجازت دوں گا۔ میری ماں کو یہ رسالے وغیرہ

مرد کا نہیں کر سکتا۔ مجھے انہیں یہ آزادی دینے دو۔“

”میرا نام عبدالغفور ہے اور میں ایک پرائیویٹ محکمہ میں ملازم تھا۔ شادی کے وقت میری بیوی نے مجھ سے ایک ہی اجازت لی تھی کہ میں اسے رسالے پڑھنے کی اجازت دوں گا۔ میری ماں کو یہ رسالے وغیرہ

ڈائجسٹ خواہن ہو، شعل یا کرن، یہ تینوں رسالے ایک ہی کام کر رہے ہیں۔ رشتوں کی مضبوطی، کردار کی تعمیر، فلاح انسانیت اور یہ الفاظ دوا سے کم اثر تو نہیں رکھتے۔ ان میں ڈھکا چھپا کوئی ایک سبق تو نہیں۔ یہ ڈائجسٹ صرف کہانیوں کا انبار ہی نہیں۔ کہانیاں صرف تخیلاتی، بے معنی، نقلی دنیا کا جال ہی نہیں۔ یہ اپنے اندر اصلاح کا ایک جہاں سموئے ہوئے ہیں۔ یہ ڈائجسٹ روشنی کی شعل سے کم تو نہیں۔

فن میں فریب نہیں چلتا۔ فلاح میں دھوکا دینا سب جو تین سے چار ہوتے عشروں میں ان ڈائجسٹوں کے لیے اپنے خون کو سیاہ کر رہے ہیں وہ ان مصلحین سے کم نہیں، جو سوچ بدلتے ہیں، شعور دیتے ہیں۔ ادب سے، ادب کے لیے، ادب کو لے کر، جو کر رہے ہیں، وہ قوم کی تعمیر سے کم تو نہیں۔



پسند نہیں تھے، لیکن کچھ کہہ سن کر میں نے اپنی بیوی کو یہ اجازت دلوا دی تھی۔ تین سال پہلے میرا ایک سیڈنٹ ہوا تو میں بستر پر آ رہا تو کرسی بھی گئی اور گھر میں مسائل کا انبار لگ گیا۔ بیوی نے سلائی کڑھائی شروع کر دی۔ ہمارے خاندان والوں نے بہت برائیاں کر دیں۔ لیکن بیوی نے بس ایک بات کی۔

”عورت کی کمالی حرام ہوتی تو حضرت خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) تجارت کیوں کرتیں؟“ اس کے منہ سے اتنی بڑی بات سن کر میں تو دنگ رہ گیا۔ پھر وہ اندر گئی اور یہ رسالہ اٹھا لائی اور میرے آگے کھول کر رکھا۔ ”یہ دیکھو“ اس میں لکھا ہے عورت کب کب اور کیسے کیسے کما سکتی ہے۔ جو اسلام کے احکامات کے عین مطابق ہے۔“ میں لا جواب ہو گیا۔

اب خاندان میں جو جو مجھ سے بیوی کی کمالی کا شکوہ کرتا میں اسے بھی یہی سب کہتا۔ میں نے تو یہی جانا ہے اڈیٹر صاحبہ کہ انسان جتنا نقصان اپنی جمالت سے اٹھاتا ہے وہ اور کسی کام سے نہیں اٹھاتا۔“ انسان جتنا فائدہ جمالت کو دور کر کے انسانیت کو دے سکتا ہے، اس سے بڑا فائدہ نہیں دیا جاسکتا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ایک میں
اور ایک تم



حزیرہ ریاض
قیمت - 350 روپے

اُجالوں کی بستی



فاخرہ جبین
قیمت - 400 روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میمونہ خورشید علی
قیمت - 350 روپے

میرے خواب
لوٹا دو



نگہت عبد اللہ
قیمت - 400 روپے

فون نمبر:
32735021

منعوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

زندگی میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ کچھ یاد رہ جاتے ہیں۔ کچھ ساتھ رہ جاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر انسان سے بالمشافہ ملاقات ہوئی ہو۔ کچھ ملاقاتیں قلم و قراطیس کی مرہون منت ہوئی ہیں اور عموماً یہی ملاقاتیں دوام پر کھتی ہیں۔

آج سے بیس سال پہلے شعاع نے جو سفر شروع کیا تھا۔ اس میں اس نے بہت سے لوگوں کو اپنا ہم سفر پایا۔ اسی خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم نے اپنے قارئین سے جانتا چاہا کہ وہ کب شعاع کے سامنے بنے شعاع سے پہلا تعارف کب ہوا، کوئی دلچسپ واقعہ اس تعلق کی بنیاد بنایا یا وہی جلتے جلتے آشنائی ہوئی۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ اس سوال کے جواب میں ہمارے قارئین نے کیسے گل بکھیرے ہیں۔

مہ وسالِ آشنائی

ادادہ

والدہ محترمہ ہیں۔ آمنہ الطاف ڈیڑھ سال کی اور فاطمہ چار سال کی ہیں دونوں شرارتی بچیوں کی موجودگی میں رسائل پڑھنا مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ مگر ہم نے شعاع اور خواتین سے اپنا نانا ٹوٹے نہیں دیا۔ اسے برقرار رکھا ہوا ہے۔

کنزہ مریم

1- شعاع سے وابستگی بلکہ سب ہی ڈائجسٹوں (شعاع، کرن، خواتین) کو 6 سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ شروع ہوئی گرمیوں کے بے زار سے دن تھے۔ میں میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہوئی تو کرن (ثانیہ فصل) اور دوست تمینہ سے ان کی لت لگی اور ایسا ساتھ شروع ہوا کہ پھر چھوٹا نہیں ہو کہ کچھ عرصہ باقاعدگی سے نہیں پڑھ پائی لیکن مستقل ہم نے منہ نہیں موڑا (یہ ہوتی ہے محبت)

اف ظالمو! ہائے کیا بتاؤں میری ٹانگ پہ جلن ہونے لگ گئی۔ جی ہاں! ابھی میرے اور شعاع کے ساتھ کوسات آٹھ ماہ ہی گزرے تھے چھٹیاں بھٹکا کر فرسٹ ایئر میں داخلہ بھی لے لیا تھا۔ اس دن بھی اسکول سے واپس آئی تو ڈائجسٹ میرا منتظر تھا۔ کھانا بھی جلدی جلدی کھایا اور چمچ کر کے رسالہ لے کر بیٹھ

شازیہ الطاف... شعاع آباد

شعاع کو کب سے پڑھ رہی ہوں؟ یہ تو مجھے یاد نہیں، مگر جب سے پڑھنا سیکھا ہے۔ اس کی تحریروں نے مجھے اپنے سحر میں گرفتار کر لیا۔ پھر ہیروئن سکھواور گھروار قسم کی۔ یہی اس کی تربیت کا ایک انداز جو بے حد متاثر کرنا ہے اور لڑکیوں کو گھر کی طرف راغب کرتا ہے۔ انہیں زمانے کی اونچ نیچ سمجھانا ہے۔

پہلے پبل تو (شادی سے پہلے) گھر میں کونوں کھدروں میں چھپ کے پڑھا کرتی کہ والد صاحب رسائل پڑھنے سے منع کرتے تھے، مگر جناب جب ہوئی ہماری شادی تو ہم نے علی الاعلان پڑھنا شروع کیا اور میاں صاحب خود رسائل لا کر دیتے ہیں۔ ہمیں مہینے کے آخر کا شدت سے انتظار رہتا ہے کہ خواتین اور شعاع ملیں گے۔ ملبہ دولت خود بھی بازار جا کر رسائل خرید کر لاتے ہیں نئے بھی اور پرانے بھی۔ شاید ہی کوئی رسالہ ہماری نظر سے رہ گیا ہو۔ میرے پاس رسائل کا انبار موجود ہے جو ہماری شعاع اور خواتین سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میٹرک کیا ہم نے 2007 میں اور شادی ہو گئی اب ماشاء اللہ دو باری پاری بچیوں آمنہ الطاف اور فاطمہ الطاف کی



ساریہ چوہدری... ڈوگہ گجرات

1۔ شعل سے ہمارا تعلق اتنا ہی پرانا ہے جتنا 18 اکتوبر 2005ء کا زلزلہ، نہیں نہیں بلکہ اس سے

بھی پرانا 2003ء سے ہے۔ سب سے پہلے میرے تایا ابو کی بیٹی زر قاتول تھیں۔ وہ بڑھتی تھیں 1990ء سے۔ جب میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے

بعد میری بڑی بہن شمعیت تول بڑھتی تھیں۔ آپنی زر قاتول کی شادی ہوئی۔ وہ اٹلی جا بیٹیں پھر آپنی شمعیت کی ہوئی وہ انگلینڈ جا بیٹیں۔ ان کے جانے کے بعد یہ سیٹ ہم نے سنہال لی اور ہم شعل، کرن، خواتین باقاعدگی سے پڑھنے لگے، شمعیت آپنی تو اب بھی اپنے شہر سے ہر ماہ ماچسٹر جاتی ہیں صرف شعل، کرن اور خواتین لینے

اور یہاں ہمارے گھر میں، میں بھی بڑھتی ہوں میری چھوٹی بہن ربیعہ بھی بڑھتی ہے۔ میری بھابھیاں آپنی سحدیہ، بشری بھی بڑھتی ہیں ربیعہ اور بشری تو اتنا نہیں مگر میں اور آپنی سحدیہ تو جب تک ختم نہ کر لیں چین نہیں آتے۔ ہم جب میٹرک میں تھے تو ڈر ڈر کر پڑھتے تھے۔ اکثر بکس میں رکھ کر پڑھتے تھے کہ سب سمجھتے سبق پڑھ رہی ہے۔ اکثر اسکول لے جاتے اور بریک میں پڑھتے اور سب سے سیٹ طریقہ تھا کہ ہم ڈائجسٹ کو کور کر دیتے تھے نیوز پیپر سے ایک تو کسی کو پتا نہیں چلتا تھا کہ ہم پڑھ کیا رہے ہیں اور سیکنڈ ہمیں

میری ڈیوٹی تھی شام کی چائے بنانے کی۔ رسالہ ہاتھ میں تھا۔ چھوڑ کر کام کرنے کو دل نہیں کر رہا تھا اور سچی بات ہے کہ چائے بنانے سے مجھے اوّل روز سے ہی شدید چڑ ہے۔ خیر سسٹر کے پاس لڑکیاں ٹیوشن پڑھنے آتی تھیں۔ اللہ خوش رکھے۔ میں نے صاعقہ سے کہا۔ ”یار پلیز چائے بنا دو۔“ وہ اچھی بچی فوراً ہی بنانے لگھ گئی۔

میری عادت کہ میں کرسی کے اوپر دونوں پاؤں کر کے بیٹھتی ہوں دو کرسیاں ساتھ ساتھ بڑی تھیں صاعقہ چائے بنا کر لائی اور لا کر کرسی کے ہتھوں پر ٹرے رکھ دی۔ ٹرے میں پورے پانچ کپ تھے۔ ساتھ والی کرسی پر امی بیٹھی تھیں۔ مجھے معلوم تو تھا کہ اوھر چائے کی ٹرے رکھی ہے لیکن کہانی سے دھیان پٹانے کو دل نہ چاہا تو ایک ٹانگ نیچے اونکائے بیٹھی تھی۔ عاداتاً وہ بھی اوپر کرنے لگی تھی کہ گھٹنا ٹرے کو لگا وہ امی یہ اٹھنے لگی تھی میں نے فوراً ”اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی اور ہاتھ ایسا زور کا لگا کہ ٹھنکے کے بجائے پورے پانچ کے پانچ کپ میرے اوپر۔“ اوسمی ٹانگ جل گئی اف! اوپر سے گرمی ہائے لہائے فوراً ”واش رو م کو بھاگی۔ جلی ٹانگ پہ پانی ڈالنے سے وقتی سکون ملا۔ بعد میں آبلے بن گئے۔ ہائے کیا بتائیں لختی مشکل ہوئی اوپر سے بھالی (طیب عثمان) کی شادی کی تیاری بھی اف!۔

کچھ کہانیاں پڑھ کر ادھر چھپا کے رکھ آئی۔ اور ہفتے کے بعد جا کر اسے دوبارہ ختم کیا۔ اور یوں شعل سے مضبوط تعلق کا آغاز ہوا۔ لیکن باقاعدگی سے نہیں۔

شعل کے ساتھ باقاعدہ آغاز چار پانچ سال کے بعد ہوا۔ جب میں ایف اے میں آچھی تھی۔ (حالانکہ اہی کا کب سے کہتا تھا کہ شعل لگوا لیتے ہیں لیکن میں نے بدھائی کی وجہ سے روکے رکھا)

دلچسپ واقعہ نہیں واقعات ہیں۔ ایک دلچسپ واقعہ جو کہ میں بھول چکی تھی اور میری دوسرے نمبر والی بہن موش جو کہ پاس بیٹھی ہے۔ اور خط لکھوانے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے نے یاد کروایا ہے۔ سحرش اور موش جو کہ اس وقت 7th اور 8th میں تھیں اب ماشاء اللہ موش بی ایڈ اور سحرش ایم ایس سی کر کے اللہ تعالیٰ کی عنایت۔ اہی کی ہمت اور حوصلے سے جانب بھی کر رہی ہیں اور گھر کو بھی سنبھال رہی ہیں میں انہیں شعل پڑھنے سے منع کرتی تھی۔ وہ اسٹیڈیز چھوڑ کر شعل لے کر بیٹھ جاتی تھیں۔ میں نے انہیں سے شعل اور خواتین کے شمارے لیے اور ان دونوں نے چھپا کر پڑھنے شروع کر دیے۔ میں نے غصے میں سارے رسالے پھاڑ دیے۔ اس میں میری اپنی بھی پسندیدہ اسٹوریز تھیں (بیٹے پل کا سلیہ) جو کہ میں آج تک مکمل نہ کر سکی حالانکہ میں بعد میں بہت پچھتائی بھی۔

بھئی چیزیں یا پچھے رسالے پسند نہیں۔ میں بہت سنبھال کر رہتی ہوں اور پلاسٹک شیٹ چڑھا دیتی ہوں نظر بھی آئے اور پچھے بھی نہ۔

اکثر لڑکیاں ہم سے ڈائجسٹ مانگنے آتی ہیں۔ پہلے ہم دے دیتے تھے مگر واپس نہیں ملنے تھے اگر ملتے تو پیچارے شہید اور ضعیف ہوتے جیسے صدیوں پرانے ہوں جبکہ ہمارے پاس تو 2000 اور 1998 کے بھی ڈائجسٹ ایسے رکھے ہیں جیسے آج کے ہوں۔ اب کوئی مانگے تو پہلے ہم گارنٹی لیتے ہیں کہ ان کا ایک کوٹا بھی دوہرا نہیں کرنا۔ اور اک قطرہ بھی آئل یا چائے یا پانی کا نہ گرے۔ ورنہ بدلے میں ہم وہی حال کریں گے جو ڈائجسٹ کا ہو گا۔

خدیجہ بانو۔۔۔ جلال پور۔ گجرات

1۔ ماشاء اللہ ہم پانچ بہنیں اور ہمارا ایک بھائی ہے۔

جو کہ شعل پڑھنے میں ہمارے ساتھ ساتھ ہے اہی کو بھی مطالعے کا شوق ہے۔ مجھے شعل سکے سے۔

جڑے ہوئے سولہ سال سے زیادہ عرصہ ہونے والا ہے۔ اور ان شاء اللہ یہ خوب صورت رشتہ جاری رہے گا۔

سب سے پہلے شعل کو اپنی نانوں کے گھر دیکھا اور بہت خوش ہوئی کہ پورا بیٹھ کر پڑھوں گی۔ جبکہ وہ (شعل) وہاں جلنے کے لیے تیار تھا بالسن کے طور پر۔





بنابر (ہنوں میں ایک بھائی مجھ سے چھوٹا ہے) بے شمار پابند یوں کا سامنا تھا۔ ابو کو ”شعل“ سے ”کچھ دشمنی نہیں تھی۔ ناراض ہوتے تھے تو صرف میرے اتنے زیادہ مطالعے پر۔ ان کا تادریاب قول تھا۔

”کہہ بیٹی اگر تم اتنا ہی پڑھتی رہیں اور وہ بھی لیٹ کر تو ایک دن اپنی بیٹائی سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔“

اسکول کا نصاب بھی تو پڑھنا ہوتا تھا۔ (مہمابدرت پوزیشن ہولڈر تھے)۔ بھائیوں سے چوری تنگ سے گھرے میں بیٹھی نصاب کی کسی کتاب کے درمیان شعل رکھے محو مطالعہ ہوتی۔ یہ پابندی صرف میٹرک تک محدود تھی۔ اس کے بعد آزادی۔ سرورق سے آنکھوں کو خیر کرنے کی خواہش اس وقت حسرت میں ڈھل جاتی تھی۔ کیونکہ رسالے پرانے ہونے کی بنا پر سرورق سے محروم ہوتے تھے۔ ہمیں بھائی کو خلاف معمول گیٹ سے داخل ہوتے دیکھا اور رسالہ آپنی کی سمت اچھال دیا۔ آخر ان ہی کو بڑے ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ ہماری آپنی تمیں اتنی پیاری اتنی اچھی کہ بالکل ایسے پوز کر تیں جیسے رسالہ ہم نہیں وہ ہی پڑھ رہی تھیں۔

دوسرا واقعہ اف جس دن شعل یا خواتین ہمارے گھر آتے ہیں۔ سارا دن پورے محلے میں ہمارا شور جاتا ہے کہ پٹکے میں نے پڑھنا ہے اور پہلے میں نے اور

بہتے تک یہ کھیچا تانی لگی رہتی ہے اور محلے والے محفوظ ہوتے رہتے ہیں۔ بقول امی کوئی شعل کے لیے ہم پانچوں ہنوں کی دھنگا مٹی دیکھے تو دنگ رہ جائے کہ یہ یونیورسٹی اور اسکول کی ٹیچرز کا حال ہے۔ ابو اللہ ان کے (درجات بلند فرمائے) 20 دسمبر 2012ء کو ان کی وفات ہوئی اور امی جان جو کہ خود ہم سے زیادہ شعل کی شوقین ہیں، ابھی شعل پڑھنے سے منع نہیں کیا۔ اسٹوری پڑھنے کے ساتھ ساتھ ہمیں گائیڈ بھی کرتی ہیں کہ اسٹوری میں کیا پوزیٹو ہے کیا نیکٹو۔

اللہ ہماری امی کو حوصلہ اور ہمت دے۔ ابو کی وفات کے بعد اللہ کے بعد صرف امی نے ہی ہمیں حوصلہ اور ہمت دی اور دنیا کا کوئی بھی رشتہ ہمیں اپنے ساتھ یا قریب محسوس نہ ہوا۔ ابو کی وفات نے ہمیں اللہ تعالیٰ اور امی کے زیادہ قریب کر دیا۔

شعل مسکان۔۔۔۔۔ جام پور

ابھی پوری طرح شعور کی دنیا میں قدم رکھ بھی نہ پائی تھی کہ شعل اور کرن کو اپنی ہم جولی کی لسٹ میں پایا۔ 7th کلاس میں کلاس فیلو آفشنل کے توسط شعل سے متعارف ہوئی۔ گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کی

والدین کی محبت بھی عجیب ہوتی ہے۔ بالکل دھوپ چھاؤں کا سامراج رکھتے ہیں۔ میرے ابو جان جو کہ خود مطالعے کے بے حد شوقین تھے۔ مجھے۔ اکثر اوقات ڈانٹتے کہ ابھی تمہاری یہ عمر نہیں ہے یہ سب پڑھنے

اکثر دودھ ایل ایل کر دیچی کے پینڈے سے یا چائے ایل ایل کر ساس پین کے پینڈے سے لگ چکی ہوتی ہے اور ہم لوگوں کو تب ہوش آتا ہے جب ماما جانی کچھ جلنے کی بو سونکھ کر کچن کا رخ کرتی ہیں اور پھر ہمارے ساتھ وہی ہوتا ہے جو اس طرح کے کاموں میں ہوتا ہے۔ ارے بھائی کچھ خاص نہیں، بس تھوڑی سی بے عزتی اس کے علاوہ رسالوں، اخبارات اور میگزین پڑھنے کا شوق ہمارے گھر کے کونے کونے سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ تقریباً ”ہر گھرے میں ڈرننگ سائیڈ ٹیبل، چکن شلیف، سلیب اور ٹیکوں کے نیچے سے جھانکتے رسالے کسی سے پوشیدہ نہیں رہتے۔ ویسے بھی بقول سدرہ ناصر (بھابی) جب عشق کیا تو ڈرنا کیا مطلب جب رسالے پڑھنا ہی ہیں تو ڈر کے کیا طے گا۔ پہلے چھپ چھپ کر پڑھتے تھے لیکن اب کھلے عام پڑھتے ہیں۔

اسی حوالے سے ایک واقعہ روز روشن کی طرح میرے ذہن میں تازہ ہے کہ ایک دفعہ میں چھپ کر رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی اور پانی عالم سے بے خبر۔ بابا جان سو رہے تھے پھر مجھے نہیں خبر کب وہ آئے اور میرا ایموشنل سین دیکھا (کچھ اور میت سمجھیں جناب میں ایک اسٹوری پڑھ کر رو رہی تھی) پھر وہ پاس آئے وجہ پوچھی تو میں نے آنسو صاف کرتے ہوئے انہیں اسٹوری کا مختصر خلاصہ سنایا جو تک

کی۔ لیکن جوں ہی یلم یا دو تاریخ ہوئی۔ میرے تھوڑے سے اصرار پر رسالہ لے آئے حتیٰ کہ پچھلے سال اپنی بیماری کے دنوں میں جب انہیں جلنے پھرنے میں دشواری ہوتی تھی تو تب بھی مجھے رسالہ لا کر دیا۔ یہ بھی محبت کی ایک صورت تھی۔ ڈانٹ ڈپٹ اپنی جگہ مگر میرا شوق وہ ضرور پورا کرتے تھے۔ 29 اپریل 2011 کو میرے ابو جان، ادب سے گمراہ گاہ رخصتے والا ایک اور چراغ بجھ گیا۔

اب بھی رسالہ ہر ماہ لیتی ہوں۔ اب بھائیوں کی جانب سے کوئی پابندی بھی نہیں ہے۔ لیکن وہ مان وہ اصرار شاید کہیں کھو گیا ہے۔

اپنے کرب کو چھپا کر نشا مشکل ہوتا ہے دھیمی دھیمی آگ میں جلنا مشکل ہوتا ہے یوں تو ضبط بہت ہے، ہم میں لیکن کیا تلائیں۔ آنکھ تک آئے آنسوؤں کو پینا مشکل ہوتا ہے۔

اب بہت کچھ بدل گیا اور نہیں بدلا تو صرف شعاع اور اس سے دوستی۔ لیکن چوری چوری پڑھنے کا اپنا ہی مزاح تھا۔ اگرچہ اب کوئی پابندی نہیں ہے۔ میں اس چوری والے لطف کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اتنا ضرور کہوں گی کہ مطالعہ کی عادت وراثت میں ملی ہے۔

عائشہ اختر بٹ۔ سرگودھا

میں، میری سسٹر اللہ رکھی اور بھابی کے علاوہ کائنات (چھوٹی سسٹر) اس طرح مطالعہ کرتی ہیں کہ



خواتین کا مین روم میں گول میز کانفرنس کئے، اندازے لگائے اور بصرے کرنے میں مصروف تھیں۔ شام تک تبصرہ سن سن کر تھک گئے تو خود ہی پڑھنے بیٹھ گئے۔ بچوں کی کہانیاں، نونمل تو جب سے پڑھنا سیکھا ہے تب سے پڑھ رہی ہوں۔ ڈائجسٹ پہلی بار پڑھا۔ عنوان تھا ”بینی راجپوت کی ملکہ“ (نمو احمد) بس پھر نشہ چڑھ گیا جو ابھی تک نہیں اترتا۔

اب تبصرہ کرنے والوں میں، میں بھی شامل ہو گئی ہوں۔

2۔ شعلے سے متعلق دلچسپ واقعہ۔ خبر واقعات تو بہت سارے ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ! میں نے آج تک شعلے یا خواتین ڈائجسٹ خرید کر نہیں پڑھا۔ میرے 8 کلاس کے ایگزام ہونے والے تھے۔ انی نے ڈائجسٹ سمیت تمام غیر نصیبی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔ اللہ اللہ کر کے پیپر ختم ہوئے ہفتہ کے روز آخری پیپر تھا۔ اور اتوار کے دن آنٹی آٹھ ڈائجسٹ لے کر آئیں اور کہا اب بے فکر ہو کر پڑھنا، کوئی نہیں ٹوکے گا۔ وہ دن اچھے ترین دنوں میں سے ایک تھا۔

فوزیہ شمرٹ۔۔۔ عجرات

شعلے سے میری وابستگی بہت عرصہ سے ہے۔ مطالعے کا شوق مجھے شعلے، خواتین، کرن پڑھ کر ہوا۔ شعلے ایک مکمل درس گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو کسی بھی انسان کو اچھی زندگی گزارنے کے طریقے سکھاتی ہیں۔ ایک استاد، ایک ماں کی حیثیت رکھتا ہے۔ شعلے ہمارے گھر میں تو میری امی جی پیارے نبی کی پیاری باتیں کی وجہ سے اور عمران بھائی کو تاریخ کے بھٹوں کی وجہ سے کیوں کہ تاریخ کا تو وہ شیدائی ہے۔

گھر میں جب شعلے آتا ہے پہلے تو بہن شازی تھی۔ جس کے ساتھ ٹکرا رہی ہوتی تھی۔ پہلے میں دیکھو دل کی پہلے میں۔ اب یہ فریضہ طیبہ بھائی ادا کر رہی ہیں۔ ویسے جو مزہ خود پہلے شعلے کا ٹائٹل دیکھنے کا

اس میں بہت اچھا اخلاقی سبق تھا تو اب جب بھی کوئی روکے تو بابا جان بھی کہتے ہیں ”بس کرو یا رنجیاں بہت کچھ سیکھتی ہیں ان رسالوں سے۔ اچھے رسالے ہیں میں جانتا ہوں۔“ اب تو پھر موجاں ہی موجاں۔ شام سویرے ہیں موجاں ہی موجاں والا معاملہ ہے مطلب ”توروک ٹوک۔“

رفیقہ کلثوم۔۔۔ ڈی آئی خان

شعلے بچپن سے ہی کرنز کے ہاتھوں میں دیکھا ہے۔ اور پڑھنا میٹرک میں اگر شروع کیا۔ اب BSC کی طالبہ ہوں۔ اب سے لگاؤ تو بچپن سے ہی تھا۔ اور اسی وجہ سے ”اخباری کیز“ کا خطاب دیا گیا۔ سب کے بقول پڑھتے ہوئے تم بے ہوش ہوتی ہو۔ اور دنیا بانیما سے بے خبر ہو جانے والی عادت سے سخت چرتے ہیں۔ چرتا تو لازم ہے کہ جب کوئی آپ سے پوچھے یہ چیز وہاں پڑی ہے۔ اور آپ ہاں کہہ دو۔ اور وہ ڈھونڈ ڈھونڈا دے۔ اور پھر آپ کہیں آئے۔ اس کی حالت کو سنجیدگی سے لے کر جب آپ اسے سنیں۔ اور حیران ہوں کہ میں نے کب کہا وہاں پڑی ہے تو اس کے لیے تو بتا ہے نا۔

ہمارے مطالعے۔ جو جی چاہے خطاب دے۔ یا اپنا سر دھنسنے۔ گرمیوں کی چپتی دوسرے کو بھی بغیر بجلی چکے کے بیٹھ کر پڑھا ہے اسے۔ ہاں ایک دلچسپ واقعہ جب بھائی ابو کے پاس میرا ڈائجسٹ لے گیا۔ کہ ابو یہ ”یہ“ پڑھ رہی تھی۔ اور ابو نے کہنے لیا کہاں سے لیا پوچھ کر یہ کہتے حوالے کر دیا۔ ”اچھا دیکھ لو پتہ بری کہانیاں ہوں تو مت پڑھنا۔“ تو ڈی بہت شرمندگی ہوئی۔ کیونکہ ابو سے چھپ کر ہی پڑھتے تھے ناں ہم۔ کچھ عرصہ ڈائجسٹوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ پھر جب لگایا۔ تو صرف دو کو۔

عائشہ رباب۔۔۔ کراچی

بس چند سال پہلے ہی سکس کلاس میں تھی۔ اسکول سے گھر آئی تو یور اگھر اٹا پڑا تھا۔ تمام حاضر جملہ

میں نے کہیں پڑھا کہ ”جو چیز اللہ نہ دے تو اسے کبھی بھی بندوں سے نہیں مانگنا چاہیے ورنہ انسان بہت خوار ہوتا ہے۔“

فقیر شہر نے قسمت لگا دی ساغر
یہ شخص درد کی دولت کو عام کرتا ہے
چیزیں یا انسان وقتی سارا تو بن سکتے ہیں مگر رب
جیسا سارا اچھا ہر وقت میسر دوست کوئی اور نہیں بس
وہی عظیم عزت۔

دربار کبھی عیوں کے جو تم کو نہ بھٹکے دے
تو فیض الہی سے کچھ ایسی امانتوں
جناب یہ سب لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ میں نے یہ سب
شعاعِ خواہشیں کرنا سے سیکھا۔ مجھے دور دور تک کوئی

ایسا واقعہ نظر نہیں آتا کہ میں نے جھوٹ بول کر رسالہ
پڑھایا کسی نے منع کیا، میرا خاص مقررہ ٹائم ہے رات
کو پڑھنے کا، ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے بہت چھوٹی
عمر سے ہی لکھنا پڑھنا رسالے میں شروع کر دیا تھا مجھے
آج بھی یاد ہے 2002 اکتوبر کا رسالہ جس میں
میں نے حضرت علی کے فرامین بھیجے پہلے میری نانو
نے یہ شوق پورے کر دیا اور اب ای بابا میری
چوائس کو سراہتے اور مجھے سپورٹ کرتے ہیں۔





مسترجات

عظیمیا

قیمت - 400 روپے

مکتبہ امانت

کیتھیرن امانت: 37 - اردو بازار، لاہور۔ فون نمبر: 32735021

ہے وہ کسی کے بتائے سے نہیں آتا ہے نا۔
اب تو خیر کوئی پابندی نہیں ہے بس جب ٹائم ملے تو
ہر نئے مینے کا شعاع ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ہاں عرصہ پہلے
جب نیا نیا شعاع پڑھنا شروع کیا تھا۔ تو ایک بار رسالہ
پڑھتے ہوئے ہنڈیا پکار رہی تھی۔ تو کبھی میں جگ بھر کر
پانی ڈال دیتا تھا۔

بس پھر نہ پوچھے اسی سے کیا چھترول (الفاظ کی) ہوئی
تھی۔ ویسے ان دنوں میں۔ کوئی نئی نئی شروع کی
تھی۔ بس پھر ای جان کے ہاتھ میرا یہ ریکارڈ لگ گیا جو
وہ ہر رشتے دار کو کوئی کارنامہ سمجھ کر سنا رہی تھیں۔ خیر
ایک ٹھوکر کافی تھی۔ میرے لیے پھر باقاعدہ کانوں کو
ہاتھ لگا کر توبہ کی تھی آئندہ کھانا پکاتے ہوئے شعاع جی
کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ (عقل مند کے لیے ایک ٹھوکر ہی
کافی ہے نا)

سیدہ نسبت زہراؓ کہو ٹیپکا

جو یقین کی راہ پر چل پڑے انہیں منزلوں نے نہادی
جنہیں دوسو سوں نے ڈرا دیا وہ قدم قدم پر ہلکے گئے
تقدیر کی گھنٹی گھنٹیاں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کو
اپنی لیٹ میں لے کر کھلا کے رکھ دیتی ہیں۔ انسان کو
کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ پھر
”امید“ روشنی اور سہارے کا کام دیتی ہے زندگی ایک
مستل تھکا دینے والے سفر کا نام ہے۔ انسان میں
تبدیلی تب آتی ہے جب ہمارے اندر کے خیالات
بدلتے ہیں اور تب آئی ایم شیور کہ آپ ایک اچھے
انسان بن سکتے ہیں لیکن زندگی گزارنا آسان نہیں۔
ایک تکلیف وہ سفر جو چلتا ہی رہتا۔ اتار چڑھاؤ زندگی کا
لازمی جزو ہیں۔ اگر آپ کے اندر برواشت کی خوبی ہے
تو آپ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق کسی حد تک بنا سکتے
ہیں۔

”بہت کچھ سننے کو ملتا ارد گرد کے ماحول، رویوں اور
اسپیشلی لوگوں کے دو غلے بن۔“

حیا کا درس میرے شامل نصاب رہا
میں حرف حرف کھر کھر بھی ایک کتاب رہا



بَیِّنْہُنْ

مصطفیٰ قریشی ہمدردِ روینہ قریشی

شاہین رشید

ازدواجی زندگی کی۔
 ”بھی لڑائی تو ہوئی ہوگی؟“
 ”کبھی لڑائی۔۔۔؟“ مصطفیٰ قریشی صاحب نے کہا۔
 ”کثر لڑائی ہوتی ہے، لیکن ہم نے بھی لڑائی کو لمبا نہیں
 کھیچا۔ ہمیں اچھا ہی نہیں لگتا کہ ہم دیر تک ایک
 دوسرے سے ناراض رہیں۔“
 ”آپ دونوں کی لومیرج ہے؟“
 ”جی۔ یہ بھی ریڈیو پاکستان سے منسلک تھیں اور
 میں بھی۔ تو ایک دوسرے سے ملنا جلتا رہتا تھا اور
 چونکہ انہیں اپنی آواز بہت غور تھا لہذا لفظ ذرا کم
 ہی ملتی تھی، مگر ہم چونکہ ایک دوسرے کے مقدر میں
 تھے لہذا دوستی بھی ہو گئی اور رشتہ بھی۔“
 ”آپ کی اب بھی سیاست سے دلچسپی برقرار
 ہے؟“ ہم نے مصطفیٰ قریشی صاحب سے سوال کیا۔

”کچھ جوڑے سدا بہار ہوتے ہیں اور ہمیں یہ کہنے
 میں کوئی عار نہیں کہ روینہ قریشی اور مصطفیٰ قریشی
 صاحب کی جوڑی بھی سدا بہار ہے۔ ان کا آپس کا پیار و
 محبت اور ایک دوسرے کا خیال رکھنا اس بات کی عکاسی
 کرتا ہے کہ دونوں میں آج بھی پہلے دن کی طرح محبت
 ہے اور ان شاء اللہ یہ محبت قائم رہے گی۔“
 ”کیسی ہیں روینہ صاحبہ اور مصطفیٰ قریشی
 صاحب؟“

”اللہ کا شکر ہے۔ آپ ٹھیک ہیں؟“
 ”جی۔ آپ کی خوش گوار ازدواجی زندگی کارا ز کیا
 ہے؟“

روینہ قریشی۔ (ہستے ہوئے) ہم اگلے وقتوں کے
 لوگ ہیں، ہم میں بناوٹ اور منافقت نہیں ہے، ہم
 رشتوں کو بچانا جانتے ہیں۔ بس یہی وجہ ہے خوش گوار

”بالکل جی۔ میں تو پہلے دن سے اس پارٹی سے وابستہ ہوں اور ان شاء اللہ وابستہ رہوں گا۔“
”مگر سنا تھا کہ آپ اپنی پارٹی سے خوش نہیں ہیں؟“

”ہاں تھوڑے بہت اختلافات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ دراصل ہم فنکار لوگ لگی لپٹی باتیں کرنے کے عادی نہیں ہوتے، جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر بھی ہوتا ہے۔ سچے کھرے لوگ ہیں ہمیں کوئی لالچ نہیں ہے۔ اب ہماری سیاست میں کرپشن بہت زیادہ ہو گئی ہے اس لیے اب ذرا دور ہی رہتا ہوں سیاست سے۔ لی بی شہید جب تک حیات تھیں سب کچھ بہت بہتر تھا۔ خیر۔“

”اور وہ جو آپ کا جذبہ تھانفکاروں کے لیے کام کرتا۔ وہ مشن جاری ہے آپ کا؟“
”جی بالکل جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا۔ گزشتہ حکومتوں نے ”آرٹس انڈومنٹ فنڈ“ بنایا تھا اس کام میں ممبر ہوں اور صدر صاحب کے ساتھ ہماری اس سلسلے میں مینٹگ ہوتی رہتی ہے اور ہم معذور بے روزگار اور بزرگ فنکاروں کے لیے فنڈ جمع کرتے ہیں۔“

”آپ کو جانے کی جلدی ہے۔ میں زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ بس ایک آخری سوال کا جواب دیں کہ مادری زبان سندھی ہونے کے باوجود آپ نے پنجابی زبان کی فلموں میں کام کیا۔ تو آپ کو مشکل ہوئی تھی؟“

”جی۔ بالکل آپ نے ٹھیک کہا۔ سندھی میری مادری زبان تھی، اردو میری صاف تھی لہذا اردو فلموں کی آفرز آئیں، کام کیا، مگر کچھ ہی عرصے کے بعد پنجابی فلموں کے لیے بلایا گیا تو انکار نہیں کیا۔ لگتا تھا کہ ساری کامیابیاں اسی زبان کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہیں۔ اللہ نے بہت کامیابیاں دیں۔ مجھے پنجابی زبان نہیں آتی تھی اور میں نے باقاعدہ اسے سیکھا کیونکہ جہاں شوق ہو وہاں کوئی کام کرنا مشکل نہیں ہوتا اور بہت جلد

میں نے پنجابی سیکھ لی۔“
”تقریباً کتنی پنجابی فلمیں کیں آپ نے؟“
”میں نے تقریباً ساڑھے تین سو پنجابی فلمیں کیں اور ٹوٹل میں نے ساڑھے چھ سو فلمیں کیں۔“
”انشاء اللہ!“ اور اب ہم نے روایتی کرپشن صاحبہ سے بات چیت کا آغاز کیا۔

”زندگی کے کچھ ہی دن ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو بیشہ یاد رہتے ہیں۔ شادی کا۔ دن بھی ان ہی دنوں میں شمار ہوتا ہے۔ یاد تو ہو گا کہ شادی کب ہوئی تھی؟“

”جی۔ جی۔ بالکل یاد ہے۔ دن بھی بھلا بھولنے والا ہے۔ ہماری شادی 1971ء میں ہوئی اور حیدر آباد میں ہوئی۔ 19 ستمبر کو۔“

”پسند سے ہوئی، جیسا کہ آپ نے بتایا۔ بات کیسے آگے بڑھی؟“

”جی پسند کیا تھی۔ ہم دونوں ایک جگہ کام کرتے تھے اور مجھے گلوکاری سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا لہذا شادی کی طرف تو رجحان ہی نہیں تھا جیسا کہ عموماً لڑکیوں کو ہوتا ہے۔ تو یہ بھی ہمارے ساتھ ریڈیو سے وابستہ تھے تو میں انہیں ”اوا“ کہتی تھی اور آپ سب کو معلوم ہی ہے کہ سندھی میں ”اوا“ بھائی کو کہتے ہیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ دراصل یہ مجھ سے شادی کے خواہش مند ہیں۔ کیونکہ میری نانچ میں تو یہ بات تھی کہ یہ کسی اور کو پسند کرتے ہیں اور جب ان کی والدہ نے ان کی پسند سے شادی کرنے پر انکار کیا کہ ”میں تمہاری شادی وہاں نہیں کروں گی“ تو میں ہی انہیں تسلیاں دیتی تھی کہ چلیں دل چھوٹا نہ کریں۔ کوئی اور اچھی لڑکی مل جائے گی اور پھر ایک دن انہوں نے اپنے گھر والوں سے مجھے ملوایا۔ میں ان کی امی کو پسند آگئی اور یوں ہمارا رشتہ طے پایا۔“

”شادی کر کے کہاں رخصت ہوئیں۔ کراچی یا لاہور؟“

”ہم لوگ لاہور چلے گئے۔ کیونکہ فلم انڈسٹری

بعد؟“
 ”نورا“ تو ہم لاہور آگئے اور میری ایک طرح سے ہنی
 مون ہو گیا۔ ہنی مون کا مقصد کچھ دن اکیلے گزار کر
 ایک دوسرے کی طبیعتوں سے واقف ہونا ہوتا ہے۔
 سو جب اکیلے رہے تو ایک دوسرے کی طبیعتوں کو جانا
 بھی پڑا تھا بھی اور سمجھا بھی۔“
 ”غور کر گھر بنانے کے لیے بہت کمپوزیشن کرتی
 ہے۔ آپ نے کیا یا کچھ زیادہ محنت نہیں کئی پڑی؟“
 ”گھر کو بنانے اور گھر داری کے لیے میں نے بہت

لاہور میں تھی اور ان کی مصروفیات بھی کافی تھیں۔
 البتہ یہ ایک سیریس بات تھی کہ لاہور میں ان کا کوئی گھر
 نہیں تھا لہذا یہ مجھے رخصت کر کے لاہور ”ساقی“ (کلم
 اشار) صاحب کے گھر لے آئے۔ ان کے گھر وہ کچھ
 ہم نے اپنے لیے کرائے کے مکان کی تلاش شروع
 کی۔“
 ”کرائے کا مکان ملنے میں مشکل تو نہیں ہوئی
 کیونکہ آپ دونوں ہی مشاء اللہ مشہور شخصیات
 تھے؟“

”ارے یہ تو زیادہ افسوس ناک بات تھی کہ ہم
 شو بزدلوں کو لوگ کرائے کے مکان دینے میں تھوڑا سا
 گھبراتے تھے بقول ان کے کہ یہ فیلڈ اچھی نہیں ہے
 اور پتا نہیں ان کے گھر میں کیسے کیسے لوگ آئیں
 گئے۔ لوگ ویسے تو ہمیں بہت پسند کرتے تھے مگر گھر
 دینے پر راضی نہیں ہوتے تھے۔ اس مشکل کو دیکھتے
 ہوئے ساقی صاحب نے ہمارا بہت ساتھ دیا کہ آپ
 لوگ کیوں گھبرا رہے ہو، میرا گھر جب موجود ہے تو ادھر
 ادھر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ خیر پھر کافی جدوجہد
 کے بعد گھر مل ہی گیا۔ پھر اللہ نے کام میں برکت ڈالی
 تو لاہور میں ہی اپنا ذاتی گھر بھی خرید لیا۔“
 ”کرائے کا اور پھر اپنا۔ سب کچھ اچھا تو بہت لگا
 ہوگا۔ کیونکہ عورت کا خواب ہوتا ہے کہ وہ گھر کی
 مالک بن کر رہے؟“
 ”ہاں۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، بہت اچھا لگا“
 لیکن میں چونکہ اپنی فیلڈ میں بہت زیادہ مصروف رہتی
 تھی تو گھر داری کی طرف میں نے بالکل بھی توجہ نہیں
 دی۔ یہ تو بھلا ہونا ہیڈ نیازی (گلوکارہ) صاحبہ کا اور
 میری دیگر دوستوں کا جنہوں نے نہ صرف میرا گھر بیٹ
 کر لیا بلکہ مجھے گھر گرہستی بھی سکھائی۔ گھر کا فرنیچر
 وغیرہ بھی سب کی مدد سے اور مشورے سے لیا۔ اللہ کا
 شکر ہے کہ جلدی اپنے آپ کو سیٹ کر لیا، ہم نے۔
 اور پھر جب اپنا گھر لیا۔ تو مزہ ہی کچھ اور تھا۔“
 ”ہنی مون کے لیے فوراً کنٹینر یا کچھ عرصے کے

صاحب؟“
 ”نہیں۔ مجھے ان پر اعتبار تھا اور ہم دونوں ایک
 دوسرے کی فیلڈ کو بہ خوبی جانتے تھے۔ شادی سے
 پہلے ہی ہم دونوں میں کافی ذہنی ہم آہنگی ہو گئی۔ مجھے
 یقین تھا کہ یہ اپنے کام سے کام رکھیں گے۔ (ہنستے
 ہوئے) اور انہوں نے اپنے کام سے کام رکھا بھی۔



تب ہی تو ماشاء اللہ ہماری لائف بہت اچھی گزری۔
”آپ نے بتایا کہ جب یہ گھر سے جاتے تھے تو بچے
اسکول ہوتے تھے اور جب آتے تھے تو بچے سو رہے
ہوتے تھے۔ گویا۔۔۔ بچوں کی تربیت میں آپ کا ہی
ہاتھ ہے؟“

”جی بالکل۔۔۔ ہر لحاظ سے ان کا خیال رکھنا۔ ان کی
تعلیم کا۔ ان کو اوجھڑی سمجھانا۔ سب ذمہ داری میں نے
اپنے اوپر لی ہوئی تھی، مگر قریشی صاحب کو جتنا ٹائم ملتا
تھا وہ بھی بچوں سے غافل نہیں رہتے تھے۔“
”غصے کا کون تیز ہے آپ یا میاں صاحب؟“

”یہ شوق بھی مجھ کو ہی ہے۔۔۔ ان کی شاہنگ بھی
میں ہی کرتی ہوں۔۔۔ انہیں ان باتوں کا لفظی کوئی شوق
نہیں ہے۔“

”ایک دوسرے سے فرمائش پر گرام چلتا رہتا
ہے؟“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نوجوانی میں کبھی فرمائش نہیں
کی تو اس عمر میں کیا کرتی۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے
کی ضروریات کا خیالی رہتا ہے لہذا فرمائش کرنے کی
نوبت نہیں آتی۔“

”شادی کے موقع کا کوئی خاص واقعہ جو آپ کو یاد
ہو؟“

”ہاں۔۔۔ بڑا یادگار واقعہ ہے۔ میری ایک دوست
کو کراچی سے آنا تھا ہماری شادی میں شرکت کرنے
اور اسی نے مجھے آکے تیار کرنا تھا۔ کیونکہ
1971ء میں بیوٹی پارلز میں جا کر تیار ہونے کا
کوئی تصور نہیں تھا۔ لڑکیاں گھر پر ہی تیار ہوتی
تھیں۔ اب جس دوست نے آنا تھا۔ وہ کسی مجبوری
کی وجہ سے آ نہیں سکی۔ اس نے کہا کہ مجھے دیر
ہو جائے گی لہذا پھر مجھے زیبائیکم نے دلہن بنایا۔ اگر وہ
بھی نہ ہوتی تو میں تو بس ساہی دلہن ہوتی۔“

”اوپر کچھ کہنا چاہیں گی؟“
”نہیں۔۔۔ آپ نے کافی کچھ پوچھ لیا ہے۔ بس
پڑھنے والے ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔“

”میں غصہ نہیں آتا بلکہ میں غصے کی بہت تیز
ہوں اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ پر گھر کی بہت ذمہ
داریاں ہیں۔ گھر کو دیکھنا، نوکروں کو دیکھنا، ہر چیز کا خیال
رکھنا۔ پھر ایسے میں ذرا سی کوتاہی ہو جائے تو مجھے بہت
غصہ آتا ہے۔“

”کس چیز پر کھپو وائز نہیں کرتیں؟“
”گھر کے نظم و ضبط پر گندگی کو، چیزیں ادھر ادھر
بکھری رہیں، مجھے پسند نہیں۔ میرا چکن صاف ستھرا
ہونا چاہیے۔“

”میاں صاحب گھر کے کاموں میں آپ کا ہاتھ
بٹاتے ہیں یا ساری ذمہ داری آپ پر ہی ہے؟“
”مصطفیٰ گھر کے کاموں میں بالکل بھی ہاتھ نہیں
بٹاتے کیونکہ انہیں دلچسپی ہی نہیں ہے البتہ انہیں
گھر کی ڈیکوریشن کا بہت شوق ہے۔ اس لیے گاہے
بگاہے کچھ نہ کچھ چیزیں لاتے رہتے ہیں اور گھر میں
فریج پر کی سہینٹ بھی تبدیل کرتے رہتے ہیں۔“
”کھانا آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند کرتے ہیں اور
خحرے دکھاتے ہیں یہ؟“

”کھانے بننے کے معاملے میں ذرا ابھی پریشان نہیں
کرتے جو آگے رکھ دوں، ہنسی خوشی کھا لیتے ہیں اور خحرہ
تو بالکل بھی نہیں ہے ان میں۔“
”شاہنگ کا شوق کس کو ہے آپ کو یا مصطفیٰ قریشی
صاحب کو؟“

جب تجھ سے نانا جوڑا ہے

ح۔ الف۔ فیض آباد

میری۔۔۔

س۔ شادی کے لیے قربانی؟

ج۔ قربانی؟ یہ تو بہت چھوٹا لفظ ہے۔ ماں باپ کی عزت کے لیے تو سب کچھ ہی چھوڑ دیا تھا۔ اپنا آپ ہی قربان کر دیا تھا۔ اپنی دوستیں ”پتی ماں“ اپنے بہن بھائی، اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔

س۔ رسول کی لین دین میں کوئی جھگڑا ہوا؟

ج۔ سب کچھ جھگڑوں میں ہی ہوا۔۔۔ ہمارا دوا کچھ بھی ان کو پسند نہیں آتا تھا۔ ہر بات میں ان کی انا آجاتی تھی لیکن ڈراموں اور فلموں میں دیکھا تھا کہ جہاں لڑائی جھگڑا ہو وہاں پیار بھی بہت ہوتا ہے۔ لیکن ایسا ہماری دنیا میں نہیں ہوتا۔

س۔ شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟

ج۔ ہا ہا ہا۔۔۔ شادی کی رات ہی وہ سبزی لینے منڈی چلے گئے کیونکہ ان کی سبزی کی دکان بھی اور میرے سرسبز باغ بچے دکان لگالیتے تھے، میرے شوہر کو بوی سے زیادہ عزیز اپنا باپ تھا تو بس پہلی بات ہی انہوں نے یہ کی کہ میں منڈی جا رہا ہوں۔

س۔ شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج۔ سب کچھ ہی تبدیل ہو گیا تھا۔ کپڑوں سے لے کر میری سوچ تک سب کچھ تبدیل ہو گیا نہ شوہر پیار کرنے والا نہ سرال اور میری منڈیں توبہ توبہ ایسی منڈیں تو کسی کی بھی نہیں ہوں گی۔ بس ان سب تبدیلیوں کے بعد زندگی گزارنا بہت مشکل ہو گیا۔

س۔ ”کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟“

ج۔ شادی کی صبح ہی جب میرے شوہر سبزی لے کر واپس آئے تو انہوں نے اٹھایا اور کہا۔ آج سے میری ذمہ داری تمہاری ہے، اٹھو اور کچھ بتلاؤ۔ میں

عنوان بہت خوب صورت تھا سوچا کہ کچھ لکھوں۔ میں ح۔ الف۔ کسی کی پوری زندگی کی حقیقی کہانی لکھ رہی ہوں اس کی زبانی۔ اگر میں کہوں کہ یہ ایک عورت کی کہانی ہے تو یہ غلط ہوگا۔ کیونکہ پاکستان میں دیکھا جائے تو زیادہ تر عورتوں کی زندگی ایسے ہی گزرتی ہے۔ اس لیے میں کہوں گی یہ زیادہ تر عورتوں کی کہانی ہے۔

جب ایک عورت ایسی زندگی گزارتی ہے تو کیوں پھر وہ اپنی بیٹی کو بیاہ دیتی ہے جب اس کو پتا ہے کہ عورت کے ساتھ ایسا ہوتا ہے تو کیوں پھر وہ اپنی اولاد کو بھی ایسے جلنے کے لیے بیاہ دیتی ہے آخر کیوں؟

س۔ شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے؟

ج۔ شادی سے پہلے بے فکری ہی بے فکری تھی۔ کسی کام کی کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ ہم لوگ نو بہنیں تھیں پھر بھی مجھے کسی بات کی کوئی منشن ہی نہیں تھی۔ کھینا کوونا، ادھر دوڑنا ادھر پھرتا۔ کوئی روکتا بھی نہیں تھا۔ کوئی کام کرنا نہیں آتا تھا۔ میں تو بچی تھی پھر میرے گھر والوں نے بھی بھی کہا ہی نہیں تھا کہ کوئی کام ہی سیکھ لو۔ مجھے آنا گوندھنا بھی نہیں آتا تھا۔ وہ دن بہت ہی اچھے تھے شاید وہ ہی دن میں نے زندگی کے گزاریے تھے۔ اب تو ایک زندہ لاش کی طرح ہوں۔

س۔ شادی کب ہوئی؟

ج۔ میری شادی 9 نومبر 1989ء میں ہوئی۔

س۔ منگنی کتنے عرصے رہی؟

ج۔ منگنی دو سال رہی اور ان دو سالوں میں بھی لڑائی ہی ہوتی رہی۔ میں نے کہا بھی کہ اگر شادی سے پہلے سکون نہیں مجھے تو شادی کے بعد کیا ہوگا لیکن قسمت

نے جانا ہے۔ اور میں وہاں کھڑی ان کا منہ دیکھتی رہی کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے تو کچھ بتانا ہی نہیں آتا اور میری خراب قسمت نے اس دن میرا اتنا متاثر کیا کہ بس۔ لڑکیاں شادی کی صبح میاں کے ساتھ ناشتا کرتی ہیں اور میں نے ان سے جوتوں کا ناشتا کیا۔

س۔ ”میکے اور سرال کے کھانوں میں فرق؟“

ج۔ ”میکے اور سرال کے کھانے میں بہت فرق تھا۔ میکے میں میری امی یا بڑی آپلی ہی کھانا بناتی تھیں اور بہت اچھا بناتی تھیں اور ہم اپنے میکے میں کافی خوش حال تھے۔ ہم ایک وقت بناتے تھے کھانا اور اسی وقت

کھاتے تھے۔ پر سرال میں ایک وقت کھانا بنایا جاتا اور تین دن وہ ہی کھایا جاتا اور وہ کھانا بھی اتنا بد ذائقہ کہ اللہ کی پناہ۔

س۔ شادی میں اپنی مرضی کس حد تک تھی؟

ج۔ شادی میں میری مرضی ذرا بھی نہیں تھی۔ میرے شوہر لڑکوں کے ساتھ ہمارے گھر کے ساتھ ہی ایک میدان تھا وہاں کھیلنے آتے تھے تو مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ ہی میرے شوہر ہوں گے۔ میں ابھی چھوٹی ہی تھی اور وہ کافی بڑے تھے۔ جب بھی میں ان کو دیکھتی تھی میں ان کو کہتی تھی کالے بھائی کالے بھائی ان کو بہت غصہ آتا تھا۔ اور میں بھاگ جاتی تھی اور میرے شوہر شاید تب کا غصہ مجھ پر اب نکالتے ہیں۔

س۔ سرال میں کن باتوں پر تعریف/تقید ہوتی؟

ج۔ سرال میں میری ہر بات پر آج بھی تقید ہی ہوتی ہے۔ تعریف کیا ہے یہ تو میں شادی کے بعد جان ہی نہیں سکی۔ میری ہر بات پر تقید ہی ہوتی تھی۔ میں بہت پیاری تھی۔ گورا رنگ بہت خوب صورت پر شادی کے بعد یہ خوب صورتی میری بربادی بنی۔

س۔ جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ؟

ج۔ پہلے ہم سب جوائنٹ ہی تھے پھر اب علیحدہ ہو گئے۔ اللہ کا بہت شکر ہے۔ میرے شوہر نے یہ جو کام کیا ہے اس کے لیے ہمیشہ میں ان کے لیے دعا کرتی ہوں۔



س۔ پہلے بچے کی پیدائش؟

ج۔ ہاں عورت کے لیے پہلے بچے کی پیدائش بہت اہمیت رکھتی ہے لیکن میری قسمت نے یہاں بھی میرا ساتھ نہ دیا۔ اللہ نے مجھے پہلی رحمت عطا فرمائی لیکن سرال والوں نے بڑی باتیں بتائیں کہ یہ بس لڑکیاں ہی پیدا کرے گی۔ اللہ نے بعد میں آسمانیاں پیدا کیں بنی کے بعد چار بیٹے عطا فرمائے۔ میرا خیال تھا۔ بیٹا ہو گا تو شاید میرا شوہر کچھ بدل جائے پھر بھی نہیں بدل پایا۔

س۔ سرال میں مقام؟

ج۔ آپ مقام کی بات کرتے ہو، مجھے آج تک اپنے سرال میں جگہ نہیں مل پائی۔ جو اپنے شوہر کے دل میں مقام نہ بنا پائے وہ سرال میں کیسے بنا سکتی ہے۔ میرے سرال میں مجھے نوکرانی کا درجہ بھی نہیں ملا۔ پتا نہیں کس چیز کی سزا ملی مجھے، پر اب میں علیحدہ ہوں، مجھے ان کی کوئی پروا نہیں جنہوں نے مجھے سزا دی میری پروا نہیں کی مجھے ان کی کیوں ہو۔ یہ بات میں

صرف آپ سے کر رہی ہوں کیونکہ میں نے ہمیشہ اپنے بچوں کو یہ سمجھایا ہے کہ عزت کرو گے تو عزت ملے گی۔ بچے بہت عزت کرتے ہیں سب کی۔ میرے بچے بہت اچھے ہیں اور مجھ سے بڑا پیار کرتے ہیں۔ میرے ساتھ ساتھ پیلا سے اور دادی سے بھی بہت پیار کرتے ہیں۔ چھپیس سال میں نے اپنے سرال میں گزارے۔

س۔ شوہر سے تعلقات؟

ج۔ شوہر سے تعلقات کیا ہوں گے آپ کو بتایا تو ہے کہ نہ سرال پیار کرنے والا ملا نہ شوہر۔ جس نے پہلی صبح ہی میرا تماشا بنادیا ہو، وہ آگے کیا نہیں کر سکتا۔ میں نے ہمیشہ ان سے پیار کیا لیکن شوہر نے ہمیشہ مجھے مارا ہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اب تک کہ سرال والے مجھے اپنی پسند سے لے کر آئے تھے لیکن ایک دن بھی انہوں نے میری طرف داری نہیں کی۔ آخر میرا جرم کیا تھا۔ سرال والے میری سائیڈ لیتے تو شاید میرا شوہر بھی ٹھیک ہو جاتا۔ پر نہیں۔ پتا نہیں کس کس بات کا بدلہ لیا ان لوگوں نے مجھ سے۔ میری منڈیں اور انہوں نے ہمیشہ مجھے نیچا ہی دکھایا میں کھانا بناتی اور وہ مردوں کا ڈبہ کھانے کے اندر ڈال دیتیں۔ حد کر دی انہوں نے، پر میں نے کچھ نہ کہا ان کو کہ اللہ لے گا میرا بدلہ ان سے۔ سرال والے تو سرال

والے ان کا کیا گلہ کرنا لیکن شوہر تو اپنا ہوتا ہے، میرے شوہر نے ہی پروا نہیں کی اب تک میری۔ کسی جانور کے ساتھ بھی انسان رستا ہے تو وہ بھی وفادار ہو جاتا ہے۔ میں تو انسان کے ساتھ پیار محبت اور مخلص ہو کر رہی لیکن وہ آج تک میرا نہ ہو سکا۔ بچے جوان ہو گئے ہیں لیکن وہ اب بھی مجھے مارتا ہے۔ بچے بھی بڑے پریشان ہوتے ہیں ان کے رویے سے۔ جب میری شادی ہوئی تو ان کی بھری کی کوکن تھی لیکن اب ماشاء اللہ اتنا اچھا کاروبار ہے ان کا لیکن کاروبار کا کیا فائدہ۔ جب ان کے دل میں میرے لیے ذرا سی بھی محبت نہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ ان کا دل پتھر ہے کیا۔ اب وہ بیمار رہتے ہیں لیکن پھر بھی سختی نہیں لگتی ان کی۔ میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ ہر لڑکی کا نصیب اچھا کرے۔ ہر لڑکی کو اچھا شوہر ملے۔ جب شوہر اچھا ہو گا تو سرال والے بھی اچھے ہوں گے شوہر کی مدد ہو تو بڑے سے بڑا پہاڑ بھی کم لگتا ہے۔ میری والدین سے گزارش ہے کہ اسے بچوں کو پیار اور محبت سے رکھا کریں کیونکہ کوئی پتا نہیں ہو گا کہ آگے ان کے ساتھ کیا ہو۔



مٹا دیے ہیں

ادارہ خواتین و انجمن کی طرف سے انہوں کے لیے خوشحورت مائل

- ☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 250 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
- ☆ محبت بیاں نہیں لکھی جدون قیمت: 250 روپے

32216361 فون: 37۔ اردو بازار کراچی۔ فون: 32216361



Pakistanipoint.com

Wazir Azam

شہر زاو غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنادیا تھا۔ اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل شے عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو تاں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے، تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بیچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پہری پار کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گئی۔

میرپاؤس میں مختتم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

مختتم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے وہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام در شوار ہے۔ خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیرہ اور طوبی ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی، لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔



خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو ان کے دونوں بچوں نمبرہ اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمبرہ کو لگائی بھائی کی عادت ہے۔ ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوطی اور در شہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انیس پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بست ڈانٹ پڑتی ہے۔

انامیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے، لیکن برہان کا بیرونیہ اسے افسردہ کرتا ہے۔ عینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں۔ دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں۔ آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیورو کریٹ سیف الرحمن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔ پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہزادہ جیسے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیہ صہب چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔ اس نے خود کشی کی دھمکی دے کر شہزاد کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہزاد کی آمد عینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہزاد پاکستان آئی تو ایک برائی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوطی اور در شہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہو میں تو بتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا وہاں محمد ہادی آچکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے۔ تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنے دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

مختصر علی کا میٹا و باج شادی شدہ ہے، لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیہ صہب نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور عینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہزاد اسے باہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔ در شہوار اور طوطی محمد ہادی کے بنگلے میں جاتی ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبائیاں توڑتی ہیں۔ محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو در شہوار اسے دھمکی دیتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔

یٹینا بیگم، شہزاد کے ساتھ ایک آستانے پر جاتی ہیں۔ واپسی پر گمر کے گملے ٹوٹے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے تیسرے شوہر ہارون رضایتا ہے کہ رومیہ نے پھر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ نسیب کھاتے ہیں تو یٹینا بیگم کا سرگھوم جاتا ہے۔ بریگیڈیرو قاردرانی کی بیٹی کترہ درانی کی گاڑی کی فکر سے جسٹس محمود کا بیٹا راجیل محمود ہلاک ہو جاتا ہے۔ رومیہ اس وقت کترہ کے ساتھ تھی۔ کترہ کے والد اسے کیس سے نکال لیتے ہیں مگر رومیہ پھنس جاتی ہے۔ "ہم زاد" کے مشورے سے شہزاد اس کا کیس لڑنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ رومیہ کی وجہ سے یٹینا اور ہارون رضاکے درمیان کئی بڑھ جاتی ہے۔ در شہوار، طوطی اور نمرہ تینوں امتحان میں فیل ہو جاتی ہیں۔ مگر شرارتیں عروج پر ہیں۔ بالآخر محمد ہادی تنگ اگر برہان سے ان کی شکایت کرتا ہے۔ گھروالے تینوں کو ڈانٹتے ہیں۔ در شہوار اور طوطی واک کے لیے نکلی ہوئی ہیں کہ ایک کتان کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ در شہوار ڈور کے مارے جنگل میں گھس جاتی ہے۔ جہاں اتفاق سے فوج ہادی موجود ہوتا ہے۔ وہ کتے کو مار دیتا ہے۔ اس کا ہمدردانہ رویہ در شہوار کے دل کی دنیا بدل دیتا ہے۔

خاقان صاحب کا نام کسی اداکارہ کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔ یہ خبر بڑھ کر انا بیہ کو صدمہ پہنچتا ہے۔ ایسے میں برہان کا نرم رویہ اس کے لیے ڈھارس بننا ہے، مگر اسی لمحے برہان کے سیل پر کسی لڑکی کی کال اسے خدشات میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہاں کی فرمائش پر صندل کو نور محل بھیج دیا جاتا ہے۔ ایک دن وہاں کو اپنی شیطانی خواہش پوری کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور وہ صندل کو بے دست دیا کر کے کمرے میں لے جاتا ہے۔

صندل گم سم حالت میں میراؤس واپس آ جاتی ہے۔ سب اس کی حالت کی وجہ سے تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ برہان اسے سایکا ٹیوٹ کو دکھانے کا مشورہ دیتا ہے تو اس کی امی یہ ذمہ داری اسے ہی سونپ دیتی ہیں۔ وہ انا بیہ کے ایڈمیشن کے معاملے میں بھی دل چسپی لیتا ہے۔ انا بیہ بہت خوش ہوتی ہے۔

محمد ہادی اپنے افسران کی جھاڑن کر سخت چراغ بٹا ہوا ہے۔ میر خاقان جنگلات کی لکڑی چرانے میں ملوث ہیں۔ ہادی مخالف پارٹی کو کیس کرنے کا مشورہ دیتا ہے اور انہیں اپنی والدہ کے پاس بھیج دیتا ہے۔ یٹینا بیگم کی مسز فریسی سے جان پہچان ہے۔ اسی لیے شہزاد ان کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ مسز فریسی شہزاد کی صلاحیتوں سے متاثر ہوتی ہیں۔ انس میں شہزاد کی ہادی سے ملاقات ہوتی ہے جو کچھ خوش گوار نہیں ہوتی۔

در شہوار کے دل میں ہادی کی محبت بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ اس کے اظہار سے بھی نہیں گھبراتی، مگر طوطی یہ جان کر سخت پریشان ہوتی ہے۔

رومیہ کو کترہ فون کر کے بلائی ہے۔ وہ شرمندہ ہے اور کیس کے حوالے سے اس کی مدد کرنا چاہتی ہے۔ رضا ہارون رومیہ سے فری ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ انہیں پھینکار کر چلی جاتی ہے اور راستے میں اغوا ہو جاتی ہے۔ اسے اپنے اغوا کا کترہ پر شک ہے۔ شاہ میر جمشی پر بنی کسی کوتاہی گھر آتا ہے۔ جہاں اس کی مذہبی طوطی سے ہو جاتی ہے وہ اس سے تھوڑا ہی مذاق کر کے اپنے کمرے کی جانب بڑھ جاتا ہے۔ جہاں دعاغ کو ماؤف کر دینے والا ایک منظر اس کا ٹھہر تھا۔ صندل خود نشی کر لیتی ہے۔ طوطی کو صندل کے ہاتھ لکھا ایک رقعہ ملتا ہے حقیقت جان کر وہ تمام مردوں سے متعزف ہو جاتی ہے۔ شاہ میر سے اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ صندل کی موت وہاں کا سکون بھی غارت کر دیتی ہے۔ شاہ میر اور طوطی کو صندل کی پانسیب چھنکنے کی پر اسرار آواز سنائی دیتی ہے۔

برہان انا بیہ کو یونیورسٹی میں کسی کو بھی نکاح کے متعلق بتانے سے منع کرتا ہے۔ در شہوار ہادی سے اظہار محبت کرتی ہے تو وہ اسے جھڑک دیتا ہے۔ ہادی کسی اور کی محبت میں مبتلا ہے۔

شہزاد میر خاقان کو عدالتی نوٹس بھیجتی ہے جس کا مقابلہ کرنے کا وہ ذہن بنا لیتے ہیں۔ مونیکا اور ذوالکفل اسٹوڈنٹس ہیں اور ایک دوسرے کو لہند کرتے ہیں۔ مونیکا عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کرنا چاہتی ہے۔

ہم زاد، شہزاد کو مشورے اور چند تصاویر دیتا ہے۔ شہزاد کو بھرپور شہر میں رہنے کا ارادہ ہے، ہم زاد اسے رد کرتا ہے۔ مگر اے ایس بی آر قاضی حیدر تائید کرتا ہے۔ اسے شہزاد پسند آئی، بسج شہزاد ار حاضی کے حوالے سے مذاق کرتی ہے تو ہم زاد ناراض ہو جاتا ہے۔

رومیہ روہیل کے دوست نے کنزہ کی گواہی کی بنا پر اغوا کیا ہے اور اسے مارنا چاہتا ہے۔ اسی لمحے کہیں سے گولی چلنے کی آواز آتی ہے۔

رومیہ کو اغوا کرنے والوں میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ دوستوں کے علم میں لائے بغیر رومیہ کو اغوا کرنے والا، گن پوائنٹ پر اس سے نکاح کر لیتا ہے۔

ہم زاد، شہزادہ سے رکھائی سے پیش آتا ہے تو وہ اس سے قطع تعلق کر لیتی ہے۔ شہزاد اپنے دوستوں کی مدد سے پولیس کانفرنس کرتی ہے، جس کی وجہ سے وقار درانی اس سے ملنا چاہتے ہیں، مگر وہ انہیں اہمیت نہیں دیتی۔ شہزاد کی سیف احسن سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ شہزاد سے متاثر ہوتے ہیں۔

برہان کی اپنی شاگرد منال قریشی سے دوستی ہے، جس سے پوری یونیورسٹی واقف ہے۔ یہ بات انابیہ کورنج میں مبتلا کر دیتی ہے۔

درسموار کے ایک بار پھر فری ہونے پر ہادی اسے جھڑک دیتا ہے۔ درسموار اس غم سے بیمار ہو جاتی ہے۔

شہزاد، شجاع غنی کا مقدمہ بہترین انداز میں لڑتی ہے، جس پر میر خاندان طیش میں آ جاتا ہے۔ وہ فون پر راضی حیدر سے بات کر رہی ہوتی ہے کہ کچھ لوگ اس کا تعاقب کرتے ہیں۔ راضی فائرنگ سن کر پریشان ہو جاتا ہے۔

مونیکا کے والدین اس کے پاس قرآن پاک کی تفسیر دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں اور جلد از جلد اس کی شادی کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ مونیکا یہ جان کر پریشان ہو جاتی ہے اور ذوالکفل کو شادی کی پیشکش کرتی ہے۔

سآلوی قیسط

یٹینا بیگم کی طبیعت صبح سے کچھ اب سیٹ تھی!

شہزاد کی پولیس کانفرنس نے خرابی طبیعت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ تب ہی سیف الرحمن کی کال آئی تو وہ ان کو منع نہیں کر پائیں، اور ان کے ساتھ میروٹ میں ڈنر کرنے چلی آئیں۔ ڈنر کے دوران بھی دونوں کا موضوع گفتگو شہزاد کا تازہ ترین کیس تھا جس کی آج دہر میں پیشی تھی۔

وہ کھانا کھانے میں مصروف تھیں، جب اچانک سیوی پر چلنے والی بریکنگ نیوز میں آنے والے ہیر سٹری کے نام نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔ نیوز رپورٹر گلا پھاڑ پھاڑ کر اسلام آباد ایکسپریس وے پر ہونے والے حملے کے بارے میں بتا رہا تھا۔

یٹینا بیگم کو سواٹ کا کرنٹ لگا، انہوں نے بوکھلا کر سامنے دو بار پر لگی ایل ای ڈی پر شہزاد کی تباہ حال گاڑی کو دیکھا، ان کے ہاتھ سے کرشل کا گلاس چھوٹ کر نیچے جایا کر اور کچھوں کی صورت میں زمین پر بکھر گیا۔ ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔ گاڑی پر گولیوں کی بارش کی گئی تھی۔ وہ اندازہ کر سکتی تھیں کہ اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔

”اوہ مائی گاڑی!“ انہوں نے خوف زدہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ لیوں پر رکھ لیے۔ سیف الرحمن نے ان کی نظموں کے تعاقب میں بی بی کی طرف دیکھا جہاں پر ٹیکر چل رہا تھا۔ ان کو بھی جھکا لگا۔

”ہیر سٹری شہزاد پر اسلام آباد ایکسپریس ہائی وے پر قاتلانہ حملہ۔“

”سیفی! میری بیٹی۔“ ان کے منہ سے بمشکل یہ الفاظ نکلے، وہ حواس باختہ انداز میں کھڑی ہوئیں۔ انہیں لگا جیسے زمانہ و مکان کی گردشیں ایک لمحے کو ختم ہو گئی ہیں اور کسی نے پوری ٹرین ان کے وجود پر سے گزاردی ہے۔

”ٹیک اسٹ ایزی سی بلوئیٹا۔“ سیف الرحمن نے فوراً اٹھ کر ان کو سارا دیا۔

”ناظرین، میرے شہزاد آج کل وفاقی وزیر حاکم علی کے بیٹے میر خاقان علی کے خلاف ایک کیس کے حوالے سے کافی خبروں میں تھیں۔“

نیوی پر کسی نیوز ایجنسی نے پکھلا ہوا سیدہ ان کے کانوں میں انڈیلا، میر حاکم علی کا نام سن کر ان کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں، اس خاندان کو کون نہیں جانتا تھا۔ وہ چلتے چلتے رکیں اور ایک ہلو کو پکڑ کر انہوں نے خود کو گرنے سے بچایا۔

دماغ میں سوچوں کا ڈھام تھا اور ذہن اس قدر منتشر تھا کہ کسی بھی مثبت سوچ کو وہاں قدم جمائے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ ان کی پیشانی پر نمودار ہونے والی پسینے کی بوندیں سیف الرحمن کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکیں۔

ابھی تو وہ صبح کی کوئی خبر نہیں تھی کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا۔ اوپر سے شہزاد پر ہونے والے اس حملے نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ ہوسل سے اسپتال کا سارا راستہ انہوں نے ٹشو پیپر سے اپنے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے گزارا۔ اسپتال کی پارکنگ میں سیفی کی گاڑی جیسے ہی رکی، میڈیا سے تعلق رکھنے والے بے شمار نیوز رپورٹرز اور صحافی ان کی طرف لپکے۔ ٹینا بیگم کا یورو کرٹ سیف الرحمن کے ساتھ آنا بھی ایک بڑی خبر تھا۔

”میم! میرے شہزاد پر ہونے والے حملے کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟“ مختلف رپورٹرز کے سوالات نے ان کا تعاقب کیا۔

وہ ان سوالوں کا کوئی بھی جواب دے کر بغیر تیز تیز کوریڈور میں چل رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر شیریں کے پاس پہنچ جائیں۔ بے شمار کیمرہ والے مشہور و معروف یورو کرٹ سیف الرحمن اور ٹینا بیگم کو ایک ساتھ اپنے کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر لیا۔

”میم! آپ کے خیال میں میرے شہزاد کو کس نے مارنے کی کوشش کی ہے؟“

”آئی ڈونٹ نو۔“ وہ بمشکل خود پر ضبط کرتے ہوئے تیزی سے آئی سی یو کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

”آپ کے خیال میں اس قاتلانہ حملے کے پیچھے آپ کی دوسری بیٹی کے اغوا کاروں کا تعلق — ہے یا کوئی اور؟“ ایک اور سوال نے ان کا تعاقب کیا، وہ چلتے چلتے رکیں، ان کا چہرہ ضبط کی کوشش میں سرخ ہوا۔

”فائر گاڈیک، کیا ہو گیا ہے آپ لوگوں کو؟“ میری بیٹی اس وقت آئی سی یو میں ہے اور میں ابھی کوئی بھی اسٹیٹمنٹ دینے کے قابل نہیں ہوں۔“ وہ لوگوں کے جھوم کو دھکیلتی ہوئی سیف الرحمن کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھیں۔

”ٹینا، مم! اس موقع پر آپ کچھ کہنا چاہیں گی؟“ ایک اور صحافی بھاگ کر عین ان کے سامنے آن کھڑا ہوا اور اس نے اپنا مائیک جیسے ہی ٹینا کے آگے کیا، ان کے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔

”سٹاپ، آئی سے جسٹ سٹاپ۔“ ان کے چیخنے پر ایک دم سناٹا چھا گیا، بہت سے رپورٹر غیر شعوری طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

”ٹینا، پلیز ٹول ڈاؤن!“

سیفی نے نرمی سے ان کا ہاتھ پکڑا اور بڑی سرعت سے آگے نکلے اور ارنلڈ جیڈ نے دور کھڑے ہی ساری صورت حال کا اندازہ لگا لیا، اس کے اشارے پر بہت سے سیکورٹی گارڈز نے ٹینا بیگم کو اپنے حصار میں لیا اور وہ اب بغیر کسی رکاوٹ کے آئی سی یو کے پاس پہنچ گئی تھیں۔

اس کوریڈور میں بہت خاص خاص لوگ موجود تھے جن میں سب سے نمایاں چہرہ مسز قویشی کا تھا۔ جو اس وقت میڈیا کے کچھ نمائندوں کو اپنا پوائنٹ آف ویو بڑے متحمل انداز میں بتا رہی تھیں۔

”شہزاد آج کل نمبر فافیا کے خلاف کیس لڑ رہی تھی اور مجھے لگتا ہے اس کا روایتی کے پیچھے ان لوگوں کا بھی

ہاتھ ہو سکتا ہے۔“

”آپ کا اشارہ میرا خاقان علی کی طرف ہے۔“ ایک رپورٹر نے چمکالینے کے انداز میں کہا لیکن اس سے پہلے وہ اس کے سوال کا کوئی جواب دیتے۔ ان کی نظر یٹنا بیگم پر پڑی وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھیں۔

”عالیہ، میری بیٹی۔“ یٹنا بیگم کے منہ سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر باہر نکلے۔

”یٹنا، ٹیکنک اٹ ایزی۔ وہ خطرے سے باہر ہے۔“ مسز عالیہ قزوینی نے فوراً انہیں بتایا لیکن یٹنا بیگم ہنوز سخت تشویش کا شکار تھیں۔

”کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر؟“

”ایک گولی شہری کے کندھے کو چھو کر گزری ہے اور گاڑی کے کچھ شیشے ٹوٹ کر لگے ہیں، باقی ڈرائیور اللہ کا شکر ہے محفوظ ہے۔“ مسز قزوینی کی اطلاع پر یٹنا بیگم کی سانسیں بحال ہوئیں۔

”تھینک گاڈ۔“ ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”میں دیکھ سکتی ہوں اسے۔“ انہوں نے اپنی نم ہوتی آنکھوں کو ٹشو سے صاف کیا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ مسز قزوینی نرمی سے ان کا ہاتھ پکڑ کر آئی سی یو کی شیشے کی دیوار طرف لے آئیں۔ سامنے شہر زاد کا وجود بے شمار تاروں اور مشینوں میں جکڑا ہوا تھا، اس کے چہرے پر زردیاں گھلی ہوئی تھیں وہ اس وقت بے ہوش تھی۔ یٹنا بیگم کے دل پر کسی نے گھونسا مارا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شہر زاد کو اس حالت تک پہنچانے والوں کا منہ نوحہ لیتیں یا کم سے کم پھانسی کے پھندے سے لڑکا دیتیں۔

”لی بریو یٹنا! مسز عالیہ قزوینی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلا سا دیا۔

”میں ان لوگوں کو چھوٹوں کی نہیں۔“ وہ روتے ہوئے زیر لب کہہ رہی تھیں۔

”یٹنا! پلینز ٹیکنک اٹ ایزی۔“

ایک کوئے سے سیف الر حنن نکل کر آگے بڑھے۔ یٹنا بیگم کو اس وقت کسی جذباتی سہارے کی اشد ضرورت تھی وہ بلا ارادہ ان کے کندھے سے لگ کر سکنے لگیں، بے شمار کیمروں کی فلڈس لائٹس چمکیں اور انہوں نے اس منظر کو بھی اپنی آنکھ میں محفوظ کر لیا، آنے والے دنوں میں یہ خبر ایک دفعہ پھر چٹ پٹے مسالے کی صورت میں اخبارات اور میگزین کی زینت بننے والی تھی۔



برکھارت کی جھڑی نے مری میں ایک سماں باندھ رکھا تھا۔ گھنگھور گھنائیں کیا برسیں، ہر چیز نکھری نکھری نظر آنے لگی۔ بیجا موسم منچلا ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی پھولوں اور درختوں نے ساون میں جھومنا شروع کر دیا۔ عام حالات میں تو در شہوار اور اس کی کزنز اس موسم کو خواب انجوائے کرتیں لیکن در شہوار کی طبیعت کی خرابی نے پورے میراؤس میں ایک اداسی کی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے چمکنے والی بلبل کا کسی نے گلا گھونٹ دیا ہو۔

در شہوار کا بخار کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر خاموشی کی مرثیت ہو چکی تھی۔ محمد ہادی کی آخری گفتگو نے اسے آسمان سے زمین پر لا پٹھا تھا۔ ابھی تک اس کے حواس بحال نہیں ہوئے تھے۔

اس کی معصوم شرارتیں، شوخ جملے اور بے ضروری گستاخوں کا اس نے انتہائی غلط اور برا مطلب اخذ کیا تھا۔ در شہوار اس کے کلمہ الفاظ کو بھول سکتی تھی لیکن اس کا زہر آلود لہجہ اس کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون برباد کر چکا

تھا۔ عزت نفس کو روند کر حاصل کی جانے والی محبت کا روپ اتنا بھیا تک بھی ہو سکتا ہے، درشوار کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ شخص اس کے پندار کو روند کر بڑی شان سے چلا گیا تھا اور اس کے اندر بے چینی کا ایک جہان آباد ہو گیا تھا۔

پچھلے تین دن سے وہ سوچوں کے اس جنم میں جل رہی تھی۔ جو بخار کی صورت میں اس کے سارے وجود کو اپنی پلیٹ میں لیے چکا تھا، چونکہ ہر شرارت کا آغاز درشوار کی طرف سے ہوتا تھا اس لیے نیمو، طوبی اور اتابیہ بھی دم سادھے بیٹھی تھیں۔ اس دن نیمو جھنجھلا کر اپنی گینگ لیڈر کے کمرے میں چلی آئی۔

”خدا کے لیے درشوار اب ٹھیک ہو جاؤ، قسم سے سخت بوریت پھیلا رہی ہے تم نے۔“
نیمو گرما گرم پکوٹوں کی پلیٹ لیے اندر داخل ہوئی اور سوچ پکوڑے کے سارے ہی ٹن نیچے کر دیے، پورا کمرہ روشنیوں سے بھر گیا، درشوار نے بے ساختہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر بڑی قوت سے ابھرا۔ یہ روشنیاں اور اجالے اسے کچھ دن سے بہت برے لگ رہے تھے۔ نیمو تھنا نظروں سے اسے گھورا۔

”اتنا آفت موسم ہے، دل کر رہا ہے فوراً“ کشمیر پوائنٹ پر لمبی واک کر کے آئیں۔“ اس نے درشوار کے کمرے کی کھڑکی کا پردہ پیچھے کیا۔ سامنے ہادی کے کمرے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کی کھڑکیاں بھی کھلی ہوئی تھیں لیکن وہ کمرے میں موجود نہیں تھا۔
”ارے واہ، کیا مزے دار چٹنی ہے پودینے کی۔“ نیمو نے ایک زوردار چٹکارا لیا لیکن درشوار پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں، کہیں خدا نخواستہ قوت گویائی سلب تو نہیں ہو گئی تمہاری؟“ نیمو نے اس کے پاس آکر شرارت سے کھیل ہٹایا، درشوار کو کرنٹ لگا۔ وہ غصے سے اٹھ بیٹھی اور شعلہ انگلی نگاہوں سے نیمو کو گھورنے لگی جس کی شوخیوں اس وقت زہر لگ رہی تھیں اسے۔

”پکوڑے کھاؤ گی؟“ اس نے مسکراتے ہوئے ایک پکوڑا اس کی طرف بڑھایا، وہ ایک جھٹکے سے اٹھی، غصے سے نیمو کا بازو پکڑا اور کھینچتی ہوئی کمرے کے دروازے کے پاس لے گئی اور زور سے باہر کی طرف دھکا دے کر دروازہ لاک کر لیا۔

نیمو جو اس حملے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی، وہ سامنے سے آتے ہوئے شاہ میر سے بری طرح ٹکرائی، اس کے ہاتھوں سے پکوٹوں کی پلیٹ اچھل کر زمین پر جاگری اور میزبیاں چڑھ کر اوپر آئی ہوئی طوبی نے یہ منظر انتہائی بے زاری سے دیکھا۔ شاہ میر اور نیمو کی بڑھتی ہوئی بے تکلفی اس کی دل آزاری کا باعث بن رہی تھی۔
”استغفر اللہ، یہ تم کیا بگو لے کی طرح جاڑی پھر رہی ہو؟“ شاہ میر نے سہارا دے کر اسے کھڑا کیا۔

”تمہاری بہن کا کارنامہ ہے یہ، وہ بھی بخار میں۔“ نیمو نے برا سامنے بتایا۔
”تمہیں کس نے کہا تھا؟ اسے چھیڑو؟“

”جب اپنا موڈ ہو تو کسی کو بخشتی ہے۔“ نیمو نے حسرت بھری نگاہوں سے زمین پر گرے پکوٹوں کو دیکھا۔

”یتا ہے ناں، آج کل طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کی۔“ شاہ میر نے فوراً ”بہن کی طرف داری کی۔“

”تمہیں خیال رکھنا چاہیے اس کا۔“ شاہ میر نے کن اکھیوں سے طوبی کے چہرے کے بڑے ہوئے زاویے دیکھے اور اپنے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا، کیونکہ اس سے کچھ بعید بھی نہیں تھا کہ زمین پر پڑی ہوئی

پلیٹ اٹھا کر اس کے سر پر دے مارتی۔ وہ منہ بتاتی ہوئی سامنے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گئی، ریموٹ کنٹرول سے فی وی کاٹن آن کیا لیکن اس کے کان شاہ میر اور نمبرو کی جانب لگے تھے۔
 ”اسی لیے تو گئی تھی کہ اس کا دل بھل جائے، لیکن اس نے تو ذرا بھی لحاظ نہیں کیا۔“ اس نے منہ بنا کر در شہوار کی شکایت لگائی۔

”کوئی بات نہیں، خود ہی سیٹ ہو جائے گی دو چار دن میں۔“ شاہ میر نے اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔
 ”تمہارے پاس کچھ ٹائم ہے تو مارکیٹ چلو گے میرے ساتھ؟“ نمبرو کی اس فرمائش پر طوبی کے کان کھڑے ہو گئے۔

”تمہارے لیے ٹائم نہیں ہو گا تو اور کس کے لیے ہو گا۔“ شاہ میر کا شوخ جملہ طوبی کو سلگا گیا۔
 ”ارے واہ، مجھے تو پتا ہی نہیں تھا میں بھی اتنی اہم ہوں کسی کے لیے۔“ نمبرو کھکھلا کر ہنسی اور طوبی کے تن بدن میں اگ لگ گئی۔

”ڈومنٹ میں ریڈی ہو جاؤ، میں چیئنج کر کے آتا ہوں، واپسی پرواک بھی کریں گے لمبی سی۔“ شاہ میر نے کن اکیوں سے طوبی کا سر چہرہ دیکھتے ہوئے اسے مزید جلایا، وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس کا بس نہیں چل رہا ہو گا کہ ان دونوں کو میراؤس کی چھت سے دھکا دے دے اور وہ دونوں دوسرا سانس تک نہ لے سکیں۔



شہر زاد کو کچھ ہی گھنٹوں کے بعد ہوش آچکا تھا۔
 اسے آئی سی یو سے پرائیوٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا۔ اب اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔
 شہر زاد کے ہوش میں آتے ہی، پولیس اس کا بیان ریکارڈ کرنے آن پہنچی اور شہر زاد نے خاصی عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نپے تلے انداز میں اپنا بیان دیا تھا۔ اس کے لمحے میں اپنے دشمنوں کے لیے کوئی چلک نہیں

تھی۔
 ”اس حادثے کے بعد آپ کا مورال کم تو نہیں ہوا؟“ ایک صحافی نے تنقیدی سے سوال کیا۔
 ”میرا خیال ہے میرے مخالفین کو اس بات کا اندازہ نہیں کہ جب انسان موت کی دلیز کو چھو آتا ہے تو وہ نفع نقصان سے بے نیاز ہو جاتا ہے، دنیا میں سب سے خوفناک چیز موت ہے اور اس کا بہت قریب سے مشاہدہ کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ اب دنیا کی کوئی بھی چیز مجھے نہیں ڈرا سکتی۔“ وہ بڑے متمثل انداز میں بولتی ہوئی بہت سے لوگوں کو رشک میں مبتلا کر گئی۔
 ”میم! میرا خیال ہے کہ یہ حملہ اسی کیس کے تناظر میں ہوا ہے جو آج کل آپ ٹمبرافیا کے خلاف لڑ رہی تھیں۔“

”تو اس کا تو پھر یہی مطلب ہوا کہ میرے مخالفین مجھ سے خوف زدہ ہیں اور مجھے تو اس بات کو انجوائے کرنا چاہیے۔“ اس کی بات پر وہاں کھڑے کچھ رپورٹرز فس بڑے۔
 ”میرا خیال ہے اب یہ سیشن ختم ہو جانا چاہیے، آپ لوگوں سے رابطہ رہے گا۔“ شہر زاد نے بہت سمجھ داری سے میڈیا کے لوگوں کو ہینڈل کیا تھا، وہ جانتی تھی کہ موجودہ دور میں ان سے بگاڑنا سب سے بڑی بے وقوفی تھی، ان سب کے نکتے ہی ٹینا بیگم اس کے بالکل قریب آن پہنچیں۔

انہوں نے صدمے بھری نگاہوں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں متورم، بال الجھے ہوئے اور چہرہ انتہائی زرد تھا لیکن اس کا لہجہ پہلے کی طرح ہر اعتماد اور مضبوط تھا اور اس چیز نے ٹینا بیگم کو بھی حیران کیا تھا، وہ یہ چیز

زندگی میں کبھی نہیں پسچھ پائی تھیں۔
”میں چھوٹوں کی نہیں ان لوگوں کو۔“ ”یہ نیا بیگم کی آنکھوں سے اٹنے والے آنسو شہزاد کو تکلیف دے رہے تھے۔

”میں ٹھیک ہوں ماں۔“ اس نے زبردستی مسکرا کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔
”تم میرا کام کی ٹیم کی ٹیم کے خلاف کیس لڑ رہی تھیں، تم نے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی۔“ ان کے پریشان چہرے کو شہزاد نے تعجب سے دیکھا۔

”مام! میرا تو کام ہی یہی ہے، آپ کیوں ٹینس ہو رہی ہیں۔“ وہ بمشکل اٹھ کر بیٹھی، اس کی رگوں میں ابھی تک کھچاؤ تھی، اس نے اپنی پھٹی سے گردن کو مسلا اور تیلی کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔

”لیکن اس خاندان سے ٹکر لینا کوئی آسان کام نہیں۔“ ان کے لہجے میں ہلکا سا خوف پوشیدہ تھا۔
”کم آن مام، ظالم دنیا کے کسی بھی کوئے میں ہو، وہ ایسا ہی ہوتا ہے، آپ ٹینشن مت لیں، ایسے لوگوں کو ہینڈل کرنا آتا ہے مجھے۔“ اس نے مسکرا کر اپنی ماں کو مطمئن کرنے کی ایک اور ناکام کوشش کی۔

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ار ترضی حیدر کا مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سفید لٹی کے پھولوں کا خوب صورت گلدستہ تھا جو وہ شہزاد کے لیے لایا تھا۔ ”یہ نیا بیگم نے تو صیغی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، دراز قامت ار ترضی پولیس یونیفارم میں خاصا پینڈم لگ رہا تھا۔ وہ شاید آفس سے سیدھا ادھر آگیا تھا۔

”السلام علیکم آئی۔“ اس نے ”یہ نیا بیگم کو مخاطب کیا تو انہوں نے ہلکا سا سرخم کر کے اسے جواب دیا۔
”نئی زندگی کی نئی صبح مبارک ہو شہزاد۔“ اس نے مسکراتے ہوئے پھولوں کا بکے شہزاد کی طرف بڑھایا۔
”یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا۔“ شہزاد جانتی تھی، اسے بروقت اسپتال لانے والا وہی شخص تھا۔
”کچھ پتا چلا، ان لوگ تھے، کہاں سے آئے تھے اور کس نے فائرنگ کروائی۔“ ”یہ نیا بیگم نے ایک سالس میں کئی سوال کیے۔

”ہمارا شک تو دو پارٹیوں پر ہے۔ مزید انویسٹی گیشن ہو رہی ہے، ان شاء اللہ جلد ہی پتا چل جائے گا۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”رومی والے معاملے کا کیا پتا؟“ شہزاد کے فکر مند انداز پر وہ مسکرایا۔
”ہمیلے آپ خود تو ٹھیک ہو جائیں۔“

”آپ نہیں جانتے ار ترضی! یہ مسئلہ میری زندگی سے زیادہ اہم ہے، میں رہوں نہ رہوں، لیکن رومی کو واپس لانا ہے مجھے۔“

”اللہ نہ کھرے۔“ ار ترضی کا بے ساختہ لہجہ دونوں ماں بیٹی کو چونکا گیا۔
”میرا مطلب ہے، اپنی زندگی کو اتنا لاسٹ کیوں سمجھتی ہیں آپ، کیوں آئی۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے وہ، اب تو جتنا نقصان ہونا تھا ہو گیا، تمہیں سب سے پہلے اپنی حفاظت کرنی چاہیے، باقی معاملات تو زندگی کے ساتھ چلتے ہی رہیں گے۔“ ”یہ نیا بیگم کے فکر مند لہجے پر وہ مسکرائی۔

اسی لمحے ار ترضی کے سیل فون کی گھنٹی بجی اور وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا، اس کی آنٹی جی صاحب سے کوئی ہنگامی میٹنگ تھی اور اس کی گفتگو سے شہزاد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے فوراً ”نکلنا ہے۔

”میں نے روم کے باہر سیکیورٹی گارڈز کھڑے کر دیے ہیں اور بہتر ہو گا کہ آپ کچھ دن تک لوگوں سے کم ملیں۔“ اس نے جانتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔

”سورہی، یہ ممکن نہیں ہے میرے لیے، میں کیسے لوگوں کو منع کر سکتی ہوں۔“ ار ترضی کو اس کی طرف سے اسی

جواب کی توقع تھی۔
 ”آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ ابھی بھی آپ ٹارگٹ پر ہیں۔“
 ”میں جانتی ہوں ایسا نہیں ہے۔“

اس کے بے ساختہ انداز پر وہ چونکا۔ ”مطلب؟“
 ”مجھے مارنے والے لوگوں کا نشانہ اتنا کمزور نہیں ہو سکتا، مجھے معلوم ہے یہ صرف ایک ہلکی پھلکی سی وارننگ دی گئی ہے۔“

”لیکن ارتضیٰ ٹھیک کہہ رہا ہے، تمہیں پھر بھی محتاط رہنا چاہیے۔“ یٹینا بیگم نے فوراً اس کی طرف داری کی تو ارتضیٰ نے غور سے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو بعض دفعہ اسے اپنے خاصے امتحان میں ڈال دیتی تھی۔

اس کے بازوؤں پر کافی خراشیں تھیں اور کندھے پر تو بھاری بھر کم قسم کی بینڈنج بھی تھی جس کا اچھا خاصا بوجھ تھا۔ ڈاکٹر زوق فقو فقو سے اسے پتہ چلا کہ جرح لگا رہے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ بار بار غنودگی میں جا رہی تھی۔
 شام چار بجے کے قریب مسز قریشی اپنے شوہر کے ساتھ اس کی عیادت کے لیے آئیں تو وہ میڈیسن کے زیر اثر غنودگی میں تھیں۔ انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی اشارے سے یٹینا بیگم کو اسے اٹھانے سے منع کر دیا۔

وہ اپنے ساتھ لائے ہوئے پھل اور پھول سائیز میز پر رکھ کر یٹینا بیگم کے ساتھ کوریڈور میں آگئیں۔ کمرے کے باہر پولیس کی کافی نفری تھی۔ وہ تینوں مہمانوں کے لیے بنے ہوئے کمرے میں آگئے۔
 ”شہر زاد پر حملے میں استعمال ہونے والی گاڑی ٹریس ہو گئی ہے۔“ مسز قریشی کی بات پر یٹینا بیگم کے کان کھڑے ہو گئے۔

”گاڑی کسی ملک جہاگیر کے نام پر رجسٹرڈ ہے لیکن میں۔“ انہوں نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔
 ”تو پتا چلا کون ہے وہ شخص؟“ یٹینا بیگم نے غلٹ بھرے انداز میں ان کی بات کاٹی۔

”خود تو ملک جہاگیر ملک سے باہر ہے لیکن اس گاڑی کی گمشدگی کی اس نے چند ماہ پہلے تھانہ کلکشت میں ایف آئی آر کٹوا رکھی ہے۔“

”اونو۔“ یٹینا بیگم کے ارمانوں پر اوس مگری۔
 ”بے فکر رہیں زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہے گا یہ معاملہ، اندازہ ہو رہا ہے کہ کڑیاں کہاں پر مل رہی ہیں۔“
 عبد اللہ قریشی نے سگار سلگاتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔
 ”لیکن جی پوچھیں تو قریشی صاحب، میں ڈر گئی ہوں اس معاملے سے۔“ انہوں نے پہلی دفعہ کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”اولاد چیز ہی ایسی ہے اس کے معاملے میں ہر شخص ہی کمزور پڑ جاتا ہے لیکن آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔“
 عالیہ قریشی نے مسکراتے ہوئے انہیں دلاسا دیا تو وہ بھی پھیکے سے انداز میں مسکرا کر چپ ہو گئیں۔



وہ ایک طوفانی بارش والی رات تھی۔
 دور نہیں آسمانی بجلی، کسی ٹرانسفارمر پر مگری جس سے فضا ایک زوردار دھماکے سے گونج اٹھی، روم میں کونگا جیسے کہیں بلاسٹ ہوا ہو، پورا فارم ہاؤس یک نخت تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ چوکیدار نے جزیئر چلا دیا تھا لیکن یہ روشنیاں بھی چند ہی منٹوں کی مہمان تھیں۔ جزیئر کچھ منٹ چلا اور پھر ایک دم بند ہو گیا، اب باہر صرف برستے ساون کا راج تھا۔

طوفانی بارش کے ساتھ چلنے والی منہ زور ہواؤں نے اس رات کو بہت خوفناک بنا رکھا تھا۔ درختوں کی شاخیں زمین پر ڈالتے ہوئے عجیب و غریب نقش و نگار بنا رہی تھیں۔ کمرؤں کی کھڑکیوں کے پٹ اتنی زور سے بجتے تھے کہ رومبھہ کا دل اچھل کر حلق سے آن ٹکراتا۔ وہ کسی اپانچ کی طرح ڈھولتی ہوئی کمرے کی کھڑکیوں کے پاس آئی۔ تاریک رات میں اسے سامنے لان میں ایک پراسرار سا ہولا سا نظر آیا۔ خوف اور دہشت کی سرد لہریں اس کے وجود میں دوڑنے لگیں۔ اسے لگا جیسے وہ ہولا اس کی کھڑکی کی طرف دوڑ رہا ہو۔ دہشت سے رومبھہ کو اپنے سارے بدن کا لہو منجمد ہوتا محسوس ہوا، اس نے جلدی سے کھڑکیوں کے پٹ بند کر کے اس پر چھٹی چڑھا دی، وہ جانتی تھی کہ کھڑکی کے باہر لوہے کی مضبوط سلاخیں ہیں، لیکن وہ اگر کوئی غیر اورانی مخلوق تھی تو یہ سلاخیں اور چھٹی اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔

رومبھہ کو اپنی کھڑکی پر ہلکی سی ٹھک محسوس ہوئی جیسے کوئی لکڑی کے تختے کو اکھاڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ رومبھہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اس نے پوری شدت سے دعا کی تھی کہ وہ شخص کہیں سے آجائے اور شاید یہ قبولیت کا ہی وقت تھا، اسے بارش میں کسی گاڑی کے انجن کی آواز آئی اور ساتھ ہی کوئی تیز تیز بھاگتا ہوا فارم ہاؤس کے رہائشی پورشن کی طرف آیا۔

رومبھہ خوف زدہ انداز میں واش روم کے دروازے کے پردے کے پیچھے جڑ کر کھڑی ہو گئی، ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ اس کی فہمیں سینے سے بھج چکی تھی اور سانسیں بالکل غیر عموماً تھیں۔ اسے کسی کے قدموں کی چاپ اپنے کمرے کے باہر محسوس ہوئی، ہلکی سی ملک کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ رومبھہ کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔ اسے لگا جیسے وہی ہولا اس کے سر پر آن پہنچا ہو۔ آج شاید موت کا دن تھا۔ اسے اپنی کنٹیناں سلگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک روشنی کی لکیر اندر داخل ہوئی۔ وہ بغیر ہلکیں جھکائے پردے کے پیچھے زمین پر بڑتی روشنی کی لکیر کو دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی ٹانگیں بے جان ہوئی ہوئی محسوس ہوئیں، جبکہ سانسیں حلق میں آنکس گئیں، بے بسی کے کمرے احساس کے زیر اثر اس کی آنکھوں سے آنسو تیزی سے پھسلنے لگے۔

”رومبھہ“ یہ آواز سنتے ہی زندگی اس میں سرسرا نے لگی۔ وہ واقعی آچکا تھا اور اب پریشانی سے اسے ڈھونڈ رہا تھا، لیکن رومبھہ کے اندر ابھی بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ پردہ ہٹا کر اس کے سامنے آجائی، میل فون کی تاریخ کی روشنی اب اس پردے کے اوپر آکر ٹھہر گئی جو اس وقت اس کی جائے پناہ بنا ہوا تھا۔

اس نے آہستگی سے پردہ ہٹایا اور تاریخ کی روشنی میں اس کا خوف سے کانپتا ہوا وجود دکھا۔ اس شخص کا دل تاسف اور ہمدردی کے کمرے احساس سے بھر گیا اسے پہلے دفعہ اپنی زیادتی کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ آنکھیں بند کیے خوف زدہ انداز میں شاید زیر لب کوئی سورت پڑھ رہی تھی۔

”رومبھہ“ اپنے بہت قریب اس کی آواز سن کر رومی کا شخص تیز ہو گیا۔ بہت سے آنسو ایک ساتھ پلکوں کی منڈیر پر آ کر گر گئے۔

”آئی ایم سوری۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے۔

باہر زوردار ایک دفعہ پھر کہیں بجلی گری، ایک زوردار دھماکہ ہوا اور وہ خوف سے اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اسے کرنٹ لگا، وہ کسی معصوم بچے کی طرح اس سے چپکی ہوئی بہت بری طرح رو رہی تھی۔ اس شخص پر شرم ساری کا بڑا بھرپور حملہ ہوا، کچھ بھی تھا وہ اس کی منکوحہ تھی۔ ان دونوں کا تعلق جن بھی حالات میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑا تھا۔ لیکن اب وہ اس کی مکمل ذمہ داری تھی۔

”کیا ہوا ڈر گئیں۔۔۔“ اس کی انگلیاں اس کے پیچھے رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ وہ اسے تھام کر بیڈ کی طرف لے آیا۔ رومیہ صبح کا سارا وجود بری طرح کانپ رہا تھا۔ وہ ابھی تک اپنے حواسوں میں نہیں آئی تھی۔ اس نے نرمی سے پکڑ کر اسے بیڈ پر بٹھایا اور سائیڈ میز پر رکھے جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر اس کی جانب پھرایا۔ جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گئی تھی۔ چند ہی دنوں میں اس کے چہرے کی لالیاں زردیوں میں کھل چکی تھیں۔ وہ پہلی دفعہ غور سے اس کا جائزہ لے رہا تھا، پچھلے کئی دنوں سے وہ ایک ہی سوٹ میں ملبوس تھی۔

”سو جاؤ، میں تمہارے پاس ہوں۔“ خلاف توقع آج اس کا لہجہ نرمی لیے ہوئے تھا۔
 ”مجھے گھر جانا ہے اما کے پاس۔۔۔“ رومیہ صبح کے سارے کس بل نکل چکے تھے۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔
 ”صبح چھوڑ آؤں گا۔“ اس کے اگلے جملے پر اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، اس کی نیلی آنکھوں میں دنیا جہان کا استعجاب سمٹ آیا۔ وہ اس کی طرف سے اس جملے کی بالکل بھی توقع نہیں کر سکتی تھی لیکن وہ بھی شاید کسی کمزور لمحے کی زد میں تھا۔

اس نے بے اختیار نظریں چرا لیں اور تیزی سے اٹھ کر کھڑکی کی جانب بڑھا، رومیہ صبح ایک دم چینی۔ ”وندوڑ مت کھولنا، باہر کوئی ہے۔“

”چھا؟“ اس نے ایک دم پلٹ کر اس کا گھبراہٹ بھرا چہرہ دیکھا اور زیر لب مسکرایا۔
 ”میں سچ کہہ رہی ہوں، باہر کوئی ہے، میں نے خود دیکھا تھا۔“ وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں اسے یقین دلانے لگی۔
 ”وہ اس کی بات مان کر پلٹ کر آگیا۔ سیل فون کی بٹھری آخری دم پر تھی اور بجلی کا دور دور تک کوئی نام نشان نہیں تھا۔
 ”ٹرانسفارمر اڑ چکا ہے اور جنریٹر میں کوئی ٹیکنیکل فالٹ آیا ہوا ہے، لائٹ صبح ہی آئے گی۔“ وہ کرسی کھینچ کر

اس کے بیڈ کے قریب لے آیا۔
 باہر بادلوں کی گرج چمک میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ طوفانی بارش نے ہر طرف ایک اُدھم مچا رکھا تھا، ایسا ہی ایک طوفان روی اور اس شخص کی زندگی میں بھی آچکا تھا، وہ کئی اکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
 اس کے آنے کے بعد وہ خاصی حد تک پرسکون نظر آ رہی تھی، اس کے ریشمی بال تکیے پر بٹھے ہوئے تھے اور وہ آنکھیں بند کیے بہت خاموشی سے اس کے دل میں ڈیرہ جما چکی تھی۔ سیل فون کی بٹھری کے اختتام کے ساتھ ہی پورا کمرہ ایک دفعہ پھر تاریکی کا گڑھ بن گیا۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ رومیہ صبح کی کانپتی ہوئی آواز اس بات کی گواہ تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی، وہ خاموشی سے اٹھ کر اس کے برابر آکر لیٹ گیا۔ وہ اس کی موجودگی کا احساس کر کے جھج کر تھوڑا ہٹ کر لیٹ گئی، دونوں کے درمیان آج صرف خاموشی گھنگو کر رہی تھی۔ وہ رات کا نہ جانے کون سا پر تھا جب رومیہ صبح کی آنکھ لگ گئی۔

بارش کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا، صبح سات بجے کے قریب وہ گہری نیند سے بیدار ہوئی تو اسے اپنے اتنے قریب لیٹے دیکھ کر اسے ایک زوردار قسم کا جھٹکا لگا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، اس کا ایک بازو ابھی بھی روی کے اوپر تھا، اس نے بوکھلا کر اسے پیچھے کیا اور جلدی سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی، وہ شاید کئی دنوں کا تھا کہ ہوا تھا۔ اس لیے خاصی بے خبری کی نیند سو رہا تھا۔

رومیہ صبح نے پہلی دفعہ اس کے چہرے کے نقوش کو غور سے دیکھا۔ اس شخص کے چہرے پر سب سے نمایاں اس کی مغزور قسم کی ناک تھی، مٹنی موچھوں کے نیچے انتہائی متناسب ہونٹ تھے، لیکن رومیہ صبح کے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ اسے پہلی دفعہ اس شخص کی شکل بری نہیں لگی تھی۔

وہ شہر زاد کی اسپتال میں دوسری رات تھی۔!
رات کا کوئی تیسرا پہر تھا جب ہم زاد کی گاڑی اسپتال کی پارکنگ میں رکی۔
اس وقت وہ نیند کے انجکشن کے زیر اثر بہت گہری نیند سو رہی تھی۔ یٹنا بیگم کو ان کی خاندانی ملازمہ روشن بوا نے زبردستی گھر بھجوا دیا تھا اور خود وہ باہر کوریڈور میں رکھے ہوئے بیچ سے نیک لگائے غودگی میں تھیں۔ سینٹرل اے سی کی ٹھنڈک میں نیند کے جموں کے انہیں بے حال کر رکھا تھا، تھک ہار کر انہوں نے نیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

دونوں پولیس کا نشیبل ابھی ابھی چائے پینے کے لیے اسپتال کی کینٹین کی طرف گئے تھے۔ ہم زاد نے جب کوریڈور میں قدم رکھا تو وہ بالکل سنان تھا اس نے ایک سرسری سی نظر بیچ پر سوئی ہوئی روشن بوا پر ڈالی اور اس کمرے کے باہر آکر رک گیا جہاں شہر زاد ایڈمٹ تھی۔

اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا، شہر زاد کا سنگل بیڈ عین اس کے سامنے تھا۔ اس کی سائیڈ میز بہت سے پھولوں کے گلدستے اور روش کارڈز سے بھری ہوئی تھی جو شاید اس کے کو لیگز اور سوشل سرکل کے لوگ لائے تھے۔

اس نے افسرہ نگاہوں سے سامنے لیٹی ہوئی لڑکی کو دیکھا جو بہت سالوں سے اس کی نیندیں چرا کر خود بڑے دھڑلے سے سو رہی تھی جس کے ہونے کا احساس ہم زاد کی زندگی کو دلکش بناتا تھا۔ اس کی ایک مسکراہٹ پر وہ اپنی پوری زندگی دان کر سکتا تھا اور اسے تکلیف میں دیکھ کر اسے اپنے پورے وجود میں ٹھیس سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

یہ وہ لڑکی تھی جس کی طرف دیکھ کر اس کی دھڑکنوں نے پہلی بار بے ربط ہونا سیکھا تھا۔
یہی وہ لڑکی تھی جو اس کے دل کا دروازہ کھول کر بڑی شان سے اندر داخل ہوئی اور اس کے بعد کسی اور کے لیے دہر نہیں کھلا۔

اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سفید گلابوں کا بکے عین اس کے تکیے کے پاس رکھ دیا۔ وہ جانتا تھا صبح ان پھولوں کا کیا حشر ہونے والا ہے ان دونوں کے درمیان ہونے والی آخری گفتگو کچھ ایسی خوش گوار نہیں تھی کہ وہ اس لمحے کو خوش دلی سے قبول کر لیتی۔

وہ کچھ لمحے غمگینی باندھے اسے غور سے دیکھتا رہا، وہ نیند میں ہلکا سا کسمپرسی تو ہم زاد زیر لب مسکرا دیا، وہ جان چکا تھا کہ نیند میں اس کی بے چینی کا سبب بننے والی شاید ہم زاد کی ذات تھی جس کی نگاہیں اس کے زرد چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا تب ہی وہ نیند کی حالت میں بھی ہلکے سے اضطراب کا شکار ہو رہی تھی۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر ایک لمبا سانس بھر کر کمرے سے نکل گیا۔

اس کے کمرے سے نکلنے کے ٹھیک تین منٹ کے بعد شہر زاد نے آنکھیں کھولیں اور حیرانی سے اپنے بالکل پاس رکھے سفید گلابوں کے بکے کو دیکھا۔ کمرے میں ایک جالی پچی سی خوشبو رقص کرتی پھر رہی تھی۔ وہ بمشکل کہنی کے بل اٹھی اور تعجب بھری نگاہوں سے اس گلدستے کو دیکھنے لگی اچانک اس کی نظر پاس رکھے کیٹ ویل سون کارڈ پر پڑی اس نے فوراً اٹھایا۔

Get well soon its an order-

(جلدی سے صحت یاب ہو جاؤ یہ حکم ہے۔)
"کیٹ ویل سون اٹس این آرڈر" وہ جانتی تھی یہ جملہ اتنے دھڑلتے سے کون لکھ سکتا ہے اس کے ساتھ ہی اسے ہم زاد کا تلخ لہجہ یاد آ گیا اس نے ہزاری سے کارڈ کے دو ٹکڑے کر کے سائیڈ میز پر اچھال دیے اب وہ ان

باتوں اور جملوں سے بہلنے والی نہیں تھی۔
اس نے جیسے ہی اپنے بندے ٹیک لگائی، اس کے سیل فون کی ٹیکسٹ ٹون بجی، اس کے ساتھ ہی اس کے دل کی دھڑکنوں میں ایک ارتعاش سا برپا ہوا۔ وہ جھنجھلا گئی، اس کا خیال تھا کہ اب دل کی دھڑکنیں اس کے نام پر اس طرح منتشر نہیں ہوں گی۔

اس کی خام خیالی تھی کہ وہ اس کے نام کے گرد سرخ حاشیہ کھینچ چکی ہے اور یہ حاشیہ وہ حد بندی تھی جو اسے اپنے اور اس کے بیچ برقرار رکھنی تھی، اس نے اپنی آنکھوں کو اس کے خوابوں سے بہلانا چھوڑ دیا تھا، اس کی سماعت اب کسی جانے پہچانے لہجے پر نہیں چوکتی تھیں لیکن اس کمرے میں موجود اس مانوس خوشبو نے اس کے سارے دعوے غلط ثابت کر دیے تھے۔ وہ آج بھی اس کے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑے ہوئے کسی فاحش سکندر کی مانند کھڑا تھا، اس نے ایک انچ بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ وہ اپنی دھڑکنوں کو اس کے نام پر منتشر ہونے سے کبھی نہیں روک سکتی اور یہ دنیا کا واحد کام تھا جو وہ پچھلے آٹھ سالوں میں نہیں سیکھ پائی تھی۔

”جانتا ہوں، اب تک میرے کارڈ کا کیا حشر ہو چکا ہوگا، لیکن میری خواہش ہے کہ تم میرے دل کے ساتھ نرمی کا معاملہ رکھو۔“

اس مہیج کے ساتھ تین منہ چڑاتی ہوئی اسماعیلی شکلیں بنی ہوئی تھیں۔ شہزاد ہلکا سا تپ گئی۔ اس نے اس کے ٹیکسٹ مہیج کا کوئی جواب نہیں دیا۔

”تمہارے کمرے کی کھڑکی کے عین نیچے کھڑا ہوں، تم چاہو تو میرا کبے بھی نیچے پھینک سکتی ہو۔“ گلے مہیج نے اسے مزید تپایا، اس نے غصے سے وہ گلدستہ اٹھایا اور بیچ کر کھڑکی کے نیچے پھینک دیا۔

”تھینکس۔۔۔“ گلے مہیج اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔
وہ بمشکل سارالے کراٹھی والے کلاک کی طرف دیکھا، رات کے تین بج رہے تھے، وہ خود کو گھسیٹتی ہوئی کھڑکی کے پاس لائی، اور نیچے جھانکا، اس کا کمرہ تھوڑا نور پر تھا، رات کے گلیجے اندھیرے میں بھی وہ پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے اس شخص کی پشت کو دیکھ سکتی تھی، وہ خاصا دراز قد تھا، اس نے جینز کے ساتھ سفید یا شاید آف وائٹ کلر کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اپنی لینڈ کروزر کا دروازہ کھول کر بیٹھ چکا تھا۔ شہزاد کو بس اس کا ہیولہ سا نظر آ رہا تھا اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑتی ہوئی پارکنگ میں جائے اور اس شخص کو بانو سے گھسیٹ کر باہر نکالے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھے کہ کسی کے دل کا چین اس طرح سے چراتے ہیں؟ کسی کو یقین اور بے یقینی کے جنم میں اس طرح دھکیلے ہیں؟

وہ اپنی گاڑی اشارت کر کے ریورس کر رہا تھا، اس کی گاڑی ہلکا سا جیسے ہوئی اور شہزاد کو افسوس ہوا اتنے فاصلے پر وہ اس کا نمبر نہیں پڑھ سکتی تھی۔ اسی وقت دوبارہ اس کے سیل فون کی ٹیکسٹ ٹون بجی، وہ جانتی تھی کہ یہ ہم زاد کا ہی مہیج ہو گا۔ وہ وزارت سے پٹی اور سیل فون اٹھا کر اسکرین پر نظریں دوڑائیں۔

”اب کھڑکی سے ہٹ جاؤ، ورنہ میں یہاں سے جا نہیں پاؤں گا۔“
شہزاد کو یہ مہیج پڑھتے ہی شدید قسم کا غصہ آ گیا، اس نے فوراً ہی اس کا نمبر ملایا، جسے پہلی ہی بیل پر ریسیو کر لیا گیا تھا۔

”زے نصیب۔۔۔“ اس کا چمکتا ہوا الجھ شہزاد کو سلگانے کے لیے کافی تھا۔
”مرا بلکم کیا ہے آپ کے ساتھ؟ آپ کا کیا خیال ہے، آپ کے پھولوں اور دوش کارڈ کے لیے مر رہی تھی میں۔“
”نہیں“ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ”میں ان کو آپ تک پہنچانے کے لیے مر رہا تھا۔“
”مر رہی جاؤ تو اچھا ہے۔“ وہ جل کر بولی۔

”وہ تو کئی سال پہلے مرچکا ہوں تم پر“ وہ شوخ ہوا۔

”شٹ اپ“

”تم حکم کرو، گج گج مرچتا ہوں اگر دس منٹ سے زیادہ دیر لگاؤں تو کسی چوک پر الٹا لٹکاؤں نا“

”دس منٹ کیوں دس سیکنڈ کیوں نہیں؟“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”بھئی دس منٹوں میں کوئی طریقہ بھی تو سوچنا ہو گا مرنے کا۔ اب کوئی پلاننگ کر کے تھوڑا بیٹھا ہوا ہوں پہلے

سے“ وہ محض اسے چڑا رہا تھا۔

”کیوں آئے تھے میرے کمرے میں؟“

”میں تو دل میں بھی آچکا ہوں تب تو نہیں پوچھا تھا۔“ اس کا معنی خیز لہجہ اسے سلگا گیا۔

”اپنی آخری باتیں یاد ہیں تمہیں کیا کہا تھا مجھ سے“

”جو کہا تھا دل پر جبر کر کے کہا تھا“ اسی کا نتیجہ ہے جو پورے شہر میں ایک ہی لڑکی کے نام کا ڈنکان بج رہا ہے۔“ اس

کی بات پر وہ چوکی۔

”مطلب کیا ہے؟“

”میں چاہتا ہوں تمہارا اشار ”لیو“ (Leo) ہے اور تم کسی شیر کی طرح ہی پورے شہر پر حکمرانی کرو۔“

”اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے“ خود کیوں گیدڑوں کی طرح چھپتے پھر رہے ہو مجھ سے۔“ اس کا لہجہ کاٹدار

تھا۔

”گیدڑ ہوتا تو تمہارے ارضی حیدر کی ساری سکیورٹی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر تم تک نہ پہنچتا، یقین

نہیں آتا تو دروازہ کھول کر دیکھ لو، کتنے کٹا ٹیل بٹھار کئے ہیں تمہارے اس ”یفین“ نے تھہ شہرارت سے ہٹا۔

”کیس تم خود ارضی حیدر تو نہیں ہو؟“ وہ ہلکا سا چوکی۔

”فار گاڈ سیک یار۔“ وہ ہلکا سا جھنجھلایا۔ ”کسی ڈھنگ کے بندے سے تو ملاؤ“ اتنا بھی برا نہیں ہوں میں۔“ اس

کا بے ساختہ انداز شہر زاد کو یقین دلا گیا تھا کہ وہ بچ کہہ رہا ہے۔

”تم سے کس نے کہا ارضی حیدر برا ہے۔“ وہ برا مان کر بولی۔

”تم اگر میری تعریف نہیں کر سکتیں تو بہتر ہو گا دنیا کے کسی اور مرد کا بھی میرے ساتھ تذکرہ مت کرو۔“ وہ اچھا

خاصا سنجیدہ ہوا۔

”کیوں جیلمسی فیل ہوتی ہے تمہیں؟“ اس نے صاف چڑایا تھا اسے۔

”ہاں؟“ اس نے بھی بر ملا اعتراف کیا۔ ”محبت میں جیلمسی نہ ہو تو بڑے پھیکے بن کا احساس ہوتا ہے۔“

”کوئی کام کی بات کرنی ہے تو آؤ اور نہ میں خون بند کر رہی ہوں۔“ وہ آکٹا ہٹ کا شکار ہوئی۔

”کام کی بات یہ ہے کہ میرا کام کی فیمیلی سے محتاط رہو تم پر فائرنگ اس کے پالتو غنڈوں کی کارستانی ہے اور وجہ تم

اچھی طرح سے جانتی ہو۔“

”بہت شکریہ اور کچھ؟“ اس نے چٹکیوں میں اس کی بات کو اڑایا۔

”میں سیریس ہوں شہر زاد۔“

”لیکن میں اب تمہاری معلومات پر سیریس نہیں ہو سکتی، کیونکہ اپنی چیزوں کو خود سے ہینڈل کرنا آپ کا ہے مجھے،

ایلی ہاؤ، تمہیں مکس فار پور کا سنڈ انفارمیشن۔“

دوسری جانب اس کے لاپرواہ انداز پر ہم زاد کے ہونٹوں پر بڑی جان داری مسکراہٹ ابھری تھی، وہ شہر زاد کو

جس ٹریک پر لانا چاہتا تھا وہ تھوڑی سی محنت سے اس طرف آچکی تھی۔

”تمہاںویا نہ مانو؟“ اسے کسی بد خواہ کی نظر لگی ہے۔
 چکن سے نکلے ہوئے تاجدار بیگم کا یہ جملہ انا بیہ کی سماعت سے لگرایا اور اس نے بوے دھیان سے سامنے بیٹھے برہان کو دیکھا۔

”امی، آپ ان فضول باتوں کو چھوڑیں، شکل دیکھیں اس کی، کتنی گم صم ہو گئی ہے، میں کل لے کر جا رہا ہوں اسے اسلام آباد۔“ ان کا لہجہ تشویش اور پریشانی میں ڈوبا ہوا تھا انا بیہ نے چائے کی ٹرے ان کے سامنے رکھی۔
 اس کا دل چاہا کہ وہ اس بے حس شخص سے کہے کہ وہ بھی کسی کی بہن ہے، اس کی اتری ہوئی شکل، آنکھوں میں موجود اسی اور بلبوں سے چھپتی گئی مسکراہٹ تو تمہیں نظر نہیں آتی۔ کیا نکاح کا تعلق اتنا کمزور ہوتا ہے۔
 ”اسلام آباد لے جا کر کیا کرو گے، نور محل میں کہاں کسی بچی کا دل لگتا ہے۔“ انہوں نے دوپٹے پر کروشے کی نیل بناتے ہوئے تبصرہ کیا۔

”میں اسے وہاں دل لگانے کے لیے نہیں کسی اچھے فریشن سے چپک کروانے کے لیے لے جا رہا ہوں۔“
 انہوں نے بیزاری سے اپنا چائے کا کپ اٹھایا، انا بیہ دانستہ وہیں صوفے پر جم کر بیٹھ گئی اور سائیڈ میز پر رکھا اخبار اٹھا کر منہ کے آگے کر لیا۔

”اچھا ہے لے جاؤ، فارحہ خوش ہو جائے گی۔“ انہوں نے بیٹے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کسی طور بھی ملنے والا نہیں ہے، تب ہی فوراً ”تھیٹار ڈال دیے اور میراؤس میں ان کی کامیابی کا یہی راز تھا۔ ایک تو اللہ نے اولاد کے نام پر تین تین بیٹے دے دیے، دوسرے وہ حاکم صاحب کی سگی بیٹی تھیں اور میرے میرے ختم کی من پسند زوجہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ حکمرانی کے سارے طور طریقے جانتی تھیں جو آج تک ان کی دونوں دیورانیوں ندرت بیگم اور شارقہ بیگم کو نہیں آئے تھے۔

”یہ ارسل آج کل کہاں گم ہے اس کا بڑا دل لگ گیا ہے نور محل میں۔“ انہیں اچانک یاد آیا۔
 ”وہ نور محل میں نہیں آج کل فرینڈز کے ساتھ کلبائن اسٹڈیز کے لیے ہوٹل میں رہ رہا ہے، لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”تمہارے واجی کا ارادہ بن رہا ہے اس کی اور در شہوار کی شادی کرنے کا۔“ اس اطلاع پر انا بیہ کے فوراً ”کان کھڑے ہوئے۔“
 ”فار گاؤسیک امی، در شہوار سے ضرور پوچھ لیجئے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”میں نہیں چاہتا، اسے بھی میری طرح قربانی کا بکرا بنادیا جائے۔“ برہان نے یہ جملہ خاصے غلط موقع پر بول دیا تھا، انا بیہ جھٹکے سے کھڑی ہوئی اور اس کی گود میں رکھا اخبار دوڑ جا کر ا۔ برہان اور تاجدار بیگم دونوں نے ہی بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ بھی وہیں بیٹھی ہوئی ہے۔ انا بیہ سرخ چہرے کے ساتھ تیز تیز سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے پورشن کی طرف بڑھ گئی۔
 ”بہت بری بات ہے برہان،“ تاجدار بیگم نے ملاستی نظروں سے اپنے بیٹے کو گھورا۔ ”آخر کیا کمی ہے انا بیہ

میں۔“

”بات کسی کمی بیشی کی نہیں ہے امی!“ انہوں نے نظریں پُر کر کہا، ویسے بھی ضمیر نے تازہ تازہ تازا تھا کہ اس لڑکی کا کیا تصور ہے تب ہی اس بار ان کا لہجہ کچھ دھیمہ تھا۔

”تو پھر مسئلہ کیا ہے؟“

”میں نے اسے کبھی بھی اس نظر سے نہیں دیکھا اور ویسے بھی لائف پارٹنر کے حوالے سے میرے ذہن میں کچھ اور تھا لیکن واجی نے اچھا نہیں کیا۔“ انہوں نے محتاط انداز میں کہا۔

”جو گند بلا بھی تمہارے ذہن میں ہے اسے نکال دو۔ ہمارے ہاں جو ایک دفعہ نام چڑ جائے تو وہ قبر تک ساتھ ہی جاتا ہے،“ سمجھے۔“ انہوں نے اپنے بیٹے کو ٹھیک ٹھاک لتاڑا تھا۔ وہ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

اسی لمحے واجی اور میر خاقان علی تیز تیز بولتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے۔ میر خاقان کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا، جبکہ میر حاکم علی تھوڑا سا سکون تھے۔

”آپ کو یہ سب کروانے سے پہلے ایک دفعہ ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے تھا۔“ میر خاقان علی کی آواز کچھ بلند ہوئی۔

”آخر ایسا کیا ہو گیا ہے جو تم اور مختشم اس بات پر ہاتھ پیر پھلائے گھوم رہے ہو۔“ وہ بیڑاری سے صوفے پر آکر بیٹھ گئے۔ تاجدار بیگم نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑا کروشیہ اور دوپٹہ ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔ برہان خود بھی تھوڑا چوکنا ہو کر بیٹھ گئے۔

”ذرائعی چلا کر دیکھیں، ہر چینل پر ایک ہی خبر چل رہی ہے کہ میر سٹریمری، میر خاقان کے خلاف کیس لڑ رہی ہے۔“

”تو۔۔۔؟“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی پر زور ڈالا۔

”یہ مسئلہ کسی اور طریقے سے بھی حل ہو سکتا تھا۔“ وہ کچھ جھنجھلا کر گویا ہوئے۔

”تم نے کب سے ”ہوش“ کے بجائے ”ہوش“ سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔“ انہوں نے طنزیہ نگاہوں سے اپنے رنگین مزارج بیٹے کو دیکھا، جن کے آنے والے دن بننے والے اسکینڈل پر وہ اکثر انہیں ہوش سے کام لینے کا مشورہ دیتے تھے، جسے وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے آزاد دیتے تھے۔

”زندگی کے ہر معاملے میں ہوش نہیں چلتا باباجان۔“ انہوں نے لمحوں میں ان کا طنز سمجھا۔

”تم چھوڑو اس قصبے کو، مختشم کا نمبر ملاؤ، پتا تو چلے بیورو کسی میں کیا چل رہا ہے۔ آج انٹریئر منسٹری کی ایک ضروری میٹنگ بھی تھی۔“ واجی نے بیڑاری سے موضوع گفتگو بدلا، برہان نے ان دونوں کو مصروف دیکھا تو خاموشی سے وہاں سے کھسکا چاہا لیکن آج شاید ان کے بھی ستارے گردش میں تھے۔

”یہ تم کہاں بھاگ رہے ہو؟“ واجی نے تکیے کی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیس نہیں واجی، ڈر اور شہوار کے کمرے تک جا رہا تھا، طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کی۔“ انہیں بروقت بہانہ سوچھ گیا جو خاصا تیر ہدف ثابت ہوا تھا۔

”در شہوار سے یاد آیا، پچھلے تین دن سے بیمار ہے بچی اور کسی کو اتنی تفریق نہیں ہوتی کہ کسی اچھے ڈاکٹر کو بلا کر چیک کروالے۔“ ان کے لہجے کی فکر مندی اور تشویش پر تاجدار بیگم تھوڑا سا مسکرائیں۔ مارا خاندان جانتا تھا کہ در شہوار اپنے واجی کی جیتی بیتی تھی۔

”برہان چھی پی کہ رہا تھا مجھ سے۔“ تاجدار بیگم نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”ہاں تو کیا مسئلہ ہے؟“

”مسئلہ تو کچھ نہیں ہے واجی، کل لے کر جاؤں گا“ برہان فوراً بولا۔

”مختشم بھائی کی کال ہے آپ کے لیے۔“ خاقان علی نے ان سائل فون میر حاکم کی طرف بڑھایا۔

”ہاں دو۔“ انہوں نے فوراً تھام لیا۔ ان دونوں کا موضوع گفتگو وہ کیس تھا جس نے آج کل پورے خاندان کی راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ ان کو باتوں میں مصروف دیکھ کر برہان اس دفعہ خاموشی سے وہاں سے کھسک آئے جبکہ تاجدار بیگم ان لوگوں کے لیے شام کی چائے تیار کروانے لگیں۔

”میکا نکل آرہا ہے پاکستان۔“
اس اطلاع نے مونیکا کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی معنی بہت عرصے سے اس کے والد کے ہیسٹ فرینڈ لاؤر کے بیٹے کے ساتھ ملے تھی جسے وہ اپنا منہ بولا بھتیجا مانتے تھے۔
”لیکن اس نے تو پہلے منع کر دیا تھا۔“

مونیکا نے اپنا لہجہ سرسری سا بنایا کراچی میں سے پوچھا، جو اس وقت پالک کے پتوں کے ساتھ ابھی ہوئی تھیں۔ جب کہ مونیکا کے دل کی دنیا میں ایک اوجھڑ چکا تھا، ابھی رات ہی اس نے ذوالکفل سے بات کی تھی اور اس نے کہا تھا کہ وہ واپس لاہور آجائے تو دونوں بیٹھ کر اس موضوع پر ڈسکشن کر لیں گے۔
”تم اس دفعہ کالج جاؤ تو بہت سی چھٹیاں لے کر آنا۔“ انہوں نے اس کے سر پر اگلا بم پھوڑا۔
”لیکن امی، میرے فاسٹل انگریز ہونے والے ہیں، آپ لوگ اتنی جلدی کیوں کر رہے ہیں۔“ وہ جھنجھلا گئی۔
”تمہارے باپ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، وہ اپنے فرض سے جلد از جلد فارغ ہونا چاہتا ہے۔“ مار تھا نے۔
سب کچھ اپنے شوہر پر ڈال دیا۔ لیکن مونیکا جانتی تھی کہ اس سارے قصے کے پیچھے اس کی ماں کا ہاتھ ہے۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ وہ کچھ سوچ کر پرسکون ہوئی۔
”کل چرچ چلو گی تم۔“ مار تھا نے ہلکا سا الجھ کر اپنی بیٹی کا مطمئن چہرہ دیکھا۔ اس کے اتنی جلدی مان جانے کی توقع جو نہیں تھی۔

”ہاں۔“ اس کے جواب پر مار تھا کے ہاتھ سے چھری گر گئی۔
”کیوں کیا ہوا؟“ مونیکا اپنی ماں کی اندرونی حالت سے اتنی بھی بے خبر نہیں تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر اس نے مزید اپنی ماں کو پریشان کیا تو ہوسکتا ہے کہ وہ اسے ملتان بھی نہ جانے دیں۔
”لگتا ہے خداوند نے تمہارے دل کو سکون سے بھر دیا ہے۔“ وہ اب کچھ مطمئن دکھائی دے رہی تھیں۔
”ہاں، آپ کی دعا قبول ہو گئی ہے۔“ وہ سادگی سے کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اندر داخل ہوتے ہی اس نے جلدی سے دروازے کی کنڈی چرھائی اور تیزی سے ذوالکفل کا نمبر ملانے لگی، اسے اب اس کو اس تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرنا تھا۔

اس نے اپنے بہت قریب سے بے تحاشا فائرنگ کی آواز سنی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ خوف اور دہشت کی برفی رواں کے پورے وجود میں دوڑنے لگی۔ رومیہ صدمہ نے بوکھلا کر ٹانگوں بکھا، رات کے دہانچے پر تھیں۔
اندھیرے میں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے سائینڈ میز پر رکھے لیپ کو روشن کیا۔ اسی لمحے اس کے بیڈروم کا دروازہ دھڑک کر کھلا، وہ بڑے حواس باختہ انداز میں اندر داخل ہوا۔ وہ آج صبح سے فارم ہاؤس میں ہی تھا۔
”نورا! نکلو، وہ لوگ یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

اس نے غلت بھرے انداز میں رومیہ صدمہ کا بازو پکڑ کر کھینچا اور اسے گھسیٹا ہوا باہر کو ریڈروم میں لے آیا، وہ ابھی نیند کے غمار سے باہر نکلی تھی اس صورت حال پر گھبرا گئی۔ اس کے پیروں میں جو ٹانگ نہیں تھا۔
”کون لوگ ہیں یہ؟“

اس کے ساتھ دوڑتے ہوئے اس نے پھولی ہوئی سانسوں سے پوچھا، ”دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔“
فائرنگ بغیر کسی توقف کے جاری تھی۔ وہ دونوں کو ریڈروم میں رکھی چیزوں سے ٹکراتے ہوئے فارم ہاؤس کے عقب

میں پہنچ گئے۔ جہاں ایک گاڑی پہلے سے کھڑی تھی۔

”ہری اپ!“ اس نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے اندر کی جانب دھکیلا اور خود اچھل کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

اس کی گاڑی کا انجن جیسے ہی بیدار ہوا قاترنگ کی آواز میں شدت آگئی۔ رومیہ نے سراسیمگی کی کیفیت میں ارد گرد کا ماحول دیکھا وہ طوفانی انداز میں گاڑی چلا رہا تھا۔ کسی ملازم نے ساری صورت حال کو دیکھتے ہوئے پچھلا گیٹ کھول دیا تھا۔

وہ لوگ جیسے ہی مین روڈ پر پہنچے، دوڑ کہیں سے پولیس کی گاڑی کے ہارن کی آواز نے بھی ان کا تعاقب کیا۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اور قاترنگ نے رومیہ کو اچھا خاصہ ہشت میں مبتلا کر دیا تھا، وہ دم سادھے اپنے برابر میں بیٹھے شخص کو دیکھنے لگی۔ جس کے دونوں ہونٹ سختی سے ایک دوسرے میں پورست تھے۔

وہ بڑی مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا جس سے رومیہ کو اندازہ ہوا کہ یہ راستے اس کے لیے انجان نہیں ہیں۔ پولیس وین کے سائرن کی آواز مسلسل ان کے پیچھے تھی، اس نے ایک آبادی کی طرف گاڑی موڑ لی، وہ کوئی قصبہ تھا جہاں بے شمار گھر موجود تھے۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا، اس نے گاڑی ایک تنگ سی گلی میں روکی اور جھلانگ مار کر نیچے اترا اور رومیہ کا بازو کھینچ کر اسے اتارا۔

”یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔“ وہ بوکھلا گئی۔
 ”چپ کر کے چلو ورنہ دونوں مارے جائیں گے۔“ اس کا سرد لہجہ رومی کی سماعت سے ٹکرایا۔ وہ اس کا بازو پکڑے ان تنگ و تاریک گلیوں میں دوڑنا ہوا ایک گھر کے پاس رکھا، اس نے ایک سیکنڈ میں اندازہ لگایا تھا کہ اس گھر کے مکین اندر موجود نہیں ہیں، کیونکہ گیٹ کے باہر ایک بڑا سا زونی قفل لٹک رہا تھا، اس نے گھبرا کر واپس بائیں دیکھا۔

”ایک منٹ رکھیں۔“

وہ اچھل کر گیٹ پر چڑھا اور نیچے صحن میں کود گیا، رومیہ نے خوف زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھا، رات کی تاریکی میں ان انجان گلیوں میں کھوجانے کا احساس ہی اتنا خوفناک تھا کہ وہ بوکھلا کر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بڑے عجلت سے بھرے انداز میں بڑے گیٹ کے ساتھ لگا چھوٹا دروازہ اندر سے کھولا اور رومیہ کا سر ہاتھ پکڑ کر اسے گھر اندر کھینچ لیا۔

پولیس وین کے سائرن کی آواز رک چلی تھی، شاید ان لوگوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگ اس قصبے میں چھپ گئے ہیں۔ پولیس نوجوانوں کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں اس گلی تک آپہنچی تھیں۔ ایک دفعہ تو رومیہ کا دل چاہا کہ وہ شور مچا کر پولیس کو اپنی موجودگی کا احساس دلا دے، لیکن دوسرے ہی پل اس کی نظر اس شخص کے انتہائی پریشان چہرے پر پڑی، اور ساتھ ہی اس کا وہ احسان یاد آ گیا جو اس نے اس کی عزت بچا کر کیا تھا۔ اس نے اپنے حلق سے نکلتی ہوئی آواز گلے میں ہی دبالی تھی۔

وہ دونوں پورچ میں دیکے بیٹھے تھے۔ اس قصبے کا یہ سب سے جدید گھر تھا، پورے گھر کی لائٹ بند تھی، رومیہ کا دل خوف سے کانپ رہا تھا، شکاواں بھاگنے کی وجہ سے اس کے پیر زخمی ہو چکے تھے۔

پولیس کی نفی اسی گھر کے باہر کھڑی تھی، جس کی وجہ سے دونوں کے حلق خشک ہو رہے تھے وہ اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر کے خود گیٹ کے پاس آگیا۔

”میرا خیال ہے سرواہ لوگ یہاں سے نکل کر جا چکے ہیں۔“ ایک پولیس کانسٹیبل کی آواز اس کی سماعت تک

پہنچی۔

”نہیں؟ اتنی جلدی وہ سہل یہاں سے نہیں نکل سکتے۔“
 ”تو پھر کیا خیال ہے سر؟ گھروں کی تلاشی لی جائے۔۔۔؟“ ایک اور مشورے پر اس کا سانس اٹکا۔
 ”دوڑھائی سو گھروں کی تلاشی لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔“
 ”ان کی گاڑی تو مل چکی ہے سر!“

”تو بس ٹھیک ہے اس قصبے سے نکلنے والے راستوں پر نظر رکھو، وہ آج رات یہاں سے نکلنے کی کوشش ضرور کریں گے،“ تھانے سے مزید نفری منگوالو۔“ پولیس آفیسر کے اس نئے حکم پر ان کے چہروں پر پریشانی کے تاثرات نمودار ہوئے ان دونوں کو پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ وہ کسی بڑی مشکل میں الجھن چکے ہیں۔



”کیا حال ہے پیر سٹریٹری کا۔۔۔؟“

ہادی ابھی ابھی اسلام آباد سے لوٹا تھا۔ سامنے کاؤچ پر لیٹے ہوئے سعد نے اس کی طرف دیکھتے ہی پریشانی سے پوچھا۔ ہادی نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اسیل فون سائیڈ میز پر رکھا اور اپنی پیشانی کو مسلا۔ وہ خاصی ٹینشن میں دکھائی دے رہا تھا۔

”کافی بہتر ہیں، گھر شفٹ کر دیا گیا ہے انہیں۔“ اس نے تھکے تھکے انداز میں اپنے جوتے اتارے۔
 ”حوصلہ تو۔۔۔ پست نہیں ہو گیا ان کا؟“

”ارے نہیں یار، وہ اس ٹائپ کی خاتون نہیں ہیں، بلکہ ہوش میں آنے کے بعد سے ساری اپ ڈیٹس اور فون کالز تک خود ریسپونڈ کر رہی ہیں۔“ ہادی بات کرتے کرتے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

”پھر تو بہت دیر خاتون ہوئیں۔۔۔“ وہ ہادی کے پیچھے ہی بیٹھیاں چڑھ کر اس کے بیڈ روم میں آگیا۔
 ”لیکن میرے خیال میں لڑکیوں کو تھوڑا محتاط ہونا چاہیے، ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور بہادری بھی کبھی کبھی انسان کو ڈوب دیتی ہے۔“ اس نے وارڈروب کھول کر اپنا ایک شلوار سوٹ نکالا۔

”کچھ بتا چلا؟“ کس کی گھٹیا حرکت ہے یہ۔۔۔؟“ سعد دونوں بازو سینے پر باندھ کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔
 ”کمال کرتے ہو سعد! کیا تمہیں نہیں پتا، اس حد تک کون کر سکتا ہے۔“ ہادی نے اینگرس سوٹ نکالتے ہوئے جرائی سے اس کی طرف دیکھا جیسے اس سے اس سوال کی توقع نہ کر رہا ہو۔

”لیکن کنفرم تو نہیں ہے نا۔“ سعد اس کا اشارہ سمجھ چکا تھا۔
 ”کم آن تائرس۔ ساری دنیا جان چکی ہے کہ یہ بزدلانہ کارروائی کس کی طرف سے ہوئی ہے۔“
 ”وہ کیسے؟“

”جس وقت پیر سٹریٹری پر حملہ ہوا اس وقت میرا حاکم صاحب بڑے شاہ جی کے مزار کے باہر کھلی پکھری سجا کر بیٹھے تھے۔“ ہادی نے طنزیہ انداز میں اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”تو اس کا کیا مطلب ہوا؟“ سعد نے ابجھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔
 ”تاکہ لوگوں کو بتائیں کہ وہ تو اس وقت عوام کے مسائل سننے میں مصروف تھے۔“ ہادی نے بیزارگی سے سر جھکا۔

”یہ بات تو کسی گدھے کو بھی پتا ہے کہ ایسے لوگ خود تھوڑی سامنے آتے ہیں ان ہی کے التو غنڈے ان کے ایک اشارے پر گردنیں اڑا دیتے ہیں لوگوں کی۔“ سعد نے منہ بناتے ہوئے ہادی کے کمرے کی کھڑکی کھولی اور

سامنے کا منظر دیکھ کر اسے دھچکا لگا۔
 در شہوار کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی اور کچھ فٹ کے فاصلے پر اس کے بیڈ کی چادر کا پرنٹ تک واضح نظر آ رہا تھا، سعد کا سا جھجکا ہوا کیونکہ اس کے بیڈ کے آس پاس گھر کی کچھ خواتین کھڑی تھیں اور کسی بھی لمحے ان میں سے کسی کی نظر اس پر پڑ سکتی تھی، در شہوار کو ڈرپ لگی ہوئی تھی اور اس کا ہاتھ زرد چہرہ چیخ چیخ کرتا رہا تھا کہ وہ اچھی خاصی بیمار ہے۔ سعد نے جلدی سے پردہ برابر کیا۔

”کیا ہوا؟“ ہادی نے آواز روم سے نکلتے ہوئے حیرانی سے اس کا پریشان چہرہ دیکھا۔

”کچھ نہیں۔ ہسپتالوں کے کمرے میں نظر پڑ گئی تھی۔“

”ہاں ان محترمہ کی خاصی عجیب عادت ہے، جان بوجھ کر یہ کھڑکیاں کھلی رکھنے کی اس لیے میں اکثر بند ہی رکھتا ہوں۔“ ہادی نے منہ بنا کر کہا اور اپنے بال بٹانے لگا۔

”مجھے لگتا ہے وہ خاصی بیمار ہے، ڈرپ لگی ہوئی تھی اسے۔“ سعد نے لگا سا جھجکا کر بتایا۔

”تھیں کس کاؤ؟ کچھ دن تو گھر میں تنگ کر بیٹھی تھی۔“ ہادی کا یہ مذاق اڑانا انداز سعد کو اچھا نہیں لگا۔

”بہت بری بات ہے، ہادی وہ بے چاری واقعی بہت بیمار ہے، اور تم اس کا مذاق اڑا رہے ہو۔“ اس نے فوراً

طرف داری کی۔

”بیر شہیری بھی کسی کی بیٹی ہے جس پر بے دردی سے گولیاں چلائی گئی ہیں۔ تم اس کی شکل دیکھو ذرا جا کر۔“

ہادی نے اسے لا جواب کیا۔

”لیکن اس میں در شہوار کا کوئی قصور نہیں۔“ سعد نے نظریں چراہیں۔

”اس خواستہ کے فیور کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔“ ہادی نے جاچتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ویسے ہی بات کر رہا ہوں یا راتم تو دیکھوں کی طرح جرح کرنے لگتے ہو۔“ سعد نے زبردستی مسکرا کر اسے

مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”ظاہر ہے، وکیل ہاں کا بیٹا ہوں، جرح تو کروں گا۔“ ہادی کا موڈ اب کچھ خوشگوار ہو گیا تھا۔

”اچھا چھوٹو، نیچے چلتے ہیں۔ گل خان نے بہت مزے کے فرائیز اسے بنائے ہیں۔“ سعد نے اپنی طرف سے

بات ختم کی تو ہادی بھی سر ہلا کر اس کے پیچھے چل دیا۔



”بیا کوئی ٹینشن ہے آپ کو؟“

طوبی چائے کی ٹرے لیے اندر داخل ہوئی تو اس نے اتنا ہیہ کو کسی سوچ میں گم پایا۔ اس کے نوٹس سامنے کھلے

بڑے تھے جب کہ دھیان کی کھڑکیاں کھیں اور کھلی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی سوچوں میں اس قدر محو تھی کہ اسے طوبی کی

آمد کا بھی پتا نہیں چلا۔

”بیا۔ کیا ہوا ہے؟“ طوبی نے اس آکر اس کا کندھا ہلایا تو وہ ایک دم خفت کا شکار ہوئی۔

”تم کب آئیں؟“ وہ ایک دم سنجیدگی سے بولی اور خود کو مصروف خاطر کرنے لگی۔

”جب آپ سوچوں ہی سوچوں میں بہان بھائی کے ساتھ کہیں اور پہنچی ہوئی تھیں۔“ طوبی نے ہلکے پھلکے انداز

میں اسے چھیڑا۔

”بے فکر ہو، ان کا کوئی راست میری طرف سے ہو کر نہیں گزرتا۔“ اس کے الفاظ سادہ لیکن لہجہ خاصا تلخ تھا۔

طوبی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”آپ سے کچھ کہا ہے انہوں نے۔“ وہ فکر مند انداز میں اپنی بہن کے بالکل قریب آکر بیٹھ گئی۔
 ”جو بات ساری دنیا سچ سچ کر کہہ رہی ہے وہ اگر خود نہ بھی کہیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اور کیا کرو گی تم پوچھ کر۔
 چھوڑو۔“ انابیہ نے گرما گرم چائے کا کپ اٹھا کر منہ سے لگا لیا اور جیسے ہی ہونٹوں پر جلن کا احساس ہوا غوراً پیچھے
 کر دیا۔

”یہ! میں آپ کی بہن ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھی دوست بھی ہوں۔“ طوبی نے ہمدردی سے بہن کے
 کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”تب ہی تو تمہیں اس تکلیف سے بچانا چاہتی ہوں جس سے میں گزر رہی ہوں۔“
 ”فارگاڈ سیک یا کیوں پسلیاں بھجوا رہی ہیں مجھے بتائیں کیا ہوا ہے؟ سخت ٹینشن ہو رہی ہے مجھے۔“ طوبی ہلکا
 سا جھنجھلا گئی۔

”تکلیتاؤں بہان کو مجھ سے سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے، وہ مجھے زبردستی کالا دوا ہوا بوجھ سمجھتے ہیں اور
 اس تعلق سے حد درجہ چیزا رہیں جو ان کے اور میرے بیچ ہے۔“ انابیہ نے ایک دم سچ کر بولی اور کمرے میں داخل ہوتی
 ہوئی شارقہ بیگم ٹھک کر دوڑاڑے پر بھیڑک گئیں۔ ان کے دل پر کسی نے گھونسا مارا تھا۔

”تو کس میں ہے دلچسپی انہیں؟“ طوبی کی آواز کسی گہرے کنویں سے نکلی۔

”مثائل قریبی میں۔“

”مثائل! وہ کون ہے؟ آپ کو کس نے بتایا؟“ طوبی نے پریشانی سے پوچھا۔

”مجھ سے سینئر ہے اور سارا اکیمپس جانتا ہے کہ سر بہان اور مثائل کے درمیان کیا چل رہا ہے۔“ انابیہ کا لہجہ
 رنجیدہ تھا۔

”تو آپ کو بتانا چاہیے تھا اسے جا کر کہ آپ کے اور بہان بھائی کے درمیان کیا رشتہ ہے۔“ طوبی کو ایک دم ہی
 غصہ آیا۔

”تو اس سے کیا ہو گا؟“ وہ استہزائیہ انداز میں گویا ہوئی۔

”تاکہ اسے پتا چلے وہ غلط کر رہی ہے اور کسی کے حق پر ڈاکا مارنا کوئی اچھی بات نہیں۔“

”اگر بہان خود اس کی طرف بڑھا ہوتا تو۔۔۔؟“ انابیہ نے طنزیہ نگاہوں سے اپنی بہن کی طرف دیکھا جس کا بس
 نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کے لیے کچھ کر گزرتی۔

”دونوں صورتوں میں اسے معلوم ہونا چاہیے یہ آپ کی بھی زندگی کا سوال ہے۔“ طوبی نے اسے سمجھانے کی
 کوشش کی جبکہ شارقہ بیگم وہیں سے پلٹ گئیں۔ ان کے دل پر ایک بھاری بوجھ آن پڑا تھا۔ انہیں پہلی دفعہ
 احساس ہوا کہ سیانے ٹھیک ہی کہتے ہیں بیٹیوں کی قسمت واقعی ماؤں جیسی ہوتی ہے۔ ساری زندگی وہ خاقان
 صاحب کے پیچھے بھاگتی رہیں لیکن ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ انابیہ کا وہ قطرہ قطرہ۔۔۔ ان کے دل میں اتر رہا تھا
 لیکن انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی زندگی سے کسی کو بھی کھیلنے نہیں دیں گی۔

”تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟“ خاقان علی کسی کام سے اوپر آئے تو شارقہ بیگم کو اپنی ہی سوجھوں میں غطال پایا۔

”ہوں۔“ وہ ہلکا سا چو نکلیں۔ ”چھا ہوا آپ آگئے۔ ایک ضروری بات کرنی ہے مجھے آپ سے۔“ وہ فیصلہ کن

انداز میں کھڑی ہوئیں۔
 ”لیکن میں تو اسلام آباد کے لیے نکل رہا تھا۔“ انہوں نے رسواچ میں وقت دیکھتے ہوئے مصروف انداز میں

کہا۔

”ایک گھنٹہ لیٹ بھی ہو جائیں گے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ ان کے لمبے میں کچھ تھا جو خاقان جیسا گھاگ بندہ ایک لمحے میں سمجھ گیا۔

”اچھا چلو، لیکن خدا کے واسطے اپنی اور ندرت کی کسی نئی لڑائی کا قصہ مت چھیڑ دینا۔“
انے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے انہوں نے تنبیہ کی، ”کیونکہ وہ جانتے تھے کہ شارقہ کی اپنی سوتن ندرت سے بالکل نہیں جتنی تھی اور دونوں ایک دوسرے کی شکایت لگانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھیں۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اپنی اولاد کے لیے ابھی سے کچھ سوچ لیں، ایسا نہ ہو ندرت جیسا کوئی عذاب آپ کی بیٹیوں کو بھی بھگتنا پڑ جائے۔“ ان کے سر دلچرہ چلتے چلتے جھنجھلا کر کے، ”فورا“ مڑ کر شارقہ بیگم کی طرف دیکھا۔ شارقہ کے چہرے پر اس وقت چٹانوں کی سی سختی محسوس کر کے خاقان کا اگلا جملہ ان کے حلق میں ہی دم توڑ گیا۔



در شہوار کو نور محل میں آئے ہوئے دوسرا دن تھا۔

فارحہ بھابھی اپنی نند کی آمد پر خاصی خوش دکھائی دے رہی تھیں کیونکہ نور محل میں رہنا ان کی مجبوری تھی۔ کیونکہ ایک تو ان کے شوہر وہاب وہاں رہتے تھے اور دوسرا ساری سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بھی ان۔ کایہ ہی گھر تھا۔ جہاں ہر وقت مہمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا۔ وہ وہاں واحد خاتون تھیں جو سب چیزوں کی نگرانی کرتی تھیں لیکن جب بھی ان کو موقع ملتا وہ ”فورا“ میرناؤس پہنچ جاتیں۔ ایک تو ان کی ساس تاجدار بیگم کے ساتھ ان کے تعلقات خاصے خوش گوار تھے اور دوسرے وہاں خواتین کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کا بھی دل لگا رہتا۔
فارحہ بھابھی اس دن چچن میں آئیں تو سامنے چولہے پر رکھی چائے پک پک کر ختم ہو چکی تھی اور در شہوار شایف سے ٹیک لگائے کسی گہری سوچ میں مگن تھی۔

”در شہوار! کوئی مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔“ انہوں نے ”فورا“ لپک کر چوہما بند کیا۔
”نن۔۔۔ نہیں تو بھابھی۔“ در شہوار ایک دم ہوش کی دنیا میں آئی تو دیکھا، سامنے چولہے پر موجود چائے کی پتیلی اچھی خاصی جل چکی تھی۔

”اوہ آئی ایم سوری۔۔۔“ وہ اچھی خاصی شرمندہ ہو گئی۔
”میں نوٹ کر رہی ہوں، تم جب سے آئی ہو، کچھ الجھی الجھی سی ہو، خیر تو ہے نا۔“ انہوں نے محبت بھری نظروں سے اپنی اکلوتی نند کو دیکھا جس کی آنکھوں سے جھلکتی شوخی اور شرارت کی جگہ اداسی لے چکی تھی۔
”ایسی تو کوئی بات نہیں، آپ بتائیں آپ کا دل نہیں گھبراتا اتنے بڑے گھر میں اکیلے رہتے ہوئے۔“ در شہوار نے بڑی ذہانت سے بات کا رخ بدلا۔

”اکیلا گھر کہاں ہے، ملا زمین کی ایک فوج ہے اور سارا دن تو مہمان داری رہتی ہے یہاں۔“ انہوں نے مسکرا کر فریج سے گوشت کا پیکٹ نکالا۔

”ہاں پھر وہاب بھائی بھی تو رہتے ہیں اور۔۔۔“ وہ زبردستی مسکرا کر بولی۔
”ان کا تو ہونا اور نہ ہونا تو بعض دفعہ برابر ہی ہوتا ہے۔“ فارحہ بھابھی کا لہجہ اداسی سے لبرز تھا۔
”ایک بات تو بتائیں بھابھی، میروڈا نف کیا محبت کے بغیر چل سکتی ہے؟“ اس نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا کیونکہ سارا خاندان جانتا تھا کہ وہاب کو اپنی بیوی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ اسی بات پر حیران تھی کہ آخر ایسی کون سی

بات ہے جس نے دونوں کو ابھی تک ایک ڈور میں باندھ رکھا ہے۔
”ہاں۔“

ان کی بات پر در شہوار کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ ”وہ کیسے؟“
”شادی شدہ زندگی محبت کے بغیر تو گزر سکتی ہے لیکن عزت کے بغیر نہیں۔“ فارحہ بھابھی کی بات ابھی مکمل ہوئی ہی تھی کہ وہاج چھینلائے ہوئے انداز میں پکن میں داخل ہوئے اور کھا جانے والی نگاہوں سے فارحہ کو دیکھا، جو انہیں غصے میں دیکھ کر تھوڑا گھبرا گئی تھیں۔

”ساری زندگی جاہل کی جاہل رہنا ہزار دفعہ سمجھایا ہے میری چیزوں کو ہاتھ مت لگایا کرو، لیکن تم جیسی کم عقل عورت کو کوئی بات ایک دفعہ کہنے سے تھوڑی سمجھ میں آتی ہے۔“ ان کا لہجہ سرا سر توہین آمیز تھا اور در شہوار کے سامنے اس کھینچائی پر ان پر گھڑوں پانی پھر گیا۔

”میرا الپ ٹاپ کیوں بند کیا ہے تم نے کنار عورت! اچھی خاصی فائل ڈاؤن لوڈ ہونے کے لیے لگا کر گیا تھا، اب مزید ایک گھنٹہ میرا غارت ہو جائے گا، پتا نہیں کس گناہ کی سزا ہو تم۔“ وہ ایک دفعہ پھر شروع ہو گئے فارحہ بھابھی کا چہرہ ضبط کی کوشش میں سرخ ہوا۔

”وہاج بھائی! آئی ایم سوری ٹیپ ٹاپ بھابھی نے نہیں میں نے بند کیا تھا۔“ در شہوار نے گھبرا کر جھوٹ بولا۔
فارحہ نے تشکر بھری نگاہوں سے اپنی نند کو دیکھا جس نے انہیں ایک بڑی مصیبت سے بچالیا تھا۔
”تم نے بند کیا تھا؟“ وہاج ایک لمحے کو گڑبڑائے لیکن معاملہ چونکہ اب اپنی لاڈلی بہن کا تھا، اس لیے خاصے ٹھنڈے بڑ گئے۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے، ایک کپ چائے کا بنوا کر بھیجو اور پلیز در شہوار! تم خود بنانا اس عورت کی تو ہر چیز بد مزہ ہوتی ہے اس کی شکل کی طرح۔“ ان کی بیڑا ہٹ اتنی کم نہیں تھی کہ دونوں کی ساعت تک نہ پہنچتی۔
”جی آپ جائیں میں لاتی ہوں۔“ در شہوار نے گھبرا کر کہا۔

فارحہ بھابی نے دو سرا ساس پین نکالا، ان کی آنکھوں سے بے اختیار دو آنسو جھلکے جنہیں انہوں نے فوراً بازو کی پشت سے صاف کر لیا۔ در شہوار کو حقیقتاً ”ان پر ترس آیا۔“
”اب سمجھ میں آگئی تا میری بات شادی شدہ زندگی میں محبت سے زیادہ عزت اہم ہوتی ہے۔“ انہوں نے ہلکا سا رخ موز کر در شہوار کو مخاطب کیا۔
”جی“ وہ ٹھیک ٹھاک شرمندہ ہوئی۔

”اس شخص سے شادی کبھی مت کرنا در شہوار! جو تمہاری عزت نہ کرتا ہو۔“ فارحہ بھابھی کی اس بات پر اس کے دل میں چھن سے کچھ ٹوٹا۔

”کیوں کرتے ہیں وہاج بھائی ایسا؟“ اس نے فوراً ”موضوع گفتگو تبدیل کیا۔“
”پتا نہیں۔“ انہوں نے برز چلایا اور چائے کا سامان کینٹ سے نکالنے لگیں۔ در شہوار کچھ لمحے تو ان کا چہرہ غور سے دیکھتی رہی لیکن شرمندگی کا احساس اس قدر گہرا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک کچن میں ٹھہر نہیں سکی۔



”ہاں یہ ہنڈرڈ پریسنٹ روی کا ہی ہے، لیکن آپ کو کہاں سے ملا؟“
شہزاد نے ارنلڈ حیدر کے ہاتھ میں جیسے ہی اپنی بہن کا برہسلیٹ دیکھا اس کے دل کی دھڑکنیں یک دم تیز ہوئیں۔

وہ ابھی ابھی اس سے ملنے کے لیے ٹینا ہاؤس پہنچا تھا۔ شہزاد کو اگلے دن شام میں اس کے ضد کرنے پر ہسپتال سے گھر شفٹ کر دیا گیا تھا۔ وہ اب کچھ پرسکون تھی لیکن گھر میں مہمانوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، کیونکہ ٹینا بیگم خاصی سوشل تھیں اور کچھ میڈیا نے اس خبر کو بھی خاصا اچھالا تھا اور اسی لیے کچھ لوگ محض چسکے کے لیے اور کچھ ہمدردی کے لیے ان کی طرف آرہے تھے۔

”بتا میں ناں کہاں سے ملا ہے آپ کو۔“ شہزاد کو بے چینی ہوئی۔

”چوہدری افتخار وڑائچ کے فارم ہاؤس سے۔“ اس نے سامنے رکھا کافی کا مک اٹھایا۔

”اس کا مطلب ہے آپ کو ریڈ میں ناکامی ہوئی۔“ شہزاد نے ایک لمبے میں ساری صورت حال بھانپ لی۔

”ارنلٹی حیدر اتنی آسانی سے اپنی ہار نہیں مانتا۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”بس تھوڑی اندازے کی غلطی ہو گئی،

ورنہ رومی صبح اس وقت گھر میں ہوتی۔“

شہزاد اس کی بات سن کر پچھلے سے انداز میں مسکرائی۔ اتنا تو وہ بھی جانتی تھی کہ آج کل سبگل فیملی کے

ستارے گردش میں ہیں، ہر چیز میں اور ہر کام میں ایک بڑی رکاوٹ منہ کھولے ان کی منتظر ہوئی تھی۔

”چوہدری افتخار وہی ہیں ناں جو صوبائی منسٹر رہے ہیں۔“ شہزاد نے ہلکا سا چونک کر پوچھا۔

”بالکل اور ان کا بھیجا ارسلان، جسٹس محمود کے بیٹے کا بیسٹ فرینڈ بھی تھا۔“ ارنلٹی نے ایک اور انکشاف

کیا۔

”اوہ مائی گاڈ! آپ نے اریسٹ کیا اسے۔“ وہ فوراً ”بے تابی سے اٹھ بیٹھی۔

”ہاں، دو گھنٹے حالات میں رہا، لیکن اوپر سے آرڈر آئے اور ضمانت کروائی گئی اس کی، لیکن بے فکر ہیں پاتال

سے بھی نکال لاؤں گا میں رومی صبح کو۔“

”تنی اہم خبر مجھے اب بتا رہے ہیں آپ؟“ شہزاد ہلکا سا برامان کر بولی۔

”یہ بات کرنے سے پہلے آئینہ دیکھ لیں اور یہ اتنی بڑی پیڈنچ بھی، پھر مجھ سے پوچھئے گا۔“ وہ ڈھکے چھپے الفاظ

میں اس کی خرابی طبیعت کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان اچھی خاصی بے تکلفی ہو چکی تھی۔

”بھارت میں جائے میری طبیعت، آپ کو اندازہ نہیں میں کتنی آپ سیٹ ہوں رومی صبح کے لیے۔“ وہ جھنجھلا کر

بولی۔

”ٹرسٹ می، آپ سے زیادہ نہ سہی لیکن کم آپ سیٹ میں بھی نہیں ہوں آپ کی بہن کے لیے۔“ اس کی

بے ساختگی ایک دفعہ پھر شہزاد کو چونکا گئی، لیکن اس نے پھر دانستہ نظر انداز کر دیا۔

”ارسلان کو نہیں چھوڑنا چاہیے تھا آپ لوگوں کو، وہ رومی صبح کے بارے میں لازمی کچھ نہ کچھ جانتا ہو گا۔“

”بے فکر ہو اس کا نام آچکا ہے ہماری لسٹ میں۔“ ارنلٹی نے اسے تسلی دی۔

”مزید کیا پتا چلا؟“

”فارم ہاؤس اس کے چچا کا ہے اور آخری اطلاع تک رومی صبح اسی فارم ہاؤس میں تھی۔ یہ ریسلٹ اور کچھ

چیزیں بھی وہیں سے ملی ہیں لیکن پریشان کن بات یہ ہے کہ ارسلان پچھلے تین دن سے دہلی میں تھا اور آج صبح کی

فلائٹ سے واپس پہنچا ہے، یعنی کہ جس وقت فارم ہاؤس میں چھاپہ مارا گیا وہ ملک سے باہر تھا۔“ ارنلٹی نے اس

دفعہ تفصیل سے جواب دیا۔

”تو رومی صبح کو وہاں سے غائب کس نے کیا۔؟“ شہزاد کو پریشانی ہوئی۔

”اسی یوانٹ پر تو ہم لوگ مزید تفتیش کر رہے ہیں شاید اس کے کچھ اور فرینڈز ہوں۔“

”شاید ہمیں یقیناً۔۔۔ انہوں نے ہی ریڈ کے دوران غائب کیا ہے اسے وہاں سے۔“ شہر زاد نے سنجیدگی سے کہا۔

”لیکن ایک چیز حیران کن ہے، جس گاڑی میں اسے وہاں سے نکالا گیا، وہ پولیس کے قبضے میں ہے اور فارم ہاؤس کے پچھلے حصے میں قدموں کے نشانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے نکالنے والا بندہ ایک ہے۔“ آر تفضی نے معلومات میں اضافہ کیا۔

”ایک بندہ؟“ شہر زاد تعجب سے بولی۔

”ہاں اور کلفنیوژن اس بات کی ہے کہ وہ یہاں اتنے آرام سے اس کے ساتھ کیوں چلی گئی، وہ شور مچا کر پولیس کی مدد بھی تو لے سکتی تھی۔“

”ہوں!“ شہر زاد کو دھچکا لگا۔ ”ہو سکتا ہے اس شخص نے اسے جان سے مارنے کی دھمکی دی ہو یا کسی اور حوالے سے ہلک میل کیا ہو۔“

”سے لی، لیکن مجھے یقین ہے کہ اب یہ صرف دو تین دن کا کیم ہے۔“ آر تفضی خاصا پر اعتماد تھا اسی وقت دروازہ ہلکے سے بجکا ملازمہ اندر داخل ہوئی۔

”شیر لی بی، بریگیڈیئر کو قاردرانی آپ سے ملنے آئے ہیں۔“ اس اطلاع پر آر تفضی نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ناگواری کا بڑا بھرپور سا تاثر ابھرا تھا۔

”مام کہاں ہیں؟“

”ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہیں۔“ ملازمہ نے مزید بتایا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ میں آ رہی ہوں۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”آئی تھنک، آپ کو ہمیں بلو الینا چاہیے انہیں۔“ وہ فکر مند انداز میں گویا ہوا۔ اس وقت وہ دونوں شہر زاد کے گیٹ روم میں تھے وہ ہسپتال سے آنے کے بعد اسی کمرے میں تھے، کیونکہ مہمانوں کی آمدورفت بہت زیادہ تھی اور بار بار ریزہ ریزہ اترنے چڑھنے سے ابھی تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔

”گولی میرے شولڈر کو چھو کر زری ہے، لیکن ٹانگیں الحمد للہ سلامت ہیں۔“

شہر زاد کے ہلکے پھلکے انداز پر وہ مسکرایا۔ ”اوکے ہسٹ آف لک۔۔۔“

”آپ نہیں ملیں گے ان سے۔۔۔؟“ شہر زاد نے ہلکا سا چونک کر اس کی طرف دیکھا جو جانے کے لیے پر تزلزل رہا تھا۔

”آئی تھنک یہ مناسب نہیں لگتا اور میری موجودگی میں وہ خواہ مخواہ کانٹنٹس ہو جائیں گے۔“ اس نے بڑے مناسب الفاظ میں انکار کیا تو شہر زاد نے بھی اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

”اوکے ٹیک کیئر آف یور سیلف۔“

اس نے بڑی گہری نظروں سے شہر زاد کا جائزہ لیا، جو اس وقت بڑے برا اعتماد انداز سے چپل پہن رہی تھی۔ اس لڑکی کا اعتماد اور بے نیازی اسے ہمیشہ کچھ فاصلے پر رہنے پر مجبور کر دیتی تھی، لیکن اس میں کچھ تھا جو وہ اپنی بے انتہا مصروفیات میں سے بھی وقت نکال کر اس کے پاس آنے سے خود کو روک نہیں پاتا تھا اور یہ چیز ان کے ارد گرد رہنے والے لوگوں نے بھی محسوس کرنا شروع کر دی تھی۔



برہان اور در شہزادوں شفاء انٹرنیشنل ہسپتال میں تھے۔

برہان نے ایک دن پہلے بہت اچھے فریضہ سے اپنا نمٹ لے لی تھی۔ در شہوار کے جاتے ہی کچھ ٹیسٹ ہوئے جن کی رپورٹس کچھ دیر میں ملنی تھیں، برہان اسے لے کر کیفے ٹیرا آگئے۔
 ”رزلٹ تو تم لوگوں کا آچکا ہے، اب مزید کیا سوچا ہے؟“ وہ رشین سلا دلے کر اس کی میز پر پہنچے اور بڑے غور سے اس کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھا۔

”طولی اور نیرو سے پوچھوں گی۔“ اس نے ہلکا سا سنبھل کر جواب دیا۔ وہ جانتی تھی کہ برہان پڑھائی کے معاملے میں کسی بھی قسم کی رعایت بخشنے کے قائل نہیں تھے۔
 ”میرے خیال میں تم تینوں کو بی ایس میں ایڈمیشن لے لینا چاہیے یونیورسٹی میں۔“ برہان نے یونی بات برہانے کی غرض سے کہا۔

”جی۔ ٹھیک ہے۔“ در شہوار خلاف توقع فوراً ہی متفق ہو گئی۔
 ”تمہیں کیا ہوا ہے در شہوار؟ کوئی اور مسئلہ تو نہیں۔“ برہان اس کے فوراً مان جانے پر ریشان ہوئے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اسے ہر معاملے میں اپنی پسند ناپسند کا بڑا خیال رہتا تھا اور اس چیز پر جھجھو کر اس کے لیے دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔
 ”نہیں۔ نہیں بھائی، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ ان کی کھوجتی نظروں پر گریڑ پڑی گئی۔
 ”مجھے کیوں لگتا ہے کہ کوئی پرابلم ہے تمہارے ساتھ۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ آج بری چھٹی تھی لیکن قسمت اچھی تھی جو برہان کی توجہ دوسری جانب مبذول ہو گئی۔
 ”ہائے برہان، آپ یہاں کیسے؟“

منائل قہقہے میں ایک دم ان کی میز کی طرف آئی۔ در شہوار کے سامنے منائل سے اچانک ملاقات نے برہان کو ایک لمحے کے لیے خفت میں مبتلا کیا لیکن جلد ہی انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔ دوسری طرف اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھ کر در شہوار کو زوردار جھٹکا لگا، یہ چہرہ وہ بھلا کیسے بھول سکتی تھی۔ پچھلے چند دنوں میں جتنی نفرت اسے اس لڑکی سے ہوئی تھی اس کی پیمائش کے لیے تو کوئی نیا ہی آلہ ایجاد کرنا پڑتا۔
 ”میں در شہوار کے ساتھ آیا تھا یہاں، میری چھوٹی بہن ہیں یہ۔“ برہان کی وضاحت پر منائل نے کھل کر سانس لیا۔ جب کہ در شہوار کے چہرے کے ذریعے اسے دیکھ کر بری طرح سے بڑبڑ گئے۔ وہ منائل کو نظر انداز کیے اپنے سامنے رکھا رشین سلا دکھانے لگی۔

”در شہوار! یہ منائل قہقہے ہیں، میری اسٹوڈنٹ اور اب کو لیگ بھی۔“ برہان کو اس کا انداز برا لگا۔
 ”جاتی ہوں میں۔“ در شہوار نے سر اٹھائے بغیر بے رخی سے جواب دیا۔
 منائل کو دھچکا سا لگا اور ایک دم سے برہان بھی شرمندگی کا شکار ہوئے۔ جب کہ منائل کو در شہوار کے بیزاری کے پیچھے چھپا اپنے مستقبل کا حال صاف دکھائی دے رہا تھا۔

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

کن من کن من برستی بوندیں اسے اچھی لگتی کر دیتی تھی۔
 تھیں ہنر۔ وہ ایک توانا مرو تھا۔ باہمت اور جوان۔ اپنے
 موسلا دھار بارش اسے عجیب سی بے چینی میں مبتلا حوصلوں سے پہاڑ کو مٹی میں بدل دینے والا۔

قوة العين خرم ہاشمی

بارشِ حجاز



سے بھر پور سہ شادی کے بعد اسے گھر کے سب لوگوں سے اتنا پیار ملا کہ وہ اپنی ہر کمی بھول گئی۔ اس نے اپنی خوش اخلاقی سے سب گھر والوں کے دل موہ لیے تھے۔ حسن بہت خوش اور مطمئن تھا، مگر شاید رب کو ان کی آزمائش منظور تھی۔

مہک نے ہر علاج سے ناکام ہونے کے بعد حسین کو دوسری شادی کرنے کی بخوشی اجازت دے دی تھی۔ اس کے باپ کا کچھ عرصے پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اب یہ گھر اور اس کے لوگ ہی اس کا سب کچھ تھے۔ حسن نے کبھی دوسری شادی کا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا، مگر مہک کا دل جانتا تھا کہ ایسا ایک دن ضرور ہوگا۔

وہ ان ہی سوچوں میں گم تھا جب بادل کی گرج چمک سے ساری فضا گونج اٹھی۔ کالے بادلوں کی وجہ سے دن میں بھی رات کا سا ملہ بندھ گیا تھا۔ اسی وقت بجلی نور سے کڑکی۔ ساتھ ہی تینوں نے چیخ باری اور اندر کی طرف بھاگ گئیں۔ حسن کے ذہن میں ایک کونڈا سا لپکا تھا۔ آسمان سے برستا موسلا دھار پانی اور پانی کی اوٹ سے جھانکتے دوسرے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے لاشعور کے پردے کو چاک کرنا، کمرے کا دروازہ کھول کر مہک اندر داخل ہوئی۔

”توبہ! اتنے نور سے بجلی چمکی کہ ہماری تو جان ہی نکل گئی۔ بس اللہ رحم کرے۔“

مہک نے ہماری سے اپنا سوٹ نکالا اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ جبکہ حسن پھر بندو لم کی طرح ہونی اور انہونی کے درمیان جھولتا رہ گیا۔ اس نے گہری سانس لے کر دوبارہ کھڑکی سے باہر جھانکا، بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اب ہلکی پھوار جاڑی تھی۔ حسن نے آگیا کر کھڑکی بند کر دی۔ حالانکہ اسے کن من اچھی لگتی تھی، مگر کبھی کبھی اپنی من پسند چیزیں بھی دل کو نہیں بھاتیں۔

مہک نے یہ دل کس گورکھ دھندے کا نام ہے۔ جو کبھی کسی حال میں بھی خوش نہیں ہوتا۔ حسن نے لیپ ٹاپ کی چمکتی اسکرین کو دیکھ کر

وہ آسمان سے برستے پانی سے ڈرتا نہیں تھا، مگر اسے برستا دیکھ کر چونک پڑتا تھا۔ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہو، مگر کیا؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک پردہ حائل تھا۔ کسی ہونی اور انہونی کے درمیان۔ مگر بارش دیکھ کر مہک ہمیشہ چل جاتی تھی۔ وہ بارش میں بھٹکنے کو ہر وقت تیار رہتی اور اس کی پوری کوشش ہوتی کہ حسن کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لے۔ مگر حسن ہاتھ اٹھا کر صاف منع کر دیتا۔

”تمہیں بارش میں بھٹکانا ہے تو بھیکو، مگر مجھ سے مت کہو۔ مجھے بہت الجھن ہوتی ہے۔“

مہک یہ سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”آپ کے خمرے تو لڑکیوں کی طرح کے ہیں۔ نہیں آتا تو نہ سہی، میں ہمارا دم کو اپنے ساتھ لے جاتی ہوں۔“ مہک نے اپنی دونوں چھوٹی ہندوں کا نام لیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

حسن نے سر جھٹکا اور لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا۔ کھڑکی پر برستی پوندوں کی آواز، اس کی خاموشی میں خلل ڈال رہی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ مسلسل دستک دے رہی ہو۔ اسے پکار رہی ہو۔ کچھ دیر تک وہ کوشش کرتا رہا کہ اپنے کام پر توجہ مرکوز کر سکے، مگر پھر تنگ آکر اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی کھول کر نیچے صحن میں دیکھنے لگا۔ آج بھی تیز ہوا کے ساتھ، پانی بہت تیزی سے برس رہا تھا۔ صحن میں مہک ہمارا دم نے شور ڈالا ہوا تھا۔ اماں اور ابا اندر سے انہیں مسلسل پکار رہے تھے۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں سن رہی تھیں۔

حسن کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کا چھوٹا سا گھر محبت اور امن کا گوارہ تھا۔ جہاں تین سال پہلے مہک کے آنے سے مزید رنگ بھر گئے تھے، مگر یہ

رنگ ادھورے تھے ان کی ذات کی طرح۔ مہک کے والد اور ابا بہت قریبی دوست تھے۔ مہک کی ماں تو اس کے بچپن میں ہی وفات پا گئی تھی۔ اس لیے مہک نے اپنے والد کے علاوہ کوئی اور رشتہ نہیں دیکھا تھا۔ مہک محسن کے والدین کی پسند تھی۔ شوخ و چنچل زندگی



اب تو اس کے ساتھ ساتھ مکہ پر بھی یہ ذمہ داری لاگو ہو گئی تھی۔

”میں نے کبھی گاؤں نہیں دیکھا۔ سچ میں بہت مڑا آئے گا وہاں۔“ مکہ نے خوشی سے چمکتے ہوئے کہا تو اہل اور اہل نے مسکرا کر تائید کی اور اسے گاؤں کے قصبے سنانے لگے۔ حسن کا بچپن وہاں گزرا تھا۔ اہل، اہل کی زبانی اپنے بچپن کے قصبے سنتا ہوا وہ بھی زیر لب مسکرا رہا تھا۔

”اور ہاں حسن! اپنی رحمت بوا سے ضرور ملے جانا۔ وہ تم سے بہت پیار کرتی تھیں۔ مکہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔ تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں مکہ! حسن جب دس سال کا تھا تو رحمت بوا کی اکلوتی بیٹی ریشم سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔“ اہل نے ہنستے ہوئے کہا تو مکہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کے اسے دیکھنے لگی۔

”سچ میں اہل!“ مکہ نے پوچھا تو اہل بھی ہنس پڑے۔

”تو اور کیسا۔ وہ اس سے پانچ سال بڑی تھی۔ حسن کے بڑے تایا کے بیٹے انور کی منگ تھی۔ اسی کی منگنی کرنے ہم گاؤں گئے تھے۔ جب یہ ریشم کو دیکھ کر شادی کی ضد کر بیٹھا تھا اور بعد میں بھی کتنے سال ہی۔۔۔ سب اس کو بہت پھیرتے تھے۔“ اہل کے کہنے پر سب ہنس پڑے۔

”اہل! آپ بھی نا۔ کیا کیا یاد رکھا ہوا ہے۔“ حسن جھینپ کر رہ گیا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ جبکہ وہ سب مزے سے اس واقعے کو دہرانے لگے۔



”فہم! اہل! مجھے یہاں کیوں لے کر آئی ہیں۔“ دس سالہ حسن نے گاؤں کی ٹوٹی پھوٹی گلیوں میں چلتے ہوئے چڑ کر کہا تھا۔ وہ سب لوگ تیار ہو کر پیدل ہی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ جو کہ قریب کے چند گھر چھوڑ کر ہی تھی۔

”نویدہ خالہ کے گھر سے کارڈ آیا ہے۔ اس کے پوتے کی شادی ہے۔“ حسن شام کی چائے اہل اور اہل کے ساتھ بیٹھ کر پئی رہا تھا۔ جب اہل نے ایک کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اسی وقت مکہ بھی وہاں آکر بیٹھ گئی۔ جبکہ ہما اور اہم اکیڈمی گئی ہوئی تھیں۔ ہما ایف ایس سی کی طالبہ تھی جبکہ اہم بی ایس سی آنرز کی طالبہ تھی۔

”شادی تو اگلے ہفتے ہے۔“ حسن نے کارڈ دیکھ کر کہا۔

”ہاں! آج نویدہ خالہ کا فون بھی آیا تھا۔ بہت اصرار کر رہی تھیں کہ ہم لوگ شادی میں ضرور شرکت کریں۔ میں نے تو اپنی طبیعت کی وجہ سے معذرت کر لی ہے۔ ایسا کرنا تم اور مکہ چلے جانا۔ اچھا ہے اسی بہانے مکہ ہمارا گاؤں بھی دیکھ لے گی اور بہت سے رشتے داروں سے بھی مل لے گی۔“ اہل نے تفصیل سے کہا تو حسن سوچ میں پڑ گیا۔

”مگر اہل! مجھے گاؤں گئے ہوئے کافی سال ہو گئے ہیں۔ میں تو کسی کو جانتا بھی نہیں ہوں اور نہ ٹھیک سے کوئی یاد ہے مجھے۔ میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟“ حسن نے اچھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ارے بیٹا! پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ مانا کہ ہمارے زیادہ تر قریبی رشتے دار شہر میں سیٹ ہو گئے ہیں مگر ابھی بھی بہت سے لوگ ہیں وہاں۔ تم فکر مت کرو۔ یہاں سے بھی کافی لوگ جائیں گے۔ وہ تمہاری رہنمائی کریں گے۔“

اب کی بار اہل نے بارعب انداز میں کہا تو حسن سر ہلا کر رہ گیا۔

اہل اور اہل بڑھتی عمر کے ساتھ گلی کئی بیماریوں کی وجہ سے بہت کم کہیں آتے جاتے تھے۔ اس لیے حسن کو خوش اسلوبی سے یہ ذمہ داری نبھانی پڑتی تھی۔

”مرے بھی! آج تمہارے انور بھائی کی منگنی ہے۔ اس لیے ہم لڑکی والوں کے گھر جا رہے ہیں۔ آجا میرا بیٹا! تھک گیا ہے تو میں گود میں اٹھا لیتا ہوں۔“ تایا ابو نے کہا تو اب فوراً ”بولے۔“

”مرے نہیں بھائی! بچہ ہے نا“ اس لیے گھر گیا ہے۔ میں دیکھ لیتا ہوں۔“ ابابا کے کہنے پر تایا ابو مطمئن ہو کر آگے بڑھ گئے۔

وہ تقریباً ”بیس افراد پر مشتمل چھوٹا سا قافلہ تھا۔ جو رحمت ہوا کے رنگ برنگی جھنڈیوں اور چھوٹے چھوٹے برقی قلمیوں سے سجے گھر کے صحن میں پہنچ کر رکا تھا۔ سب ایک دوسرے سے بہت تپاک سے مل رہے تھے۔ جانتے تو یہ سب ایک دوسرے کو کئی سالوں سے تھے۔ بس کچھ عرصہ پہلے ہی تایا ابو کے ساتھ ساتھ حسن کے والد نے شہر کی طرف کوچ کیا تھا۔ مگر یہاں سے جاتے ہوئے وہ رحمت ہوا سے رشمن کا ہاتھ مانگ گئے تھے۔ اب انور کی نوکری لگتے ہی وہ منگنی کرنے چلے آئے تھے۔ انور کو کیت میں بہت اچھی نوکری مل گئی تھی۔“

بیس سالہ انور نے جب پہلی بار رشمن کو دیکھا تھا تو اپنا دل ہار بیٹھا تھا۔ رشمن بھی ہی ایسی۔ حسن اور نزاکت کا مجموعہ۔ اس کے حسن کی وجہ سے بہت سے لوگ اس کے رشتے کے طلب گار تھے مگر رحمت ہوا نے انور کے لیے ہاں کی تھی۔ رحمت ہوا کی وہ عورت تھی۔ جس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ گاؤں میں اس کی بہت عزت تھی۔ سب اسے رحمت ہوا کے نام سے جانتے اور پہچانتے تھے۔ رحمت ہوا کے دونوں بیٹے شادی شدہ اور بچوں والے تھے۔ اب صرف رشمن کی ذمہ داری اس کی بوڑھے کندھوں پر تھی۔ آج وہ دن بھی آپہنچا تھا۔ جس کا انتظار اسے ایک مدت سے تھا۔

چھوٹی سی رسم کے بعد رشمن کی نازک انگلی میں انور کے ہاتھ کی انگوٹھی جگمگانے لگی۔ مبارک سلامت کے شور سے فضا گونج رہی تھی۔ سب خوش تھے۔

ہنس رہے تھے۔ حسن اماں کو دھونڈتا ہوا عورتوں والے حصے میں چلا آیا۔ جہاں سب گھونگھٹ میں سر جھکائے بیٹھی رشمن کو مٹھائی کھلا رہے تھے۔ حسن نے بھی ضد کی۔

”میں بھی دلہن کو مٹھائی کھلاؤں گا۔“ سب ہنس پڑے اور اسے آگے کیا۔

”پہلے دلہن کا منہ تو دکھاؤ۔“ حسن نے کہا تو ہر طرف سے قہقہہ ابل پڑا۔

”بھئی چھوٹا سا ہے مگر ہے بہت تیز۔ کس نے پٹی دھائی ہے تمہیں۔“ رشمن کی کسی سہیلی نے ہنس کر کہا۔

”جی نہیں۔ مجھے دلہن کو دیکھنا ہے بس۔“ حسن کے ضد کرنے پر رحمت ہوا نے آگے بڑھ کر تھوڑا سا دھنپا پیچھے کیا اور کہا۔

”بچہ ضد کر رہا ہے تو دکھا دو چہرہ۔ ویسے بھی یہاں کون بے مرد ہیں۔“

حسن نے خوشی سے سر جھکائے بیٹھی رشمن کو دیکھا۔ اسی وقت رشمن نے بھی سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ رشمن کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں بے تحاشا چمک تھی اور جب وہ مسکرا رہی تھی تو اس کے سفید چمکتے دانت صاف نظر آ رہے تھے۔ حسن مٹھائی کھلانے کے بجائے کچھ سوچتا رہا۔

”اماں! کیا دلہن سچ میں اتنی پیاری ہوتی ہے؟ مجھے بھی لینی ہے کہن۔“ حسن کی معصوم فرمائش پر ساری محفل کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”پگلا کہیں کا۔۔۔ چل ادھر آ۔“ اماں نے ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں سے اٹھایا، مگر حسن اگلوٹا بیٹھا ہونے کی وجہ سے کالی ضدی تھا۔ سارے راستے یہی بات کہتا رہا۔

جو آہستہ آہستہ سب میں پھیل گئی۔ سب اسے بچے کی معصوم ضد سمجھتے رہے اور ہنستے رہے۔ جبکہ حسن ایک کونے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ۔۔۔

”میں نے ایسا کیا کہہ دیا کہ کوئی میری بات کو سنجیدہ

ہی نہیں لے رہا۔“

”یہ کیا بات ہوئی بہن۔ میری تو خواہش تھی کہ جلد از جلد اپنی بیٹی کے ہاتھ پہلے کر دوں، مگر آپ کہہ رہی ہیں کہ ابھی انور کو دو سال اور لگیں گے، پہلے ہی ایک سال کا کہہ کر اتنا وقت نکال دیا ہے۔ تین سال ہو گئے ہیں ان دونوں کی معافی ہوئے۔“ رحمت بوائے تللی امی کی بات سن کر ریشائی سے کہا تھا۔ پتا نہیں جواب میں تللی امی نے کیا کہا۔

حسن وہاں سے اٹھ کر بھاگتا ہوا ریشم کے پاس گیا۔ جو کوئی کتب کھولے کم صم سی بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے جیسے انور کے پاکستان آنے کے چانس کم ہونے لگے تھے، ویسے ویسے ریشم زیادہ تر کم صم رہنے لگی تھی۔ حسن کو دیکھ کر چونکی اور مسکرا کر اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”انور بھائی اس سال بھی پاکستان نہیں آرہے۔ بس دیکھ لینا! آپ کی شادی مجھ سے ہی ہوگی۔“ حسن کے کہنے پر ریشم نے ہلکی سے چپت اس کے سر پر لگائی۔

”بڑی بات۔ ایسے نہیں کہتے۔ بھابھی کہا کہ مجھے ریشم نے ہمیشہ کی طرح اسے سمجھایا۔“ کوئی نہیں۔ بھابھی کیوں بولوں؟“ حسن نے ضدی لہجے میں کہا۔ ریشم گہری سانس لے کر رہ گئی۔

”اب تم بڑے ہو رہے ہو حسن۔ اس سال چودہ کے ہو جاؤ گے۔ اچھا نہیں لگتا کہ تم میرا نام لو۔“ ریشم نے سنجیدگی سے کہا تو حسن منہ بنا کر رہ گیا۔ ”مگر مجھے ایسے ہی اچھا لگتا ہے۔“ حسن کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ جبکہ ریشم گہری سانس لے کر رہ گئی۔

”تللی امی کہاں ہیں؟“ حسن نے اکیلی بیٹھی ہوئی رحمت بوائے کے پاس آکر پوچھا۔ تو انہوں نے سامنے بنے غسل خانے کی طرف اشارہ کیا۔

”وضو کرنے گئی ہیں۔“ رحمت بوائے کا لہجہ اور آنکھیں بھیجی ہوئی تھیں۔

”رحمت بوائے دیکھ لیں، میں کتنا بڑا ہو گیا ہوں۔“

انور اور ریشم کی شادی اگلے سال ہونا قرار پائی۔ ان دنوں انور کو نئی نئی نوکری ملی تھی۔ سب کی خواہش تھی کہ وہ تھوڑا سیٹ ہو جائے تب ہی اس کی شادی کرتے، مگر نئی کے بعد باقی رشتے دار تو چلے گئے، مگر تایا ابو اور بابا زمین کی کچھ قانونی کارروائی کی وجہ سے وہیں رک گئے۔ ان کا قیام اپنے چچا زاد بھائی کے گھر پر تھا۔ حسن تو پہلے ایک دن بھی گاؤں رہنے پر تیار نہیں تھا۔ اب یہاں سے جانے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

وہ اور انور بھائی اکثر گھر سے نکل جاتے اور کسی نہ کسی بہانے در صم پر حاضری لگانے پہنچ جاتے۔ انور خود تو پیچھے رہتا، مگر حسن کو ریشم کے پاس بھیج دیتا، کبھی کوئی رقعہ لکھ کر اور کبھی کوئی زبانی پیغام بھیج دیتا۔ حسن کو اکثر انور کے پیغام بھول جاتے اور وہ خود مزے لے لے کر ریشم سے باتیں کرتا رہتا اور باہر کسی درخت کی اوٹ میں کھڑا انور اس کا انتظار کرتا رہتا۔

کبھی انور محسن سے کہتا کہ ریشم کو لے کر ندی پر آجائے حسن ہاں میں سر ہلا دیتا، مگر ریشم کو لے کر ندی پر نہیں آتا تھا۔ اسی طرح اگر انور کہتا کہ اسے کسی بہانے چھت پر لے آؤ۔ تاکہ میں دیکھ ہی سکوں، تو حسن اس بات پر بھی عمل نہیں کرتا تھا۔ ریشم کے پاس بیٹھ کر خود ہی باتیں کرتا رہتا۔ ریشم اس سے باتیں کرتی اور اس کی باتوں پر ہنستی تھی۔

اور یوں ہی ایک دن ان کی واپسی کا دن بھی آگیا۔ حسن بہت بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے آیا۔ انور کا بھی منہ لٹکا ہوا تھا۔ شہر آکر کچھ دن تو اس کا دل نہیں لگا، مگر پھر زندگی معمول پر آنے لگی۔

انور پر دیس چلا گیا۔ حسن یا تو بابا یا تللی امی کے ساتھ اکثر گاؤں چلا جاتا۔ وجہ صرف ایک ہی تھی ریشم۔ ابابا کا گاؤں کا چکر بہت کم لگتا تھا مگر تایا ابو اور تللی امی نئی رشتے داری کی وجہ سے بھی گاؤں آتے جاتے رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے حسن کو بھی ایک راستہ مل گیا تھا۔



رہشعل سے بھی لبدا۔ آپ میری شادی کر دیں
رہشعل سے۔ آپ کی پریشانی ختم ہو جائے گی۔ وعدہ
میں رہشعل کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ ”حسن
نے ایسے بھولے پن سے کہا کہ رحمت بوا کے چہرے پر
مسکراہٹ پھیل گئی۔

”بری بات ہے بیٹا! رہشعل تم سے عمر میں بڑی
ہے۔ اس کا نام مت لیا کرو۔ بھابھی یا باجی کہہ لیا کرو۔
تم یہاں بیٹھو۔ میں بھی نماز پڑھ لوں۔ وقت نکلا جا رہا
ہے۔ ”رحمت بوا نے نرمی سے اسے سمجھایا اور وہاں
سے اٹھ کر چلی گئیں۔

حسن خاموشی سے انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

پھر کچھ ہی سال گزر گئے۔ تعلیمی مصروفیات کے
بڑھتے ہی اس کے گاؤں کے چکر لگانا کم سے کم ہوتے
گئے۔ تایا ابو اور تائی امی انور بھائی کے پاکستان نہ آنے
کی وجہ سے شرمندگی کے مارے گاؤں نہیں جاتے
تھے۔ رحمت بوا تک بھی خبر پہنچ گئی تھی کہ انور نے
کویت میں کسی مال دار آدمی کی اکلوتی بیٹی کے ساتھ
شادی کر لی ہے، اسی لیے وہ پاکستان نہیں آ رہا تھا۔ مگر جو
بھی تھا اسے ایک بار گھر میں بتانا چاہیے تھا۔ اس کی
وجہ سے رحمت بوا انتظار کی سولی پر لٹکی ہوئی تھیں اور
تایا ابو اور تائی امی شرمندگی کے مارے گاؤں کا رخ
نہیں کرتے تھے۔ تعلقات پر وقت نے اچھی خاصی
گرد و آل دی تھی۔ پھر بڑھتی مصروفیات کے دوران
آپس میں ملنا ملنا بھی کم سے کم ہو چلا گیا۔ ابابا اور حسن
ایک بار کسی قریبی رشتے دار کی وفات پر گاؤں گئے
تھے۔ تب حسن ایف ایس سی کا امتحان دے کر فارغ
ہوا تھا۔ اس کے بعد پھر بھی اس کا وہاں جانا نہیں ہوا
تھا۔

اس دوران انور بھائی پاکستان آئے تھے اچانک
سب حیران رہ گئے تھے۔ سنا ہے کہ وہ سب گاؤں بھی
گئے تھے اور بار بار گئے، معافی مانگی۔ ”مٹانی کا یقین دلا دیا“
مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کے انتظار میں کئی سال
سے بیٹھی رہشعل نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ اگر
انکار ہی کرنا تھا تو اتنے سال تک انتظار کیوں کیا؟ سب

کے ہونٹوں پر ان گنت سوال تھے، مگر سامنے والے کی
ایک چُپ۔ سب پر بھاری تھی۔ رہشعل ماں کیوں
نہیں رہی تھی۔ سب کی منتیں کرنے کے باوجود وہ
اتنی پتھریل تو نہیں تھی۔ پھر ایسا کیا ہوا کہ وہ چٹن کی
طرح اپنی بات پر اڑ گئی تھی۔

جب دیکھا کہ وہ کسی طرح بھی نہیں مان رہی تو انور
نے اپنے والدین کی مرضی اور پسند سے ایک بچی عمر کی
لڑکی کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ اسے لے کر واپس چلا
گیا اور کچھ عرصے کے بعد تایا ابو کی ساری فیملی وہاں
سیٹ ہو گئی۔ اب ان کا پاکستان آنا بہت کم ہو تھا۔

حسن کو یاد تھا کہ ایک بار تایا ابو نے ابابا کو باتوں
باتوں میں بتایا تھا کہ انور نے جس لڑکی سے وہاں شادی
کی تھی، اس نے کچھ عرصے پہلے ہی انور سے طلاق
مانگ لی تھی۔ جس کے بعد اس نے فوراً ”پاکستان کا رخ
کیا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ اس دوران ان کے یہاں اولاد
نہیں ہوئی تھی، نہیں تو ان کی کسٹڈی کے لیے بھی
مزید کئی سال انور کو کیس لڑنا پڑتا۔

وقت تیزی سے گزرنے لگا۔ ماضی کی باتوں پر حال
کی گرد پڑ گئی تھی۔ بہت سی باتیں اور تعلقات صرف
یادوں اور قصوں میں رہ گئے تھے۔ شہر کی تیز رفتاری
زندگی نے گاؤں سے جڑے ہر رشتے اور تعلق پر
لا تعلقی کی چادر ڈال دی تھی اور اب اتنے سال کے بعد
حسن ان راستوں پر ایک بار پھر سے سفر کرنے جا رہا
تھا۔ جہاں کچھ بھی ٹوٹا نہیں بچا تھا۔ مگر شاید ماضی کی
راکھ میں یاد کے کسی لمحے کی کوئی چنگاری، آج بھی جلتی
اور بجھتی تھی۔



”گاؤں کی زندگی کتنی مزے کی ہے نا۔ ایک ہفتہ
کیسے گزرا، پتا ہی نہیں چلا۔ مزے مزے کے کھانے“
دیکھی تھی میں کچھ ہوئے، تندور کی تازہ روٹیاں، تازہ
نکھن، دودھ کا ذائقہ تو میں کبھی نہیں بھول پائوں گی۔
ہر طرف سرسبز و شاداب کمیت، نہر کا ٹھنڈا پانی، سب
سے بڑی بات یہاں کے لوگوں کا خلوص اور یہاں سے کچھ

دیکھ کر پوچھا۔

”چلتا کیوں؟ وہ سامنے ٹانگہ دیکھ رہے ہیں نا۔ اس پر جاؤں گے۔ اب یہاں اگر بھی اپنے سب شوق پورے نہ کروں۔“ ”مہک کے کہنے پر حسن اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ جب ٹانگہ رحمت بوا کے گھر کے سامنے رکا تو سارا آسمان کالے بادلوں سے چھپ گیا تھا۔

”بھائی! آپ تھوڑی دیر ہمارا انتظار کر سکتے ہیں۔ دراصل موسم کے تیور ٹھیک نہیں ہیں۔ واپسی پر مشکل ہو جائے گی۔“ حسن کے کہنے پر ٹانگے والا مان گیا اور ایک درخت کے سائے میں رک کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ حسن نے آگے بڑھ کر لوہے کے گیٹ پر زور سے دستک دی، اسی وقت کن من بارش شروع ہو گئی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد ایک چاپ ابھری۔

”کون ہے؟“ مترنم اور شبیدہ سی آواز میں پوچھا گیا۔

”میں ہوں۔“ حسن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنا تعارف کیسے کروائے۔

”اپنا نام بتائیں۔ ایسے کیسے سمجھ میں آئے گا انہیں۔“ ”مہک نے ہلکی آواز میں ٹوکا۔ اس سے پہلے کہ حسن کچھ کہتا۔ جھٹ سے دروازہ کھل گیا۔ سامنے کالی چادر میں بہرے کی طرح دھنکی لشمعل کھڑی تھی۔

”واؤ! یہ تو بہت خوب صورت ہیں۔“ ”مہک کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ لشمعل کا سو گوار حسن ہر دیکھنے والی آنکھ کو اسیر کر لیتا تھا۔

حسن اور مہک نے سلام کیا۔ لشمعل نے آہستگی سے جواب دے کر انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں لشمعل کے پیچھے پیچھے بڑے سے صحن سے گزر کر سامنے بنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ لشمعل انہیں وہاں ٹھاکر کمرے سے باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد رحمت بوا کمرے میں داخل ہوئیں۔ حسن کو دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کیا۔ مہک

بھی کہیں، ابھی بھی شہروں اور گاؤں کی زندگی میں بہت فرق ہے۔ بہت خالص ہے یہاں کی دنیا۔“ ”مہک محسن کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر پگڈنڈی پر چلتی ہوئی مسلسل بولے جا رہی تھی۔

”ویسے آپ لوگوں کو گاؤں کی ساری زمین نہیں پہنچی چاہیے تھی۔ کم از کم ایک گھر تو بناتے۔ کبھی کبھار ہی سہی یہاں آکر رہتے ہم لوگ۔“ ”مہک نے افسردگی سے کہا۔

”یہ اس وقت کی بات ہے جب میں بہت چھوٹا تھا۔ اہل بتائی ہیں کہ ہمارے اچھے مستقبل اور تعلیم کے لیے تباہیو اور ابانے اچانک گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر ان کی دیکھا دیکھی اور بھی رشتے دار یہاں سے کوچ کر گئے مگر ابھی بھی کچھ خاندان ہیں جو اپنی مٹی سے جڑے ہوئے ہیں۔ دراصل گاؤں سے شہر میں سیٹھ ہونے کے لیے ایک مناسب سرمائے کی ضرورت تھی۔ اس لیے سب کچھ بیچنا پڑا۔ ویسے ایک بات تو بتاؤ، اگر میں گاؤں میں ہی پلا بڑھا ہوتا تو کیا تب بھی تم اس رشتے کے لیے ہابی بھرتیں۔ کیونکہ شہر کے لوگوں کو مستقل طور پر یہاں آکر رہنا بہت مشکل لگتا ہے نا۔“ حسن کے پوچھنے پر مہک ایک لمحے کے لیے سوچ میں ڈوبی پھر بولی۔

”شاید عام حالات میں میرا جواب نفی میں ہوتا، مگر میں ایک بات پر یقین رکھتی ہوں کہ آپ کی قسمت آپ کو کہیں بھی لے جاسکتی ہے۔ اس لیے بڑے بول بولنے سے ہمیشہ اجتناب کرنا چاہیے۔“ ”مہک کے جواب پر حسنین کی آنکھوں میں سناسنش کے رنگ ابھرے تھے۔

”کل صبح ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ آپ مجھے رحمت بوا کے گھر تو لے کر نہیں گئے۔ چلیں ابھی چلتے ہیں۔“ ”مہک کے اچانک یاد دلانے پر حسن چونکا۔ پہلے سوچا کہ اسے ٹال دے، مگر پھر اہل کی ہدایت بھی یاد آگئی۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر یہاں سے تھوڑا دور ہے۔ تم اتنا چل لو گی؟“ حسن نے سوچتی نظروں سے اس کی طرف

رہ گئی۔

”رہشعل! اگر ڈال لے چاول لے کر آؤ۔ حسن کو میرے ہاتھ کے بنے ہوئے چاول بہت پسند تھے۔ آج بھی چاول بیاتے ہوئے تمہیں یاد کر رہی تھی اور تم آگئے۔“ رحمت بوا کے کہنے پر رہشعل اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”واہ! کیا نیلی پیتی ہے۔“ مک نے چڑ کر سوچا اور فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

”تمہیں خالہ! ہمیں بہت دیر ہو رہی ہے۔ وہ تو ماں نے کہا تھا اس لیے میں حسن کو مجبور کر کے یہاں لے آئی۔ حسن کو تو یاد بھی نہیں تھا آپ سے ملنا۔“

مک کی بات پر رحمت بوا کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ جبکہ دروازے کی طرف جانی رہشعل نے مڑ کر دیکھا تھا۔ حسن کی آنکھوں میں حیرت اور چہرے پر واضح شرمندگی تھی۔ اسے مک سے اس بات کی امید نہیں تھی۔

”چلیں حسن! تانگے والا کب سے انتظار میں کھڑا ہے۔“ مک نے جلدی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

”بیٹا! بارش ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر رک جاتے تو۔“ رحمت بوا نے سمجھانا چاہا، مگر مک رکنے پر تیار نہیں تھی اور برستی بارش میں بھاگتی ہوئی تانگے میں جا کر بیٹھ گئی۔ کوچوان نے بڑی شیٹ آگے کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ بارش سے محفوظ رہی تھی۔

”ماں! آپ آرام کریں۔ میں دروازہ بند کر کے آتی ہوں۔“ رہشعل نے ماں سے کہا، مگر وہ کھاسن کی طرف تھا۔ جیسے اسے جانے کا کہہ رہی ہو۔ حسن نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے کمرے سے باہر نکلے۔ صحن کے بیچ میں پہنچ کر حسن رہشعل کے ہاتھ پر رک گیا اور پلٹ کر دیکھا۔

”یہ آپ کی امانت۔ مجھے اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ رہشعل نے کالے رنگ کی چادر اس کی طرف بڑھائی۔ بارش دونوں کو بھگو رہی تھی۔ حسن نے

کے سر پر پار کیا اور کچھ نوٹ اس کی مٹھی میں تھا۔ بس۔ حسن اور مک نے بہت منع کیا، مگر رحمت بوا نے کہا کہ یہ میری طرف سے تحفہ سمجھ کر رکھ لو۔ حسن کو افسوس ہونے لگا کہ جلدی میں ان کے گھر خالی ہاتھ کیوں چلا آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد رہشعل گرم چائے کے ساتھ مختلف لوازمات کی ٹرے سجا کر چلی آئی۔

”اس کی کیا ضرورت تھی، ہم کھانا کھا کر گھر سے نکلے تھے۔ بس ماں نے خاص تاکید کی تھی کہ آپ سے ضرور مل کر آنا ہے۔ اس لیے آج فراغت ملتے ہی چلے آئے۔“ مک نے کہا تو رہشعل نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا تھا۔

”شہری لوگ چائے کے زیادہ شوقین ہوتے ہیں۔ اس لیے میں جلدی سے بنا کر لے آئی۔“

”بہت شکریہ۔“ مک نے متاثر لہجے میں کہا۔

”حسن بیٹا! بہت چپ چاپ ہو۔ ارے بیٹا بھول گئے۔ کبھی تم روزیہ ماں لے کر آئے ہو تو دھوڑتے تھے اور سارا سارا دن یہاں گزار دیتے تھے۔ تمہیں پتا ہے مک! یہ چھوٹا سا تھا جب۔“ رحمت بوا بھی ماں کی طرح مزے لے لے کر مک کو اس کے بچپن کا قصہ سناتے لگیں۔ مک چہرے پر مسکراہٹ سجائے سننے لگی۔ جب تک رہشعل کو نہ کھا نہیں تھا۔ مک کو اس قصے کو سن کر اچھا لگتا تھا، مگر آج رہشعل کو دیکھ کر وہ عجب سی بے چینی کا شکار ہو گئی تھی۔

”حسن سے صرف چار پانچ سال ہی تو بڑی ہے، یہ مگر دیکھنے میں مجھ سے بھی چھوٹی لگتی ہے۔“ مک کے دل میں عجیب سے وسوسے سر اٹھانے لگے تھے۔

”مجھے خبر ملی تھی کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ گاؤں آئے ہوئے ہو۔ اس دن سے ہم دونوں ماں، بیٹی تم لوگوں کی آمد کے منتظر تھے۔“ رحمت بوا نے سادگی سے کہا۔ مک نے ایک تیکھی نظر سر جھکائے بیٹھی رہشعل پر ڈالی۔

”اسی لیے نام پوچھہ بغیر ہی دروازہ کھول دیا تھا محترمہ نے۔“ مک اپنی سوچ پر غصے سے پہلو بدل کر

کرن

اگست 2017 کا شمارہ شائع ہو گیا

کرن کا دسترخوان

ایک شمارہ کرن کے ساتھ مفت مضمون کریں

• ”دیباغہ نمبر 14 اگست“ علق فضیات سے شایین

رشید کا پورے

• ”کبریٰ فاطمہ خاتون“ سے شایین رشید کی ملاقات،

• اداکارہ ”علیہ علیہ“ کتھان ”میری بھی سنے“،

• اس ماہ ”عاصمہ علیہ السلام“ کے ”مقابل ہے آئینہ“

• ”من موزیک کی بات نہ کرو“ آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول،

• ”زلزلہ“ خلیلہ ریاضی کے سلسلہ وار ناول

• ”ہوا کی رخ بدل گئیں“ گوشت عبد اللہ کا جلد آنے

والا سلسلہ وار ناول،

• ”مہجور لکھن“ مصباح علی سید کا مکمل ناول،

• ”روشن صبحیں، خوشگوار شامیں“ صائمہ اقبال

کا مکمل ناول،

• ”طلال“ فیملہ امیر لہجہ کا دلچسپ ناول،

• ”بیلا“ فضا حسن علی کے ناول کی آخری قسط،

• ”نیم کاٹو“ فزاہ جلیل راؤ کا ناول،

• طیبہ ناصر مغل، شمس فاطمہ اور یحییٰ اختر کے

افسانے اور مستقل سلسلے

نا کبھی سے ہاتھ آگے بڑھایا۔ جیسے ہی اس نے چادر
تھاں اس کے ذہن میں ایک گوند اسالپکا۔ اس نے عورت
سے دیکھا یہ وہی چادر تھی جو کچھ دیر پہلے رشمال
نے اوڑھی ہوئی تھی۔ مگر یہ چادر مردانہ تھی اور۔۔
حسن آہستہ آہستہ قدم اٹھا تا دروازے کی طرف بڑھا۔
بارش کی بوندیں سرخائیتوں کے بنے فرش پر تلج رہی
تھیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا
چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا، چادر اس
نے اپنے کندھوں پر ڈال لی تھی۔ ایک عجیب سے
احساس نے اسے گھیرا تھا۔ اسی خوشبو سے کسی یاد کا در
کھلا تھا۔ اس کے ذہن میں کئی سال پہلے کی ایک ایسی
ہی شام پر سات کی تیز جھڑی میں بھیتے دو سائے لہرائے
تھے وہ چوٹا تھا۔

اسے یاد آیا۔

جب آخری بار وہ لبا کے کسی عزیز کی فون کی پر گاؤں
آیا تھا۔ تو رحمت ہوا سے ملنے ان کے گھر بھی آیا تھا۔
تب رحمت ہوا کے کہنے پر رشمال کو لینے اس کی
سہیلی کے گھر گیا جو دو گلیاں چھوڑ کر تھا۔ اس دن صبح
سے موسم کے پتور خطرناک تھے۔ حسین کو یاد آیا کہ
واپسی پر بہت تیز بارش شروع ہو گئی تھی۔ جس سے
بچنے کے لیے وہ ایک چھپر کے نیچے کھڑے ہو گئے تھے۔
اس دوران ہی رشمال کا پاؤں پھسلا تھا اور اس سے
پہلے کہ وہ کچڑ میں گرئی، حسن نے ہاتھ پکڑ کر اسے
سنبھال لیا۔ چھوٹی موٹی سی رشمال، لمبے چوڑے
سے حسن کے سامنے چھپ سی گئی تھی۔ حسن نے
بارش کے پانی سے بچنے کے لیے اپنی کالی چادر اس طرح
تائی تھی کہ وہ دونوں پانی سے محفوظ رہ سکیں۔ بس کچھ
لمحوں کی بات تھی، مگر ان لمحوں نے رشمال کے دل
کی دنیا بدل دی تھی۔ واپسی کے سفر میں رشمال کالی
چادر کے حصار میں بہت گم صدم سی تھی۔ جبکہ حسن کو
گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔

رشمال کی خاموشی پر وہ بہت حیران ہوا تھا، مگر
رشمال نے کہا کہ اسے سردی لگ رہی ہے۔ حسن
اسے بحفاظت گھر پہنچا کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ مگر شاید

میں بچاؤ بننے میں لمحے بھر کی دیر نہیں لگاتی۔ کوئی بھی معمولی سالمہ کوئی بھی معمولی سی بات اسے بوجھ کے لیے اپنا اسیر بناتی ہے۔

کچی مٹی بھی پہلی بارش کی بوندوں سے مہکتی ہے اور عورت بھی اپنی زندگی میں آنے والے اس پہلے مرد کو کبھی بھی نہیں بھولتی جو اس کے دل کی بنجر زمین پر اپنے لمس سے محبت کے ان گنت پھول کھلاتا ہے۔ جس کی ہونے سے اس کے دل کی سوئی زمین کروٹ لے کر بیدار ہو جاتی ہے۔ پھر اس زمین سے اٹھنے والی خوشبو اس عورت کو کسی اور کا نہیں ہونے دیتی۔ کہ شرک تو محبت میں بھی نہیں ہے۔

مجھے آج بھی چھپرتے بارش کی اوٹ میں بھیگا وہ لمحہ یاد ہے۔ زندگی میں جب بھی اس لمحے کے سحر سے نکلی تو ضرور آگے کا بھی سوچوں گی۔

رہشمال کا اندازہ دو ٹوک تھا۔ حسن تھکے قدموں سے پلٹا۔ اسے وقت کی ستم ظریفی پر افسوس ہو رہا تھا۔ کہاں اگر اسے ”ہمکنی“ ملی تھی۔ جب پیچھے مڑنا آسان نہیں رہا تھا۔ زمانے کے دُر رسم و رواج کے پردے کے پیچھے اس نے اپنی ہر ممکن کوشش کی تھی اسے بھلانے کی، بچپن کی ایک معصوم خواہش سمجھ کر سر جھٹکنے کی۔ اس لیے تو خود سے بھاگتا وہ ہونی اور انہونی کے درمیان جھولتا رہتا تھا، مگر آج بھی اپنی جگہ جسم کھڑا تھا۔

حسن نے گھر کی دہلیز پار کی۔ تانگے میں بیٹھی مہک نے ہاتھ ہلا کر اسے متوجہ کیا۔ حسن نے کچھ لمحے خاموشی سے اسے دیکھا اور پھر پلٹ کر شیڈ کے نیچے کھڑی رہشمال کو۔

عورت اپنی زندگی میں آنے والی پہلے لمس کو کبھی نہیں بھولتی۔

تو مرد بھی اپنے دل کی زمین پر برسنے والی پہلی بارش کو کبھی نہیں بھولتا۔ پھر کتنے ہی ساواں آتے اور جاتے رہتے ہیں۔

وہ بارش میں بھیگ رہا تھا، مگر اس کا اندر ایک مدت سے سوکھا رہا تھا۔

کبھی نہ جانے کے لیے حسن فوراً پلٹا اور بھاگتے ہوئے شیڈ کے نیچے کھڑی رہشمال کے پاس آیا۔

”آپ نے آج تک شادی کیوں نہیں کی؟ کیا انور بھائی کی بے وفائی کی وجہ سے؟“

رہشمال نے ایک نظر اٹھا کر بارش میں بھیگتے حسن کو دیکھا تھا۔ ”انور جیسا عام اور کم ظرف مرد میرے جیسی عورت کی وفا اور محبت کے قابل نہ پہلے کبھی تھا اور نہ ہی آج ہے۔“

”تو پھر؟“ حسن بضد تھا کچھ جاننے کے لیے۔ ”تو پھر کیا؟“ مٹی کی سوندھی خوشبو آ رہی ہے۔ تا۔ رہشمال نے فضا میں پھیلی خوشبو کو اپنی سانسوں میں اتار لیا تھا۔

حسن نے پاس ہی موجود کیاری میں جمع ہوتے بارش کے پانی کو دیکھا تھا۔

”آج صبح بتاؤ کہ کچی مٹی بوجھ بارش کی پہلی بوندوں سے ہی کیوں مہکتی ہے؟ اس کی سوندھی سوندھی خوشبو میں کیسا فرحت بخش احساس ہوتا ہے، مگر پھر بعد میں آنے والا ساواں اسے یا تو کچھ بڑبڑاتا ہے یا پھر مٹی پانی کے سنگ بہتی کہیں دور نکل جاتی ہے، مگر وہ پہلی بارش کا لمس وہ احساس بوجھ ہی کیوں محسوس ہوتا ہے۔“ رہشمال نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا تھا۔

حسن کو اس لمحے وہ بھی پہلی بارش کی طرح لگی تھی۔ خود میں ہی سمٹی ہوئی، اپنی خوشبو سے ہی مہکی ہوئی سی۔ اس کے ارٹاکاز کو رہشمال کے نرم لہجے کی پھوار نے چھوا تھا۔

”پھر بہت عرصے کے بعد میں نے جانا تھا کہ محبت کا رشتہ وہ ہوتا ہے جو دل کے تاروں سے بنتا ہے۔ جو دل کے تاروں سے کسی کو جوڑ دیتا ہے، بغیر کئے بغیر کچھ نے پھر یہ راز مجھ پر منکشف ہوا کہ۔“

عورت اور مٹی ایک ہی جیسی ہیں۔ ایک ہی اجزائے تربیعی ہوگی ان کی یا شاید عورت کی مٹی زیادہ حساس یا وفا شناس ہوتی ہے۔ اس لیے تو عورت محبت

حسن نے پہلی بار زندگی سے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا اور ہلٹ گیا۔ مکہ نے ٹھکی سے منہ پھیر لیا تھا۔ اس بارش میں اس کے آنسو بھی شامل تھے۔ جن سے حسن انجان نہیں تھا۔ مگر وہ فیصلہ کر چکا تھا اور مرد ایک بار فیصلہ کر لے تو پیچھے نہیں ہٹتا۔ اس نے تانے میں بیٹھی مکہ کے نرم ہاتھ تمام کر تلی دی تھی۔ مکہ نے روتے ہوئے اپنا سر اس کے کندھوں پر ٹکا دیا تھا۔ جس ہوئی کا خوف اسے بجھنے تین سال سے تھا۔ وہ گھڑی آج سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ جس کا سامنا اسے ہر حال میں کرنا ہی تھا۔ ہر حال حسن نے اسے جو عزت اور مان ہمیشہ دیا تھا۔ اسے اس کا پاس بھی رکھنا ہی تھا۔



دشمل نے تیز بارش کے اس پار اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ پانی کی چادر اس کی بینائی کی راہ میں رکاوٹ ڈال رہی تھی، مگر آج وہ بارش سے ناراض نہیں ہوئی تھی۔ یہ بارش ہی تھی جس نے اسے محبت کا سہلا مس عطا کیا تھا اور یہ بارش ہی ہے جس نے آج کسی کے عشق کا تاج اس کے سر پر سجایا تھا۔

”بارش تو رحمت ہوتی ہے اور بھلا رحمت سے بھی کوئی ناراض ہوتا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے دروازہ بند کیا۔

کچے آنگن کے وسط میں، سرخ اینٹوں کے بنے فرش پر دونوں ہاتھ پھیلا کر وہ گول گول گھوم رہی تھی۔ آسمان سے برستی بارش زمین کے سب ہی منظروں کو بھگور رہی تھی۔

اور محبت کی بارش، دل کی زمین پر برستی غواہوں کی قوس قزح سے سب منظر سجا رہی تھی۔

بارش کے اس پار بھی زندگی بھیک رہی تھی اور بارش کے اس پار بھی۔۔۔

وہ اس لمحے جان گیا تھا کہ بارش کے اس پار کھڑی، محبت کی خاموش بچان اس کا ”عشق“ تھی۔ وہ اس کے دل کی وہ پہلی بارش تھی جو عشق کا روپ لیے، ہر موسم میں دل کی غیر زمین پر برستی رہتی تھی۔ بارش کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ مکہ اسے آوازیں دے رہی تھی۔ حسن نے موسلا دھار بارش کے اس پار سے دشمل کو کھاتے ہوئے دروازے کی طرف آتے دیکھا۔ دروازہ بند کرنے کے بجائے وہ اس کے جانے کا انتظار کرنے لگی۔ یہ بھی محبت کے اصولوں میں سے ایک اصول تھا کہ جب تک محبوب نظر آتا رہے اسے دیکھتے رہنا۔ حسن مضبوط قدم اٹھانا آگے بڑھا۔ دشمل ڈر کر پیچھے ہوئی۔ مکہ نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ کچھ ایسا تھا اس لمحے میں جس کا سامنا کرنے سے وہ تینوں ڈر رہے تھے۔

حسن نے اپنے کندھے سے کالی چادر اتار کر، دشمل کے سر ڈالی تھی۔ ایک لمحے کے لیے پیچھے اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھی۔ مکہ کے شک نے یقین کا لبوہ اوڑھ لیا تھا۔ دشمل حیرت سے نگاہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ پیچھے جھوٹے سے جھانکتی رحمت بوا کی آنکھوں میں مدت بعد خوشی کے آنسو چمکے تھے۔ بیٹی محبت کے لوگ میں ایک مدت سے جو مگر بنی ہوئی تھی وہ جانتی تھیں، مگر مجبور تھیں کہ محبت کے جوگ یا تو مٹی میں لے جاتے ہیں یا مٹی بنادیتے ہیں۔

”ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ مرد کے دل کی زمین بھی مٹی سے بنی ہوئی ہے۔ جس پر برسنے والی محبت کی پہلی بوندیں اسے بھی ہمیشہ مہکا لی رہتی ہیں۔ بات صرف محسوس کرنے کی ہوتی ہے اور مجھے اعتراف ہے میں نے اسے جاننے میں کچھ دیر کر دی، مگر شکر ہے کہ بہت دیر نہیں ہوئی۔ تھوڑا وقت لگے گا، واپسی کے سفر میں۔ مگر وعدہ رہا۔ لوٹوں گا ضرور۔ کیونکہ اب کی بار میں بارش کے اس پار اپنا عشق چھوڑے جا رہا ہوں۔“ اور عشق تو سونے دار بھی نچاتا ہے۔ یہ تو پھر در جاہل تھا۔

خوشبو صحرایِ عسکری

بہت عزیز تھا۔ اونچی چھتوں والے کھلے کمرے،
رتھن کشیشوں والے دروازے کھڑکیاں، دونوں
اطراف برآمدے، لان اور اوپر کی منزل کی کشادہ
بالکونیاں جن پر لگی چنبیلی کی گھنٹی جیلیں فضا کو ہمہ وقت
مرکائے رکھتی تھیں۔

اطلاعی پتلی کی تیز آواز نے ہم سب کو ہی چونکا دیا۔
”اف توبہ، یہ اس وقت کون آگیا۔“ میں نے ہزار
بار کی بڑھی ہوئی ”ایس ان ونڈر لینڈ“ کو بند کرتے
ہوئے کوفت سے سوچا۔

بچوں کے لیے لکھا گیا عالمی ادب ہمیشہ سے ہی میری
کمزوری رہا ہے۔ ان دیکھی دنیاؤں کی سیر کراتے یہ

اس دن بہت گرمی تھی۔ شام ڈھلے کچھ ٹھنڈک
ہوئی تھی پھر رات کو تو ٹھنڈی ہوا بھی چلنے لگی تھی۔
حالات کو زیادہ نہیں ہوا تھا، شاید نو ساڑھے نو بجے
تھے۔ لیکن سائے کی وجہ سے لگتا تھا کہ بہت رات
بیت گئی ہے۔

ہم سب اس وقت بڑے ہال میں لیٹے اپنے اپنے
مشاغل میں گم تھے۔ ہمارا یہ ہال بیک وقت میٹنگ روم
ڈائننگ روم اور بی بی لافنج کا کام دیتا تھا۔
قدیم طرز کا درختوں میں گھرا ہوا ایانا بگھر ہم سب کو

نافولٹ



ناچار اٹھنا ہی پڑا، کیونکہ ابابو پر اپنی اسٹڈی روم میں تھے اور چچا پچھلے کمرے میں دوستوں کے ساتھ مصروف تھے۔

”اسد! پوچھے بغیر دروازہ نہ کھول دینا۔“ امی سے رہا نہ گیا اور وہ اسد کے پیچھے پیچھے برآمدے تک پہنچ گئیں لیکن وہ شاید گیٹ کھول چکا تھا کیونکہ ایک دم ہی کچھ ملی جلی آوازوں نے مجھے بھی کتاب چھوڑنے پر مجبور کر دیا

بریلوں، شنائدوں، جادو گروں، بونوں اور پھیروں کے کردار میرے لیے جادوئی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ سب میرے بچپن کے ساتھی ہیں۔ آج بھی جب کہ زندگی دھواں اڑاتی ٹرین کی طرح بھاگی چلی جا رہی ہے، میں کچھ نہ کچھ وقت نکل کر انہیں ضرور پڑھتی ہوں۔ یہ مجھے بہت متاثر کرتے ہیں۔

اس دفعہ انٹرکام کی ٹون بھی بجنے لگی۔ سو اسد کو



تھا۔ کچھ حیرت اور خوشی میں ڈوبی ہوئی آوازیں تھیں۔
میں ہال کے دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ امی اور
اسد کی معیت میں تین اجنبی چہرے دکھ کر ٹھٹھک گئی۔
”ارے یہ نازی ہے نا؟ ماشاء اللہ کتنی بڑی ہوئی
ہے بالکل تمہاری تصویر ہے فرخندہ۔“ سب سے
آگے آتی ہوئی خاتون نے مجھے گلے لگاتے ہوئے امی
سے کہا۔

”بالکل ٹھیک پہچانا آپ نے مومنہ آپ۔“ امی کے
لبے میں بے پناہ خوشی تھی۔
”ظہیر بھائی آپ اطلاع کر دیتے تو کوئی آپ کو
اسٹیشن لینے چلا جاتا مگر تلاش کرنے میں کتنی دقت
ہوئی ہوگی آپ کو۔“

امی اب مومنہ آپا کے ساتھ آنے والے صاحب
سے مخاطب تھیں۔

اب کسی تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ میں
اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ یہ مومنہ خالہ ہیں۔ امی کی
اکٹونی ماموں زاد بہن، جو کہ کراچی میں رہتی تھیں جن
سے ہم عاتمانہ طور پر تو متعارف تھے لیکن کراچی اور
لاہور کے فاصلے کی وجہ سے کئی سالوں سے ملنے کا اتفاق
نہیں ہوا تھا۔

ان کے ساتھ خالو ظہیر کے علاوہ ایک اور ہستی بھی
تھی جو اس وقت میری ساری دلچسپی کا مرکز تھی یہ رنی
آپا تھیں۔ مومنہ خالہ کی اکٹونی صاحبزادی۔ بلا کی
حالیہ بیت تھی ان کے سراپے میں۔ اتنی چمکدار سنہری
رنگت جیسے۔ میرے ذہن میں کوئی تشبیہ نہیں آ رہی
تھی جیسے تازہ شدیا گندم کا خوشہ، دوسری نمایاں چیز ان
کی آنکھیں تھیں۔ دوستانہ چمک لیے ہوئے گہری کالی
آنکھیں جن کا کھنی پلکوں نے احاطہ کیا ہوا تھا۔
سیدھی مانگ کے ساتھ لمبی سی چوٹی ان کے چہرے کا
بہت معصوم تاثر دے رہی تھی۔

لمحے بھر کے لیے تو وہ مجھے اپنی کسی پڑھی ہوئی کہانی
کا کردار ہی لگیں۔

”نازی، چلو اٹھو کھانا نکالو اور اسد تم اپنے لبا کو اوپر
اسٹنڈی روم میں مومنہ آپا کے آنے کی اطلاع دو۔“ امی

کی آواز نے میری محویت کو توڑا۔

”نہیں فرخندہ! کھانا تو ہم ٹرین میں کھا چکے ہیں
اب تو نازی بیٹا تم گرام گرم چائے پلا دو۔“ امی کی بات
ختم ہوتے ہی مومنہ خالہ بول پڑیں۔

”آپا! کھانا بھلا ٹرین میں کیوں کھایا، جب یہاں
میرے پاس آ رہی تھیں۔“ امی نے پار بھری ناراضی
دکھائی تو مومنہ خالہ اور خالو ظہیر دونوں ہنس پڑے۔

”ارے بھئی اپنے ہاں ٹرینوں کے ٹائم کا کوئی اندازہ
نہیں کر سکتا، صحیح وقت پر پہنچا دیں گی یا کئی گھنٹے لیٹ
ہو جائیں گی، سو اسی لیے ہم سات بجے کھاپی کر فارغ
ہو گئے اور اب پورے ایک ہفتے یہاں رہوں گی
تمہارے پاس۔“ مومنہ خالہ نے محبت سے کہا۔

میں چائے کے لیے اٹھی۔ تو رنی آپا بھی میرے
ساتھ بچن میں چلی آئیں۔ ذرا ہی دیر میں وہ مجھ سے
بے تکلف ہو گئی تھیں بلکہ یہ کہہ گئیں کہ میں ان سے
بے تکلف ہو گئی، جو کہ خاصی حیران کن بات تھی
کیونکہ میں جلد ہی نئے لوگوں کے ساتھ گھلتی ملتی
نہیں۔ اس کا سارا کریڈٹ رنی آپا کے حذر درجہ دوستانہ
رویے کو جاتا تھا۔

میں نے شامی کباب تلنے کے لیے فرانی بین میں
رکھے اور ڈیمر لوازمات کے لیے ٹرائل سیٹ کرنے لگی۔
رنی آپا میرے منہ کرنے کے باوجود مسلسل میری مدد
کر رہی تھیں۔ ہم دونوں نے ذرا سی دیر میں ایک
دوسرے کے متعلق اچھا خاصا جان لیا تھا۔

وہ چند سال قبل گریجویشن کرنے کے بعد ایک
گرامر اسکول میں پڑھا رہی تھیں۔ جواباً میں نے بھی
فخر سے اپنے بی ایس سی فائنل کی اسٹوڈنٹ ہونے کی
اطلاع انہیں دی۔

”بس رنی آپا اب آپ بیٹھ جائیں۔“ میں نے
قریبیہ اسٹول انہیں دیا اور چائے دم پر رکھنے لگی۔

”ارے ٹرین میں بیٹھے بیٹھے ٹانگیں دکھ گئی ہیں
کھڑے رہنے میں زیادہ مڑا آ رہا ہے۔“ وہ مسکراتی
ہوئی بچن کے پچھلے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو
گئیں۔

تھا۔ ”وہ سر جھکا کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئے تو رنی آپا حقیقتاً ”گڑبڑا گئیں۔“

”نازی میں اندر جارہی ہوں۔ شاید امی آواز دے رہی ہیں۔“ وہ میرا جواب سنے بغیر چھپاک سے کچن سے باہر نکل گئیں۔

”بہت بری بات ہے اشو چچا، آپ نے انہیں کنفیوژ کر دیا، کیا سوچیں گی بھلا وہ آپ کے بارے میں۔“

”ارے وہ کیا سوچیں گی، فی الحال تو انہوں نے ہمیں سوچ میں ڈال دیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اشو چچا نے بھی دروازے کا رخ کیا تو مجھ سے رہانہ گیا۔

”آہم۔۔۔ خیر تو ہے۔ آپ کو بھی بڑی جلدی ہے، کچھ کچھ دال میں کالا ہے کیا؟“ میں جوان کی پیشہ سے لاڈلی اور بقول امی کے ”سر چڑھی“ جیسی تھی، کیسے پنپ رہ سکتی تھی۔

”جب کچھ کالا پیا نظر آئے گا تو ضرورتاً دس گے، فی الحال تو روشنی اتنی تیز ہے کہ نظریں خیرہ ہوئی جارہی ہیں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے دروازے پر رک ٹکر مارا اور باہر نکل گئے۔

موقع بے موقع ہوئی قلعے بنانے کی عادت نے اس وقت بھی مجھ پر شدت کے ساتھ حملہ کر دیا تھا، سوڑائی کے ساتھ بال تک پہنچنے پہنچنے میں مستقبل کے کئی منظر اپنے پسندیدہ رنگوں سے سماجی تھی۔



اگلی صبح بڑی ہنگامہ خیز تھی۔ امی نے صبح ہی سب رشتے داروں کو فون پر مومنہ خالہ کے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ لہذا آگیا رہ بجے سے ہی مہمانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا سب سے پہلے آنے والوں میں ماموں جان کی فیملی تھی۔

”جیسے ہی مومنہ کے آنے کا سنا، فوراً ہی دوڑی چلی آئی ہوں۔“ مامی جن سے اپنے بھاری بھر کم وجود کے ساتھ چلتا پھرتا بھی دو بھر تھا ان کے منہ سے دوڑنے کا ذکر سن کر مجھے اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔

یہ دروازہ پچھلے لان کی طرف کھلتا تھا۔ دو تین میٹر چھیاں نیچے آ کر یہ چھوٹا سالان امی کے شوق اور محنت کی بدولت سارا سال پھولوں سے لدا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک کمرہ بھی تھا جو باہر کی طرف دائیں ہاتھ کی گلی میں کھلتا تھا۔ گھر سے الگ تھلک ہونے کی بنا پر اشو چچا اپنے دوستوں کو زیادہ تر وہیں بٹھاتے تھے۔ ایک طرح سے وہی ڈرائنگ روم تھا۔

”میں پہلے کبھی کراچی سے باہر نہیں گئی اس لیے ٹرین کے سفر کی عادت نہیں ہے۔“ وہ سادگی سے بولیں۔ تو میں سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کون کہتا ہے کہ بڑے شہروں میں مقصومیت غنقا ہوتی جارہی ہے۔ یہ تو قدرت کا دیولت کر رہا جو رہے جو کہیں بھی پایا جاسکتا ہے۔

ان کی بات بمشکل ختم ہوئی تھی کہ اچانک پیچھے کا دروازہ ڈور سے کھلنے پر وہ بری طرح لڑکھڑا گئیں۔

”ارے نازی! یہ دروازے کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔“ اندر داخل ہونے والے اشو چچا تھے۔ جن کی نظر جملہ پورا کرتے کرتے رنی تیار پڑ چکی تھی۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ وہ لمحے بھر کے لیے کچھ کھو سے گئے تھے لیکن یہ صرف ایک پل کے لیے تھا وہ فوراً ہی خود کو سنبھال چکے تھے۔

”سوری! آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔ حالانکہ اصولاً تو یہ سوال آپ کو کرنا چاہیے تھا۔“ ان کی فطری شوخی لوٹ آئی تھی۔

”جی وہ میں نازی چائے بن گئی کیا؟“ رنی آپا اس حملے کے لیے قطعی طور پر تیار نہیں تھیں۔

”اشو چچا، یہ رنی آیا ہیں۔ میرا مطلب ہے ریفہ، کراچی والی مومنہ خالہ کی بیٹی، دراصل پہلی دفعہ یہاں آئی ہیں نا، اسی لیے آپ پہچان نہیں سکے۔“ میں نے اس طرح سے تعارف کرایا جیسے میں تو برسوں سے رنی آپا سے واقف تھی۔

”یقین کیجئے، اپنی اس بے خبری پر شرمندہ ہی نہیں رنجیدہ بھی ہوں۔ باقی داوے، آپ نے آنے میں اتنی دیر کیوں کر دی۔ آپ کو تو بہت پہلے یہاں آ جانا چاہیے

جو گھر یلو سکون قائم رکھنے کے لیے زندگی بھر اپنے وجود کی کرجیاں سمیٹتے رہتے ہیں، چاہے انگلیاں گنتی ہی نگار ہو چکی ہوں۔

”بیٹا نازی ہمارے لیے چائے اوپر بھجوا دینا۔“ ماموں جان نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور زینے کی طرح مڑ گئے کیونکہ ابا چھٹی کی وجہ سے آج گھر پر ہی تھے۔ ماموں جان چھٹی کا دن ان کے ساتھ اسٹڈی میں ہی گزارا کرتے تھے اور آج تو خالو ظہیر بھی تھے۔

”تم سناؤ، آخر اتنے برسوں بعد رشتے داروں کی یاد کیسے آگئی، تم تو عرصے سے سب کو بھلائے بیٹھی تھیں۔“ مامی کے لہجے میں وہ طعنت تھا جو اب کا خاصہ بن چکا تھا۔

اشوچا تو کہتے تھے کہ مامی کے شناختی کارڈ میں ان کی شناخت ”کات واراجہ“ ہی لکھنا چاہیے تھا۔

”بس بھابی! دل تو بہت چاہتا تھا لیکن کچھ تو کراچی کے حالات، کچھ میزا اپنا جوڑوں کا درد گن سب وجوہات کی بنا پر نکلنے کی ہمت ہی نہ ہوئی گوراب بھی رنی کے ابوالپنے بزنس کے سلسلے میں بدل آرہے تھے تو میں نے بھی پروگرام بنالیا۔“ مومنہ خالہ نے مامی کی جرح کے جواب میں صفائی پیش کی تو انہوں نے

بلے نیازی سے سر ہلادیا۔

یہ جو مای خود ہر دوسرے مہینہ کراچی کا چکر لگاتی ہیں اپنی بہن کے گھر کا بھلا آج تک گئی ہیں مومنہ خالہ کے گھر، لیکن میں یہ کہہ نہ سکی۔ صرف سوچ کر رہ گئی۔

”بیٹی کا کس رشتہ رشتہ ملے کیا؟ میری صائمہ سے تو پورے چھ مہینے ہڈی ہے رفیعہ۔“ انہوں نے ”چھ“ پر کچھ اس طرح زور دیا کہ آج چھ سال ہوں۔ میں نے شکر ادا کیا کہ رنی آنا ابھی ابھی کمرے سے باہر نکلی تھیں۔

”نہیں بھابی! تم بھی تو کبیں نہیں کیا اللہ مالک ہے جب اس کا حکم ہو گا ہو جائے گا۔“ مومنہ خالہ نے رمان سے کہا۔

”آپ تیسویں کی سنائیں خیریت سے تو ہے کوئی فون

ان کے پیچھے ہمیشہ کے خاموش طبع ماموں جان اور صائمہ باقی تھیں۔ انتہائی غریبی اور پرلے درجے کی شو باز۔ باوجود اس کے کہ وہ میرے اکلوتے ماموں کی صاحبزادی تھیں، میری ان کی کبھی انڈر اسٹینڈنگ نہ ہو سکی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے کبھی مجھے لفٹ کرانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی میں جوان کی اداؤں سے ویسے ہی خائف رہتی تھی اور ان سے چپتی چلی گئی۔

عجیب طبیعت پائی تھی صائمہ باقی نے، ہر کسی کو اپنے سے کم تر سمجھتا، ہر اچھی چیز پر اپنا تسلط جمانا ان کی عادت تھی۔ مامی نے لاڈ پھار اور ہر بات میں انہیں بے جا شہ دے کر بالکل ہی ناکارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ جب کہ ان کے برعکس تیمور بھائی یعنی صائمہ باقی کے اکلوتے بڑے بھائی، بہت ہی اچھی عادت کے مالک تھے۔ ملنسار، انتہائی حساس اور دوسروں کا خیال رکھنے والے۔

امی کہتی تھیں کہ تیمور بھائی بالکل ماموں جان کی کاپی ہیں، لیکن مجھے اس پر یقین نہیں آتا تھا۔ اس لیے کہ تیمور بھائی تو بولنے کے ایسے دھنی تھے کہ بات بات پر چلمچلنیاں چھوڑا کرتے تھے۔ جب کہ ماموں جان کو تو میں نے ضرورت کے وقت بھی دو لفظوں میں بات ختم کرتے دیکھا تھا۔ ہاں ایک شفیق سی مسکراہٹ ضرور ان کے چہرے کو گھیرے رکھتی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں ایک دفعہ جب چھوٹی خالہ انگلینڈ سے آئی ہوئی تھیں تو امی نے کیسے ایک ٹھنڈی سانس لے کر ان سے کہا تھا۔

”میرا ہیرے جیسا بھائی بیوی کی بد مزاجی اور پھوہڑ پن سے بالکل ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔“

اس وقت تو میں یہ بات سمجھ نہیں سکی کہ اچھا بھلا صحیح و سالم انسان کس طرح ٹوٹ جاتا ہے لیکن عمر کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے شعور آتا گیا تو یہ اور اک بھی ہوا کہ صرف شریف عورتیں ہی برے مردوں کے پلے بندھ کر ساری زندگی سزا کے طور پر نہیں گزارتیں۔ کئی گھرانوں میں ایسے شریف مرد بھی پائے جاتے ہیں

دیگر آیا۔ ”مائی ابھی یقیناً“ کچھ اور کہیں اسی لیے امی نے دانستہ طور پر تیمور بھائی کا ذکر جھڑا جو پچھلے چار مہینے سے اپنی کمپنی کی طرف سے کسی شارٹ کورس کے لیے چلایا گئے ہوئے تھے۔

”ہاں ہل خیر سے بالکل ٹھیک ہے رات ہی فون آیا تھا۔ ابھی آتے آتے دو ڈھائی گھنٹے جا میں گئے۔“ مائی کے جواب پر میں نے سکھ کا سانس لیا کہ مجھے معلوم تھا کہ اب اگلے ایک گھنٹے ان کا موضوع گفتگو کیا ہو گا۔

دوپہر کے کھانے میں ابھی خاصی دیر تھی۔ آج امی نے بہت اہتمام کیا تھا۔ میرے اور امی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود دینی آیا صبح سے ہی بلورچی خانے میں میرے ساتھ لگ گئی تھیں۔ وہ اتنی پھرتی سے کام کو سمیٹتی تھیں کہ مجھے حیرت ہونے لگتی۔ زکسی کو فتنے اور مرغ کرکھائی تیار ہو چکی تھی۔ فرانی مچھلی کے لیے مچھلی کو مسالا بھی لگا دیا تھا۔

”پلاؤ کھانے سے ذرا اور پہلے دم کریں گے۔“ یہ کہہ کر امی نے اپنی تیار کر کے رکھ دی تھی۔ لہذا اس وقت فراغت کا احساس ہو رہا تھا۔

چائے کے لوازمات کے ساتھ میں نے دوبارہ ہل میں قدم رکھا تو حسب توقع مائی کی تیز آواز گونج رہی تھی۔

”ارے لڑکیوں کی کیا کمی ہے، ایسے ایسے اونچے گھرانوں کی لڑکیوں کے پیغام آ رہے ہیں میرے بچے کے لیے کہ کیا بتاؤں، کیا مینیک، کیا سسرال، ہر جگہ لوگ آس لگائے بیٹھے ہیں، جہاں جاتی ہوں لوگ تو صبح میں بچے جاتے ہیں۔“ انہوں نے میرے ہاتھ سے گاجر کے حلوے کی پلیٹ لیتے ہوئے کہا تو میں سٹپا کر رہ گئی۔

”ارے بھائو میں جائیں یہ اور ان کے بیٹے، لو بھلا ہم تو اپنے گھر آنے والے ہر مہمان کی حسب توقع مہمان نوازی کرتے ہیں۔ یہ نہ جانے کیا کیا مطلب نکالتی ہوں گی۔“ میں اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔

”بڑے مقدر والی لڑکی ہو گی، جو میرے تیمور کی

دلن بنے گی۔ کس چیز کی کمی ہو گی اسے خیر سے آٹھ سیٹ چوڑیاں اور کڑے تو میں بڑا کر رکھ چکی ہوں۔ جھومر اور ٹیکا بھی جڑاؤ ہے۔ اس کی شادی ہوتے ہوئے دو چار سیٹ اور بن جائیں گے ان شاء اللہ۔“

تیمور بھائی کی ہونے والی دلن کے زیورات کی تفصیل مجھے گزشتہ کئی برسوں سے اذیر ہو چکی تھی۔

”اللہ مبارک کرے“ آپ کو اپنے بچوں کی خوشیاں دکھائے، کب تک ارادہ ہے تیمور کی شادی کا۔“ مومنہ خالہ نے بڑے خلوص سے پوچھا۔

”پہلے کوئی ڈھنگ کی لڑکی تو نظر آئے، میں تو دیکھ دیکھ کر ٹھک چکی ہوں۔ تپتے ہی ملنے والوں سے کہہ رکھا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اچھی لڑکیاں تو ساری بیانی گئی ہیں۔“ انہوں نے نہایت احقانہ بات کی تو میں غصے کے باوجود ہنس بڑی۔

”یہ ڈھنگ کی لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں مائی۔“

”ارے بیٹا، یہی کہ ناک نقشہ اچھا ہو، پاپ بھائی کھاتے پیتے ہوں۔“ وہ باتوں کے ساتھ ساتھ خود بھی کھانے پینے سے پورا انصاف کر رہی تھیں شاید اسی لیے کھانے بنے پر زور تھا۔

”یہ اشتر گماں ہیں، کیا ابھی تک سو کر نہیں اٹھے۔“ صائمہ بائی نے بے زار سے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ وہ اشو چچا کی غیر موجودگی میں اسی طرح منہ بنائے بیٹھی رہتی تھیں۔

”جاؤ اسد، جا کر اٹھاؤ انہیں۔“ میرا جواب سنے بغیر وہ اسد سے مخاطب ہوئیں۔ لہجے میں بڑا استعجاب تھا۔ اشو چچا میں صائمہ بائی اور مائی کی دلچسپی ہم لوگوں سے دھکی چھپی نہیں تھی۔

”ارے نہیں بیٹا، سوئے دو اسے، ایک چھٹی کا دن ہی تو غریب کو ملتا ہے آرام کے لیے، نہیں تو صبح کا نکلا رات گئے تک مصروف رہتا ہے۔“ امی کو ہم سب سے زیادہ اشو چچا کا خیال رہتا تھا۔

امی جب — بیابہ کر آئیں تو اشو چچا بہت کم عمر تھے۔ یعنی صرف چار سال کے، امی ان کی سگی بچا زاد بہن بھی تھیں۔ پھر میں بھی امی کی شادی کے ٹھیک

ساڑھے چار سال بعد پیدا ہوئی۔ اس طرح طویل عرصے تک اشو چچا کمرے اٹھوتے بچے بنے رہے۔

میری سیدائش سے پہلے دادا جان اور دادی جان کے یکے بعد دیگرے انتقال سے اشو چچا امی کے بہت نزدیک ہو چکے تھے۔ امی کو ان سے والہانہ محبت تھی۔

ان کے اچھے بھلے نام اشعر کو بھی امی کی محبت نے ہی مختصر کر کے اشو کر دیا تھا۔ اب جب کہ وہ چند سالوں سے اپنا ایم بی اے مکمل کر کے ایک ملائی پینسل کمپنی میں ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔ امی کے نزدیک اسد فیضی اور مجھ سے کہیں بڑھ کر اہمیت رکھتے تھے اور وہ تو خیر امی، ابا اور ہم تینوں پر جان لٹاتے ہی تھے۔

”رہی تبا! آپ کے پال ماشاء اللہ کتنے خوب صورت ہیں اور سیدھی مانگ بھی آپ پر کتنا سوٹ کرتی ہے۔“ میں نے فوراً ”زور سے گما گونکہ میں نوٹ کر رہی تھی کہ صائمہ بائی رنی آپا کو مسلسل نظر انداز کر رہی ہیں۔“

”بھئی مجھے تو بڑی الجھن ہوتی ہے لمبے بال دیکھ کر“ آواہا دن تو ان کو سلجھانے میں لگ جاتا ہے اور نہ ہی کوئی خاص ہیئر اسٹائل بن سکتا ہے۔“

صائمہ بائی اپنے سامنے کسی اور کی تعریف بھلا کیسے برداشت کر سکتی تھیں۔

”ایسے تو نہ کہیں صائمہ بائی، جو حسن لمبے بالوں میں ہے وہ ہمارے ان چھوٹے چھوٹے بالوں میں کہاں۔“ میں نے مصنوعی ٹھنڈی سانس بھری۔ اب میں ان سے اختلاف رائے کا مزہ لینے لگی تھی۔

”کس کے حسن کا ذکر ہو رہا ہے بھئی ہم بھی تو سنیں۔“ اشو چچا کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام، بھئی بڑی محفل جی ہوئی ہے۔“

انہوں نے مای وغیرہ کی طرف رخ کیا۔ صبح ٹھہ کر سب کو سلام کرنے کی روایت کو ہم نے اپنے گھر میں پوری طرح قائم رکھا ہے۔ امی کہتی ہیں اس طرح سارا دن گھر میں سلامتی اور برکتوں کا نزول جاری رہتا ہے۔

”شکر ہے آپ اٹھے تو سہی“ میں تو بور ہو گئی تھی۔ ”صائمہ بائی نے بڑی نزاکت سے کہا۔“

”اٹھا، صائمہ جی بھی آئی ہیں، زبے نصیب، زبے نصیب۔“ کچھ کہہ کر کیا حال چال ہے۔ ”اشو چچا نے اس طرح چونکنے کی ایکٹنگ کی جیسے ان کی ابھی ابھی صائمہ بائی پر نظر پڑی ہے۔“

”ہم تو اکثر یاد کر لیتے ہیں، آپ نے ہی تیمور بھائی کے جانے کے بعد ہمارے گھر میں قدم نہیں رکھا ہے، فون کرو تب بھی آپ نہیں ملتے۔“ صائمہ بائی اپنی اس پذیرائی پر نبال تھیں۔

”آرے آپ فون پر ملنے کی بات کرتی ہیں، ہم تو کل سے خود اپنی تلاش میں ہیں۔“ دو سرافقہ خواصا دھیرے سے کہا گیا تھا۔ لیکن رنی آپا کا چہرہ گلابی پڑتا جا رہا تھا۔ نظروں کا مرکز بھی تو وہی تھیں۔

”میں تو آج سخت بور ہو رہی ہوں،“ اشو چک کا پروگرام رکھ لیتے ہیں۔ ”اب صائمہ بائی پوری طرح موڈ میں آچکی تھیں۔ پہلے والی بے زاری کا میں نام و نشان نہیں تھا۔“

”ہاں ہاں ضرور، آخر ہمیں اپنے مہمانوں کو بھی تو سیر کرانی ہے اپنے شہر کی، کیوں رفیعہ! آپ بھی تو کچھ رائے دیں۔“ وہ براہ راست رنی آپا سے مخاطب ہوئے تو وہ جو خاموش بیٹھی سب کی باتیں سن رہی تھیں دھیرے سے مسکرا دیں۔

”میں کیا بتاؤں، آپ کا شہر ہے۔“ میں نے محسوس کیا تھا کہ رات کی بہ نسبت اب وہ خاصی پُر اعتماد تھیں۔ رات شاید ایک دم نئے ماحول اور نئے لوگوں کی وجہ سے وہ کچھ کنفیوژ ہو رہی تھیں لیکن اب وہ بالکل پُر سکون تھیں۔ حتیٰ کہ صائمہ بائی کی خود پسند اور تکلیف دہ شخصیت بھی ان پر زور برابر اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ ہاں ایک حجاب ان کی شخصیت کا حصہ ضرور تھا۔ جو ان کی آنکھوں سے بات چیت سے اٹھنے بیٹھنے سے غرض کہ ان کی ذات کے ہر رنگ میں نمایاں تھا۔

یہ حجاب بھری خود اعتمادی مجھے بہت پیاری لگ رہی تھی اور کسی اور کو شاید مجھ سے بھی زیادہ۔

ابی اور اباتوان کے گرویدہ۔ ہو چکے تھے اسد اور فیضی بھی رنی کاپیہ رنی کیا وہ کی گردان جاری رکھتے تھے۔ چند دنوں میں ہی ایسا لگتا تھا کہ وہ ہمارے گھر کی اہم فردین چکی ہیں۔

”کیا ہوا تمہارا ایک ابھی تک بتائیں۔“ اسد نے چوتھی بار کچن میں آکر جھانکا۔

”جب بن جائے گا تو تم تک بھی پہنچ جائے گا۔“ بے صبر این مت دکھاؤ“ میں نے اپنے دو سال بڑا ہونے کا فائدہ اٹھایا۔

”ویسے رنی کیا! آپ کو تو میرا رواں رواں دعائیں دے رہا ہے جو آپ کی بدولت ہمیں بھی کچھ کھانوں کی درائی نصیب ہو گئی، ورنہ یہ نازی تو آکو گوشت، بھنڈی گوشت، ٹوکڑی گوشت، ٹوزا کی بنی گوشت میں ڈال کر پکانے سے زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی۔“ وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔

”سچ کہہ رہا ہوں، آپ ابھی کچھ عرصہ اور رک جائیں، ہم غریبوں پر بڑا احسان ہو گا۔“ اس نے شرارت سے بات پوری کی تو میں اس کی بات پر آنے والا غصہ بھول کر اس کی ہمنوا ہو گئی۔

”واقعی رنی آیا! ابھی مت جائیں۔ خالہ اور خالو کو جلانے دیں۔ ہم آپ کو بعد میں خود چھوڑ آئیں گے پلینز۔“

”کیسے رک سکتی ہوں نازی، اسکول سے ایک ہفتے کی چھٹی بھی بڑی مشکل سے ملی ہے۔ ایسا کروا گلے مینے تم لوگ کراچی کا پروگرام بنا لو۔ سچ بڑا مزا آئے گا۔“

”ارے ہم کہاں نکل سکتے ہیں فیضی کے امتحانوں تک۔“ میں نے ماپوسی سے کہا۔

”مان جائیے نا، کیوں بچوں کا دل توڑ رہی ہیں۔ دل رکھنا تو بڑے ثواب کا کام ہے۔“ پتا نہیں اشو چچا کب کمرے میں آئے۔

سفید شلوار قمیص میں ان کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔ ڈارک براؤن آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھی ہوئی تھی۔ مجھے تو وہ اس وقت اتنے اچھے لگ رہے تھے کہ

”آپ آخر کہاں گم ہیں، کچھ اتنا ہوتا بھی ہے یا آپ بھی ہمارا والا وائرس حملہ آور ہو رہا ہے۔“ اشو چچا نے میرے آگے ہاتھ ہلایا تو میں بھی اپنے خیالوں سے باہر آ کر بس پڑی۔

قصائد بانی کو شاید آؤٹنگ کے پروگرام میں اوروں کو اہمیت دینا اچھا نہیں لگ رہا تھا اسی لیے وہ پھر سے بے زار نظر آنے لگیں۔

”افوہ، یعنی آخر یہ تمہارے گھر میں اس قدر شور شراب کیوں مچا رہتا ہے۔ یہ اسد اور فیضی کو تم منع کیوں نہیں کرتیں۔“ وہ مجھ سے مخاطب تھیں۔

”اسد اور فیضی تو میرے گروہ ہیں، جہاں کا پروگرام وہ بتائیں گے وہیں جایا جائے گا۔“ اشو چچا نے دونوں کو پار سے دیکھا تو وہ دونوں جو اپنے خواہ مخواہ ہی لپیٹ میں آجائے سے کچھ شرمندہ سے نظر آنے لگے تھے دوبارہ سے تفرق کا پروگرام بنانے لگے۔



مومنہ خالہ بڑے کمال کی خاتون تھیں۔ ہر وقت مصروف رہتی تھیں۔ آج انہیں آئے ہوئے بانیچوال دن تھا۔ وہ درحقیقت ہر نین مولا تھیں۔ گھر کی تمام امور کے متعلق کوئی چیز ایسی نہ تھی جو ان کی دسترس سے باہر ہو اور ایسی ہی تربیت انہوں نے رنی تپا کی بھی کی تھی۔ وہ بھی گھنٹوں کا کام منٹوں میں نبٹا لیا کرتی تھیں۔ پچھلے چند دنوں میں چونکہ روزانہ ہی سہ پہر سے ہونے پھرنے کی تیاری شروع ہو جاتی تھی لیکن وہ صبح سے ہی اٹھ کر سارا کام ختم کر دیتی تھیں۔ دوپہر اور رات کا کھانا بنانے کی ذمہ داری ہم دونوں کی تھی۔ امی کو تو مومنہ خالہ اپنے پاس سے اٹھنے ہی نہیں دیتی تھیں۔

رنی آپا کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت تھا۔ جس روز ہم سارا دن باہر گزارنے کے لیے شلالا مار باغ گئے اس دن تو ان کی بنائی ہوئی ساری چیزیں بہت ہی زبردست تھیں۔ چکن، ویجیٹبل رولز، پڑا، دی بڑے، گولڈا کباب، نائن اپیل کیگ اور کئی چیزیں میں نے ان دنوں ان سے سیکھی تھیں۔

میں نے ان پر سے نظر مثالی مبادا میری ہی نظر نہ لگ جائے۔

”اسکول کا مسئلہ نہ ہوتا تو ضرور رک جاتی، وہاں میری عدم موجودگی میں بڑا مسئلہ ہو رہا ہو گا۔“ مئی آپا نے دھیرے سے پلکیں جھپکائیں۔

”مسئلہ تو خیر ہاں بھی ہو گا مگر مشکل یہ ہے کہ اس کی سبب سے آپ احساس ہی نہیں کر رہیں۔“ اشوچا کے جملے معنی چیز ہوتے جا رہے تھے۔ اسد تو خیر کب کا باہر جا چکا تھا لیکن میرے لیے مئی آپا کے چہرے پر اترتے رنگ دیکھنا ایک بہت خوب صورت تجربہ تھا۔



آج شام کی ٹرین سے مومنہ خالہ وغیرہ کو واپس جانا تھا۔ فطیر خالو کا کام تو تین دن میں ہی ختم ہو چکا تھا۔ لیکن ہمارے پُر زور اصرار پر وہ تقریباً ایک ہفتہ رک گئے تھے۔ وہ بڑے خوش مزاج اور مصلحتی شخص تھے۔ ان کی باتیں بڑی رُ لطف تھیں۔ نہ جانے کہاں کہاں کے قصبے چھڑے رہتے تھے۔ اب اسے تو ان کی پہلے سے ہی بہت ہم آہنگی تھی کیونکہ کبھی کبھار جب اباکراچی جاتے تھے تو ان ہی کے ہاں ٹھہر کرتے تھے۔ اب تو خیر اباکو بھی گئے ہوئے سات آٹھ سال کا عرصہ بیت گیا تھا۔

اور تو اور ماموں جان بھی ان دنوں ہمارے گھر تقریباً روز آنے لگے تھے۔ فطیر خالو کی صحبت نے انہیں بھی خاصا خوش و خرم کر رکھا تھا۔ ایک روز ماموں جان نے ان کی اور ہم سب کی دعوت بھی کی تھی۔

ہفتہ گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔ مئی آپا کی محبت میرے دل میں بہت گہری ہو چکی تھی اور اب تو اشوچا کی وجہ سے وہ مجھے اور بھی پیاری ہو گئی تھیں۔

ان سات دنوں میں اشوچا کیا کیا ہو گئے تھے۔ شوخی تو خیر شروع سے ان کی فطرت کا حصہ تھی۔ لیکن کسی خاص ہستی کی طرف ان کا واضح جھکاؤ میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا تھا۔ صائمہ باجی اور مائی کی اپنی

ذات میں نمایاں پسندیدگی رکھنے کے باوجود انہوں نے کبھی ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی بلکہ ایک مناسب فاصلہ طے کرنے میں برقرار رکھتے تھے۔ ہاں تیمور بھائی ان کے عزیز از جان دوست تھے۔ اشوچا کا یہی گریز مائی کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں رکاوٹ تھا۔ اس کا ہم سب کو احساس تھا۔

”بچوں کے امتحانوں سے فارغ ہو کر ان شاء اللہ میں اور نازی کے ابو فوراً آپ کے ہاں حاضر ہوں گے۔“ امی خالو فطیر سے مخاطب تھیں۔

”ہاں ہاں بھی ضرور تمہارا اپنا گھر ہے اور صرف تم دونوں کیوں، بچوں نے اور اشعر میاں نے کیا قصور کیا ہے۔“ انہوں نے گرجوٹی سے جواب دیا۔

”ایک دفعہ تو ہم دونوں کو ہی آنے دیجئے پھر خبر سے سب کے ساتھ آئیں گے۔“ امی کے لہجے میں خوشی کی ٹھنک اتنی واضح تھی کہ مومنہ خالہ سے باتوں میں مصروف مائی نے ایک گہری نظر اُڑائی۔

میرا دل خوشی سے دھک دھک کرنے لگا۔ کیا امی نے بھی وہ حریر بڑھ لی تھی جو پہلی خوشی بن کر اشوچا کے چہرے پر رُقم تھی۔

میری نگاہ برآمدے کی سیڑھیوں سے پھسلتی ہوئی سامنے لان کی طرف سے آتی مئی آپا پر پڑی۔ لائٹ پنک کمر کے چکن کائن کے سوٹ میں وہ دھیر سارے پھولوں کی شبنیاں اٹھائے ان ہی کا حصہ لگ رہی تھیں۔ وہ روزانہ ہال میں رکے گلہانوں میں تازہ پھولوں کی کئی خوب صورت شبنیاں لگا دیتی تھیں۔ برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف آتے ہوئے وہ مجھے اپنے قدم طرز کے گھر میں بہت فٹ محسوس ہوئیں، جیسے وہ اسی ماحول کا حصہ ہوں۔

سر جھکائے سیڑھیاں چڑھتی مئی آپا نے جانے کس دھن میں تھیں کہ سائیڈ کے کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کا رخ کرتے اشوچا سے بری طرح ٹکرا گئیں۔ اگر اشوچا بروقت انہیں تھام نہ لیتے تو وہ بری طرح سیڑھیوں سے گر جاتیں ان کے تھامے ہوئے سارے پھول اشوچا کے قدموں میں اس طرح پڑے

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- کرتے ہوئے بالوں کو رکتا ہے
- بال اگانے سے
- بالوں کو مضبوط اور چمکا رہا کرتا ہے
- مردوں، عورتوں، بالوں کے لئے
- کہاں نہ
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت - 150/- روپے

سوہنی ہیرائل 12 کی بوتلیں کاسرب ہے اور اس کی تجارتی کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تجویزی مقدار میں جاری رہتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دبی خریدنا چاہئے یا ایک بوتل کی قیمت صرف - 150/- روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے آڈر بھیج کر ہفت روزہ پورل سے منگوائیں ہر ہفت روزہ سے منگوانے والے نئی آڈراس حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلیں کے لئے ----- 360/- روپے
- 3 بوتلیں کے لئے ----- 500/- روپے
- 6 بوتلیں کے لئے ----- 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکیج ہارڈ شامل ہیں۔

منی آڈر بھجئے گئے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، -53 اورنگز ہارکٹ، سینڈ فور ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی بھار آئل ان جگہوں
سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، -53 اورنگز ہارکٹ، سینڈ فور ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈاک بکس، -37 اورنگز ہارکٹ، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

ہوئے تھے جیسے اسی مقصد کے لیے بننے گئے ہوں۔ پل بھر کے لیے ایسا لگا جیسے وقت ساکن ہو گیا ہے۔ فضا میں کوئی آہٹ تک نہیں، دونوں آگہی کے خوب صورت احساس کی گرفت میں تھے۔ لیکن یہ صرف ایک لمحہ تھا فوراً "ہی رنی کیا خود کو سنبھال کر ان پھولوں کو چھنے لگیں۔ جنہیں ہوا کے تیز جھونکے نے میڑھیوں پر پھیلا دیا تھا۔ اشو چچا میڑھیاں اترتے سیدھے پورچ کی طرف چلے گئے۔

میری نظر اچانک ہی صائمہ باجی پر پڑی جو برآمدے میں پڑی کین کی کرسی پر بیٹھی پوری طرح سے ان دونوں کی طرف ہی متوجہ تھیں غصہ، نفرت، جلن کا احساس، کتنے ہی منفی جذبے ان کی آنکھوں سے ٹپٹپٹ تھے ان کی لودیتی ہوئی آنکھوں کی آنچ مجھے بہت قریب محسوس ہونے لگی۔ مجھے ان سے ڈر سا لگنے لگا۔

"گھبرانے کی کیا بات ہے اگلے مہینے ہی کارپورام ہے کراچی جانے کا" ایک دفعہ کوئی باقاعدہ بندھن بندھ جائے پھر کوئی کیا لگا ڈسکے گا۔" میں نے خود کو جیسے تسلی دی۔ ذرا سی دیر میں مہمانوں کی آمد نے مجھے دوسری طرف مصروف کر دیا۔ آج سب مومنہ خالہ وغیرہ سے الوداعی سلامات کے لیے آرہے تھے۔

نرالی کے ساتھ بچن سے ہل تک کے متواتر چکروں میں ذرا دیر پہلے کی گھبراہٹ میں یکسر بھول چکی تھی۔



رنی آیا وغیرہ کو گئے آج چوتھا دن تھا۔ ہم سب ہی انہیں بہت مس کر رہے تھے۔ اتنا بڑا گھر خالی لگ رہا تھا۔ میں نے رنی آیا وغیرہ کے جاتے ہی امی سے ان کا ارادہ معلوم کر لیا تھا۔

"نازیہ لڈرا فون تو وہ اٹھا کر دو تین دن سے بھائی جان کے گھر کی خبر خبر نہیں، کم از کم خبریت ہی معلوم کر لوں۔" امی کی آواز پر میں کارڈ لوئس اٹھا کر برآمدے سے ہل میں آئی۔ ساموں جان کا نمبر ملا کر فون امی کے ہاتھ میں تھموا۔

"ہیلو ہاں کون سلیم؟ دو علیکم السلام ذرا ابھالی جان یا

بھائی جان میں سے کسی کو بلانا۔ ”امی، ماموں جان کے ہاں کام کرنے والے لڑکے سے مخاطب تھیں۔
”کب گئے، خیریت تو تھی۔“ امی کے لہجے پر میں جو نیچے بیٹھی، غواغخواہ فیضی کی کتابوں کو الٹ پلٹ کر رہی تھی، چونک سی گئی۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ آئیں تو مجھے اطلاع کر دینا، علیکم السلام۔“

”بھابھی جان کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا، اب بھلا بیٹھے بیٹھائے کراچی جانے کی کیا تک تھی۔“ امی ٹیلی فون بند کر کے مڑیں۔

”کون کون گیا ہے امی۔“ مجھے بے حد بے چینی ہوئی۔

”تینوں ہی گئے ہیں، سلیم بتا رہا تھا کہ ویسے تو سب خیریت ہے، بس ایک دم ہی پروگرام بن گیا۔“ امی کا لہجہ الجھا ہوا تھا۔

”بائی ایئر گئے ہیں، کل رات واپسی ہے۔“ امی کچھ اور بھی کہہ رہی تھیں لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ امی کی معنی خیز نظریں اور رنی آپا کو گھورتی صائمہ باجی کی آنکھوں کی پیش مجھے ایک بار پھر سخت گھبراہٹ کا شکار کر گئی تھی۔

”امی، آپ اور ابابا اسی پٹنے اشوچا کی بات پکی کر دیں جا کر، فیضی کا کیا ہے اس کی پر بھائی میں دیکھ لوں گی۔“ میں نے دل میں آتے ہوئے دوسو سو کو دباتے ہوئے امی سے کہا۔

”بیٹا، فیضی یہاں تو مجھے کیسے اکیلا جانے نہیں دیتا، بھلا کراچی کیسے جانے دے گا، بندہ دن کی تو بات ہے۔ اسے اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گی، ورنہ یہاں تو خود کو ہانک کر لے گا۔“ امی کا کہنا صحیح ہی تھا کیونکہ فیضی بیس سال کا ہونے کے باوجود امی سے ہی ہر وقت الجھجھکتا رہتا تھا۔

”چلو خیر اللہ مالک ہے، یہ پندہ دن بھی گزر رہی جائیں گے۔“ میں نے خود کو سمجھانا چاہا لیکن دل میں ایک بے کلی سی تھی۔

”امی! امی اور صائمہ باجی آئی ہیں۔“ اسد نے لان سے ہی آواز لگائی۔ تو میں جلدی سے چن سے باہر آ گئی۔

”آخر تمہیں کب عقل آئے گی اسد! اتنے بڑے ہو کر بچوں کی طرح چلاتے ہو۔“ صائمہ باجی حسب عادت اسد پر ناراض ہوتی آ رہی تھیں، ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔

”السلام علیکم بھابھی جان! خیر تو تھی، یہ ایسے ایک دم کراچی کیسے جانا ہو گیا۔“

امی اپنی بھابھی کے استقبال کے لیے برآمدے کی سیڑھیوں پر پہنچ چکی تھیں۔

”ہاں سب خیر ہی ہے، ذرا سانس تو لے لوں۔“ امی ذرا سا چل کر رہی بری طرح جانپ جاتی تھیں۔

”آج تو بڑا خوش قسمت دن ہے جو اشعر بھی گھر پر نظر آرہے ہیں۔“ صائمہ باجی نے چمکتے ہوئے اشوچا پر نظر ڈالی، جو آج ذرا جلدی اس سے آگئے تھے۔

”ارے ہمارا کیا ہے ہم تو موزر آدی ہیں۔ آپ سنائیں، یہ اتنی ساری مٹھائی کس خوشی میں ہے۔“ وہ خوش دلی سے بنے، امی اور ابابا کے ارادوں سے آگئی کے بعد سے تو مسکراہٹ ان کے لبوں سے جدا ہی نہیں ہوتی تھی۔

”خیر سے بیور کا رشتہ دے کر آئی ہوں مومنہ کے ہاں، اسی کی مٹھائی ہے۔“ امی نے امی کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

”خس کے ساتھ، کیا رنی آپا سے۔“ میرے منہ سے بمشکل نکلا۔

”ارے تو اور ان کی کون سی دو چار بیٹیاں ہیں۔“ صائمہ باجی کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے چاروں طرف پرف سی گر رہی ہو، ساری آوازیں جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ مت ہمت کر کے میں نے اشوچا کی طرف دیکھا۔ ان کی خوب صورت

اس طرح ہتھیلی پر سر رسول جملے کے انداز میں رشتہ لے جانے والی نہیں تھیں۔

”ایک ہی اولاد ہے، ویسے مومنہ اور ظہیر کیا کیا دیں گے، ویسے تو ظاہر ہے جو کچھ بھی ہے اسی کا ہے۔“ ایسی باتیں کرنا تو مامی کی فطری مجبوری تھی لیکن میری دلچسپی اب ان کی باتوں میں ختم ہو چکی تھی۔ میری نظر تو چھوٹے لان کے دو سرے سرے پر بنے اس کمرے کی طرف بار بار جا رہی تھی جس میں اشوچا اب نہ جانے کتنی دیر کے لیے گم ہو گئے تھے۔



دن رات بالکل بدل کر رہ گئے تھے۔ اشوچا نے خود کو بظاہر سنبھال لیا تھا لیکن گہری اداسی اور بے بسی کا احساس ان کی آنکھوں میں مستقل ڈیرہ ڈال چکا تھا۔ انہوں نے خود کو بالکل الگ تھلگ کر لیا تھا۔ اول تو وہ مصروف ہی بہت رہنے لگے تھے۔ نہ جانے کیا کام تھا ان کے آئس کا جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا اور اگر گھر میں بھی ہوتے تو ان کا ہونا نہ ہوتا برابر ہی لگتا تھا۔ ان کی وہ جملے بازیاں، فیضی اور اسد کے ساتھ دلچسپ شرارتیں، امی سے لاڈ اٹھوانے کی عادت، غرض کہ کچھ بھی تو پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ میری بالکل بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ان کے لیے کیا کروں۔ جتنی دیر وہ گھر میں رہتے میں ان کا سایہ بنی رہتی لیکن کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اشوچا نے اپنے گرد ایک محل تعمیر کر لیا ہو، اداسی اور تنہائی کا محل، سات دیوانوں اور اونچی اونچی فصیلوں والا محل جس میں وہ مقید تھے، اور میری لاکھ کوششوں کے باوجود وہ ساتواں در کھلنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

امی کی متا بھری نگاہ غافل نہیں تھی۔ اشوچا کا وہ ان کی روح تک میں اتر گیا تھا۔ لیکن اب تیور بھائی کے رشتے پر اشوچا کا پرو نزل نہیں دیا جاسکتا تھا کیونکہ اس طرح قریبی رشتوں میں نہ بھرنے والی دراڑ پڑ جاتی۔ یہ امی اور بابا کا مشترکہ فیصلہ تھا۔ مامی اشوچا کا رشتہ اپنی بیٹی صائمہ کے ساتھ طے

براؤن آنکھوں میں جیسے ہزاروں لاکھوں ٹوٹے ستموں کی کرچیاں تھیں۔

وہ جیسے ایک خواب کے عالم میں کھڑے تھے۔ سرخی مائل گندی چہرہ بالکل سفید پڑ چکا تھا۔ مجھے ڈر لگنے لگا کہ انہیں کچھ ہونہ جانے لچکا کہ وہ تیزی سے مڑے اور بنا کسی سے کچھ کہے باہر کی سائیڈ پر بنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

”ارے اشوچا! کہاں جا رہے ہو۔ رکو تو، ابھی تو ہم آئے ہیں۔“ صائمہ باجی کی آواز مندی کا احساس لیے ہوئے تھی۔

”ان کے دوست بیٹھے ہوئے ہیں، چائے کا کمنہ آئے تھے۔“ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس وقت تنہائی چاہ رہے ہوں گے اسی لیے بات بنائی ورنہ صائمہ باجی تو ان کے پیچھے ان کے کمرے تک پہنچ جاتیں اور مجھے اپنے اشوچا کا بھرم قائم رکھنا تھا۔

”اللہ مبارک کرے۔ کیا مومنہ آپا نے ہاں کر دی۔“ امی بے شکل خود کو سنبھال سکی تھیں۔ ”ہاں ہی سمجھو، میرے تیور میں آخر کی کیا ہے، یہ کہو کہ رسا، ہو چنے کے لیے کچھ وقت مانگا ہے۔“ مامی کی باتوں سے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے رشتہ مانگ کر مومنہ خالہ پر کوئی احسان عظیم فرمایا گیا ہے۔

”مومنہ کی بیٹی کے تو مجھ کو نصیب کھل گئے، اتنا لائق ہزاروں لاکھوں میں ایک لڑکا، انہوں نے تو سوچا بھی نہ ہو گا۔“ میری سوچ کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی چند روز پہلے تک تو رنی آپا کو دیکھ لینے کے باوجود مامی ”ڈھنک کی لڑکی“ نہ ملنے کا رونا رو رہی تھیں۔ پھر ایک دم ان کے گھر میں یہ فیصلہ کس طرح کیا گیا جبکہ تیور بھائی بھی یہاں نہیں تھے۔ میرے دل کو کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ کیا یہ سب کچھ صرف میرے اشوچا کو شکست دینے کے لیے کیا گیا ہے۔ صائمہ باجی کی خود غرض اور زمانے سے اپنی پسند کی ہر چیز چھین لینے والی عادت۔ مجھے بچپن سے اب تک کئی چھوٹے بڑے واقعات یاد آ کر رہ گئے۔

یقیناً ”میری وجہ ہے ورنہ مامی اور صائمہ باجی کبھی بھی

کرنے پر بے انتہا اصرار کر رہی تھیں لیکن امی نے واضح طور پر انکار کر دیا تھا۔ جس پر مایہ خوار چرائی پائی تھیں اور چھپچھپے تین یاہ سے ان کی ہمارے ہاں آمد و رفت ختم ہی ہو چکی تھی۔ ماموں جان البتہ چکر لگا لیتے تھے۔

”کچھ بھی ہو بھابھی جان ملیں یہ نہ ملیں میں اپنے بچے پر اتنا برا ظلم نہیں کر سکتی۔“ امی نے مجھ سے کہا۔ مومنہ خالہ کی طرف سے اب تک خاموشی ہی تھی۔ سنا تھا کہ تیور بھائی کے آنے کے بعد ہی کچھ فیصلہ ہو گا اور آج تیور بھائی کو آئے تیسرا دن تھا۔

ابھی ابھی میری دوست فرح کا فون آیا تھا۔ وہ ”آرٹ اینڈ کرافٹ“ کے کسی کورس میں ایڈمیشن لینے کے لیے مجھ پر زور دے رہی تھی لیکن میرا دل ہی نہیں چاہا، گھر سے متعلق جن کاموں میں رہی تپا کے سامنے میری دلچسپی حد درجہ بڑھ گئی تھی وہ تو چند دن میں ہی ختم ہو گئی تھی۔ اب تو بس بے دلی سے روزمرہ کے کام نبھاتی تھی۔

”کاش، رہی آپا کبھی ہمارے گھر نہ آئیں۔“ میں پچھلے سال میں بیسی سوچ رہی تھی۔

جب اتنے سالوں سے ملنا جلنا نہیں تھا تو اب بھی نہ ہوتا تو کتنا اچھا تھا۔ میں ان ہی سوچوں میں گم تھی۔ اشو چچا حسب معمول غائب تھے۔ اس بار تو وہ تیور بھائی سے بھی نہیں ملے تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے تو اگر تیور بھائی دو دن کے لیے بھی شہر سے باہر جاتے تھے تو وہ بے چین ہو جاتے اور اب جب کہ وہ اتنے مہینوں بعد واپس آئے تھے تو ملنا تو درکنار اشو چچا نے انہیں فون بھی نہیں کیا تھا۔

کل تیور بھائی خود ہمارے گھر آئے تھے ان کی اچھی طرح خبر لینے کے لیے، لیکن کل بھی ان کی ملاقات نہیں ہو سکی۔

مجھے پکا یقین تھا کہ اشو چچا جان بوجھ کر کتراتے ہیں شاید ڈرتے ہوں کہ تیور بھائی سے اپنی بدلی ہوئی کیفیت کیسے چھپا یاں گے۔

اچانک ہی فیسٹی پن کی طرف سے سیدھیاں اترتا

ہوا نظر آیا۔

”بائی ماموں جان وغیرہ آئے ہیں اتنے بڑے مٹھائی کے دو ڈبے لے کر۔“ اس نے ہاتھوں کے پھیلاؤ سے ڈول کا سا زینتنا چاہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ مومنہ خالہ کی طرف سے ہاں ہو گئی ہے۔“

اگرچہ بات غیر متوقع نہیں تھی لیکن پھر بھی مجھے دھچکا لگنا نہ جانے کیوں رہ رہ کر میرے دل کو امید تھی کہ شاید کچھ ایسا ہو جائے گا کہ میرے اشو چچا کی خوشیاں انہیں مل جائیں گی لیکن اب تو۔

میں نے اندر جانے کے لیے قدم بڑھائے ظاہر ہے اب چائے وغیرہ کا انتظام کرنا تھا کہ کچھ ٹائماؤس سے شور نے مجھے عجیب سی حیرت میں ڈال دیا، آواز تو سو فیصد ماموں جان کی تھی لیکن یہ لہجہ ان کا تو نہیں تھا۔ یہ تو کسی بڑے رعب داب والے آدمی کا انداز تھا۔ میں اسی شش بونچ کے عالم میں برآمدے تک پہنچ گئی۔

”ہمارے بچے کوئی گڈے کرنا نہیں کہ ہم جو چاہیں ان کے متعلق فیصلہ سناویں۔ انہیں اپنی زندگی جینے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔“

ماموں جان کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔

”اس عورت کی کم عقلی میرے بچوں کی خوشیوں کو برباد کرے، یہ میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ میری زندگی تو جیسے گزری تم سب کے سامنے ہے لیکن تیور کا مجھے گھر کے ساتھ ساتھ دل بھی آبلور کھنا ہے۔“

”ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا بس اب آپ ریلیکس ہو جائیں بھائی صاحب۔“ ابانے انہیں شانوں سے تھامتے ہوئے کہا تو امی جو گھرائی ہوئی پاس ہی کھڑی تھیں اپنے آنسو خشک کرنے لگیں۔

”ارے میری بیٹی وہاں کیوں کھڑی ہے۔ یہاں تو میرے پاس۔“ میں جو ہال کے دروازے پر کھڑی اب تک اندر کی صورت حال سمجھنے سے قاصر تھی خاموشی سے ماموں جان کے نزدیک چلی آئی۔

”احمد، میری جھولی میں یہ خوشی ڈال دو۔ میں ہاتھ جوڑ کر تم سے التجا کرتا ہوں۔“ ماموں جان نے ابانے

آگے واقعی ہاتھ جوڑ دیے تو اب شرمندہ سے ہو گئے۔
”سب آپ ہی کے بچے ہیں بھائی صاحب“ آپ پریشان مت ہوں۔“

”نہیں احمد! یہ تو تمہارا ظرف ہے اگر تیمور مجھ سے کچھ نہ کہتا تو انجانے میں تین زندگیاں برباد ہو جاتیں۔“ ماموں جان اب کرسی پر بیٹھ چکے تھے لیکن میں تو اب تک صورت حال پر غور کے بجائے ماموں جان کے بدلے انداز پر حیران تھی۔ وہ کتنے دنگ لگ رہے تھے اور خاموش آنسو بہاتی مای کس قدر کمزور مجھے تو ان پر رحم آنے لگا۔ اس طرح سب کے سامنے ماموں جان ان کی کوشلی کرسی کے میرے تو کبھی تصور میں بھی نہیں تھا۔ نہ جانے گھر میں کیا کچھ کہہ کر آئے ہوں گے۔

”بس کریں بھابھی جان“ آپ کیوں دل چھوٹا کر رہی ہیں۔ یہ باتیں تو زندگی کے ساتھ چلتی ہی ہیں۔“ ای نے مای کو طے لگا لیا۔

”تم سب مجھے معاف کرو فرخندہ“ میں ہمیشہ سب کے دل دکھائی چلی آئی میں نے بڑی ہونے کے باوجود بھی پڑا بن کر نہ دکھایا اپنی خواہشوں کی غلام بن کر رہ گئی تھی۔“ وہ ایک بار چہرہ پر بس۔

”کیس باتیں کر رہی ہیں آپ“ ہمیں تو آپ سے کوئی شکایت نہیں۔“ ای ان کی مسلسل دل چوٹی کر رہی تھیں۔

”نہ جانے میری عقل پر کیوں پتھر پڑ گئے تھے۔ میں تو تب سمجھوں گی کہ تم نے مجھے معاف کر دیا جب تم تازی کے لیے ہاں کر دی۔“ مای نے محبت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو یک دم میری سمجھ میں ساری بات آئی چلی گئی۔ اس کے بعد تو میرا دل اک پل ٹھہرنا بھی محال تھا۔

”میری تو یہ دیرینہ خواہش تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہی میرے بیٹے کی آرزو تھی۔“ ماموں جان کی آواز باہر برآمدے میں صاف سنائی دے رہی تھی۔

”میں نے پرسوں کی فلاٹ کی بنگلہ کراچی کے لیے کرائی ہے ان شاء اللہ اشعر اور رنی کی بات طے کر کے

ہی لوٹیں گے پھر جیسے سہولت ہو کوئی رسم وغیرہ کر لیں گے۔“ ماموں جان اب اسے مخاطب تھے۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ اباجان نے کہا۔
”اور ہاں صائمہ کے لیے میرے بچپن کے دوست فرید احمد اپنے بیٹے کے لیے خواہش مند ہیں۔ اچھا لائق لڑکا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ایم ایس کر کے لوٹا ہے۔ بہت اچھے اور سیکھے ہوئے لوگ ہیں۔ میں نے انہیں اپنی رضامندی دے دی ہے۔ مجھے امید ہے کہ صائمہ بھی ان کے ساتھ رہ کر اپنی علوتیں سنوار لے گی۔“ ماموں جان تو آج صرف اپنے فیصلے سنارہے تھے۔

میں کچھ عجیب سے احساسات کا شکار ہو رہی تھی۔ شرم گھبراہٹ میں سب کچھ دلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ اور آج اس خوب صورت شام میں مجھے تیمور کے نام کی انگوٹھی پہنائی جانی ہے۔ دو روز قبل ہی ہم لوگ اشوٹجا اور رنی آپا کی ملگنی کی رسم ادا کر کے آئے ہیں۔ اور اگلے جمعہ کو صائمہ بائی کی ملگنی ہے۔ سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ خوش بھی بہت ہیں۔ ہے نا حیرت کی بات!

اب جب کہ گھر میں بڑا خوشگوار سا ہنگامہ پھیلایا ہوا ہے مجھے وہ خاموش سی سہ پہریاد آ رہی ہے جب تیمور بھائی اپنی آمد کے دوسرے دن ہمارے ہاں آئے تھے۔ میں بلا مقصد ہی برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ جب وہ کھلے ہوئے گیٹ سے مجھے اندر داخل ہوتے دکھائی دیے۔ ای اس وقت اوپر کی منزل میں کسی کالم میں مصروف تھیں۔ فیضی حسب عادت ان کے ساتھ تھا۔ ابابا ابھی تک لوٹے نہیں تھے۔ غرض نیچے سنا تھا۔ سرخ اینٹوں کی روش کو تیز قدموں سے پار کرتے ہوئے وہ اسی طرف آرہے تھے کہ پل کے ہزارویں حصے میں عین نے فیصلہ کیا۔

”تیمور بھائی! میری ایک بات سن لیں پلیز۔“ میں نے انہیں لان میں ہی جا پکڑا۔

”الٹی خبر۔ نہ سلام نہ دعا“ آخر اتنے مہینوں بعد آیا ہوں کم از کم خیریت ہی پوچھ لیتیں۔“ وہ بڑے ہشاش

دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ جو سامنے بیڑھیوں سے تیسور بھائی آگئے کے نعرے لگاتا ہوا آ رہا تھا اور اس کے پیچھے امی تھیں۔

اب کوئی اور بات کرنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے شدید غصہ آ رہا تھا۔

”ہیں تو آخر امی کے بیٹے اور صائمہ باجی کے بھائی ہی، خواہ مخواہ اتنی دیر خوشامدی۔“ میں نے زیر لب تیسور بھائی کی شان میں گستاخی کی۔

”کچھ بات بھی نہیں بنی اور اگر انہوں نے کسی سے یہ سب کہہ دیا تو جوتے پڑنے کا خدشہ الگ، امی تو مجھے کبھی نہیں بخشیں گی۔“

میں نے سامنے پڑے لکڑی کے چھوٹے سے ٹکڑے کو پاؤں کی ٹھوک سے دور پھینکتے ہوئے اپنا غصہ اتارا۔



جس وقت میں عقلمندوں کی سرکاری سنبھالے تیسور بھائی کو صلواتیں سنار ہی تھی، میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ تیسور نے تو گھر پہنچتے ہی اس رشتے سے انکار کر دیا ہے اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ”نازی“ کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کریں گے۔ ہاں اشوچا والے معاملے سے وہ میری زبانی ہی باخبر ہوئے تھے جس کے بعد انہوں نے ماموں جان کو اعتماد میں لے لیا تھا۔

مجھے کیا معلوم تھا کہ میری اشوچا اور رنی آپا کے لیے کی جانے والی بے پناہ دعائیں ان کے ساتھ ساتھ خود میرا نصیب بھی جگاری ہیں۔

اشوچا کی خوشی سے کھلتی آواز ہمارے سارے گھر میں پھول کھلا رہی ہے۔ طمانیت کا گہرا احساس میرے دل میں اترتا جا رہا ہے۔ ساتواں دروازہ آخر کار کھل ہی گیا میں نے وہ اسم چوالیا تھا۔



”خیریت سے تو آپ نظر آرہے ہیں۔ خیر السلام علیکم۔“ میں نے قرض اٹارنے کے انداز میں سلام کیا تو وہ ہنس پڑے۔

”وعدہ کریں، جو بات میں آپ سے کہوں گی، آپ ضرور مانیں گے۔“ میں نے گھر والوں کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر فاسٹ راؤنڈ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”لڑکی! مجھے اس وقت تم بہت مشکوک دکھائی دے رہی ہو، کہیں مروانہ دیتا۔“ انہوں نے مصنوعی سنجیدگی اختیار کر لی تھی۔ ”خیر کو، کیونکہ کہے بغیر تم مانو گی نہیں۔“

”تیسور بھائی! آپ رنی آپا سے شادی سے انکار کر دیں۔ پلیز، دیکھیں وہ اور اشوچا ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں۔ آپ نے تو انہیں دیکھا بھی نہیں ہے۔ آپ کو کچھ فرق نہیں پڑے گا لیکن اشوچا بہت زیادہ ہرٹ ہوئے ہیں۔“ میں نے ایک ہی سانس میں سب کچھ ان کے گوش گزار کیا۔

”آہ۔“ تیسور بھائی نے ایک گہرا سانس لیا جیسے کوئی بھاری بوجھ ان کے سر سے اتر گیا ہو۔

”اچھا پھر میرا کیا بنے گا، بڑی مشکل سے تو والدہ ماجدہ کو کوئی لڑکی پسند آئی ہے۔“

”ارے آپ بالکل فکر نہ کریں، اچھی سے اچھی لڑکی آپ کو مل جائے گی، آپ تو خود اتنے اچھے ہیں۔“

میں نے انہیں ٹھوڑا سا مکھن لگانا ضروری خیال کیا۔ ویسے بھی بیرون ملک کی آب و ہوائ ان کی شخصیت پر اچھا اثر ڈالتا تھا۔

”چلو کم از کم یہ تو پتا چلا کہ میں کتنا اچھا ہوں، اب ذرا میں پھوپھی جان سے مل لوں۔“ انہوں نے اندر جانے کے لیے قدم بڑھائے تو میں بوکھلا گئی۔

”ارے میری بات کا جواب تو دے دیں۔ آپ منع کر دیں گے نا۔۔۔؟“ میری ساری محنت بے کار جا رہی تھی۔

”دیکھیں گے ویسے یہ بیویوں کے فیصلے ہیں اور آئندہ آل میں ایک مشرقی لڑکا ہوں۔“ انہوں نے فیضی کو

ماہوش طالب

سارول کے کنگن میں

”ارے میری بات مان لے، ابھی بچی کو زیادہ دن
نہیں گزرے اسکول جاتے ہوئے ہٹا لے اسے اس
نے کیا کرنا ہے بڑھ لکھ کر۔“ اماں نے پرات میں آٹا
گوندھ کر ایک طرف رکھا اور اب آلو کے شوربے کے
لیسہ دیکھی میں ہی پیاز کاٹنے لگی۔



میں اماں کا ساتھ دیتے اور واپسی پر بذات خود اسے لے کر آتے جیسے کہ پہلے دن۔
اماں ذرا سخت طبیعت کی اماں تھیں اور بیٹی کے اسکول جانے کے معاملے میں اور بھی زیادہ مگر اماں کے سامنے ان کی ایک منہ بولی۔

زینب اماں کی ایک اکلوتی اولاد تھی اور یہ ابا کا بڑا پرانا خواب تھا کہ وہ اپنی اولاد کو پرہائیں گے۔ انہوں نے کبھی اپنی غموت کو اس خواہش کے پورا ہونے میں رکاوٹ نہیں بننے دیا تھا۔ اماں سے کبھی اس بات کو کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی کیوں کہ زینب سے پہلے اماں نے تین بیٹوں کو جنم دیا تھا، مگر ہر بار آنے والا ننھا وجود بھی بھرے بغیر ہی لوٹ گیا تھا۔ اور پھر اماں نے اس ہی چھوڑ دی، مگر وہ سال بعد اللہ نے دوبارہ رحمت کی تو اماں اماں نے پھر سے نئی امید، نئے یقین کے ساتھ آنے والے کی زندگی کی دلیل دیکھنا شروع کر دیں۔

اب کی بار دعا میں رکھ لے آئی تھیں۔ زینب کی شکل میں اللہ نے کتنی ہی عطا کی تھی انہیں اماں باتو اللہ کا شکر ادا کرتے چکے تھے۔

مگر لڑکیوں کی تعلیم کے معاملے میں اماں کی دینا ساقی عورت ثابت ہوئی تھیں۔ مگر جیسے ہی زینب نے پانچویں سال میں قدم رکھا، اماں نے اسے گھر کے قریب ہی واقع پرائمری اسکول میں داخل کرا دیا۔

”اوہ ہلے لوکے (اوہ بھلی عورت) تو کیوں بچی کے پیچھے بڑگئی ہے۔ اسکول ہی داخل کر لیا ہے نا، کون سا لڑنے بھیج دیا ہے۔ بڑھ لکھ جائے گی، ڈاکٹر بنے گی اور نہیں تو کسی اسکول میں استانی لگ جائے گی، نام روشن کرے گی ہمارا۔“ اماں نے پہلے کی طرح ہی اماں کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ بڑے بڑے خواب سجائے بول رہے تھے۔

”اونہ نہ کیا کروانا ہے، ہم نے نام روشن کر کے، پہلے ہی مزاج نہیں ملتے اب اور کبھی کام کاج سے جائے گی، وہ کوئی بلب ہے جو نام روشن کرانا ہے۔“ اماں نے انتہائی بے زاری سے ابا کو جواب دیا۔

”اوہ کچھ خدا دا خوف کر، وہ معصوم سی کیا کرتی ہے خرو، ابھی تو پیر (پاؤں پاؤں) چلنا شروع کیا ہے اس نے، تیرے والی تو حد ہی ہو گئی ہے، بے قصول ہی بولے جاتی ہے، بس میں نے کہہ دیا ہے وہ اسکول جائے گی ہر روز، تو نے اب اس کے سامنے کوئی بات نہیں کرنی۔“ ابا ایک — تنبیہ کر کے کمرے کی طرف بڑھ گئے، جہاں زینب اپنی نئی نئی کاپیوں اور کتابوں میں سر دیے بیٹھی تھی — اماں کی بددعا نہیں بدستور جاری تھیں۔ دیکھی میں چھپ چلائے کے ساتھ ساتھ۔



جب سے پانچ سالہ زینب نے اسکول جانا شروع کیا تھا۔ اماں اٹھتے بیٹھتے باتیں سناتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ابا کو جو یہ بیٹی کو پرہائیں لکھانے کا بخار چڑھا ہے۔ چار دن کی چاندنی ثابت ہو گا۔ جب آئے دن کاپیاں، ٹیلیس اور ان گورنمنٹ اسکولوں کی نریدی مسوں (چچرز) کے حکم پر، آنے بہانے پیسہ خرچ کرنا پڑے گا۔ مگر اماں کا خیال محض خیال ہی رہا بلکہ اپنی موت آپ ہی مر گیا۔ جب وہ ہفتے گزر جانے کے باوجود بھی ابا اتنے ہی فاقہ و شوق سے زینب کو نہ صرف اسکول چھوڑنے جاتے بلکہ صبح اسکول جانے کے لیے تیاری

شہری آبادی سے ذرا دور یہ قصبہ سبز لہلماتے کھیتوں میں گھرا تھا۔ جس کے آس پاس بیسیوں چھوٹے چھوٹے گاؤں لگتے تھے۔ زینب کے ابا قصبے کی مرکزی سڑک پر پھلوں کا ٹھہلا لگاتے تھے۔ اماں نے محلے کے کسی دوست سے زینب کو اسکول داخل کرانے کا ذکر کیا تھا۔ چچا صابر کے اپنے بچے تو ان بڑھ بکتے تھے، سب سے چھوٹی بیٹی نے بھی بس پانچویں جماعت تک اسکول کا منہ دیکھا تھا اور ان کی بیوی و اس پر ہی بڑا مان تھا۔ جب اپنے شوہر سے ہمسائے کی اکلوتی

بٹی کے اسکول داخلے کی بات سنی تو فوراً ”اگلی صبح اماں چپاس پہنچ گئیں۔“

”رانی کے اپنے بتایا تھا مجھے کہ اپنی زینب بھی اب اسکول جائے گی، بڑی سوہنی بات ہے یہ تو۔“ اماں نے مسکرا کر سر ہلایا۔

”یہ میری رانی کی وردی ہے۔ وہ تو اب جاتی نہیں ہے۔ زینب کو چھوٹا کر دینا۔“ رشیدہ چاچی نے ہاتھ میں پکڑا تھمیلہ اماں کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بڑی مہمانی۔ ویسے تو میں۔ کپڑے آئی تھی اس کا سوٹ سینے کے لیے“ اماں نے آگ بڑھانے کے لیے چھوٹک سارتے ہوئے کہا اور تھمیلہ پکڑ لیا۔

”ویسے تو بچپن کو شروع شروع میں ہی شوق ہوتا ہے اسکول جا کر پڑھنے کا پھر مسوں کی ڈانٹ بھنکار سے تنگ آ کر خود ہی چھوڑ دیتی ہیں۔“ اماں کو تو پہلے ہی قلق تھا مگر رشیدہ چاچی کے کہنے پر سادہ سے انداز میں بولیں۔

”بس اس کے اٹنے کو بڑا شوق ہے، پڑھنے والی بچیاں تو ہر حال میں پڑھ لکھ جاتی ہیں۔“

”نا میری رانی کوئی ماڑی ہے، ماشاء اللہ سے سارا گھر سنبھال رکھا ہے اس نے، پڑھ لکھ کے کیا کارنامے کر لینے تھے اس نے، وہ تو بڑا اچھا پڑھتی تھی۔ اس کے بابا نے منع کر دیا۔“

چاچی نے فوراً ”پینتہ ابد لا تھا، اماں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں۔ جانتی تھیں اس عورت کی فطرت کو۔ ہر محلے میں ایک ہنگامہ بھیلانے والی عورت ملازمی ہوتی ہے جو باقی اہل محلہ کو یکسانیت اور روریت کا شکار نہیں ہونے دیتی۔ بس چاچی رشیدہ کو بھی یہی اعزاز حاصل تھا۔

”اب مجھے تو بڑا آرام ہے، کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی میری رانی، اور تو ابھی تک سارے کام خود ہی کرتی ہے۔ اب اللہ نے اتنی۔۔۔ مشکلوں

سے اولاد دی ہے تو اس کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔“ رشیدہ چاچی نے پھر سے اماں کے بلے پر نمک چھڑکا تھا۔

ان کا بھی تو یہی ارادہ تھا کہ زینب ذرا قد نکالے تو اسے اپنے ساتھ کام کاج میں لگائیں، جس طرح اس علاقے کی بیشتر عورتیں بیٹیوں کے ساتھ کرتی تھیں، مگر زینب کا بابا بھی نا! اماں نے بظاہر رشیدہ کے خیالوں کی تردید کی، اور جب وہ بیزار ہو کر جانے لگیں اماں نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ جاتے جاتے رشیدہ کو بھی دعوت دے ڈالی۔

”ارے نہیں، رانی نے آج گزوالے چاول بنائے تھے، بنالے ہوں گے۔ اب تو وہی کھاؤں گی بلکہ تجھے بھی بھیجوں گی جا کر ٹیپو کے ہاتھ۔“ کہتے ہوئے وہ ڈیوڑھی پار کر گئیں۔



زینب بہت بیماری اور ذہین بچی تھی۔ جب اپنی توہلی زبان میں ٹونٹیکل ٹونٹیکل پڑھتی تو حقیقت میں کوئی چمکتا تارہ لگتی تھی۔ لیا کو تو دھیر سارا بار آتا ہی تھا، اماں بھی صدقے واری جاتی تھیں۔ بس ایک یہ خیال کہ ”اتنا پڑھنے کا فائدہ“ اماں کی خوشی پر کوڑے کی طرح لگتا۔ مگر آہستہ آہستہ اماں بھی جیسے مطمئن ہو گئی تھیں۔

اور پھر ایک سنہری دھوپ میں ان کے گھر ایک نئی گزنی نے جنم لیا۔ زینب اسکول سے آئی تو بابا کے ہاتھ میں تو لیے میں لیے کسی گزیا سے وجود کو پایا۔

”دیکھ زینب اللہ نے تیرے لیے بہن بھیجی ہے“ بابا جس خوشی سے دمکتا چھو لیے بول رہے تھے وہ قابل دید تھی۔ زینب نے حیرت و خوشی کے ملے جلے تاثرات سے اماں کی جانب دیکھا۔ اماں نے فطرت کے باوجود الوہی مسکراہٹ سے سر ہلایا۔ زینب اس وقت ناچیس جماعت میں تھی۔ اس کی تنہائی۔ ختم کرنے کو اللہ نے اسے بہن جیسی دوست، نعمت اور رحمت سے نوازا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اسے بھی اسکول اپنے ساتھ ہی لے جایا کرتی۔

بھی نرمی آگئی تھی۔



”زہنب پرتو کیوں کھپ رہی ہے اتنی گرمی میں۔“
زہنب شام کے وقت بچوں کو پردھا کر فارغ ہوئی تھی
جب ابانے اسے آواز دی۔
”ابا اس میں کھنے کی کیا بات ہے۔ میں فارغ ہی
ہوتی ہوں۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔“ زہنب نے ہلکے پھلکے
انداز میں وضاحت کی۔

”میں کیا (میں نے کہا) پرتو! تو نہیں سمجھ رہی کہ
کیسے آگے تیری پردھائی کے خرنچے سے ڈر کر تیرا ابا
تجھے پردھائے ہی تا۔“ ابا کے انداز میں فکر مندی اور
معصومیت کو دیکھ کر اسے بے انتہا پیار آیا۔
”نہیں ابا ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ پریشان نہ
ہوں۔“ زہنب نے کہا تو امل بھی ابا کی چارپائی کے
پائنتی پر آکر بیٹھ گئی۔

”نہیں زہنب کے ابا یہ بتا رہی تھی کہ آگے والی
پردھائی یہ مفت میں کرنے کی۔ کیا نام بتا رہی تھی۔“
امل سوچنے لگی۔ ”ہاں وظیفہ۔ اپنی زہنب کو وظیفہ
ملے گا ہر سال۔“ زہنب نے کہا۔ ”امل نے زہنب سے
تقدیق چاہی۔ زہنب نے اثبات میں سر ہلادیا۔
”اچھا، اچھا زہنب کو آٹھویں میں بھی تو ملا تھا
وظیفہ۔“ ابا کو یاد آیا ”خوش رہ میرا بیٹا۔“ ابا نے زہنب
کے سر پر پیار کیا۔



امل کی ہڈیوں میں پہلے والا دم غم نہیں رہا تھا۔
زہنب کو اس کا احساس تھا۔ تب ہی اس نے آدھی
سے زیادہ ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں۔ حج خدیجہ کو
تیار کرتی اسکول سے آکر اگرچہ تھکی ہوتی پھر بھی آٹا
گوندھ کر پھلکے تیار کر لیتی۔ سالن امل پہلے ہی تیار کر
لیتی تھیں۔ زہنب محلے کی دوسری لڑکیوں کے برعکس
تمام کام بغیر زبان چلائے کرتی تھی۔ ورنہ ماں بخولی
جانتی تھیں کہ لڑکیاں کیسے کولہوں کے تیل کی طرح کام
کرتی تھیں اور لڑکر تر زبانیں بھی چلاتی تھیں۔ ہر

”ابا یہ بڑی کب ہوگی، میں اسے اپنے ساتھ اسکول
لے جانا چاہتی ہوں۔“ ہر دوسرے دن وہ اس اور
معصومیت سے پوچھتی کہ اب ابا کیسے گئے کہ ”ہاں
زہنب، اب خدیجہ اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ محلے سے
تمہارے ساتھ اسکول جاسکے۔“ حالانکہ زہنب سمجھتی
تھی کہ ابھی تو خدیجہ نے بولنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ لیکن
اسے یہی انتظار تھا کہ جھٹ سے وہ دن آجائے جب
خدیجہ اس کے ساتھ باتیں کرے، وہ دونوں کھیلیں،
ایک ساتھ اسکول جائیں۔

اور پھر دھیرے دھیرے وقت وقت گزر گیا۔ خدیجہ
نرسری کلاس میں داخل ہو گئی اور زہنب پرائمری
اسکول سے ہائی اسکول میں۔ یہ اسکول ایک سال پہلے
ہی پرائمری سے ٹیل اور ہائی اسکول میں بدلا تھا۔ زہنب
اب بڑی ہو گئی تھی اور جہاں اس کی سمجھ داری میں اور
عقل مندی میں اضافہ ہوا تھا وہیں اس کے سکھ داپے
اور خوش اخلاقی کو دیکھ کر امل کے سارے غم جاتے
رہے تھے۔

مس مومین نے زہنب پر بہت محنت کی تھی۔ وہ نوپس
جماعت سے اسے اسلامیات پردھاتی تھیں۔ مس
مومین بچوں کی اخلاقی تربیت پر بہت زور دیتی تھیں۔
زہنب نے ان سے اخلاقیات اور گھر واری سیکھی
تھی۔ زہنب میں سیکھنے کی صلاحیت موجود تھی لہذا جو
کچھ کتابوں سے سیکھتی اسے عملی طور پر اپنی زندگی
میں شامل کرتی۔ وہ ہر سال یا چھ ماہ بعد نیا یونی فارم یا نئی
چیزیں نہیں خرید سکتی تھی۔ مگر صاف شہر یونی فارم
اور تیل لگے بالوں کو چھیا میں گوندھنا تو اس کے اختیار
میں تھا۔ سلیقہ سے دوشے لیے وہ کئی لڑکیوں میں ممتاز
نظر آتی۔ اس نے اپنے گھر کو بھی اپنی محنت سے جنت
بنا دیا تھا۔ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے پودے لگا کر گھر کی
آرائش و زیبائش کر کے اس نے امل کو خوش کر دیا
تھا۔ امل اس کی عقل مندی کی قائل ہو گئی تھیں۔
موسم گرما کی چھٹیوں میں اس نے محلے کے بچوں کو
یوشن پردھانا شروع کر دیا۔ امل نے پہلے تو منع کر دیا مگر
پھر مان گئیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی طبیعت میں

چاول بھجھتے ہوئے اماں نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر دیکھا تو ٹھٹھک گئیں۔ گندی رنگت بڑی بڑی آنکھیں اور درمیان سے مانگ نکالے بالوں کی چوٹی باندھیے وہ عام سے حلیمے میں بھی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اماں نے نظروں ہی نظروں میں بلا میں لیں جبکہ زینب اماں کی نظروں سے خائف ہو کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔

شام سیاہ رات میں مدغم ہو رہی تھی۔ دیواروں میں چھپے جھینگروں کی آوازیں عجیب سی سنسنیٹ پھیلا رہی تھیں۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے پھر سے تسلی کرنی چاہی کہ اماں گہری نیند سو رہی ہیں۔ ان کی بائیں طرف والی چارپائی پر خدجہ لیٹی تھی۔ ابامغرب کی نماز کے بعد اسے دو ستوں یا دیواروں کے پاس تھے۔ وہ مطمئن تھی، کٹنگی گھبرا کر پردے کے پیچھے سے اس نے ہاتھ بڑھایا اور ساتھ ہی سرگوشی بکھرا انداز میں تنبیہ کی۔

”یہ لے جاؤ لیکن اپنی اماں کو نہ بتانا کچھ بھی اب جلدی سے جاؤ۔“ دروازے کے باہر کھڑے لڑکے نے ہاتھ بڑھا کر شارب۔ لپٹا اور چلا گیا۔ وہ آگے بڑھ کر دروازہ بند کرنے والی تھی جب سامنے ابا کو دیکھ کر اس کے قدموں تلے زمین سرک گئی۔ اسے لگا ابا بھی اسے بالوں سے پکڑیں گے اور زمین پر پڑ جائیں گے مگر ابا۔۔۔ وہ کچھ کے بغیر صحن میں چھٹی چارپائیوں میں سے ایک کی طرف بڑھ گئے اور وہ مرے مرے قدموں سے کمرے کے اندر چلی گئی۔ ابا کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس میں بس نے تو اپنی طرف سے بہت احتیاط سے سب کیا تھا مگر پھر بھی۔۔۔ گرم سال اس کے گالوں پر بننے لگا۔ وہ بے بسی سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

اگلی صبح عجیب تھی۔ ابا نے اس کی طرف دیکھا تھا نہ کوئی بات کی تھی۔ اماں معمول کے مطابق نارمل موڈ میں تھیں۔ مگر شام کو واپسی پر ابا نے جو فیصلہ سنایا، وہ اس کی روح کھینچنے کو کافی تھا۔

”آپ نے اتنی جلدی فیصلہ کر لیا۔ مجھے تو لگا تھا“ وہ تین ہفتے تو کہیں نہیں گئے۔“ اماں خوشی اور حیرانی کی ملی جلی کیفیت میں بول رہی تھیں۔

دوسرے گھر کا یہی ماحول تھا مگر زینب کو اس کی بڑھائی نے زبان چلانا نہیں سکھائی تھی نہ ہی ابا کے اعتماد نے اسے بد لحاظ کیا تھا۔ اماں زینب سے مکمل طور پر مطمئن تھیں۔

زینب کے میٹرک کا رزلٹ آگیا تھا اور امید کے صحن مطابق اس نے اپنے علاقے میں ٹاپ کیا تھا۔ ابا کا تو بس نہ چلتا تھا ورنہ اپنا پیٹلا بیچ کر پورے قصبے میں مٹھالی بانٹ دیتے۔ اماں کی خوشی بھی دیدنی تھی اور وہ بخوشی زینب کا کالج میں داخلہ کرا دیتیں مگر ان دنوں اماں کی خالہ زاد بہن اسے بیٹے کا رشتہ لے کر آگئی۔ ابا نے توصیف انکار کر دیا لیکن اماں کی یہی خواہش تھی کہ بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دیے جائیں۔ اسکول میں ٹاپ اور بڑھائی کی اہمیت اپنی جگہ مگر بیٹی کے ہاتھ بھی تو پیلے کرنے ہی تھے اور جب اتنا اچھا رشتہ گھر چل کر آجائے لڑکے نے میٹرک کر رکھا تھا اور اس کی قریب ہی گاؤں میں کریانے کی دکان تھی اور پھر دیکھنے میں بھی خوش شکل اور خوش اطوار تھا پھر بھلا اور کیا چاہیے تھا مگر ابا کو کون سمجھاتا۔ وہ چاہتے تھے کہ زینب مزید تعلیم حاصل کرے ابھی کون سا اس کی عمر نکلی جاتی ہے۔ ابا کا موقف بھی ٹھیک تھا۔

”ارے وہ لوگ تو یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ زینب شادی کے بعد جتنا چاہے پڑھ لے۔“

اماں نے یقیناً ”ابا کا موقف ان تک پہنچایا تھا۔ وہ لوگ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے مگر زینب کی تعلیم پر انہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ ابا سوچ میں پڑ گئے اور کچھ وقت مانگ لیا۔ اماں کی مراد یہ کہنے والی تھی۔ ظاہر ہے وہ ماں تھیں، بچیاں جتنے بھی وظیفہ اور ڈگریاں حاصل کر لیں، جب تک وہ باعزت طریقے سے اپنا گھر نہ بسائیں، ماؤں کو چین نہیں آتا۔ اور یہاں آکر شہری دیہاتی ماں کی تھپوری ایک ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

زینب کچھ دنوں سے مضطرب نظر آرہی تھی۔

”میں نے سوچا، دو چار ہفتوں بعد بھی یہی فیصلہ کرنا ہے تو ابھی کیوں نہیں تو نکاح کی تیاری کر۔“ ابا نے سادگی سے کہا کراہاں ٹھک گئیں۔

”دیکھ تاج دین! تو نے کسی پریشانی میں تو یہ فیصلہ نہیں کیا۔“ ماں نے فکر مند ہی پوچھا۔

”اری! اونیک بخت! پریشانی والی کیا بات ہے۔ اللہ رحم کرے، مجھے بھی اپنی بیٹی کی خوشی عزیز ہے۔“ اب کی بار ابا نے ذرا خوش نظر آنے کی کوشش کی۔

دوسری طرف زینب پریشانی سے بڑھ چلی تھی۔

اسے ایسا یہ توقع نہیں تھی۔ وہ ابا کو وضاحت دے سکتی تھی مگر ابا نے اس سے کوئی وضاحت مانگی ہو تب نا۔ اسے ابا کے فیصلے پر اعتراض نہ تھا مگر ابا کے فیصلے کے محرک پر اعتراض تھا۔ ابا کے کہنے پر وہ کسی اندھے لنگڑے سے بھی شادی کر لیتی۔ مگر اس طرح سے نہیں۔ خود کو ابا کی اور اپنی نظروں میں مجرم سمجھتے ہوئے تو ہرگز نہیں۔

زینب نے چاچی رشیدہ کی بڑی بیٹی کی شادی پر جو سوٹ پہنا تھا وہ بڑا نفیس تھا اور تب ہی سے رانی کی اس پر نظر تھی۔ چند دن پہلے جب ابا رانی کے شکرانہ کی مبارک باد دینے گئیں تو چاچی نے زینب کے اس سوٹ کی بابت پوچھا تھا اور اگلے ہی دن رانی کو لے کر ابا کے پاس آچھیں کہ شادی پر پہننے کے لیے زینب کا وہ سوٹ ادھار مل جائے، ماں بہت حیران ہوئیں کہ اس بال بچوں والی کو زینب کا ماپ کسے آئے گا۔ مگر چاچی کا خیال تھا کہ آج کل کھلے اور لمبے سوٹوں کا رواج ہے تو اسے کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ قند کاٹھ میں بھی ان کی بیٹی زینب جتنی ہی تھی، ”ماں! تذبذب کا شکار نظر آئیں تو انہوں نے یہ پیشکش دی کہ وہ آدمی قیمت پر سوٹ ان کی ہی کو بی دے دیں۔ اور ماں۔۔۔ اول تو وہ یہ سوٹ دینے کو تیار نہ تھیں اور اگر راضی ہوتیں بھی تو چاچی رشیدہ جیسی عورت کو بھی نہ دیتیں جن کا محلے بھر میں کوئی اعتبار نہ تھا۔ سوال ماں نے دس لفظوں میں انکار کر دیا۔ زینب کو پتا چلا تو اسے افسوس ہوا کہ ابا نے ایسے کیوں کیا۔

کچھ ہی دن گزرنے کے بعد رانی کا چھوٹا بھائی جو غالباً ”کسی چھوٹے سے نجی اسکول میں جاتا تھا“ زینب سے چھٹی جماعت کی کتابیں لینے آیا۔ اب کی بار بھی ابا نے یہی کہا کہ اگر کتابیں چاہئیں تو آدمی قیمت میں مل جائیں گی۔ زینب کو بے حد افسوس ہوا، کیوں کہ زینب کو ہر سال مفت کتابیں ملتی تھیں۔ اب کی بار زینب چپ نہ رہ سکی۔ ابا نے نجانے کیوں رشیدہ چاچی سے خائف تھیں۔ زینب کو یہی لگتا تھا ”زینب یقیناً“ ابا کی طرح چاچی کی فتنہ پرداز طبیعت سے ناواقف تھی۔

لہذا جب ابا ٹیو (رانی کا چھوٹا بھائی) کو صاف انکار کر کے غسل خانے کی طرف بڑھ گئیں تو اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر اسے روکا اور کہا کہ وہ پرسوں شام کو آکر کتابیں لے جائے مگر گھر میں کسی کو نہ بتائے اسے ابا کا ڈر نہ تھا کہ انہیں تو وہ کسی طرح سمجھا ہی لیتی بس وہ خفا ہوتے کہ وہ اپنی ماں کو بتائے بغیر سب کر رہی ہے اور پرسوں شام وہی ہوا جو وہ نہیں چاہتی تھی۔ ابا گھر پر موجود نہ تھے مگر چاچا ایک آگے اور انہوں نے یقیناً ”اس کی باتیں بھی سن لی تھیں۔ اس نے تو ٹیو کو خبردار کیا تھا کہ وہ چاچی کو نہ بتائے ورنہ وہ ابا سے آکر ذکر ضرور کر تیں اور پھر ابا اس کی جو شامت پلا تیں وہ الگ۔ مگر شامت تو اب بھی اس کی ہی آئی تھی۔ اسے افسوس تھا کہ ابا کو اس پر شک تھا۔ وہ اس پہ اعتبار نہ کرتے تھے تب ہی آنکھوں دیکھی، بلکہ ادھوری دیکھی سنی کوچ سمجھ کر جلدی میں نکاح کر دیا تھا وہ افسوس نہ کر لی تو کیا کر لی۔



”تاج دین! یہ صابر کی دو بہنی (بوی) ابھی کیا بکواس کر کے گئی ہے۔ بے شرمیوں کی طرح میری زینب پر کیا الزام لگا کر گئی ہے۔“ ابھی کچھ دیر پہلے رشیدہ چاچی آئی تھی اور زینب کے بارے میں حد سے زیادہ بکواس کر کے گئی تھی، ”ماں! کو حیران و پریشان چھوڑ کر۔“ تو اس کی باتوں میں نہ آئیں نے دماغ ٹھکانے لگا

دیا ہے۔ اب نہیں آئے گی اور حرجب تک معافی نہ مانگ لے۔ ”غصہ تو ابابو کو بھی بہت تھا بلکہ ان حالات کا اندازہ تھا۔ جب ہی رشیدہ کو ٹھیک ٹھاک سزا دی تھیں۔

”تب ہی میں کموں، تجھے کیسے اتنی جلدی بیٹی کی شادی کا خیال آگیا۔ وال میں کچھ تو کالا ہوگا۔ ہم نے تو زہنب کی تربیت ایسی نہیں کی تھی۔ اس کے سرال والے کیا سوچتے ہوں گے ایسی ہنگامی شادی کرنے پر۔“ اماں یقیناً اور بے یقینی کی کیفیت میں تھیں۔

”او، کچھ سوچ سمجھ کر بولا کر، تیری بیٹی ہے وہ تجھے نہیں بتا اس فلسفی (شادی) عورت کا۔ ہماری زہنب کبھی کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کر سکتی۔“ ابابو یقین لہجے میں بولے تھے اور کمرے کے دروازے کے پار کھڑی زہنب کے دل سے منوں بوجھ اتر ا تھا۔

وہ اپنے کالج میں داخلے کی خبر اماں کو سنانے آئی تھی۔ ماجد کے گننے پر ہی اسے آتا ہوا دروازہ ابابو کی۔ بے اعتباری نے تو زہنب کی طرف سے اس کا دل برا کر دیا تھا اس کا شوہر کچھ۔ دیر پہلے ہی اسے یہاں چھوڑ گیا تھا مگر اماں ابابو کی آمد سے بے خبر اپنی بحث میں پڑے ہوئے تھے۔

”اماں! وہ جھٹ سے ابابو کے سینے سے جا لگی۔ اماں پھرے اس صورت حال پر پریشان ہو گئیں۔

”آپ نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا، آپ کو اندازہ نہیں میں کتنی پریشان تھی اور پھر آپ نے اس طرح سے کیوں میری شادی کر دی؟“ آنسو پیٹتے ہوئے اس نے ابابو سے شکوہ کیا۔

”نہ میری بیٹی! ایسی بات نہ کر۔ صابر کا لڑکا تو پہلے ہی میرے پاس آیا تھا میں نے اسے کہا تھا کہ زہنب باپ سے پوچھ لے کتابوں کا جا کر پڑا میں نے تجھے کچھ کہا تھا بھلا؟“ ابابو اطمینان سے ساری کہانی سنا رہے تھے۔

”اور جہاں تک بات ہے ہنگامی شادی کرنے کی تو بہت ضروری تھا یہ اس رشیدہ نے اپنے خاوند سے اپنے بیٹے کے لیے زہنب کے رشتے کی بات بھی کہلوائی تھی میرے پاس اور اس شام میرے آنے

سے پہلے رشیدہ ہمارے دروازے پہ پہنچی ہوئی تھی، بیٹا! تیری بھی تو غلطی تھی نا کہ تو نے شام دہانے اسے کتابیں لے جانے کا کہا۔“ انہوں نے زہنب کی غلطی کی بھی نشاندہی کی تو زہنب شرمندگی سے سر جھکا گئی۔

”مجھے پتا تھا اس نے اپنے بندے (شوہر) کو پٹیاں بڑھا کر پورے جگ میں تماشائگان دیا تھا ہمارے خلاف الٹی سیدھی باتیں پھیلا کر۔ اور اب دیکھ جیسے ہی زہنب کے نکاح خبر ملی فوراً“ ان کی وہ فساد مچانے۔“

”جھلاتم لوگ مجھے بھی بتا دیتے ہیں معاملے کو دیکھ لیتی۔“ اماں کو اپنی بے خبری کا دکھ ہوا۔

”او چل چھڑو دیوے“ کھے (مٹی) پاپا ہن ساری گل تے، زہنب دھیمے خوش تو ہے نا میں نے کہیں زیادہ جلدی بازی میں کوئی غلطی تو نہیں کر دی۔“ ابابو یکدم زہنب کی فکر ہوئی۔

”نہیں ابابو مجھے پہلے بھی آپ دونوں کے کسی فیصلے پر اعتراض تھا نہ اب ہے میں بہت خوش ہوں اور یہی تو بتانے آئی تھی کہ ماجد نے میرا کالج میں داخلہ بھیج دیا ہے۔“

”شکر ہے میرے رب دا“ اس نے ہم غریبوں کی لالچ رکھی۔“ ابابو بہت خوش ہوئے تھے۔ اماں نے بھی بیٹی کو گلے لگا لیا۔

”اماں! خدیجہ نظر نہیں آ رہی۔“ زہنب کو یکدم اس کی کمی محسوس ہوئی۔ ”اسکول گئی ہے تو اپنے آنے کا بتا دیتی تو میں چھٹی کر دیتی اس کی آج۔“

”نہیں کوئی بات نہیں میں شام تک یہیں ہوں، مجھے تو یہ ڈر تھا کہ میں میری وجہ سے آپ لوگ خدیجہ کا اسکول نہ چھوڑا دیں۔“

”میں دھیمے آئندہ ایسی بات نہ کہتی تھی۔“

تم دونوں تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔ تم لوگوں پہ کیوں بے اعتباری کرنی، مجھے اپنی تربیت پہ کوئی شک نہیں۔“ زہنب کھلے دل سے مسکراتی تھی اور اماں ابابو نے بھی مسکراہٹ میں اس کا ساتھ دیا۔



تقسیم ہند کے فسادات میں گوجرانوالہ کے رہائشی تیرہ سالہ برکت اللہ کے تمام گھروالے کام آگئے تھے۔ صرف اس کی ماں اور دو بیٹے گئے۔

ان ہی دنوں گھنٹو کے نواب خاندان کی ایک بیگم اپنے وفادار کوچوان اسماعیل کی مدد سے اپنے کم سن بیٹے کے ساتھ جان بچا کر برکت اللہ کے گاؤں پہنچی۔ جہاں برکت اللہ کی ماں نے انہیں پناہ دی۔ دونوں خواتین اور ان کے بچوں میں دوستی ہو گئی۔ دونوں نے اپنے بچوں کی شادیاں بھی ایک ہی خاندان میں کیں۔ برکت اللہ کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ نواب حسین خان کے دو بیٹے عائشہ اور شارق تھے۔ عائشہ اور جمال ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے مگر نواب حسین خان نے نوابی کے زعم میں برکت اللہ کے بیٹے کا رشتہ ٹھکرا کر انڈیا میں مقیم اپنے رشتہ دار نواب تبرک حسن خان کے انتہائی مال دار گھرانے میں عائشہ کی شادی کر دی۔

انڈیا سے بارات آئی تو دودھا اس میں شامل نہیں تھا۔ بتایا گیا وہ بیمار ہے۔ نکاح ٹوکی کو انڈیا لے جا کر کیا گیا۔ عائشہ کا شوہر نیم پاگل تھا جس کا علم نواب صاحب کو نہ ہو سکا۔ عائشہ پاگل شوہر کا تشدد برداشت نہ کر سکی اور ایک بچے کو جنم دے کر چل بسی۔ بچے چھپا لیا گیا۔ جب حسین خان بیٹی سے ملنے انڈیا پہنچے تب انہیں پتا چلا۔ کوچوان اسماعیل نے جان پر کھیل کر نواب صاحب کا نواسا ان تک پہنچا دیا۔ نواب تبرک حسن خان دیوانہ وار پوتے کو ڈھونڈتے رہے مگر ناکام رہے۔ نواب صاحب نے برکت اللہ سے دوبارہ دوستی قائم کرنے کی غرض سے اپنے بیٹے کا رشتہ اس کی بیٹی سے طے کر دیا مگر اس بار بیٹے نے انکار کر دیا۔ یوں بچپن ادھیر عمری تک کی دوستی سرد جنگ میں بدل گئی۔ البتہ دونوں گھرانوں میں تعلقات بحال رہے۔ نواب صاحب کا بیٹا ایک فضائی حادثے میں اپنی بیوی اور بچے سمیت ہلاک ہو گیا۔

نواب صاحب کاؤں کا گھر چھوڑ کر ایک کالونی میں آجے جہاں کچھ عرصے بعد اتفاق سے برکت اللہ بھی ان کے ہمسائے بن کر آ گئے۔ دونوں بزرگوں کی سرد جنگ سے پوری کالونی واقف تھی۔ برکت اللہ کی پوتی حرم اور نواب صاحب کے نواسے احرار نے دونوں بزرگوں کی دوستی پھر سے کرائے کی ٹھانی۔ حرم اور احرار دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔

ام طیفور

دوسری اور آخری قسط

سپاس ملن کی رت



مکمل ٹاول

ان کے ہمراہ تھے۔ بیس سالہ بیٹی سے لے کر سب سے چھوٹے پانچ سالہ بیٹے تک سب کے سب ایک لائن میں پھوپھو کے شانہ بشانہ کھڑے تھے۔ ایک طرف چار فل سائز سوٹ کیس دھرے تھے جو پھپھو کے قریب تھے۔ پھوپھو کی عادت تھی کہ چاہے پندرہ دن رکنا ہو تا، سامان وہ مہینے کا باندھ کر لاتی تھیں۔

اس دفعہ بھی ایسا ہی ہونے والا تھا، مگر فی الحال تو وہ پورے جوش و خروش سے ماری باری گھر کے ایک ایک فرد سے گلے مل رہی تھیں۔ بھابیہوں سے ملنے کے بعد جب وہ بے جی کے گلے لگیں تو فرط جذبات سے رو دیں۔ پہلے ذرا جیسے سروں میں اور پھر تان اونچی ہوتی چلی گئی۔ بے جی کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔ آخر بیٹی اتنے ماہ بعد آئی تھی، مگر فوزیہ پھوپھو کا سیشن ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ وہ عید ملنے کے انداز میں پہلے بے جی کے داہنے کندھے پر سر رکھ کر روتیں۔ دو جھٹکے کھاتیں اور پھر ماتیں کاندھے پر سر دے مارتیں۔ بے جی بے چاری ان کا سر ناک پر لگنے کے ڈر سے ناک کی سیدھ میں دیکھے جا رہی تھیں۔

ان ہی سوچوں میں غرق اپنے بستر میں لیٹے لیٹے اس نے ساڑھے نو گھنٹے تھے اور ابھی اس کا لیٹاف سے نکلنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ ایک گہری بو جھل سانس اندر کھینچتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی تو کانوں میں ہلکے ہلکے شور کی آواز آئی جو رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے

یہ اعلان کر رہا تھا کہ باہر فوزیہ پھوپھو — آ چکی ہیں۔ سب کے ملنے ملانے کی آوازیں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ ایک دھیمی سی مسکان نے اس کے ہونٹوں کو چھوا۔ اس وقت فوزیہ پھوپھو کا آنا اسے اچھا لگا تھا۔ دل پر جو ایک بے نام سی اداسی طاری تھی وہ ضرور چھٹی محسوس ہوئی تھی۔ وہ سستی جھاڑنی الماری میں سے کپڑے نکال کر واش روم میں جا گھسی۔



باہر بڑے سے صحن میں وہ قیامت کا شور مچا ہوا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہر کوئی اپنی بین بجائے جا رہا تھا۔ فوزیہ پھوپھو پورے چھ ماہ بعد آئی تھیں اس دفعہ۔ اور اس دفعہ پورے چھ بچے



جتا نہیں سکتیں کہ وہ آپ سب کو کتنا یاد کرتی ہیں۔“
 ”واہ جی واہ۔“ بیگم جمال اور بیگم اجمل نے فوراً
 مرعوب ہو کر سر دھننے لگے۔ آٹھویں پاس پھوڑی نے

کتنے اشاکل سے فقرے میں انگریزی کے تروپے
 (ٹانکے) لگائے تھے۔ ان کے خود کے بچے اتنا پڑھ لکھ
 گئے تھے بروہ ایسا کمال کبھی نہیں دکھائی تھیں۔
 بے جی نے ناک چڑھا کر بیٹی کو گھورا اور منہ ہی منہ
 میں بدبوائی۔

”ناکل دی پتہ۔“ اب بھلا سوؤں کے سامنے بیٹی کو
 کیا نوکریں۔ البتہ میاں جی نے حقہ ٹھیک کر قریب
 کیا اور ایک بھر پور کش لے کر فخر سے بیٹی کو دیکھتے
 ہوئے بولے۔

”اے میری دھی شروع توں ہی لیت (لائق)
 سی۔“

میاں جی کی کھانسی سے مشابہہ نہیں نے باقی سب کو
 بھی ہنسا دیا بشمول کینڈی کے۔ جس کو پھوپھو نے
 کھسایا تو ہوئے شوکار کر بیٹی اندر کروائی۔ بے جی
 نے میاں جی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں گھر کا تو ان کی
 ہنسی کے انجن کو بریک لگا۔ بے جی نے مسکراہٹ
 دہاتے ہوئے بیٹی کو پکارا۔

میری بچی۔ ہم بھی تمہیں بہت یاد کرتے تھے۔
 چل چھوڑ ساری باتیں۔ مجھے یہ بتا کہ تجھے انگریزی کا
 ٹیکہ کس نے لگا دیا اپنی کینیڈا والی منہ کا جو ٹھا کھالیا
 ہے۔

”اؤنوبے جی۔ ابھی میں نے ڈیڈ نہیں ہونا جو منہ کا
 جو ٹھا ایٹ کر دیا۔ اصل میں مسٹر ارشد (شوہر) نے
 کینیڈا اشفت ہوئے کارو گرام بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں
 کہ پہلے خود ہیٹ ہو جائیں تو پھر ہم سب کو بھی بلا لیں
 گے۔ اس لیے اب ہم سب ہوم میں ہی انگریزی
 اسپیک کرنے کی پریکٹس شروع کر رہے ہیں۔ یہ
 اپنی کینیڈی تو اتنی پرانی (بیاری) انگلش بولتی ہے کہ
 بس! ابھی ادھر آئے ہوئے ایک ڈنکی کا روالا (گدھا
 گاڑی) ہماری چنگ چکی کے فرنٹ میں آگیا ایک دم۔
 اس سے پہلے کہ چنگ چکی والا اور ڈنکی کا روالا آپس

جب تیسری سے چوتھی مرتبہ پھوپھو کا سر بے جی کے
 دائیں کانڈھے پر اٹا تو انہوں نے پھوپھو کی گدی پر
 ایک ہلکا ہاتھ جمایا اور بولیں۔

”اے مونڈھا تیرے پودا اے جنوں تروٹن لگی
 ہوئی اس۔ پھوڑی!“ (یہ کندھا تمہارے باپ کا ہے
 جس کو توڑنے لگی ہوئی ہو۔ فوزیہ)

”بے جی! فوزیہ کال کیا کریں۔“ بچے گرو
 (برے) ہو گئے ہیں۔ پھوپھو کا نام بچپن سے گھر والوں
 نے بگاڑ کر پھوڑی کر دیا تھا اور اب تک یہ نام باقی سب
 کے منہ سے تواتر گیتا تھا مگر بے جی اور میاں جی آج بھی
 اسی نام سے تے تھے۔ جو فوزیہ پھوپھو کو تیری کی طرح
 لگتا۔ ابھی بھی براہ راستے ہوئے بے جی کو تھپا۔

فوزیہ پھوپھو جذبات پر قابو پاتے ہوئے وہیں دھپ
 سے بے جی کے پلنگ پر براجمان ہوئیں تو باقی افراد بھی
 کرسیاں ٹھیک کر ارد گرد ہی بیٹھ گئے۔ بچوں کا ٹولا
 صحن کے دوسری طرف دھاجو کڑی مچانے میں مشغول
 ہو گیا۔

فوزیہ پھوپھو کی سب سے بڑی بیٹی قندیل عرف
 کینڈی بھی قدرے نزاکت کے ساتھ ماں کے ساتھ
 ٹانگ پر ٹانگ دھر کر بیٹھ چکی تھی۔ فوزیہ پھوپھو نے
 پورے اشماک سے کینڈی کی لمبے کا پرنٹ تازنی
 بیگم جمال کے گھٹنے پر زور دار دھپ رسید کی تو پرنٹ
 میں کھجی ان کی ”آنکھیں“ گرتے گرتے پھیں۔ بے
 چاری بوٹھلا کے منہ کا منہ دیکھنے لگیں۔

”الٹو! بھابھی! میں کیا نیل کر رہی کہ میں کتنا
 رعبہ مہر کرتی ہوں آپ سب کو۔“

فوزیہ پھوپھو کی بات پر ارد گرد بیٹھے سب ہی افراد
 کے منہ سے نا سنجی والا ”اُمس“ یوں نکلا تھا جیسے انڈین
 ڈراموں میں ایک چھینک مارنے کے بعد دو منٹ تک
 دھن دھن دھن ہوتی رہتی ہے۔

”ہیں بی پھوڑی۔ اے کی بولی اس تو۔“ بے جی
 نے ابرو اچکا کر فوراً سوال کیا۔ جواب کینڈی کی طرف
 سے آیا۔

”وہ اصل میں امی کے کہنے کا مطلب ہے کہ وہ

ہوئے تھے۔ فوزیہ پھوپھو نے ان دونوں کے گلے لگ کر بھی آنسو بہانے کی کوشش کی تھی، مگر تھوڑی دیر پہلے تو ہتھ پتھتے لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں تو اب ایک دم

میں فائٹ کرتے۔ میری کینڈی نے دونوں بینڈز اٹھا کر اتنے اسٹاکل سے بولا۔ ”اٹاپ۔ اینڈ گو ٹو ہیل۔“

اللہ! کچھ نہ پوچھیں بے جی۔ میاں جی! ایسے سب نے ٹرن ٹرن (مزمن) کر میری کینڈی کو دیکھا۔ فوزیہ پھوپھو نے بے حد خراور لاڈ سے اس بیٹھی۔ اٹھلائی اور انگلی پر بالوں کی لٹ کا نفل بتائی کینڈی کی تھوڑی کو چھوا تھا۔ ہونق سی میر عوبیت ہوز بیگم جمال اور اجمل کے چہروں پر چھائی تھی جب کہ بے جی نے فوزیہ پھوپھو کو بغور سر سے پیر تک دیکھا اور میاں جی سے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

”میں نے کہا جی۔ ایہ ڈنگی کار کیٹری ہے۔“

”کھو تار بڑھی۔“ میاں جی نے بڑی متانت سے ایک ابو اچکا کر حقے کی نے منہ میں دبا کر اور دھیسے دھیسے گردن ہلا کر جواب دیا تھا۔ بے جی نے ناک چڑھا کر ”اس“ ڈلی شکل بتائی اور فوزیہ پھوپھو کا ایک بار پھر سر سے پیر تک جائزہ لیا اور لہجے کو سرسری بناتے ہوئے بولیں۔

”ہیں نی پھوڑی۔ اتو کنے دن رہتا ہے۔“

”دن منتہ یعنی ایک ماہ۔“ فوزیہ پھوپھو نے لاہوائی سے جواب دیا اور برآمدے کی بیڑھیاں اترتی حرم کو دیکھ کر جھٹ اٹھ کر اس کی طرف بڑھ گئیں۔ بے جی نے ایک لمبا اور ٹھنڈا سانس فضا میں چھوڑا جب کہ میاں جی نے انہیں مزولیتی نظروں سے دیکھا اور انداز کر آتی ہستی کو حقے کی نے تلے دیائے اسے زور زور سے گڑ گڑانے لگے۔ دونوں بھابھیاں ”مریدوں“ سی شکل لیے منہ کے کھلنے پینے کا خصوصی انتظام کرنے کچن میں جا گھسی تھیں۔



دوپہر کا کھانا کھا کر سب تسلی سے بیٹھے تھے۔ لاؤنج میں ہی محفل جی تھی۔ فوزیہ پھوپھو کی وجہ سے گھر کے سب مرد بھی کھانے کے وقت موجود تھے۔ جمال اور اجمل صاحب بھی بہن کو دیکھ کر بے حد خوش

سے آنسو کہاں سے دیدار کرواتے۔ لہذا دوچار سسکیاں بھر لینے پر اتکا کیا۔ کھانے پر خاصا اہتمام تھا۔ چنبلی کباب جو پھوپھو کو بے حد مرغوب تھے وہ بطور خاص بھابھيوں نے بڑی محبت سے منہ کے لیے بنائے تھے۔ اس کے علاوہ زکسی کو فتنے بھی مینو کا خاص آئٹم تھے۔

میاں جی دوپہر کو کھانا نہیں کھاتے تھے۔ گرمیوں میں لسی اور سردیوں میں گرم گرم دودھ پیتے تھے۔ خوب سیر ہو کر۔ اب جو کھانا شروع ہوا تو پانی سب تو فرشی دسترخوان کے گرد بیٹھے تھے جب کہ میاں جی پیچھے صوفے پر۔ شو مئی قسمت فوزیہ پھوپھو ان کے بے حد قریب تھیں۔ ایک کباب ان کی بھری ہوئی پلیٹ سے اٹھایا۔ ایک کوفتہ بھی اچک لیا۔ فوزیہ پھوپھو کن اکھیوں سے دیکھتیں۔ اپنے ایک کباب اور کوفتے پہ صبر کرتی۔ ذرا سا رخ موڑ کر دوپہری طرف بیٹھی، اور بس بھائی کی بیوی ٹوپیا سے باتیں مضارنے لگیں۔ اس دفعہ وہ الرٹ تھیں۔ جیسے ہی میاں جی نے ایک لمبی سی ڈکارے کر ان کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو پھوپھو نے لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر پلیٹ ان کی پہنچ سے دور کر دی۔

”کیا میاں جی۔! فوہ نو بولتے ہوئے بھی آپ ماشاء اللہ سے کتنے ہی کباب اور کوفتے پلیٹ گئے۔ اور پوچھنے پر آپ بولیں گے کہ میں لچ تو ٹیک کرتا ہی نہیں۔ اب یہ میرا فاسل (آخری) کباب اور کوفتہ ہے۔ ان پر تو آپ لگ بھی نہ ڈالیں۔“ فوزیہ پھوپھو نے دوپٹی کی آڑ سے کراہی پلیٹ کو محفوظ کیا تھا۔

”دوپا غلے۔! میں نے تو تیرا ہی بھلا کیا ہے۔ شیدا سین نہ ہووے تہ۔ یہ کباب اور کوفتے دوڑے کے قیے کے ہیں اور تو رہنے والی اچھرے کی۔ تم لوگ عادی ہو ”کھوتے“ کھانے کے۔ گائے کا قیرہ کھا

کر کہیں تیرا (سانس) اٹھانہ ہو جائے نکلیاں جی چڑاتی ہوئی نظروں سے ہٹی کو دیکھ کر بولے۔
فوزیہ پھوپھو خشکیوں سے انہیں دیکھے گئیں۔ پھر بے جی کو متوجہ کرتے ہوئے بولیں۔

”لگ کریں بے جی۔ کیسے میاں جی ہم ”لاہوریز“ کو باتیں سنا رہے ہیں۔ اسپورنٹ (لازی) تو نہیں نا کہ پورے لاہور نے ڈنگی کھائے ہوں۔“

بے جی نے نوالہ نگل کر پانی کا گھونٹ بھرا اور پرسوج انداز میں فوزیہ پھوپھو کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

”ویسے پھوزی۔ پچھلی واری اسی جب تیرے گھر آئے تھے لاہور۔ تیرے شہر اپتا۔ لیکن واسطے اس ویلے تیرا کھسب عجیب کھوتیاں والیاں حرکتیں کرتا تھا۔ چھلانگ مار کر کبھی اندر تے کبھی باہر۔ ہنستا تھا تو بیچارے کے گلے سے کھوتے کی آوازیں آتی تھیں۔“

بے جی کی بات پر گھر کے سب ہی افراد کھلکھلا کر ہنس دیے۔ وہ سب ایسی صورت حال کے عادی تھے اس لیے انجوائے کر رہے تھے۔

بیگم جمال نے ایک کباب اٹھا کر اور بیگم اجمل نے ایک زرگسی کوٹہ اٹھا کر فافٹ روٹھی روٹھی سی فوزیہ پھوپھو کی پلیٹ میں رکھ کر ”مریدی“ کا فرض نبھایا۔ فوزیہ پھوپھو نے بھی اتراتے ہوئے ”مذرانہ“ قبول کیا اور چہرہ بھی مٹھل اٹھا۔

ان تمام ہنستے مسکراتے چہروں میں واحد حرم تھی جو پر نظر چہرہ لے جلدی جلدی نوالے نگل رہی تھی۔ اس نے ایک نظر اٹھا کر عیس کو دیکھا، مگر وہ کینہ بن دکھاتے ہوئے مسلسل کینڈی کو دیکھ رہا تھا اور کینڈی پلیٹ دسترخوان سے اٹھا کر ہاتھ میں تھامے ہوئے تھی اور کانٹے سے زرگسی کوٹے کو کبھی اوپر لڑھکاتی تو کبھی ادھر۔ ایک بے نیازی نگاہ گاہے بگاہے عیس پر بھی ڈالتی تھی۔ ایسی ہی ایک ”مست“ نظر میں گوٹنے کو زرا زور کی ”شٹ“ لگ گئی اور وہ بے شرم پلیٹ کی باؤنڈری وال کر اس کرتا پھدکتا ہوا۔ کب

سے قیموں کی طرح بڑے ”مٹو گوشت“ کے سالن میں سونمنگ کرنے کی غرض سے کود پڑا۔ ”ہا۔۔۔ اوسے ہائے۔۔۔“ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ارد گرد بیٹھے کالی لوگ شور بے سے فیض یاب ہوئے تھے اور اب سب کینڈی کو فوکس کیے ہوئے تھے وہ بے چاری ہونق بنی کبھی ہاتھ میں تھامے کانٹے کو دیکھتی تو کبھی کوٹے کو۔ ساری شوخی ”شور بے“ میں ڈوب کے مر گئی تھی۔

حرم نے موقع غنیمت جان کر پاس پر اچھو تاک کے عیس کے گھٹنے پر مارا۔ وہ بے چارہ کینڈی کو بھول کر ”گوڈا“ پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔ حرم کو قدرے غصے سے گھورا تو اس نے جھٹ سے کوئی اشارہ دیا جسے عیس نے سمجھ کر پہلے تو ناک بھوں چڑھائی۔ اس کے بعد اگلے ٹھاد کھا کر ”ڈن“ کا سگٹل دے دیا۔ حرم چپکے سے اٹھی اور لاؤنج سے باہر نکل گئی۔



چھت پر ٹٹل ٹٹل کر اس کی ٹانگیں جواب دے رہی تھیں مگر ابھی تک احرار اپنی چھت پر نہیں آیا تھا۔ اب اس کا نظر طیش میں بدلتا جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگلے پانچ منٹ تک اگر وہ نہیں آیا تو مارے غصے کے اس کا سر بھاڑ ڈالے گی۔

پہلے ہی کم پریشانی تھی جو رہی سی کس فوزیہ پھوپھو کی آمد نے پوری کر دی تھی۔ ان کا آنا وہ معمول کے مطابق سمجھی مگر آج جس وقت وہ فریش ہو کر فوزیہ پھوپھو سے ملنے صحن میں گئی تھی۔ انہوں نے اس کے گل چوم چوم گھسا ڈالے تھے۔ اسے اچھا بھوا تھا۔ اتنی دلاری تو وہ پھوپھو کی کبھی بھی نہیں رہی تھی اور پھر کینڈی نے گلے لگتے ہوئے چند سیکنڈز میں جو کچھ اس کے کان میں انڈیلا۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ فوزیہ پھوپھو اپنے جیٹھ کے بیٹے کا رشتہ لائی تھیں۔ وہ بھی پوری تیاری کے ساتھ۔ ان کے قیام کے دوسرے ہفتے میں ان کے جیٹھ اور جھٹانی باقاعدہ رشتہ لانے والے تھے۔ تب سے وہ

”نہیں۔ تم نہیں۔ تمہارے پیچھے تمہاری کزن کھڑی ہے۔ اس کو بولا۔“ وہ حرم کے عقب میں دیکھتے ہوئے بھرپور سنجیدگی سے بولا۔ وہ بے چاری بری طرح گھبرا کر پیٹی بکری پیچھے کوئی ہوتا تو دکھائی دیتا۔ حرم خفا سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی تھی جب احرار نے ایک جھٹکے سے اس کی کلائی تھام کر روکا تھا۔

”ناراض ہو کر جاری ہو۔؟“

”نہیں۔ میں بھلا کیوں ناراض ہونے لگی۔ حالات کسی بھی رنج پر چلے جائیں۔ ناراضی کیسی! آدھے گھنٹے سے خوار ہو رہی ہوں چھت پر۔ مگر تمہیں پرواہی نہیں۔ ناراضی کیسی؟ گھر میں پھوپھو میرا رشتہ لے کر پہنچ گئی ہیں۔ منظور ہو گیا تو کیا؟ ناراضی کیسی۔؟“ وہ روہائی ہوئی بولے چلی گئی۔ پھر ہاتھ چھڑا کر وہیں مازیل کے پیچ پر ٹنگ گئی۔ آنکھوں میں نمی تھی۔ جنہیں وہ پلکیں جھپک جھپک کر چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ احرار بے چین سا ہو کر اس کے قریب پہنچوں کے بل بیٹھ گیا تو بولا۔

”اچھا سوری۔ قسم سے مجھے نہیں معلوم تھا کہ مسئلہ اتنا گہیر ہے۔ اور جہاں تک چھت پر دیر سے آنے کا تعلق ہے تو مجھے ابھی ابھی تو عمیمس نے تمہارا پیغام دیا ہے۔ جیسے ہی اس نے مجھے بتایا میں سب کام چھوڑ چھاڑا اور چلا آیا۔“

”یہ عمیمس بھی نا۔ ایک نمبر کا کینہ ہے۔ اور آج تو اس کا دماغ صبح سے ٹھکانے نہیں ہے۔ پھوپھو فوزیہ کی کینڈی کو پٹانے میں لگا ہے۔ گدھا کہیں کا!۔“ وہ غصے سے ہاتھ کام کا بنا کر پیچ پر مارتے ہوئے بولی۔

”کہیں کا نہیں۔ بیس کا۔ میں نے ایسا گدھا کسی اور کے پاس نہیں دیکھا۔ قسم کھا کر کہتا ہوں۔“ احرار نے شرارت سے ہنستے ہوئے مگر جواباً حرم مسکرا بھی نہ سکی۔

”کیوں اتنی ٹیشن لے رہی ہو۔؟ ابھی صرف رشتہ آیا ہے۔ منظور تو نہیں ہو گیا نا۔ رشتے تو آتے

احرار سے بات کرنے کا موقع ڈیوٹنڈری تھی۔ یہ بات سیل فون پر کرنے والی نہیں تھی۔ وہ اس سے دبدو اور دو ٹوک بات کرنا چاہتی تھی۔

اور اب آدھا گھنٹہ بیت گیا تھا اسے احرار کے انتظار میں، مگر وہ بھی آج اس کا صبر آزمائے پر تلا تھا۔

اتنی دیر تک وہ ”گیشدہ“ بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کی ڈھنڈیا پڑ جانی تھی۔ بے بسی سے ہونٹ کاٹتی وہ اب واپس ہونے کو بھی جب ساتھ والی چھت پر مانوس آہٹ نے اس کی دھڑنوں کو تیز کر دیا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اچک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ دیوار کے پار پہلے احرار کا خوب صورت بالوں سے بھرا سر نمودار ہوا۔ پھر وہ خود سالم کا سالم بڑی مہارت اور پھرتی سے دیوار بھاند کر اس پار کود گیا تھا۔ اس کی گہری سبز آنکھوں میں شرارت تاج رہی تھی۔ نیوی بلیوئی شرٹ کے ساتھ گرے جینز پہنے۔ دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر گھڑی کا اسٹریپ بند کرتا وہ بے نیازی سے چلتا اس کے قریب آ رہا تھا۔ حرم کو اندلے بے اختیار ہوتا محسوس ہوا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے گی۔ احرار کے شوخی سے کھنکھارنے پر اس کا فون ٹوٹا اور اسے یاد آیا کہ وہ تو ناراض تھی۔ فوراً ”منہ بھلا کر سن پھیر لیا۔“

”کیا ہوا جان من۔! ناراض ہو۔؟“ انداز صاف چڑانے والا تھا اور ذرا واقعی چڑ گئی تھی۔

”بکواس نہیں کرو۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ مجھے اس طرح کے گھٹیا ناچوں سے مت بلایا کرو۔ چپ لگتا ہے۔“ دھڑکتے دل کو سنبھال کر وہ قدرے ڈپٹ کر بولی۔

”اچھا! کیا حال ہے موٹی۔؟ اب ٹھیک ہے۔؟“ سر کو کھجاتے ہوئے وہ اس سے بڑی معصومیت سے سوال کر رہا تھا۔

”کیا کہا۔ موٹی۔! میں اور موٹی۔! حرم نے ایک نگاہ بے یقین اپنے سر پرے پر ڈالی اور آنکھیں پھاڑتے ہوئے جارحانہ انداز میں اس سے پوچھا۔

پادے تمہارے گھر میں ڈرے ڈالے بیٹھے ہیں۔
بس وقت کا انتظار کرو اور نبی اکمال اسے داؤ کھیل لینے
وے۔ ”حرم بے حد مطمئن سی ہو لے سے مسکرا دی اور
ایسے میں اس کی ناک کی لونگ سے پھوٹنے والی روشنی
نے ایک بار پھر اس کا چہرہ جگمگا دیا تھا۔

”یہ مارا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔! مان لیجئے آپ اب ہمیں۔۔۔“

دوسری بار آپ کا بادشاہ مار گرایا ہے۔ وہ بڑے فخر سے شطرنج کی پچھی بساط کو تک رہے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کے پنجوں کو ایک دوسرے میں جھنسا کر سر کی پشت پر رکھا اور جسم میں بھرپور تازہ پیدا کر کے دم اسے ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ جب بھی خوشی یا بیجان کی کیفیت محسوس کرتے ہمیشہ یوں ہی خود کو نازل کرتے تھے۔

مقابل نواب حسین احمد خان تھے جو بے حد حیرت سے ہلکا کوٹے جارہے تھے اور دل ہی دل میں اپنے حریف کی ذہانت کے قائل بھی ہو چلے تھے۔ پچھلی کئی بیٹھکوں سے وہ اپنے حریف سے ہارتے آرہے تھے۔ انہوں نے پر سوچ نگاہیں شطرنج پر جماتے ہوئے اپنی بارہ لیش ٹھوری کو کھینچا اور بولے۔

”میاں! اقبال تو ہم ہو چکے۔ آپ واقعی خالص
منجھے ہوئے کھلاڑی ہیں۔ ورنہ کم تو ہم بھی نہ تھے۔
ماری عمر کھیلا ہے۔ تین میں سے دو بازیاں تو یقینی
ہمارے نام ہوتی تھیں۔ اب تو ہم بے سوچ رہے ہیں
کہ کدھر چوک ہو رہی ہے، ہم سے جس کا فائدہ آپ
حضور اٹھائے چلے جا رہے ہیں۔“ انہیں ابھی بھی
اپنی ہار کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

”آپ ہی سے سیکھا ہے حضور۔! ورنہ ناچیز اس
کھیل سے واقف ہی کہاں تھا۔“ وہ بے حد متانت
سے گویا ہوئے۔

”اے میاں! ہم ہی سے سیکھ کر۔ ہم ہی کو چاروں شانے جت کر دیا۔ اب سوچ رہے ہیں کہ ہمیں بھی کوئی مرکز سنبھالے رکھنا چاہیے تھا۔ برے

ہی ہیں۔ یہ کوئی ایسی انسانی تو نہیں۔۔۔ پریشانی والی بات تو تب ہے نا جب کوئی رشتہ طے ہو گیا۔۔۔“ وہ اسے رساں سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”تو کیا تم رشتہ طے ہونے کا انتظار کر رہے ہو؟“ اس کے بعد بلہ بولو گے کیا؟ کیا بات ہے جناب نواب زادہ احرار حسن خان کی۔“ وہ اس کی بات کا مذاق اڑاتے ہوئے چل کر ہوئی۔

”میں تمہارا رشتہ کہیں ہونے دوں گا۔ تب
 نا۔!“

”چھا جی۔! کیا کریں گے آپ۔؟ بدھکیں
مارتے ہوئے شادی رکوانے پہنچ جائیں گے یا میرے
نازیدہ مگیترا کا مرڈ کر انیں گے۔ اونہ۔ آئے
بدھ۔!“

۳۳ استغفر اللہ۔۔۔! تم نے مجھے موابی سمجھ رکھا ہے یا کسی علاقے کا بھائی۔۔۔ جو ایسے گھٹیا کام کروں گا۔ بے وقوف! وہ اسے عورت کہتا کہتا زبان و انتوں تلے دبا گیا۔ اسے اپنے خوب صورت بال بے حد عزیز تھے جو نچوانے کا اس کاراۓ ہرگز نہیں تھا۔ اس نے ایک اچھی نگاہ اس کے سراپے پر ڈالی جو کالے اور سبز امتزاج کے لباس میں دل میں اتری جارہی تھی۔ سونچ کی روشنی ایک رخ سے اس کے چہرے کو چھو رہی تھی اور ناک میں پسینی باریک سی لونگ کا سنہری گھینے ساری تپش خود میں جذب کیے اس کے چہرے پر گلال کی صورت بکھیر رہا تھا۔ اس نے جلدی سے نظر ہٹائی اور گلا صاف کرنے کے بعد بولا۔

”میرا یقین کہد حرم۔ تم اگر میرے نصیب کی زنجیر سے بندھی ہو تو اس کڑی کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ سب کچھ بھی ہو، تمہیں میرے ہی پاس آنا ہے۔ ٹامک ٹوٹیاں مارنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ لہذا۔“ اس نے ایک بار بھری جھپٹ حرم کے سر پر سپرد کی۔

”آب تم چل Chill“ کرو اور بل مجھے بھیج
 ”آخر میں نے بھی کنبھے کھیل رکھے ہیں بچپن
 میرے نشانہ میرا بھی خاصا تھا ہوا ہے میرے بھی

وقت کے لیے۔۔۔ وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے ہنس دیے۔

”تو سنبھال لیتے نا، آپ کو منع کس نے کیا تھا۔۔۔؟“ وہ ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔

”ہمیں یہی گڑ تو نہیں آیا کہ کوئی گر سنبھال رکھتے۔۔۔ وگرنہ برا وقت ہمیں یوں پچھاڑ کر بیت جاتا۔؟ ہمارا پورا وجود چھلکی بن گیا۔۔۔ پور پور میں سے دکھ لگتا ہے جناب۔!“ وہ یک دم بے حد آزرہ

ہو گئے۔۔۔ آنکھیں بھبھک گئیں۔۔۔ پتا نہیں کیا کچھ یاد آیا تھا۔ ان کے مقابل بیٹھے غم خوار نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر دھر اور لا سا دیا تھا۔

”رشتوں میں اکھاڑ پچھاڑ تو زندگی کا حصہ ہے۔۔۔ قدرت کے کھیل بڑے عجیب ہیں۔۔۔ زندگی میں جو لوگ ہمیں زخم دیتے ہیں وہی مرہم بن جاتے ہیں۔۔۔ اچھا وقت، برے وقت کے پیروں میں چمپا بیٹھا ہوتا ہے۔۔۔ پر پھر پھڑلانے کی دیر ہوتی ہے بس اور کیا ملٹ جاتی ہے۔۔۔ بعد ہم لمحے میں نواب حسین احمد خان کی آنکھوں میں بھرتی امید کی لو کو تیل دے رہے تھے۔“ کیا وہ بھی بیٹھے سینے سے لگائے گا۔۔۔؟“ حسین احمد خان نے حسرت سے پوچھا۔

”کیوں نہیں! انسان کے سینے میں بڑی گنجائش ہوتی ہے۔۔۔ ہانڈوں سا وزن سمونے کی سکت رکھتا ہے۔۔۔

”چلیے جھوٹیے ان باتوں کو۔۔۔ آپ کی ”جھپی“ میں طیافت ہوئی چاہیے کہ قاتل کے دل کی رگوں تک آپ کے سینے کی حرارت پہنچ جائے۔“

انہوں نے پورے جوش سے نواب صاحب کے ہاتھ کی پشت کو چھتا دیا اور شطرنج کی بساط پر ایک دفعہ بھر مے سیٹ ہوئے لگے۔ کھیل ابھی باقی تھا۔



”کچر کچر۔۔۔ کچر کچر۔!“ مولیاں اور گاجریں جہانے کی آوازیں پورے صحن میں چکراتی پھر رہی

تھیں۔۔۔ بچے اسکولوں کو حرم اپنے کالج اور مرد سارے کام سے۔۔۔ لہذا اتلی بخش ناشتوں کے بعد ساری خواتین گھر کے صحن میں آ بیٹھی تھیں۔۔۔ موسم میں ہلکی ہلکی خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔۔۔ دھوپ سینکے کو جی کرنا تھا۔۔۔ بیگم اجمل سبزیوں کی نوکری بھی لیتی آئی تھیں۔۔۔ باتوں باتوں میں بن جاتی تھی سبزی بھی۔۔۔ کچھ دونوں دیورانی جھٹھالی نے جب فوزیہ پھوپھو کو بے جی کے پاس فرصت سے بیٹھے دیکھا تو اس کی صحبت سے

فیض یاب ہونے کا موقع کیسے جانے دے سکتی تھیں۔۔۔ آج کل تو خواب میں بھی دونوں اپنی اکلوتی نند سے ”گرو منگ کلاسز“ لیتی تھیں اور صبح جب اٹھتی تھیں تو خود کو سرٹائی فائڈ محسوس کرتی تھیں۔

اوپر ادھر کی باتوں میں سبزی بننے کا پتا بھی نہیں چلا اور اب مولیوں اور گاجروں کا دور چل رہا تھا۔۔۔ کینڈی گو بھیجے کے ڈھنسل اور مٹر کے چھلکے بھینس کے آگے ڈال کر آگئی۔۔۔ بیگم جمال کو وہ بڑی اپنی اپنی سی لگی۔

”مے پھوزی۔!“ تو کیوں ننس لکھاندی مولی۔۔۔ اے دیکھ تے سہی کئی مٹھی شید (شہد) اے۔۔۔ لے ذرا۔۔۔ چک مار کے دیکھ۔!“ بے جی نے مولی پر نمک اور لال مرچ لگا کر فوزیہ پھوپھو کی طرف بڑھائی۔۔۔ جواباً انہوں نے خوب ناک چڑھا کر اور دائیں آنکھ قدرے مونڈ کر نخوت سے اے بے کیا۔

”تو بے جی نوسہ! میں نہیں کھاتی۔۔۔ اس کی تو اسمبل ہی اتنی آتی رہتی ہے ہاتھ سے۔۔۔ اور پھر ڈکارس بھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔“

بیگم جمال اور بیگم اجمل نے ایک ساتھ ادھ کھائی مولی کو نے یہ بندھی بھینس کی طرف اچھلی تھی اور ایک دوسرے کو اس حکمت عملی پر توصیفی لگا ہوں سے دیکھا تھا۔

”نفع دور۔!“ بے جی نے ہاتھ جھٹک کر بیٹی کو ”نفع دور“ کیا۔

”وڈی آئی شوخی۔!“ بے جی نے دخت نو پھڑی۔۔۔ ساری عمر ایسوج کھا کھا کے بن اکریراں دے ”وڈو“

”جھٹی“ کھان دا خیال آیا اے۔ شیدا مین نہ ہووے تے!“

”بس بتائیں بے جی۔! آپ نے ہی اسٹونز مارنے پس تو بھلا شریکوں کی کیا ضرورت۔“ فوزیہ پھوپھو پر امانتے ہوئے گردن اکڑا کر بولیں۔

”نامینوں دس۔ کڑی داویاہ ننیں اوکرتا۔“ بے جی کے سوال پر بیگم جمال کے کان پورا ”کھڑے ہوئے تھے اور حواس چوکس۔ آخر انہیں ابھی عمیس کو بیاہنا تھا اور کینڈی انہیں بے حد بھائی تھی۔ بیگم

اجمل کو قلق سا جاگا۔ کاش زارون ادھر ہوتا یا پھر ان کا گونگوبی وڈا ہوتا۔!

”افسوس! بے جی ابھی ایچ ہی کیا ہے۔! تو تھری ایئر زڈرا کینڈا جا کر انجوائے تو کر لے میری ڈائٹ۔ نیا گرافل کا وائبر بھی داچ کر لے پھر میج کر دوں گی اس کی۔!“ فوزیہ پھوپھو کا لبلا پلان تھا۔ بے جی نے بھنویں اچکا کر چند لمحے منہ کے زاویے پر بگاڑ کر بیٹی کو گھورا اور پھر اسی انداز میں قریب بیٹھی کینڈی سے مخاطب ہوئیں۔

”پتہ۔! اے کی پونکدی پٹی اے۔؟ کینڈی سٹپائی۔! ماں کو دیکھا تو ان کے انداز میں لاہروانی تھی جیسے بے جی کے یوں کہنے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑا۔“

”دوس۔! بے جی! اماں کے کہنے کا مطلب ہے کہ ابھی میری عمر ہی کیا ہے، دو تین سال ذرا کینڈا جا کر ان کی ڈائٹ یعنی کہ میں۔ کینڈا کا وائبر۔ یعنی کہ پانی کے مزے لے لوں تو پھر میری شادی کے بارے میں سوچیں گی۔!“ آخری جملے کی ادائیگی تک کینڈی کا لہجہ شریکوں ہو گیا۔ جو سیدھا بیگم جمال کے دل میں ترازو ہوا تھا۔ کتنے سجاوے ماں کی بات کی تشریح کی تھی اس نے۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ یہاں سے اٹھ کر پہلا کام انہیں کینڈی سے مرچیں وار کر چولہے میں جھونکنے کا کرنا ہے۔! بے جی کی پاٹ وار آواز انہیں مرچوں سے واپس مولیوں، گاجروں میں

لے آئی۔!

”میں نے کماوڈی (بیگم جمال)۔! ذرا تھوڑا سا وائبر میری بیٹی پر ڈالو۔ اس کے داغ میں خشکی ہو گئی اے۔!“

”آپ ٹینشن نہ لیں بے جی۔!“ فوزیہ پھوپھو نے صلح جو انداز میں ماں کے گھٹنے پر ہاتھ دھرا۔ مجھے کینڈا چاہیے دیں بس۔ ساری ڈرائی سنیں۔ گیلی ہو جائے گی۔!“ پھوپھو کی بات پر سب ہی نے سرد ہٹا تھا۔ بے جی نے تاسف سے اور دونوں بھابھوں نے ستائش سے۔!

”میں بھی آپ میری ایک ٹاک غور سے سنیں۔!“ فوزیہ پھوپھو نے بے جی کے قریب کھسک کے رازدارانہ ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

”پہلے بندے دی پتر بن کے گل کسے پھر میں سنوں گی ننیں تے دفع دور۔!“ انہوں نے گھٹنے پہ دھرنا فوزیہ پھوپھو کا ہاتھ جھٹک کر دو ٹوک انداز میں کہا۔

”فوفو بے جی۔! آپ بھی نا۔! اچھا صرف ابھی کے لیے۔ بعد میں میں دوبارہ اپنی لنگھوتی میں ہی بات کروں گی۔ پھر آپ نے مجھے نہیں ٹوکنا۔!“

”ہن بول بھی دے۔!“ بے جی نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

”اصل میں، میں اس دفعہ ایک خاص مقصد کے تحت یہاں آئی ہوں، اتنا خاص۔ اتنا خاص۔ کس۔!“

”ہن تو تہی واری بولی تے تیرے خاص دج باس بے جانی اے۔“ (اب تم تیسری دفعہ بولی تو تیرے خاص میں بوڑجانی ہے) بے جی نے فوزیہ پھوپھو کے ہاتھ پر پتلی سی مولی مارتے ہوئے کہا۔ وہ بے چاری جھٹ سے ہاتھ سلانے لگیں۔

”اچھا۔! اچھا بول رہی تھی میں۔ بات کا سارا مزہ کر کر آ کر یا آپ نے بے جی۔! ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میں اس دفعہ اکیلی نہیں آئی۔ بلکہ۔!“

”آہو۔! جھے شٹو ٹکڑے (بچے) دی ٹال نے تیرے۔! افلاطون دی اولاد اے۔!“ بے جی نے پھر

فوزیہ پھوپھو کی بات کاٹ کر لقمہ دیا۔

ملاحظہ کر رہی تھیں۔

”بے جی۔! وہ تو بچپن کی بات ہے تب ہارون ذرا موٹا ہوا تھا۔!“

”(اچھا)! تے وہ بچپن دو سال وچ گیا واہ بھی واہ تے اب کتنا موٹا ہے نمنا۔“ بے جی استہراسیہ لہجے میں سوال کیا۔

”اب بھی ذرا سا ہی موٹا ہے وہ بے جی۔ کام سے لگا ہے تو کملا گیا ہے۔!“ فوزیہ پھوپھو نے کمزور سا دفاع کیا۔ تب ہی کینڈی بچ میں بول پڑی۔

”مکدھر مانا۔! ویسے کے ویسے ہی ہیں ہارون بھائی۔ بلکہ پہلے تو پھر آنکھیں دھکتی تھیں اب تو

ڈھونڈنی پڑتی ہیں۔ اب بھی ذرا ڈھیل دے کر بیٹھیں تو پچھی کی آواز کے ساتھ ان کی پتلون پھٹ جاتی ہے۔ پچھل منٹنی بھی اسی لیے ٹوٹ۔!“

”کیو اس بند کر کینڈی۔!“ فوزیہ پھوپھو نے اسے بری طرح ڈانٹا اور بایاں ابو اچکا اچکا کر چپ کرنے کا اشارہ کیا۔

”بے جی! اس کی عادت ہے بک بک کرنے کی۔ منٹنی شنگنی نہیں ہوئی تھی بس یوں ہی بات چلی تھی۔ مگر ہارون کو لڑکی نہیں بھائی تھی اس لیے بات وہیں کی وہیں ختم ہو گئی۔!“

”سیدھی طرح بول کہ کڑی نولڈو پھی جیسا ہارون نہیں بھایا۔ بڑی آئی کہنے والی۔ ہارون کو لڑکی نہیں بھائی۔!“ بے جی نے باقاعدہ منہ میڑھا کر کہے فوزیہ پھوپھو کی نقل کی۔ وہ شرمندہ سی نوکری میں رکھی سزیاں پھونے لگیں۔

”دیکھ پھوزی۔! حرم کے ساتھ دشمنی نہ کر۔ اتنا ہی اولڈکا اچھا ہے تے اپنی کینڈی دایاہ کر دے اووے نال۔ میری پوتی کو کیوں پھنسانی ہے۔!“ بے جی انگلی اٹھا کر دو ٹوک انداز میں بولیں تو فوزیہ پھوپھو فوراً جذباتی ہو گئیں۔

”اللہ نہ کرے بے جی۔! میں کیوں پھنسانی لگی اپنی بھتیجی کو۔ میری کینڈی نے جھٹھائی کا دودھ پیا ہے

”ہا۔ ہائے بے جی۔! آپ کو تو میری اولاد ویسے ہی نہیں بھائی۔ اب اگر وہ آپ کے پوتوں پوتیوں سے زیادہ حسین اور ذہین ہیں تو آپ صبر سے کام لیں۔ کیا پتا آپ کے پوتوں کے پوتوں میں کوئی ایسا نکل ہی آئے۔!“ فوزیہ پھوپھو نے مبالغہ آرائی کی حد کر دی۔

اب کے بے جی نے نوکری میں کوئی موٹی سی موٹی ڈھونڈنے کی کوشش کی جسے وہ ان کے سر پر مارتیں۔ بیگم اجمل نے فوراً ”بے جی کے آگے سے نوکری جھپٹ لی اور صلح جو انداز میں بے جی سے مخاطب ہوئیں۔

”آپ پہلے بات تو سن لیں پھوزی۔ میرا مطلب فوزیہ کی بے جی۔!“ کیا پتا، کتنی ضروری بات ہو جو ابھی تک ادھوری ہے۔!

بے جی تیکھے چتون لیے بیٹی کی طرف متوجہ ہوئیں تو فوزیہ پھوپھو ڈیلے گھا کر سر آگے کیا۔

”میں اپنی بیٹی حرم کے لیے اپنے جیٹھ کے بیٹے ہارون کا رشتہ لانی ہوں۔ اپنے ستن بم پھوڑ کر فوزیہ پھوپھو نے سب کے تاثرات جانچے مگر مینوں خواتین ایک دم چپ سی انہیں دیکھے گئیں۔ چند لمے مزید یوں ہی بیت گئے اور پھر سب سے پہلے بے جی نے ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

”فلفے منہ۔! دفع دو۔!“ فوزیہ پھوپھو کو ایسے جواب کی توقع ہو کر نہیں تھی۔ سٹپنا کر پیچھے ہوئیں۔ ”یہ وہی جیٹھ دا پتر ہے تا تیر۔۔۔ جسے تو آپ ہاتھی کا بچہ کہتی تھی۔“

فوزیہ پھوپھو حیرت سے جی ہی جی میں بے جی کی یادداشت کو سات سلام پیش کر رہی تھیں۔ کینڈی منہ پھیر کر ہنسی روکنے کی کوشش میں بے حال ہو رہی تھی۔ جبکہ بیگم جمال اور اجمل کے تاثرات سے ابھی کچھ بھی اندازہ لگانا بے حد مشکل تھا۔ دونوں عجیدہ اور سپاٹ چرے لیے اپنی ساس اور زند کا مکالمہ

کہ کیا تم حرم کو کسی کھاتے پیتے گھرانے میں نہیں بیاہنا چاہتی۔ جواب دواں گئے۔ کیا کہتی ہو تم اس رشتے کے متعلق۔“ بیگم جمال نے بڑے مدبرانہ انداز میں اپنی دیورانی کو پوری بات کا ترجمہ کر کے بتایا۔ آنکھوں میں فخر بھی ناچ رہا تھا ”دیکھا! مجھے سمجھ آئی فوزیہ کی انگریزی کی۔“

”میں کیا بولوں بھابھی جی! جو بے جی اور میاں جی کا فیصلہ ہو گا وہی میرا بھی۔ حرم کے لیے ان سے زیادہ اچھا کون سوچ سکتا ہے بھلا۔“ بے جی نے ہو کے جواب پر جتنائی نگاہوں سے فوزیہ پھوپھو کو دیکھا۔

”ہن بول۔“ فوزیہ پھوپھو نے نخوت سے بیگم اجل کو دیکھ کر سر جھکا دیا۔

”ڈنگر جی نہ ہووے تھے۔“ جی ہی جی میں بددائیں اور غصہ وہ اب بھی پنجابی میں ہی نکالتی تھیں، بھٹل میں ہی سی۔!

”ٹھیک ہے بے جی۔! اُون ہو گیا۔ اب یہ سارا میٹر میں میاں جی کے آگے رکھوں گی۔ وہ اس رشتے کو رٹو نہیں کریں گے۔! وہ پورے بھروسے سے کہتی ہوئی انھیں اور اندر چلی گئیں۔

”ہونسن! دفع دور۔! بے جی نے بھی ان کی پشت پر باقاعدہ ہاتھ سے لعنت بھیجی۔ دونوں بھاپیاں چھی اٹھ کر ٹوکریاں سینٹی مند کے پیچھے پیچھے چل دیں۔ انیس فوزیہ پھوپھو کی ناراضی کی فکر لگی تھی۔

صحیح صحن میں اب صرف بے جی اور کینڈی بیٹھی رہ گئی تھیں۔ کینڈی بے چاری مسلسل شرمندہ سی کونے میں بندھی چھلی کرتی بھینس کو سٹے جاری تھی۔ جبکہ بے جی کی آنکھوں میں فکر بھورے لیتا صاف نظر آ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

”آ۔ آ۔ آ۔ آ۔! صبح صلیق کا وقت تھا اور حسین احمد خان اپنے التو کیو تروں کو چمت بردانہ ڈال رہے تھے۔ کابک چلی ہوئی تھی اور سارے کیو تر اس

ورنہ ضرور بیاہ دیتی میں اسے ہارون کے ساتھ۔ اور حرم کے لیے خود میری جھٹھانی نے بات کی ہے۔ میں خود بھی چاہتی ہوں، بے جی کہ میرے میکے کی بچی کھپ جائے ہارون کے ساتھ۔ اتنی بڑی لمبی چوڑی جائیداد ہے اس اکیلے کی۔ باہر سے جو آکر راج کرے گی کوئی۔ تو اپنی حرم کیوں نہیں۔؟ میں جب کینڈا چلی جاؤں تو کوئی میرا اپنا میرے پیچھے موجود ہو جو میرے پورشن کی رکھوالی کر سکے۔ آج کل کسی کا کیا بھروسا ہے جی۔!“

”بہت اچھے اسے۔! بے جی نے اپنے گھٹنے پر خوب زور کا ہاتھ مارا جیسے خود کو شامپاش دی ہو۔“ تو اصل میں یہ بات ہے۔ تمہیں چوکیداری کے واسطے اپنا بندہ چاہیے۔ شرم نہیں آتی تجھے فوزی۔ وہ گائے کا پچر ہی ملا تھا میری حرم واسطے۔ بھل جا۔ اے رشتہ نہیں ہو سکتا۔ تے نالے اپنی جیٹھ اور جھٹھانی کو بھی میس کر دے کہ خبردار جو ادھر آئے۔ میں ٹائلس تروڑ دیاں گی۔! بے جی نے ایک مولیٰ کو ٹھیک درمیان سے ٹھک کر کے توڑا جیسے چ میں فوزیہ پھوپھو کے جیٹھ کی ٹانگ ہاتھ میں ہو۔

”گھٹ ہو گئی بے جی۔ وہ میرے ان لازم ہیں۔ آپ ان کی لیک بریک کریں گی تو وہ میرے ساتھ رشتہ بریک کر دیں گے۔ میں کسی کو اپنا فیس دکھانے کے قاتل نہیں رہوں گی۔! فوزیہ پھوپھو اپنی جون میں لوٹ آئی تھیں اور اب قدرے خفا سی بے جی کو حالات اور تعلقات کی نزاکت سے باخبر کر رہی تھیں۔ بیگم جمال اور بیگم اجل بھی کچھ کچھ قائل سی نظر آ رہی تھیں۔

”کیوں چھوٹی بھابھی۔! آپ بتائیں کہ آپ حرم کی میرج کسی اچھی ایٹنگ ڈیننگ میلی میں کرنا لائیک نہیں کریں گی کیا۔؟“ فوزیہ پھوپھو نے یکدم بیگم اجل سے سوال کیا تھا اور جواباً وہ بے چاری ہونق سی محض اتنا ہی بول سکیں۔

”ہیں۔!“

”فح۔! یہ اپنی فوزیہ کے کہنے کا مطلب ہے

وقت تازہ ہوا کا مزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر طبعی بھرا جڑہ اچھال کر فرش پر پھینکا اور آواز لگائی۔

”آ۔ آ۔ آ۔!“

”کھا۔ کھا۔ سب کو کھا۔!“ حسین احمد خان چونکے اور پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے کوئی نہیں تھا۔ نگاہ ساتھ والوں کی چھت پر پڑی تو برکت اللہ چاہپائی پر انگلی کرتا پینے ٹائلیں پسارے بیٹھے تھے۔ پہلو میں موٹا تازہ شیر (التولہ) بیٹھا تھا جو بار بار اپنی زبان ہونٹوں پر پھیرتا تھا۔ جیسے ہی ہسائے سے آواز آئی۔

”آ۔ آ۔ آ۔!“ یہ بلا توقف اونچی آواز میں شیر کو ترغیب دیتے۔

”کھا۔ کھا۔ کھا۔!“

حسین احمد خان کا خون کھول رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی یہ سروم بخت ان کے اتنے خوب صورت اور قیمتی کیوتز ہرپ چکا تھا۔ وہ دانہ ڈالنے کا کام موقوف کرتے ہوئے کیوتزوں کو کالک میں بند کرنے کی نیت سے آگے بڑھے۔ برکت اللہ نے ہانک لگائی۔

”نس جا۔ نس جا۔“ فائنٹ نس جا کیوتز۔“

حسین احمد خان نے خون کا گھونٹ بھرا اور جی ہی جی میں برکت اللہ کو کوسا۔

انہوں نے سوچا کہ کیوتزوں کو یونہی چھوڑ کر خود نیچے چلے جائیں اور کل وقتی ملازم لڑکے سے کہہ کر کیوتز کا بک میں بند کروالیں۔ یہی سوچ کر وہ بیڑھیوں کی طرف مڑے تھے کہ کندھوں پر اوڑھی ہوئی گرم مردانہ شل میں پاؤں ٹانگ گیا گرتے گرتے پئے۔

اودھر برکت اللہ چھڑائی (چھلانگ) مار کر یکدم

چاہپائی سے اترے تھے اور بے چینی سے دونوں چھتوں کے بیچ کی دیوار کے قریب چلے آئے۔ مگر جب مسنین احمد خان کو سنبھلتے دیکھا تو خود کو بھی بے نیاز پوز کرتے ہوئے کھن کے اندر انگلی پھیرتے ہوئے

”اک تو تیری نازک مزاجیاں ننس گئیں۔ یالا

(سردی) ابھی اندروں میں وڑا (گھسا) ننس اور تو ٹھنڈا ٹھنڈا کر بچا چوچا (بھیکا چونہ) بن جاتا ہے۔ تیرا تو وہ حال ہے کہ کیلنڈر پر بدل (بادل) کو لکھ لے تو جرسی چڑھا کر آ جاتا ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔!“ برکت اللہ خود ہی اپنی جگت پر اتنا پنے کہ کھاسی چھڑ گئی۔ ہنستے جاتے اور کھانستے جاتے۔ حسین احمد خان کے بس میں ہوتا تو ایسا عمل کرتے کہ برکت اللہ کیوتر بن جاتے اور وہ مزے سے انہیں بچھرے میں بچھرٹا دیتے۔

”ہم آپ کے منہ نہیں لکنا چاہتے برکت اللہ۔ بہتر ہے کہ آپ بھی احتراز بیجئے۔ ورنہ باتیں ہمارے پاس بھی ہیں کہنے کو۔“ حسین احمد خان چلور جھٹک کر دو ٹوک انداز میں بولے۔

”او۔ خانا۔! میرے تیل سیدھی طرالی بول۔“ تیری آپ جناب میرے پلے تب ننس پڑی تھی جب جوانی کا طوطی بولتا تھا۔ اب ایس عمرے تو گوڑے گٹوں سے کڑا کے بھی بچھلی میں نکلتے ہیں۔“ برکت اللہ کی بات پر حسین احمد خان نے فوراً رخ پھیر کر مسکراہٹ چھپائی تھی۔ آخر وہ بچھلی سمجھ تو بخوبی لیتے تھے۔ ایک لمحے کو تو جی چاہا کہ جتا وقت اور جوانی لوٹ آئے اور وہ یونہی یکدم پلٹ کر ایک جست میں دیوار پر چڑھ کر ٹائلیں لٹاکے بیٹھ جائیں۔ پھر باتوں کا بھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے اور دن ڈھل جائے۔ دل بھیک سا گیا اور ایک نمی سی آہ آنکھ میں جگنو کی مانند چمک اٹھی۔ مگر اگلے ہی لمب برکت اللہ کے جملے نے سارے جذبات جھاگ کی طرح بٹھا دیے۔

”کھل سن خانا۔! اپنے منڈے کو ذرا تمیز شیز سکھا، لگتا ہی ننس نوابوں کی نسل ہے۔ شہدانہ

ہوے تے۔ اور اسے کہہ کہ ذرا میری کوٹھی وچ تاکا جھاکی بند کرے۔ ورنہ برکت اللہ کو بٹنے کھیدنے ابھی بھی آتے ہیں۔“ سمجھا!

”ہمیں علم ہے اس بات کا برکت اللہ صاحب! آپ کے اسی وصف کے سبب تو آپ کو بڑا کما جاتا تھا، ہم بھلا بھول سکتے ہیں۔“

عذر مانع نہیں ہوگا۔“

صوفیہ بیٹھے وہ مارے غصے کے ہانپ رہے تھے۔
”چروہ آتش ششال بنا ہوا تھا۔“

”اے آج یہ مجھوں میاں بھی۔۔۔ کچھ ہوش کے ناخن ان کو دلانے کی بھی ضرورت ہے۔۔۔ عشق کیجئے تو گورکن کو بھی ہوسیار رکھیے، یہ بلا جان لے کر ملا کرتی ہے۔۔۔ اور ہم میں اب سکت نہیں کہ ہم بار بار اپنا ہی جگر کاٹ کر دھتے رہیں۔۔۔ ہم تھک گئے ہیں۔۔۔ تھک گئے ہیں ہم بیٹیں دھوتے دھوتے!“ وہ بے دم سے ہو کر صوفیہ سے سر ٹیک کر اکھڑے اکھڑے سے سانس کھینچ رہے تھے۔۔۔ زینب بی کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔۔۔ جھٹ سے پانی کا گلاس منہ کو لگایا۔۔۔ چند گھونٹ پانی کے حلق میں اترے تو آنکھیں موند کر خود کو پرسکون کرنے لگے۔

”آپ کیوں برکت بھائی کے منہ لگتے ہیں۔۔۔ جانتے بھی ہیں کہ ان کی عادت ہے آپ کو چڑانا۔۔۔ اور آپ چڑ جاتے ہیں۔۔۔ ہم بات کریں گے حاجہ آپ سے۔۔۔ وہ سمجھائیں گی انہیں۔۔۔ آپ فکر مت کیجئے۔۔۔ کہیے تو عاصم (ملازم لڑکا) سے کہہ کر ڈاکٹر صاحب کو بلواؤں۔“ زینب بی نے فکر مندی اور محبت کے ساتھ شوہر کے ماتھے پر ہاتھ دھرا۔

”نہیں! ہم اب بستر ہیں اب بھی ہم میں اتنا دھرم ہے کہ ایک کے جواب میں دس کہہ سائیں۔۔۔ ذرا اعصاب ٹھکانے آئے تو نواب صاحب کا ظنہ بھم ٹھکانے پر تشریف لے آیا۔۔۔ زینب بی نے سکون سانس لیا اور دھیمسا مسکرا دیں۔۔۔ انہیں بھی اس جگہ ہوئی رسی کے ٹلے جے حد عزیز تھے۔۔۔

”بس آپ احرار کو سمجھا دیجئے۔۔۔ حرم بیٹی کا خیال نکال دیں دل سے، ورنہ اب کی بار جو سرخ آندھ لگا تو سب اندھے ہو جائیں گے۔۔۔ نفرتوں کی میخیں سہ کی آنکھیں پھوڑ دیں گی۔۔۔!“ زینب بی نے دہل کر کہا تھا۔۔۔ وہ ایک ننگ نواب حسین احمد خان کے چہرے کے جاری تھیں۔۔۔ جس پر کچھ کھودینے کا ہر اس غما

ٹھہرے ہوئے بچے میں برکت اللہ بر جوت کر کے حسین احمد خان نے اپنی گرم شال کا پلو جھٹک کر کندھے پر ڈالا اور ایک گہری نگاہ برکت اللہ کے غصے سے سرخ چہرے پر ڈال کر بو بھل قدموں سے زینے کا رخ کیا۔۔۔



زینت بی ہال کمرے کی داہنی دیوار کے ساتھ بچھے خوب صورت دیوان پر چمکی گاؤ تکیے سے پہلو ٹکائے بڑی نزاکت و نفاست سے کھٹے موڑ کر دونوں ٹانگیں ہارے بیٹھی تھیں۔۔۔ ہاتھ مہارت و مشاقی کے ساتھ گرو شیا تھاے اچھے ریشم کے کپڑوں کی بنیت کرنے میں مصروف تھے۔۔۔ قریب ہی چاندی کا منقش پاندان دھرا تھا جو آج بھی جگر جگر چمکتا تھا۔۔۔ حالانکہ وہ پان کی رسیا نہیں تھیں اسے یونہی قریب رکھ لیتی تھیں۔۔۔ کبھی کبھی دو چمکی صوف پھانک لی اور بس! ایک زنانہ گزر گیا تھا انہیں یہ بھولے ہوئے کہ وہ دیسانی اور ٹھینہ بچالی ہیں۔۔۔ ان کی خوب اس قدر تبدیل ہو چکی تھی کہ کسی نئے ملنے والے کو ان کے چہرے پر چھائے وقار اور تمکنت دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا کہ وہ جدی پستی نواب ہیں۔۔۔ یہ تو بس وہ جانتی تھیں کہ اس ”نوابی لبادے“ نے ان کے جذبات اور ان کی اولاد کا خون چوس رکھا ہے۔۔۔ نواب زاوی عاشر اور نواب زادہ شارق کا خیال آتے ہی ان کی انگلیوں کی رفتار سست ہو گئی۔۔۔ آنکھوں میں پانی کی لکیر سی چھج گئی۔۔۔

ایک دم ہال کمرے کا داخلی دروازہ دھاڑ سے کھلا اور غنیض و جلال کی تصویر بنے ہوئے نواب حسین احمد خان اندر داخل ہوئے۔۔۔ وہ فوراً ”سمجھ گئیں کہ برکت اللہ سے مناظرہ کر کے تشریف لارہے ہیں۔۔۔“ یہ۔۔۔ یہ شخص۔۔۔ اس کی جرات تو دیکھو۔۔۔ ہمارے خون پر تہمت باندھتا ہے۔۔۔ نواب حسین احمد خان کے۔۔۔ ہمیں دھمکاتا ہے۔۔۔ اگر اس شخص نے ہمارے نواسے احرار خان کی طرف میلی نگاہ بھی کی تو ہم بچ اس کی آنکھیں نکلوا دیں گے۔۔۔ ہمیں کوئی

لیٹ گیا۔

بے جی کی نظریں فوزیہ پھوپھو پہ بھی ٹکی تھیں۔
جو کبھی نزاکت سے دو انگلیوں کے ساتھ اپنی پیشانی
مسلتیں تو کبھی رومال سے ناک صاف کرتیں۔
بے جی کے حملے کے جواب میں انہوں نے اپنی
جلتی آنکھوں کو بمشکل کھول کر بے جی کو گھور اور جوابی
فائر داغا۔

”آپ جو بھی کہیں بے جی! آج ہی وائر کا وائر اور
ملک کا ملک ہو جائے گا۔ دیکھتے ہیں میاں جی کیا رپلائی
کرتے ہیں مجھے!“ بے جی کے چہرے کے زاویے
بگڑ گئے تھے۔ ایک تو فوزیہ پھوپھو کے انگریزی ٹائٹل
ان کے لیے نہیں پڑتے تھے۔ اور سے جواب بھی
تفصیلی ہوتا تھا۔ قریب سے ہی اور کس بھائی کی بیگم
ثوبیہ پھورے رنگ کا ڈبل پلائی والا کبیل لے کر گزر
رہی تھیں۔ بے جی نے غصہ دیا تے ہوئے اسے آواز
دی۔

”نی ثوبیہ!“ ثوبیہ بھابھی بے جی کی پکار سن
کر آدھ کھلے منہ کے ساتھ مستعد سی انہیں سوالیہ
نظروں سے دیکھتی کھڑی ہو گئیں۔
”پت منہ بند کر۔ نہیں تو (دانت) گر جائیں گے
تے نالے اے کبیل اپنی پھوپھو فوزی دے اتے پا
وے۔!“ ثوبیہ بھابھی نے سختی سے ہونٹ بھیج کر۔
فوزیہ پھوپھو کے نہ نہ کرنے کے باوجود انہیں وزنی
کبیل اوڑھا دیا۔

”چل!“ ایس انگریزی پترواڑا حکم (منہ) تے بند
ہو یا۔!“ بے جی کو نگلو کے سر میں باریک کنگھی
پھیرتے ہوئے بڑبڑائیں۔

اتنے میں میاں جی اندر آئے۔ دھیمی چال چلتے
ہوئے فوزیہ پھوپھو کے بالکل ساتھ والی کرسی پر آکر
ٹک گئے۔ نظر ساتھ والی کرسی پر ڈالی اور کبیل کے
پھولے ہوئے حصے پر زور دار چھکی دے کر بولے۔
”مائے کون ریچھ داچھ اے۔۔۔؟“
اتنے میں فوزیہ پھوپھو نے زور وار کراہ کے ساتھ

☆☆☆

فوزیہ پھوپھو کو ٹھنڈ لگ گئی۔ فلو، بخار اور ساتھ
میں کچکی۔ دونوں بھابیاں خدمت میں پیش پیش اور وہ
ٹوڈ تین تین جوڑی موزے۔ سر پر گونگلو سے ادھار
لیا ہوا موٹا اپنی ٹیپا اور اس کے اوپر ٹال۔ جس کے
ساتھ ناک اور منہ ڈھک رکھے تھے۔ دو جریاں بھی
نسب تن کی ہوئی تھیں۔ یعنی کہ کل ملا کر فوزیہ
پھوپھو کے وزن میں دس کلو کا اضافہ تو ہو ہی گیا ہو گا۔
یہ سب پن اوٹھ کر وہ زرا سی دھوپ نکلنے پر باہر صحن
میں کرسی ڈال کر بیٹھ گئیں۔ بے جی کے پلنگ سے
لڑا ٹک رہے۔ دونوں کی بات چیت بند تھی۔ محض
بانہ کے فائز مارتی تھیں بوقت ضرورت۔!

بے جی کو ابھی تک کل والی بات پر غصہ تھا۔ اور
کئی بار تنبیہ کر چکی تھیں کہ فوزیہ پھوپھو اس رشتے کا
اگر میاں جی کے سامنے نہ کریں مگر وہ بھی اپنے نام کی
ایک تھیں۔ بے جی کو کھرا جواب دیا تھا کہ وہ یہ رشتہ
کروا کر رہیں گی۔ اب یہ محض اتفاق تھا کہ رات
ہونے والی بارش نے موسم کی خنکی میں بھی اضافہ ہو گیا
تھا اور سرشام ہی فوزیہ پھوپھو کو ہونے والے نزلے
رکام میں بھی برکت پڑ گئی تھی۔ رہی سہی کسر بخار
نے پوری کر دی ورنہ وہ رات ہی میاں جی کے ساتھ
میٹھک جمالیتیں۔! اب دھوپ سینتے ہوئے اور بے
نی کی مسلسل خود پر پڑتی تیز جھپتی نگاہیں نظر انداز کیے
ان کا دھیان گیٹ کی طرف لگا تھا۔ انہوں نے
سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی میاں جی آئیں گے وہ انہیں
میں لے کر بیٹھ جائیں گی اور ہاں کروا کر انھیں گی۔
آخر کون کے سرال کا معاملہ ہے۔

بے جی گونگلو کے سر میں تیل کی مالش کر رہی تھیں۔
اسے آج اسکول سے زبردستی چھٹی کروا دی تھی
یونکہ بے جی کو اس کا پنڈا گرم گرم لگ رہا تھا۔ گونگلو
ہاں کو بھی ہمانہ مل گیا۔ وہیں تخت پر بستر پھینک کر

بڑی مشکل سے لمبل میں درز ڈھونڈ کر منہ باہر نکالا۔
میاں جی بے چارے کھسائے سے انہیں دیکھتے چلے گئے۔

”اف‘ میاں جی! آپ کا پیٹھ ہے کہ پھو (ہتھوڑا)۔ میرے پیٹھ (سر) کا سرمہ بنا دیا۔ اتنی مشکل سے ذرا سی اونٹھ آئی تھی۔ آپ نے سب ڈسٹرائے کر دیا۔ اف اللہ!“ فوزیہ پھوپھو اپنی زکام زدہ آواز میں کر لائیں۔ میاں جی پچکارے ہوئے بولے۔
”نہ میرا پت۔! تجھے کس سیانے نے مشورہ دیا تھا“
اتادو ڈاکبل اونٹھ کر بیٹھنے کا۔ غی سی کرسی ہے۔ شکر کر، تجھے سارا ہوا ہے اس نے اوپر سے تو نے سوا من کا کبل بھی غملنی پر لا دیا۔“

”آپ بھی۔۔۔ آپ بھی میاں جی اپنی ڈائر کو ایسا کہہ رہے ہیں اگر آپ نے مجھے لٹے کتا ہے تو باقی سب کا ماوتھ میں بھلا کیسے کلوز کر سکتی ہوں۔ پہلے ہی یہاں آتے ہی مجھے سائیٹ (نظر) لگ گئی ہے۔ ابھی بھا بھی کو کہتی ہوں کہ مجھ پر سے چلھ (مرچیں) واریں“
فوزیہ پھوپھو ناک بو محبتے ہوئے بیگم جمل کو آواز میں دینے لگیں۔ وہ جی جیسے تیار بیٹھی تھیں۔ بول کے جن کی طرح ہاتھ میں سات مرچیں پکڑے حاضر ہو گئیں۔ بڑے جوش اور شوق سے مرچیں وارے ہوئے خوشی سے ان کا چہرہ بھی لال مرج بنا جا رہا تھا۔

میاں جی جو بڑی کینہ توز نظروں سے یہ منظر ملاحظہ کر رہے تھے۔ فوراً ہولے۔
”واری جاؤتے اجاڑی جاؤ۔۔۔ اے وڈی نو (بڑی ہسو) چٹنی مرچیں تو داروار کے چولہے میں جھونکتی ہے نا۔ کسی دن شہر میں مرجاں کا کل (قحط) پانا ہے تو نے“
انہوں نے مرچیں قریب رکھی انگلیٹھی میں جھونک دی تھیں۔
میاں جی غصے میں کھانتے ہوئے اندر چلے گئے۔

بے جی کا متوقع صورت حال کے تصور سے ہی ہنس ہنس کر حشر ہو چلا تھا۔ اور پھر اگلے چند لمحوں میں ہی

برسی طرح کھانتی ہوئی فوزیہ پھوپھو نے ایک جھٹکے سے کبل الٹ دیا۔ زکام اور بخار نے پہلے ہی مت مار رکھی تھی۔ اب مرچوں کی دھانس نے چہرہ آتش فشاں بنا دیا تھا۔

”بس کر دیں بھابھی۔۔۔ بس کر دیں۔ اب تو کھانس کھانس کے میرا دل اوپر حلق میں چڑھ آیا ہے!“ لال ہوئی ہوئی آنکھوں کا پانی صاف کر کے فوزیہ پھوپھو نے بمشکل جملہ پورا کیا۔

بے جی نے ایک تیز نظر فوزیہ پہ ڈال کر سکون کا سانس لیا کہ کم از کم ابھی کے لیے وہ اس قاتل نہیں رہی تھیں کہ میاں جی کے سامنے اپنے جیٹھ کے رشتے کی بین بجا تیں۔ مگر کب تک؟ اس سے پہلے ہی انہیں کوئی قدم اٹھالینا چاہیے۔ انہیں اب جلد از جلد نینبلی سے بات کرنا تھی۔



عمیس لاؤنچ میں داخل ہوا تو وہاں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا، صرف داہنی دیوار کے آخری صوفے پر کینڈی لون سلایاں تھلے کچھ بننے میں مگن تھی۔ آج کل وہ بے جی سے سیکھ کر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ شوق تھا اس لیے جلدی سیکھ رہی تھی۔ اے جہلی آواز میں ٹی وی پر کوئی ڈرامہ چل رہا تھا۔ یعنی کہ ماحول بے حد سازگار تھا۔ عمیس کی باجھیں چہ گئیں۔ یکدم اس کی شاعرانہ رگ پھڑک پھڑک کر اسے اکسانے لگی۔ اس نے دھیرے سے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ کینڈی یونی مگن سی بیٹھی رہی حالانکہ وہ عمیس کی موجودگی سے باخبر تھی۔ وہ چند قدم چلتا ہوا آگے آیا اور سب سے اگلے صوفے پر اجماع ہوتے ہوئے آواز میں بھاری پن پیدا کر کے ہوئے بولا۔

”عرض کیا ہے۔۔۔“
”تھا لیں کہ آئیں گی یہ راتیں کبھی۔۔۔“

عمیس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔
بوکھلاہٹ میں وہ اول قول کے جا رہا تھا۔ کینڈی ہنستے
ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

”واہ جی واہ۔۔۔! کیا کہنے آپ کے عمیس بھائی ٹی! کینڈی نے لفظ بھائی کو قدرے چباتے ہوئے داد دی تھی۔

”مان گئی آپ کا جگرا۔۔۔ ایک بل میں جس کے ساتھ عشق جھاڑا جا رہا ہو۔ اگلے ہی بل اسے آپنی باجی نیکار نے کافن آپ کو بخولی آتا ہے۔ واللہ! میں تو آپ کی شاگردی اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں!“ طفرے کے شیرے میں ڈوبی مصنوعی عقیدت کا اظہار کرتی کینڈی کا اعتماد دیکھ کر عمیس سچ بچ بوکھلا گیا تھا۔

”وہ تو میرے منہ سے اچانک نکل گیا تھا۔ اصل میں کینڈی۔“ بھرپور سنجیدگی کا تاثر لیے نگاہیں اس پر جمائیں۔ ”میں نہیں چاہتا کہ تمہاری محبت کا جو بچ میں نے اپنے دل میں بویا ہے۔ اس میں سے کوئی پھوٹنے سے پہلے ہی کوئی اسے نوچ ڈالے۔“

”آں۔۔۔ ہاں!“ کینڈی نے مزہ لینے والے انداز میں ہونٹ سکیڑے۔

”اچھا آپ کوئی کلام سنار ہے تھے اپنا۔ سنائیے نا۔“

”ارے ہاں وہ اصل میں مشتاق کے چکر میں ذہن سے ہی نکل گیا۔۔۔ لو پھر عرض کیا ہے۔“

”ہم بھول گئے رے ہر بات۔۔۔ مگر تیرا پیار نہیں بھولے۔“

تمام رات ہوتی رہی برسات۔۔۔ مگر تیرا پیار نہیں بھولے۔“

پرانے پاکستانی گانے کا ولیہ بنا کر عمیس اب داد طلب نظروں سے کینڈی کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے چہرے پر واضح طور پر ہائیں کا تاثر تھا۔ اس نے دھیرے سے کھنکھار کر بالائی لب پر انگلی نکاتے ہوئے کہا۔

”آپ تو بہت مہمان ہیں عمیس بھائی۔ آپ کا

کینڈی نے اک ادا سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور پایاں ابرو اچکاتے ہوئے بولی۔
”اچھا جی۔۔۔! اس کا انداز دیکھ کر لمحے بھر کو تو عمیس سٹپٹا گیا مگر اگلے ہی بل وہ پھر سے پر اعتماد تھا۔
”تھاقیں کہ آئیں گی یہ راتیں کبھی۔۔۔ تم سے“ ٹانگے گھر“ میں ہوویں کی ملاقاتیں کبھی۔“

”واہ واہ۔۔۔! کینڈی نے سلاخیوں کو اون کے گولے میں گھیرا اور دونوں مٹھیاں ٹھوڑی پر جما کر پوری طرح عمیس کی طرف متوجہ ہوئی۔ نگاہوں میں اشتیاق کا سمندر بھٹا تھا۔ مارنا دکھائی دیا عمیس کو اودھ کو رکش بجالایا۔

”آداب عرض ہے۔۔۔ آداب عرض ہے۔۔۔!“
”مگر آپ نے تو شعر عرض کیا تھا۔ عمیس بھائی۔“

کینڈی نے معصومیت سے عرض کیا۔
”سچ۔۔۔! شاعر شاعر ہوتا ہے بگلی۔ بھائی نہیں ہوتا۔“

بھائی کہنے سے شاعرانہ ”خیالات“ مرہ ہو جاتے ہیں۔
عمیس نے جھنجھلاہٹ چھپاتے ہوئے ناصحانہ انداز میں کہا۔

”یوں کہیں نا۔۔۔ کہ شاعر کو بھائی کہہ دو تو اس کا دل کھائی میں کو پڑنے کو کرتا ہے۔ ہا ہا۔۔۔! کینڈی زور دار تالی مارتے ہوئے ہنسی۔ عمیس نے دانست کچکپکائی۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ یعنی تم سنجیدہ ہی نہیں میرا کلام سننے کے لیے۔“ وہ مصنوعی دل گر فنی سے اٹھنے لگا۔

کینڈی فوراً سے پشیمانی ہوئی۔
”ارے! ایسا ہرگز نہیں۔ آپ کا کلام سننے کے لیے تو مشتاق بیٹھے ہیں۔“

”ہائیں۔۔۔! وہ تیری!“ عمیس ڈڈو کی مانیفیکدم اچھا تھا۔“ سر اسیمد سا پورے لاؤنچ میں نظریں گھمانے لگا۔

”ک۔۔۔ کہاں ہیں مشتاق صاحب؟ بھلا پہلے بتاؤ کہ یہاں کوئی مشتاق صاحب بھی تشریف فرما ہیں۔ حد کرتی ہو کینڈی۔ ہن۔۔۔! جو تے پڑنے کے خیال سے

ہم نے کہا ”یہ بھی بول، ساری عمر بیوی کو رلاؤں گا۔“

بے حد دل گرفتگی سے کینڈی نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا۔۔۔ سترکی دہائی کی ہیروئن کی طرح لہرا کر آنکھوں پر دوپٹے کا پلو بھی دھرایا۔

عمیس کی پیاری میں ابھی چار مصرعے مزید تھے اور وہ پورے فارم میں بھی تھا۔۔۔ جب پیچھے سے یکدم میاں جی نے شاندار امنٹری دی۔

”خچر دیا تیرا۔۔۔ ایدر آ۔۔۔!“
کینڈی تو کھوں میں نو دو گیا رہ گئی۔۔۔ میاں جی کے ہاتھ میں عمیس کی سکی اور لمبی گردن اگنی تھی۔ اس کے بعد عمیس آگے آگے اور میاں جی ہاتھ میں اپنا چہرے کا کھسکا لیے پیچھے پیچھے! ناک ناک کے نشانے یہ مارا تھا۔ اور پھر شام تک جب جب چوٹیں سہلاتے عمیس کے منہ سے دہائی نکلتی تب تب وہ اپنی سات پشتوں سمیت تک بند یوں سے نائب ہو مارا تھا



گو نگلو کو اسکن الرجی ہوئی تھی۔۔۔ سارے جسم پر چھوٹے چھوٹے باریک دانے سے نکل آئے تھے۔ چٹا گورا گو نگلو اس وقت لال چھندر ہوا جا رہا تھا۔ بخار الگ کسر پوری کر رہا تھا۔۔۔ بے جی کی تو ویسے ہی اس میں جان اپنی تھی۔۔۔ ہتیلیاں مسل مسل کروا دیا کیے جا رہی تھیں۔

”آئے ہائے! ہو رہے کدی نظر لگ گئی میرے گو نگلو نو۔۔۔ سارا پنڈا (جسم) چھوٹ ہو گیا منڈے دا

سب جی کی دہائی تب تک جاری رہی جب تک حرم کالج سے گھر نہیں آگئی۔ گھر کے مردوں کے آنے میں ابھی تاخیر تھا اور بے جی جانتی تھیں کہ میاں جی نے محض گو نگلو کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے وقت سے پہلے کسی لڑکے کو گھر روانہ نہیں کرنا۔ اور جو کھانے کے بعد تو عمیس بھی باقاعدگی سے فیکٹری

کلام تو آپ کی پیدائش سے کئی دہائیاں پہلے ہی چوری بھی ہو گیا۔۔۔ دھت تیرے کی۔۔۔!“
اپنے ہی سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

عمیس نے فخر سے سینہ پھلایا اور بات کی تہ میں پہنچے بنا ہی بڑھک ماری۔

”اف۔۔۔ دل نو چر پایا تھا۔۔۔ جگر بھی لے اڑیں ظالم صرف تم نے ہی میرے کلام کی قدر پہچانی ہے۔۔۔ ورنہ ایک دہائی تو مجھے بھی ہو گئی کتے ہوئے کہ میرے الفاظ چرائے جا چکے لوگو۔۔۔ خدا را کوئی تو سنو۔۔۔ مگر دیوانے کی بڑبڑ کون کون کان دھرتا ہے!“ عمیس نے مصنوعی تاسف سے آنکھیں میچ لیں۔۔۔ کینڈی کو یکدم شرارت سوجھی۔

”عمیس بھائی ایسی ہلکی ہلکی تک بندیاں تو میں ناچ رہی بھی کر لیتی ہوں۔۔۔ تو کیا خیال ہے ہو جائے کھٹی البدی۔۔۔!“

”ہیں۔۔۔ کون سی دی۔۔۔؟“ عمیس نے تھوک نکل کر پوچھا۔

”دی کہہ رہی ابھی عمیس بھائی۔۔۔ چلیے نا“
موقع بھی ہے دستور بھی۔۔۔ کچھ آپ کہیے کچھ ہم سناتے ہیں۔۔۔ ذرا داؤ بیچ آزماتے ہیں؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔۔۔“ (مرگیا عمیس) جی ہی جی میں عمیس کر لایا۔۔۔ کینڈی کے بھرپور جوش کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک لمبا اور ٹھنڈا سانس کھینچا اور اتر آیا میدان میں۔۔۔ ”آریا پاس۔۔۔ بیٹا جتنے شاعر نظر سے گزرے ہیں سب کا گھونٹا لگا دے۔۔۔ ورنہ ورنہ عزت کی چٹنی بن جائے گی۔“ اندر ہی اندر خود کو دلا سادیتے ہوئے عمیس ہمال نے آنکھوں میں خمار بھرے ہوئے پہلے عرض کیا۔

”ہم۔۔۔! میں نے کہا۔۔۔ تم سے بہت پیار ہے۔“

”آہاں! ہم نے کہا۔۔۔ تو ہی تو دلدار ہے۔۔۔!“
میں نے کہا ”دھوم دھام سے لے کر بات اپنی جاؤں گا۔۔۔“

کے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ اس نے قدرے بے بسی کے ساتھ کلینک کے داخلی دروازے کی طرف نگاہ کی۔ عین اسی لمحے ڈاکٹر کی آمد ہوئی۔ حرم نے شکر کا کلمہ پڑھا اور بے جی کو متوجہ کیا۔

”بے جی۔ اب بس کریں، انہیں جلدی ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں۔“

”ہن آیا اے شٹ پینا۔ میرا دل ہنسا کر دالے کہ کوئی (کنی) مار کے ایدیاں ناساں (ناک) پن دواں۔“ خچر جیانہ ہووے تے۔ ”بے جی تو مزید پیش میں آ گئی تھیں۔ سارا غصہ انہوں نے ڈاکٹر پر نکالا تھا۔ ارد گرد بیٹھے مریض دبی دبی ہنسی ہنس رہے تھے۔ محفوظ ہو رہے تھے۔

اللہ اللہ کر کے ان کا نمبر آیا تو تینوں اندر چلے گئے۔ گو نگلو کو پشٹ اسٹول پر نکا کر حرم خود اس کی تکلیف کو تفصیلاً بیان کرنے لگی۔ ڈاکٹر بلال حرم کو دیکھ کر ٹھک سا گیا۔ نظریا ریا بہک کر گو نگلو کے بجائے اسی کے حسین چہرے پر آ گئی۔ جبکہ بے جی بیاں ابو اچکائے نظر کے موٹے چہرے کے پیچھے سے مسلسل ڈاکٹر بلال کو کینہ توڑ نگاہوں سے دیکھتے جا رہی تھیں۔

ڈاکٹر بلال نے گو نگلو کا معائنہ کیا اور نسخہ لکھنے سے پہلے استقبالیہ انداز میں حرم کو دیکھتے ہوئے گو نگلو کا نام پوچھا۔

”ایدا ناں گو نگلو۔“ جواب بے جی کی طرف سے آیا تھا۔

”نہیں املاں جی! ہیٹ نیم نہیں اصل نام!“ ڈاکٹر بلال نے نرمی سے بے جی سے پوچھا۔

”نل تے میں تینوں کدوں اووے نڈ (پیٹ) دانا پ دیا اے۔“ اکھیا تے ہے گو نگلو۔ گو نگلو!“ بے جی نے نظروں ہی نظروں میں حرم کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بے جی سے ڈاکٹر بلال کو جواب دیا۔ ڈاکٹر بلال نے ٹھنڈا سا سانس بھرتے ہوئے پوچھا۔

”والد کا نام۔“

”اجمل۔“ جواب پھر بے جی نے ہی دیا۔ حرم

رہا تھا۔ لہذا کسی کو فون کر کے بلاتیں بھی تو آتے آتے ہی چار گھنٹے لگا دیتے۔ اس لیے جیسے ہی حرم گھر پہنچی، مشکل اسے منہ پہ دوپھینٹ مارنے کی اور منہ میں دو لالے ڈالنے کی رعایت ملی تھی۔ بے جی نے گو نگلو کا بازو پکڑا۔ سر پر رقعہ لٹکایا۔ کوفت زدہ سی حرم مشکل ساتھ چلنے پر راضی ہوئی تھی۔ وہ تو شکر تھا کہ اور بس بھائی کی کشش گھریں ہی کھڑی تھی اور حرم ڈرائیو کرنا جانتی تھی اس لیے جلدی ہی کلینک پہنچ گئے۔ اسکن اسپیشلسٹ کے کلینک پر رش بے تماشا تھا اور ڈاکٹر غائب۔ ”لو کن لے کر حرم فرصت سے ویننگ روم میں آکر بیٹھ گئی۔ بے جی اور گو نگلو کے برابر۔“ بے جی بڑی محویت سے مریضوں کی اکثاری ہوئی شکلوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ حرم جانتی تھی کہ ان میں سے ہی کسی مریضہ کے ساتھ اگلے پندرہ منٹ میں بے جی دوستانہ تعلقات استوار کر کے اس کا شجرہ نسب تک جان لیں گی۔ حرم نے سر پر اوڑھی چادر کو کھینچ کر ناک تک آدھا چہرہ ڈھکا اور سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔ اس پر غنودگی طاری تھی یا شاید واقعی وہ سو گئی تھی جب ایس کے حواس یک دم بے جی کی قدرے اونچی اور محضیلی آواز پر بیدار ہوئے۔

”لے دس! میرے نالوں سال کھنڈ چھوٹی ہوئی۔ تے مینوں املاں جی کھندی اے جی۔ تیرے تے سارے دند (دانت) ڈگے پئے۔ پھلے (پھولے) شاہر و رگا تیرا منہ اے۔ میرے وات (دہانہ) اندر رب دا شکر پورے ست (سات) دند تے چار داڑھاں (داڑھیاں) سالم دیاں سالم مونخو دے۔ ووئی آئی تو ہموں چھنی (کاکی منی)۔“

حرم بے چاری بوکھلا کر بے جی کو چپ کروانے کے لیے ٹھوکے دیے جا رہی تھی۔ اسے پوری بات تو نہیں مانی بس بے جی کے فقروں نے اسے بخوبی باور کرا دیا تھا کہ سامنے والی کرسی پر غصے سے بددیوانی خاتون نے ”ہن!“ بے جی کو بزدلی کی سند عطا کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں بے جی نے جواباً ”ان خاتون کے لشکروں کے پتے لگا دیے تھے۔ ادھر گو نگلو غار شکر کر

ہاتھ پرے جھٹکا۔ ”پراس کروڑی! تے مرچاں دی بجائے پھوڑی نو چلے (جو لمے) کو چپا دے۔“
 فوزیہ پھو پھو کو تو پٹنگے لگ گئے۔ میاں جی کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

”آپ سکون سے ٹی ڈرنک کریں میاں جی۔ اور ادھر بے جی مجھے اسٹو میں تھرو (پھینکا) کر کے فائر لگانے کا بول رہی ہیں۔ بس۔۔۔ لہف ہو گیا۔ میں نے مسٹر ارشد کو فون کر دیا ہے۔ پرسوں فرائینڈ (بھو) پر جتنے ہی نکل پڑیں گے۔۔۔ اور اب میں جی تو آپ کو چھٹی بھی اپنا ٹیس نہیں دکھاؤں گی۔ ایک پروپونل ہی تو لائی ہوں اپنی بیٹی کے لیے۔ کیا۔۔۔ ہے جو ایک سیٹ کر لیں۔!“

فوزیہ پھو پھو نے شال کے پلو سے آنکھیں رگڑ رگڑ کر سرخ کر لی تھیں مگر آنسو ایسے ڈھپٹ تھے کہ شاید آنسو گیس کی شینگ ہوتی تو نکل ہی پڑتے۔

”او پھوڑی پتر۔! جذباتی نہ بن۔ سوچنے کے لیے ٹیم تو دے!“ میاں جی رساں سے بولے۔ اس دوران بے جی اب آرام سے بیٹھی۔ فوزیہ پھو پھو کی چائے والا کپ تھامے سڑسڑ کی آواز کے ساتھ پیے جا رہی تھیں۔۔۔ چرے پر سکون تھا کیونکہ ان کی بھڑاس نکل چکی تھی۔ اور میاں جی کے تاثرات سے بھی وہ انداز کر چکی تھیں کہ انہوں نے کوئی خاص دلچسپی نہیں دلی تھی اس رشتے میں۔ یہ بات خاصی طمانیت بخش تھی

دیوار پارائے کمرے کی بالکونی میں کھڑے اترارے بے ساختہ شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔ میاں جی کے چھکے سینے رویے نے اس کی نس نس میں خوشی بھری تھی کم از کم ہارون نامی بلا تو سر سے ملی تھی۔ اترارے میاں جی یہ ڈھیروں پیار آیا۔ اس کی نظروں کی حرارت تھی کہ میاں جی نے چونک کر سر اٹھایا اور نگاہیں اس میں کھڑے اترارے کی نگاہ سے ٹکرائی۔ اسے یکدم شرارت سو جھی اور میاں جی کی طرف فلاںنگ کس اچھالتا، بھرپور ہنس ہنستا رہے ہو گیا۔ میاں جی نے سٹپٹا کر سب کے چرے دیکھے۔ کوئی بھی متوجہ

مارے شرمندگی کے سر جھکائے بیٹھی تھی۔
 ”پیشنٹ کا نام۔۔۔ گونگلو! والد کا نام۔۔۔ اجمل! یعنی کہ گونگلو! اجمل۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ یہ تو بڑی فنی (مزاحیہ) سی بات ہے۔“ ڈاکٹر بلال نے بڑی میٹھی نظروں سے حرم کو دیکھا اور ہنستے ہوئے بولا۔

اس کی حرم کو تازہ فطرس دیکھ کر بے جی دوبارہ طیش میں آ گئیں۔

”میں اک چھٹا ماری اے“ تیری ساری فنی خرابی نکل جالی اے۔۔۔ ڈاکٹر بن، شوہر نہ بن۔۔۔“
 اب کے ڈاکٹر بلال کے چوہہ طبق روشن ہوئے تھے۔ اس نے عافیت اسی میں جالی کہ خاموشی سے نسخہ لکھے اور ہاتھ میں تھامے ورنہ ان بزرگ خاتون سے کوئی بعد نہ تھا کہ باہر بیٹھے مریض بھی اس کی اس عزت افزائی کو لایا ملاحظہ کرتے۔



بے جی۔ حرم اور گونگلو کے ساتھ گھر پہنچیں تو فوزیہ پھو پھو آگے پچائیت لگائے میاں جی کو گھر سے بیٹھی تھیں۔ بیگم جمال اور بیگم اجمل بھی قریب ہی براجمان تھیں۔ کیٹڈی ابھی ابھی چائے بنا کر لائی تھی اور سب کو کپ پکڑا رہی تھی۔

بے جی پہلے ہی اکتائی ہوئی تھیں۔ یہ تماشا دیکھ کر تو ان کا جی چاہا کہ فوزیہ پھو پھو کی گردن مروڑیں۔ بے جی نے برقعہ اتار کر حرم کو پکڑا اور آستین چڑھائی میدان میں اتر آئیں۔ پھر تو وہ تھماں کارن پڑا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دی۔ صرف بے جی کی پنجابی اور فوزیہ پھو پھو کی انگریزی ایک دوسرے سے سر ٹکراتی، پاش پاش ہو کر فضا میں بکھر رہی تھیں۔ میاں جی بیٹھے مزے سے سردھتے ہوئے چائے کے گھونٹ بھر رہے تھے۔ انہیں عورتوں کی لڑائی دیکھنے میں لطف بہت آتا تھا۔ بیگم جمال کہیں اور اندر سے مروچیں پکڑ لائیں۔ دونوں ماں بیٹی پر سے وارنے لگیں۔ ان کے خیال میں کسی کی بد نظمر لگی تھی جو ماں بیٹی لڑ پڑی تھیں۔ بے جی نے چڑ کر بیگم جمال کا

نہیں تھا۔ وہ شکر ادا کرتے ہی جی میں بڑھائے۔
”چچو! پتہ۔“



دیوان خاص میں وحشت بھری خاموشی چھائی تھی،
... یوں جیسے ابھی ابھی میت ابھی ہو اور پیچھے محض اس
کاسوگ دھیمی دھیمی سسکیاں بھرتا ہو۔ بے حد اونچی
چھت اور خوب صورت شیشوں سے مزین روشن
دانوں والا یہ کمرہ پرانی طرز تعمیر پر مشتمل جدید
آسائش سے لیس تھا۔ وسط میں لٹکا فانوس اور
اس کا جگر جگر کرنا کچھ۔ روشن دان سے آتی سورج کی
کریں پڑنے کی وجہ سے نگاہوں کو دکھائے دے رہا تھا۔
یہاں موجود نوالی طرز کا بھاری بھر کم فرنیچر اس کی
شان و شوکت میں اضافے کا باعث تھا۔
اس وسیع و عریض دیوان خاص کی سفاک خاموشی
میں غیظ و غضب چھلکانی شخصیت نواب ترک
حسین خان کی تھی۔ مارے طیش کے نوابی رحمت لاوا
اگل رہی تھی۔

”ہم۔۔۔! تو آخر کار زمین نے نواب حسین احمد
خان کو اگل ہی دیا۔ ہونہر وہ ہمیں کیا سمجھتے تھے اگر وہ
آسمان کی وسعتوں میں بھی چھپ جاتے تو وہاں سے
بھی ہم ہاتھ برسا کر انہیں نوح لاتے۔ جیسے سال،
پورے چھپیس سال ہم نے اپنے پوتے کو ڈھونڈا ہے۔
ہماری عمر بھر کی کمائی تھی وہ۔۔۔ ہمارے فرزند نواب
راہہ طلال حسن خان کی نشانی۔ جس طرح انہوں نے
اسماعیل نمک حرام (کوچوان) کے ذریعے ہماری ٹانگ
کے نیچے سے ہمارا چوٹا غائب کر لیا تھا۔ ٹھیک ویسے ہی
ہم حسین احمد خان کی نگاہوں کے سامنے اسے لے کر
آئیں گے۔ ہم شب خون نہیں ماریں گے۔
ہمارے جانے کے انتظامات مکمل کرواؤ شیراقلن۔
ہمیں جلد از جلد پاکستان پہنچنا ہے اور اپنے پوتے کو
پارے طحطراق کے ساتھ اس محل میں لانا ہے۔ وہی
ہمارا اصلی وارث ہے۔ چلنے کی تیاری کرو شیراقلن
اب ہم مزید تاخیر نہیں چاہتے۔“

دو دھیا سفید مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے انہوں نے
ابو اچکا کر ادھیڑ عمر شیراقلن اور اس کے جواں سال
بیٹے زردلی کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ دونوں
جان کی امان پانے پر جی جی میں شکر بجالاتے ہوئے
سر جھکائے اٹلے قدموں واپس ہو لیے۔۔۔ آج کئی
سالوں کی مشقت کے بعد شیراقلن اس محل کے
وارث کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس سے
پہلے اس کا باپ اسی مہم میں ٹانگی کے باعث نواب
صاحب کے عتاب کا نشانہ بنا اسے معلوم ہو ہی گیا کہ
پاکستان میں نواب حسین احمد خان اپنے نواسے اور
نواب تبرک حسن خان کے پوتے کو لے کر کس
علاقے میں روپوش ہیں۔ اوزاب یہ خوش خبری نواب
صاحب کو دینے کے بعد کم از کم اسے بھوکے تیر کے
آگے نہیں ڈالا جانا تھا۔۔۔۔۔ وہ سرعت کے ساتھ
محل سے نکلا تھا اور اب اسے اگلے انتظامات کرنے
تھے۔۔۔

نواب تبرک حسن خان اپنی جگہ سے اٹھے اور
ہیروں جڑی چھتری کا دستہ مضبوطی سے تھام کر سبج سبج
چلتے کمرے کے سب سے تاریک گوشے تک چلے
آئے۔ باقی ماحول سے کٹ کر اور ہٹ کر بنے اس
اندھیرے اور ٹھنڈے حصے میں ایک بے نام سی
وحشت اور سوگواریت طاری تھی جیسے دیوار پار کوئی
زندہ لاش پچکیاں لیتی ہو۔ نواب تبرک حسن خان
نے ایک چھوٹا سا بٹن دیا۔ کھٹ کی آواز کے ساتھ
دیوان خاص سے متصل اس گوشے کی قدرے نیچی
چھت پر لگے یلو اسپالس جل اٹھے۔ تبرک حسن خان
مسکرا دیے۔ سامنے زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور
طلال حسن خان کا ہو شربا اور جاندار پوزٹریٹ پوری
شان سے آویزاں تھا۔۔۔

”کتنا حسین ہے یہ چہرہ۔!“ نواب تبرک حسن
خان نے گہری سانس بھرتے ہوئے سوچا۔

ہلکے بھورے چمک دار بیل، اونچی پیشانی، روشن
آنکھیں، کھڑی ٹانگ اور بھرے بھرے گالوں کے
ساتھ وہ ایک عمل شاہکار تھا۔ بے عیب بھرپور مرد،

مگر صرف نظر آنے کی حد تک۔۔۔ نواب زادہ طلال حسن خان۔۔۔ مرحوم!

”آپ کی جوان مری کا داغ ہمارے سینے پر ماسور بن کر دھرا رہا ہے، ہم نے برسوں اس کی آبیاری کی ہے۔۔۔ اور تب تک کریں گے جب تک نواب حسین احمد خان کا سینہ ایسے کئی ماسوروں سے چھلتی نہ کرویں۔

ہم ان کی نگاہوں کے سامنے سے اپنا ”کوہ نور“ جھپٹ لائیں گے اور پھر وہ اپنے برہا پے کے بقایا دن یوں ہی تڑپ تڑپ کر کاٹیں گے جیسے ہم نے گزشتہ کئی سال کاٹے ہیں۔۔۔ آپ کی قبر کھڑے ہو کر جو قسم ہم نے کھائی تھی طلال خان۔۔۔ آج اس کے پورے ہونے کا دن آن پہنچا ہے۔۔۔ ہم اس محل کا وارث۔۔۔ اپنا خون اور آپ کے اکلوتے بیٹے ”چھوٹے نواب“ کو لینے عقربہ پاکستان جا رہے ہیں۔۔۔“

نواب زادہ طلال حسن خان کی تصویر کے آگے کھڑے ہو کر اندھا دھند زہر لگاتے ہوئے انہیں لمحہ بھر کو یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ان کے دیے دکھوں کے تمنے تو آج بھی نواب حسین احمد خان کے سینے پر سجے ہیں جو بے کسی اور درد برداری کی موت نواب زادی عائشہ خان کا مقدر بنی تھی وہ بھی بھی فراموش نہیں کر سکے تھے۔۔۔ آج بھی وہ نہالی میں بیٹی کو یاد کر کے بچوں کی طرح ہلک اٹھتے تھے جس کا مرام نہ بھی انہیں دیکھنا نصیب نہ ہو سکا تھا۔۔۔ طلال حسن خان نے تو دورے کی حالت میں خود کو دوسری منزل کی بالکونی سے گرا لیا تھا۔۔۔ شدید زخمی ہونے کے بعد وہ جانبر نہ ہو سکے اور دم توڑ گئے۔۔۔ جبکہ نواب زادی عائشہ کو تو دھکا دے کر گرایا گیا تھا۔۔۔ کسی کو خبر بھی نہ ہو سکی۔۔۔ اور وہ مدتوں سے دیار غیر میں نواب خاندان کے خاندانی قبرستان میں پوند خاک تھیں۔۔۔ نواب تبرک حسین خان کی بیگم کا بھی برسوں ہوئے ساتھ چھوٹ چکا تھا ایک بیٹی تھیں رومنا۔۔۔ وہ طلال حسن خان سے چھوٹی تھیں۔۔۔ بیاہ کر دو کن گئیں۔۔۔ وہیں پر اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہی تھیں۔۔۔ طلال حسن خان کے مرنے کے بعد سے تو وہ مزید خوش و خرم

ہو گئی تھیں کیونکہ ان کے شوہر ان پر پہلے سے زیادہ فریفتہ ہو گئے تھے۔۔۔ آخر کو اب ساری جائیداد اور محلات رومنا کا مقدر تھے۔۔۔ مگر فی الوقت بازی الٹ گئی تھی۔۔۔ جس گھڑی سے نواب تبرک حسن خان کو اپنے پوتے کی اطلاع ملی تھی گویا ان کے کھنڈر وجود میں زندگی نئے سرے سے جاگ اٹھی تھی۔۔۔ وہ ابھی اس محل میں آیا نہیں تھا مگر انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے پوتے کی شادی رومنا کی اکلوتی بیٹی زونا نشہ کے ساتھ کر دیں گے یوں ان کا خون ایک دفعہ پھر اس محل کی دیواروں میں حرارت بن کر دوڑے گا۔۔۔ خواب بھی اونچے تھے اور ارادے بھی۔۔۔ بس طرف بے حد چھوٹا تھا۔۔۔ وہ دل میں بے شمار فیصلے قائم کرتے ہوئے طلال حسن خان کے صندلی فریم والے پورٹریٹ کو دیکھنے لگے۔۔۔ انہیں لگا جیسے آج ایک طویل عرصے کے بعد طلال حسن خان کے بے تاثر چہرے پر مسکراہٹ سی رنگ گئی ہے۔۔۔



فوزیہ پھوپھو ناراض ہو کر واپس چلی گئی تھیں۔۔۔ بقول ان کے۔۔۔ ان کی شدید نوعیت کی بے عزتی کی کئی تھی۔۔۔ کیا تھا جو حرم کے لیے ہارون کا رشتہ قبول کر لیا جانا۔۔۔ مگر بات جب جمال تلیا کے کانوں میں پڑی تو انہوں نے دو نوک انداز میں منع کر دیا تھا بلکہ وہ فوزیہ پھوپھو پر باقاعدہ غصہ ہوئے تھے اور رد عمل کے طور پر اسی دن انہوں نے سالن باندھا۔۔۔ بچے اکٹھے کئے اور روٹی بسورتی نکل لیں۔۔۔ بے جی سے تو ملی بھی نہیں اور انہوں نے بھی بیٹھے بیٹھے ہاتھ جھٹک کر زوردار ”ہونہ“ بول دیا۔۔۔ فی الحال وہ خود بھی یہی چاہتی تھیں کہ فوزیہ پھوپھو اپنے گھر سدھاریں تاکہ وہ حرم کے لیے سکون اور تسلی سے کچھ طے کر سکیں۔ میاں جی نے البتہ بہتری کو سس کی تھی انہیں روکنے کی۔۔۔ پیار سے پکار کے۔۔۔

”چل پھوڑی۔۔۔ پتہ نہ چالے دے غصہ۔۔۔!“

”ہرگز نہیں میاں جی۔۔۔ نیو۔۔۔!“

”جل ناس۔ پوکی بات نہیں مانے گی۔ نہ جا۔۔۔“
 ”میں اب ہرگز نہیں اٹے کروں گی میاں جی۔۔۔“
 ”مان جا پتر۔۔۔“
 ”نہ۔۔۔ میاں جی۔۔۔“
 ”مان جا۔۔۔“
 ”مال۔۔۔“

”جل فیر چھمتی نکل۔۔۔ ترین چھوٹنے والی ہے تیری۔۔۔“

میاں جی نے ناک کھجاتے ہوئے بے نیازی سے کہا اور فوزیہ پھوپھو منہ بسور کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔۔۔ میاں جی نے عمیس کو آواز دی اور اسے فوزیہ پھوپھو کو جلدی سے اسٹیشن چھوڑ کر آنے کے لیے کہا۔ عمیس اندر سے یکدم برآمدے میں یوں نمودار ہوا جیسے کسی نے دھکا دے کر پھینکا ہو۔۔۔ کینڈی کے او اس چہرے پر رونق سی اتر آئی۔۔۔ وہ تو ابھی واپس بھی نہیں جانا چاہتی تھی مگر ماں کی دو گھوڑیوں پر چکی بیٹھ رہی۔۔۔ بے جی نے بغور یہ منظر دیکھا تھا جبکہ میاں جی کا دھیان عمیس پر تھا۔۔۔ وہ گردو پیش سے بیگانہ سا کینڈی کو یوں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے آخری دیدار کر رہا ہو۔ میاں جی کو اس کا چھوڑ پھوڑ دیکھ کر اندر ہی اندر ابال آ رہا تھا مگر موقع کی نزاکت کا خیال تھا۔۔۔ وہ کسی کو متوجہ نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے پہلے تو ہلکا سا زبردانے ہوئے اسے ”بے غیرت“ کہا اور پھر قدرے اونچی اور ٹھوس آواز میں مخاطب ہوئے۔

”میں کیتا عمیس پتر۔۔۔ ایک شاپر میں اپنی آنکھیں ڈال اور چھو پھی کے تال ہی بیچ دوے۔۔۔“
 عمیس نے یکدم سٹپا کر میاں جی کو دیکھا جو قہار نگاہیں اسی پر جمائے ہوئے تھے کینڈی کا چہرہ محفت سے سرخ ہوا تھا جبکہ بے جی نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے سرینچے کر لیا تھا۔۔۔ وہ جو سوچ رہی تھیں یہاں وہی معاملہ تھا۔ انہوں نے اپنے اندازے کی درستی پر خود کو داد دی۔ فوزیہ پھوپھو دونوں بھابیہوں کے روبرو کرکے مل رہی تھیں۔۔۔ بھائیوں سے بھی وہ ناراضی

کے اظہار کے طور پر بغیر ملے چلی گئی تھی۔
 اسی وقت حرم کالج سے لونی تو اس سے بھی فوزیہ پھوپھو۔۔۔ گیٹ پر کھڑے کھڑے ہی مل بس۔۔۔ اور جلدی سے اپنی پلٹن لے کر عمیس کے ساتھ نکل لیں۔ اس افراتفری پر حرم حیران پریشان سی کھڑی تھی جبکہ گھر کے بقیہ افراد کے تاثرات خاصے اطمینان بخش تھے۔۔۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتی وہیں بے جی کے پیروں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔۔۔ بے جی حرم سے نہ جانے کیا کھسر پھسر کیے جا رہی تھیں پر اس کا دھیان کہیں اور اٹکا تھا۔۔۔ یکدم کوئی خیال آنے پر وہ تیزی سے اٹھی۔۔۔ اتاری ہوئی سینڈل دوبارہ اڑسیں۔۔۔ اور بے جی کو ”ابھی آئی“ کہہ کر گیٹ سے باہر نکل آئی۔۔۔ اس کا رخ کچھ فاصلے پر بننے پارک کی طرف تھا۔۔۔ آج احرار نے اسے ضروری بات کرنے کے لیے وہاں بلایا تھا اور وہ بیکر بھول گئی تھی۔۔۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی پارک میں داخل ہوئی پھر ان بڑا تھا۔۔۔ کوئی اکا دکا بزرگ آدمی بیچوں پر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔۔۔ حرم گیٹ کے قریب ہی ایک شیخ پر بیٹھ کر بے چینی سے احرار کا انتظار کرنے لگی۔۔۔ آج اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے مجبور کرے گی کہ وہ حسین نانا اور زینب نانی کو رشتہ لانے کے لیے کہے۔۔۔ ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔

اسے وہاں بیٹھے ہوئے میں منٹ گزر گئے مگر احرار کا کوئی پتا نہیں تھا۔ وہ نہج ہونے لگی تھی۔۔۔ جلدی میں اپنا میل فون بھی بے جی کے پلنگ پر چھوڑ آئی تھی ورنہ کال کر کے ہی پوچھ لیتی۔۔۔ مزید دس منٹ انتظار کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور مضطرب سی گیٹ کی طرف چل دی۔۔۔ نظریں مسلسل ابھرا دھر ہٹک رہی تھیں کہ شاید کہیں سے احرار کا چہرہ نظر آجائے۔۔۔ جی ہی جی میں غصے کو دباتی وہ پارک کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی جب کسی نے دور سے اسے پکارا تھا۔۔۔ وہ تھک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔۔۔ ایک خوش پوش اور خوش شکل سانجوان تیز قدموں سے چلا اس کی سمت آ رہا تھا۔۔۔ حرم نے اسے پہچاننے کی کوشش کی

”اوہ ڈاکٹر بلال!“
 ”کیسی ہیں آپ؟ پہچانتا مجھے؟“ قریب پہنچ کر ڈاکٹر بلال نے خوش سے پوچھا۔
 ”جی۔ پہچانتا۔ ہو تا تو کبھی ٹھہرتی نا۔!“

حرم نے سارہ لہجے میں جواب دیا۔ ڈاکٹر بلال فوراً سنبھلا تھا اور خود کو کمپوز کرتے ہوئے بے جی اور گونگو کا حال احوال دریافت کرنے لگا۔ چند منٹ حرم نے بے حد قفل سے سوالوں کے جواب دیے تھے مگر پھر اسے کوفت نے گھیر لیا۔ ایک تو پہلے ہی احزار پر غصہ تھا اور سے یہ ڈاکٹر بھی لسوڑہ ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے جان چھڑانے کی غرض سے کہا۔

”ایسا ہے ڈاکٹر بلال۔! میں کسی دن اپنے بھائی کو آپ کے کلینک بھجوا دوں گی۔ آپ اس کا تفصیلی معائنہ کر لیجئے گا۔ آپ کو دوبارہ مجھے سربراہ روک کر اس کا حال دریافت کرنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی۔ چلتی ہوں!“

حرم نے قدم آگے بڑھا دیے۔ ڈاکٹر بلال خفیف سا کھڑا سے جاتا دکھتا رہا۔ یہاں تک کہ بالکل سیدھی سڑک پر کافی فاصلے پر حرم ایک خوب صورت کوٹھی میں گھسٹی دکھائی دی۔

”اوہ۔!“ ایک خوشگوار اور طمانیت سے بھرپور سانس ڈاکٹر بلال کے منہ سے خارج ہوئی۔ تو آخر اسے اس دل نشین پری بیکر کا اتنا تامل ہی گیا تھا جس کے لیے وہ گزشتہ کئی دن سے کالونی کی گلیوں میں خوار ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر بلال نے تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف قدم بڑھائے تھے۔

”میاں! آج کل ہم خاصے پریشان ہیں۔ نہ جانے کیسے اندیشوں سے دم بھتا رہتا ہے۔“
 تنگی بسلا پر مہارت سے ایک مو آگے بڑھاتے ہوئے نواب حسین احمد خان نے کہا۔ لہجہ قدرے بوجھل اور بھجا بھسا تھا۔
 ”دانش مندی کا تقاضا ہے کہ جب سستانے

بیٹھیں تب بھی چوکنے رہیں مگر دشمن آپ کی فرصت کو کمزوری نہ جانے اور پیٹھ پیچھے وارنہ کرنے پائے۔ امید ہے کہ میری بات آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔!“ نواب صاحب کے اعصاب کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اس رنج پر تو انہوں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ وہ یکدم گم صمم سے ہو گئے اور چند خانے بعد جب گویا ہوئے تو آواز بھلی ہی دھیمی تھی مگر لہجہ مضبوط تھا۔

”آج پانچواں دن ہے میاں۔ ہمارا نواسہ ہم سے کتنی کترا رہا ہے۔ احزار میاں ہمارے بیدار ہونے سے پہلے نکل جاتے ہیں اور رات آنکھ لٹنے کے بعد تشریف لاتے ہیں۔ ہم پر نظر پڑے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ جالنج رہے ہوں۔ کسی کھونج میں ہوں۔!“

”تو بتا دیجئے میاں۔ نواب صاحب! عمر ہے۔ تجربہ ہے۔ چوٹ کھائے بیٹھے ہیں۔ آپ بھی چاہیے کہ کس زخم کا کھرید اکھڑنا چاہتا ہے۔ رنے سے پہلے مر، ہم کا انتظام کیجئے۔ عمر سے کچھ نہیں ہوتا نواب صاحب۔ کھلاڑی مہارت رکھتا ہو تو باری بازی پلٹ سکتا ہے۔ جیسے یہ رہا آپ کا مہو۔“ انہوں نے نواب صاحب کا ہاتھ تھام کر ایک مہرے پر رکھا۔
 ”اور یہ رہی آپ کی چال۔“ ڈھیر سے ان کے ٹھنڈے ہاتھ کو جنبش دی ”اور یہ شہادت۔!“

نواب حسین احمد خان کے کمزور سے پیادے نے ان کا یاد شاہ مار دیا تھا اور وہ بڑے ٹھنڈے بیٹھے انداز میں نواب صاحب کو تنگ رہے تھے جبکہ نواب حسین احمد خان یک تنگ بسلا کو چرت سے تنگے جارہے تھے۔ یہ جیت ان کی توقع کے برعکس تھی۔

نواب صاحب نے دھیرے سے پلکیں اٹھائیں ہلکی گھلائی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ انہوں نے اپنے مقابل بیٹھے اس مہولان چہرے کے لیے دل میں بے پناہ محبت محسوس کی۔ جی ہی جی میں مہم ارادہ باندھا کہ اب کی بار انہیں کسی صورت شکست نہیں کھانی۔ نہ اختیار سے اور نہ وقت سے۔!

زیادہ تکلیف اس بات کی تھی کہ اس دن یارک میں نہ آنے کے باوجود اس نے معذرت کا یا شرمندگی کا کوئی فون تک نہ کیا تھا۔ اور اب حرم کا غصہ حقیقتاً بریشالی میں بدل چکا تھا۔ ایک دفعہ بہانے سے اس کے گھر بھی ہو آئی تھی مگر نہ بتائی بھی اس کی روئین سے بیزار بیٹھی تھیں۔

اور اب یہ ڈاکٹر بلال کا رشتہ! کیا وہ اتنا بے خبر تھا یا پھر جان چھڑانے کے بہانے ہیں؟ حرم نے دیکھے سر کو داپس ہاتھ کی انگلیوں سے مسکتے ہوئے سوچا۔ اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ بیٹھک میں اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ اس کی ساری دلچسپی کا سلمان تو دیوار پار تھا اور دیوار پار بیٹھا ساجن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سندریا پار جا بیٹھا ہے۔ بیٹھک سے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں باہر تک سنائی دے رہی تھیں۔ اندر میاں جی کے بھڑکنے اور بھڑک کے صلواتیں سننے کی آواز اب صاف اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔

”میں کہہ دتا۔ کوئی سوچے دی تا۔ اے میں ہونے ہی نہیں دیتا۔ پادیں (چاہے) وہ نواب کا پتر میرے پیروں میں آکر بیٹھ جائے۔“

”تے تیر میں دی اکھ دتا۔ کہ حرم دواواہ میں احرار تل ہی کرنا۔ پادیں ج دی ہو جائے۔ میں زبان دتی اے۔“ بے جی نے بھی گردن اکڑا کر تڑی دی۔ میاں جی نے طنز سے ہنسا کر ابھر کر کہا۔

”ہو نہ۔ اکھڑی زبان۔ زبان تے تیرے منہ وچ اے۔ مینوں پاگل بنائی اس۔“

”گل سنو جمل دے اپا۔! دشمنی تے صرف حسین بھرا تل اے تا۔ احرار نمائے نے کی قصور کھتا اے۔ ایتا سوہنا منڈا۔ ایتا لیتق نیتق (لائق فائق)۔ تسی بن جان دیو پر اپیاں گلاں۔ دل وڈا کر لو توے سارے گلے آپوں آپ ہی مک جانے۔“

بے جی اب کے بے حد رسلان سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ نیماں جی نے آنکھیں چندھی کر کے بے جی کو لغو دیکھا اور پھر تیا جمل اور اجمل صاحب پر نظر ڈالی۔ قریب پڑا سلگتا حقہ کھینٹا اور ایک بھر پور

حرم کا رشتہ آیا تھا۔ ڈاکٹر بلال کے لیے اس کے والدین سولی بن کر آئے تھے۔ اور بہت محنت سے تقاضا کیا تھا۔ پوری کوٹھی میں تھر تھلی سی بچ گئی تھی جیسے۔ رشتہ بہت پائے کا بھی تھا اور پوری فیملی خاصی اسٹینڈرڈ کی تھی۔ پڑھی لکھی۔ شائستہ اطوار اور وضع وار۔!

بے جی کا میٹر تو اسی لمحے گھوم گیا تھا جس لمحے انہوں نے ڈاکٹر بلال کو ڈرائنگ روم کے سنگل صوفہ سیٹ پر وانت گھوسے بیٹھے دیکھا تھا۔ میاں جی البتہ بے حد خوش تھے اور بچے جارہے تھے۔ کیونکہ ڈاکٹر بلال کے دادا کا تعلق بھی میاں جی کے پنڈ سے نکل آیا تھا اور میاں جی اس بات پر ”خاخواہ“ والا آخر محسوس کر رہے تھے۔ بے جی نے بمشکل وہاں بیٹھے رہنے کی ذمہ داری پوری کی تھی وگرنہ ان کا دل کر رہا تھا کہ بغیر گلی لپٹی رکھے صاف کہہ دیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ مہمانوں سے بھی وہ اکھڑی اکھڑی سی رہیں۔ جبکہ بیگم اجمل اور بیگم جمل بھی مرعوب سی خاطر داری میں لگی تھیں۔

مہمان چلے گئے اور رشتہ ڈال گئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ انہیں یہ نہیں کی جائے گی۔ اور اب ڈرائنگ روم میں میاں جی۔ گھر کے بچوں کے ساتھ مل کر ریفرنسمنٹ کے لیے رکھی گئی چیزوں کا صفایا کر رہے تھے۔

بے جی نے فون کر کے فوراً ”تیا جمل اور اجمل صاحب کو بلایا تھا۔ دونوں سرعت سے پہنچے تھے اور پھر کچھ ہی دیر میں گھر کے سارے بڑے بیٹھک میں بند ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ اور لیں بھائی بھی گھر آتے ہی بیٹھک کی نذر ہو گئے تھے۔ عہمیں نے بہتری کوشش کی کہ اسے بھی بیروں کی صف میں شامل سمجھا جائے مگر میاں جی کی ایک کھلی نظریں اس کی ہوا نکال دی تھی۔ اب وہ شرافت سے بیٹھک کی اس کھڑکی سے کان لگائے کھڑا تھا جو لان کی طرف کھلتی تھی۔ جبکہ حرم کمرے میں بند تھی۔ احرار کو کال ملا ملا کر انگلیاں کھسکی تھیں مگر اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔

خلاف جاہی نہیں سکتا۔

”میں نے کیا کہا ہے میاں جی! جو بے جی اور بڑے بھائی صاحب فیصلہ کریں۔ مجھے منظور ہو گا۔ حرم ان ہی کی اولاد ہے۔“ اجمل صاحب نے ہمیشہ کی طرح جھگڑے کے ساتھ سیدھا سادا سا جواب دیا۔

”نا۔ تو کاغذی بابا ہے حرم کا۔ وڈا تو قریطہ۔ اگے پیچھے بولتا نہیں۔ بولا تو کفن ہی پھاڑا مارا۔!“
میاں جی کے بس ہی نہیں تھا کہ اجمل صاحب کی پھینپی لگا دیتے۔ بے جی کے چہرے کی چمک لوٹ آئی۔
واری صدقے جاتے ہوئے بولیں۔

”چھڑو جی۔ جمال دے بابا۔! میرا اے پتر بڑا ہی بیباک۔۔۔ پہلاں تولد اے فیروں لد اے۔!“

”پر میں نہیں ماننا۔ ایسے رشتے میں بڑے روئے ہیں۔!“ میاں جی کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

”روئے تو توڑے (آپکے) داغ دچ نے۔!“ بے جی نے تیوریاں چڑھائیں۔

”مان جا میں میاں جی۔ بچوں کی خوشی دیکھیں۔“ جمال نایا کا التجا بے اندازہ۔

”تسی صرف میری مرضی دیکھو۔!“ میاں جی کی وہی اکڑ۔

”مان جا میں میاں جی۔ میری بیٹی وہاں خوش رہے گی۔“ اجمل صاحب نے منمناتے ہوئے عرض کیا۔

”نا۔ کیتناں۔!“ وہی صفا چٹنا بے جی کا پارا چڑھائے دے رہی تھی۔ کب سے مکمل خاموشی کے ساتھ ساری کاروائی ملاحظہ کرنا اور یس اب کے چپ نہ رہ سکا۔ ٹھوک نکل کر۔ گردن کو ہلکا سا جھکا دیتے ہوئے بولا۔

”میرا بھی ووٹ ازار کی طرف ہی ہے میاں جی! وہ بہترین لڑکا ہے۔ ہم اس کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں لہذا اس کو ہم سے بہتر کون جانے گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ۔!“

”او۔ تو چپ کرو کا کا۔!“ میاں جی نے غصے سے ہانہ لہرا کر اور یس کو چپ کرایا۔ چہرے پہ افسردگی

کش لینے کے بعد بلغمی آواز میں بولے۔

”جا۔ کیا یاد کرے گی۔!“ حاضرین کے چہرے یوں کھلے جیسے بجتے دے میں تیل ڈال دیا ہو۔ سب ہی نے ایک برس کون ساں خارج کی تھی۔

”جا۔ نہیں مکاتا (ختم کرتا) میں کھلے اکر لے جو بھی کرتا۔ اب کی بار میری لت (ٹانگ) اوپر ہی رہے گی۔ میں نے بھی اپنے آپ کو زبان دی ہے۔ یہ دیکھ۔“ میاں جی نے اپنے زبان باہر نکال کر بے جی کو دکھائی۔ ”میرے منہ کے وچ ہی ہے یہ۔!“ بچوں کی طرح ایک بار پھر سب کو اپنی زبان کا دیدار کر کے حقے کا کش لیا اور دھواں بے جی کے چہرے کی طرف رخ کر کے چھوڑ دیا۔ جن کے تیور خاصے جارحانہ ہو رہے تھے۔ جمال تبا بھی یکدم پریشان سے ہوا اٹھے۔
دھیمے اور بابا دب لہجے میں گویا ہوئے۔

”میاں جی۔! آپ کا فیصلہ سر آنکھوں پر۔ مگر اب سے پہلے ماضی میں بیوں کی۔ کی گئی غلطیوں کا

خیزا زہ ہم سب نے بھگتا اور ابھی تک بھگت رہے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک اور غلط فیصلہ کر کے ہم

اپنی اگلی نسل کو اس کا خراج بھرنے کے لیے چھوڑ جائیں۔ تاکہ یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہ سکے۔ پے

در پے غلط فیصلے صادر ہوتے جائیں اور ہماری نسلیں ان کی بحیثیت چڑھتی جائیں۔ کیا ایسا چاہتے ہیں آپ؟“

”پتر۔! تو کرتا ہے کتابی باتیں اور میں حقیقت کے پنے الٹا ہوں۔!“ میاں جی کا مدبرانہ جواب آیا۔

پھر ایک خشمگین نظر اجمل صاحب پر ڈال کر بولے۔

”یہ اپنا صدر ممنون ہے جو۔ اس سے بھی بوجھ لے۔ ہوئے یہ ہی وہ نہ چاہتا ہو نماں جو تم لوگ

چاہتے ہو۔!“

”صدر ممنون“ میاں جی اجمل صاحب کو کہا کرتے تھے۔ ان کی خاموشی جو انہیں ہمیشہ ان کی فرماں برداری لگا کرتی تھی۔ اس وقت زہر لگ رہی تھی۔

انہیں یقین تھا کہ ان کا یہ سپوت ان کی مرضی کے

لانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولے
”تسبی سارے ملے ہوئے اور ایسے طرح کرو کہ
ابے نوڈے دوج بند کرو تے دریا دوج روڈہ دیو۔
(ہاں)۔“

”تا۔ تاخیری صلا۔“ بے جی نے مٹھی بھیج کر
چنے پہ رکھی۔ میاں جی خوش ہوئے کہ تیر نشانے پر
لگا۔

”کیسی آل گلاں کروے او جمل دے ابا۔ دریا دوج
ایویں ای روڈہ دیں۔ ڈبہ مینوں دے دیا جے۔ میں
سانجھ (سنبھال) لوں گی۔“ بے جی نے ناک پر سے
مکھی اڑاتے ہوئے گویا قصہ ہی ختم کیا۔ اور ایسے اور
اجمل صاحب نے ہنسی چھپانے کے لیے ادھر ادھر
دکھنا شروع کر دیا۔ جمال بابا نے سر پکڑ لیا، کیوں کہ
بے جی نے معاملہ بگاڑ دیا تھا۔ کھڑکی سے لگا عیس
اور حوری بیٹن لیے اندر کو بھاگا۔

میاں جی کے ہاتھ پھرنے لگے تھے۔ مارے طیش
کے سینہ اٹنے لگا۔ خرخراتی سانس جاری ہو گئی۔
بے جی نے جی جی میں خود کو کوسا۔ ناحق طیش دلایا
۔ اور دو چار جذباتی جملے ہوتے تو میاں جی ڈھے ہی
جاتے، مگر اب تیر کمان سے نکل گیا تھا، میاں جی اپنی
جگہ سے کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھ پیچھے باندھتے
ہوئے بھر پور سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

”حرم کاویاہ ڈاکٹر بلال نال ہی ہوئے گا۔ یہ میرا
آخری فیصلہ ہے۔ بن کسی نے احرار داناں میرے
سامنے لٹھاتے میرا مویا (مرا) منہ دیکھے گا۔“

بیٹھک میں یک دم خاموشی چھا گئی۔ سب اپنی
جگہ جے بیٹھے رہ گئے۔ میاں جی گرم چادر کی بکلیں
مارتے۔ حقہ ہاتھ میں اٹھائے تن کر چلنے باہر نکل گئے
تھے۔ بے جی نے اپنے ہاتھوں سے ایسی کرہ لگائی تھی
جسے منہ سے کھولنے کے لیے دانت کدھر سے لاتیں
۔ اب تو بس انہونی ہو جانے کی دعا کرنی تھی۔!



سارا دن برستی بارش نے سردی کی شدت میں

اضافہ کر دیا تھا اور رات ہونے تک ہلکی ہلکی پھوار پھر
سے شروع ہو گئی تھی۔ اس ٹھنڈی سردی سے بے
نیاز احرار کب سے چھت پر ٹپلے جا رہا تھا۔ اس کے
وجود کے اندر نہ جانے کون سا لاؤ بھڑک رہا تھا جو اسے
چین ہی لینے نہیں دے رہا تھا۔ سرخ ہوئی ناک اور
متورم آنکھیں لیے اس کا لمبا چوڑا وجود بھی اس کے
خیالات کی طرح منتشر تھا۔ بیزاری اس کے روم روم
سے چھلکتی تھی۔

اچانک دیوار پر چھت پر کھٹکا سا ہوا۔ کوئی سچ
سچ چٹا اسی کے پاس آ رہا تھا۔ وہ دونوں چھتوں سے
مقتل دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا مگر پلٹ کر
نہیں دیکھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ حرم کے علاوہ کوئی اور
نہیں ہو سکتا!

حرم کے دل میں جیسے کوئی کانٹا سا چبھا تھا۔ اتنے
دن ہو گئے تھے انہیں ایک دوسرے کو دیکھے۔ اور اب
جب اتفاقاً وہ اسے مل ہی گیا تھا تو اتنا بے نیاز کیوں
دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ وہ کتنے ہی
شکوے کرے گی۔ خیرے دکھائے گی۔ ناراضی کا
اظہار کرے گی اور تب تک نہیں مانے گی جب تک
اسے انتہائی ستانہ لے جتنا وہ خود پچھلے کئی دنوں سے
پریشان تھی۔ مگر یہاں احرار تو وہ احرار لگ ہی نہیں رہا
تھا۔ اس کا بے حد سنجیدہ اور سپاٹ چہرہ دیکھ کر حرم کو
یوں محسوس ہوا جیسے پہلی بار وہ ”نواب زادہ احرار حسن
خان“ سے متعارف ہو رہی ہے۔ وہی نوابی رعونت اور
ظننہ اس وقت اس کی خوب صورت کھڑکی ناک پر
بڑی شان سے براجمان تھا۔

حرم بے اختیار جھج کر چند قدم کے فاصلے پر ہٹ
کر کھڑکی ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس ٹھنڈی سردی
میں وہ بغیر کسی جیکٹ یا گرم سوئیٹر کے کھڑا تھا۔ اس
کے چوڑے اور مضبوط شانے بارش کی پھوار نے بھگو
ڈالے تھے۔ اس نے بمشکل بات شروع کرنے کے
لیے سر اٹکالا۔

”احرار۔! تمہیں اتنی سردی میں یوں کھڑا
نہیں ہونا چاہیے۔ اگر بیمار پڑ گئے تو۔۔۔ دیکھو نا تم

سارے بھگ چکے ہو۔“
 حرم کو اپنا ہی جملہ بے ربط اور پر تکلف محسوس ہوا۔
 وہ اپنے ہونٹ چبانے لگی۔
 ”تم اوپر کس کام سے آئی ہو؟ کوئی تماشا کھا کرنا
 ہے کیا؟“ اس غضب کی ٹھنڈ نے حرم کے اعصاب
 شل نہیں کیے تھے مگر احراز کے بے مہربانے اور اجنبی
 جیلے نے اس کی رگوں میں دوڑتا ہوا ضرور جمادیا تھا۔
 ایک ہی بل میں اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر
 گئی تھیں۔ وہ بمشکل ضبط کرتے ہوئے بولی۔ اس
 کے انداز میں کٹیا لپٹا تھا۔

اس نے شدید بے چینی کے عالم میں دونوں ہاتھوں
 کی انگلیوں میں بالوں کو جکڑا۔ اور پھر بچان زدہ سا چلا
 کر بولا۔

”میں تو خود اپنوں کی سفاکی کا شکار ہوا ہوں۔ میرا
 ہر رشتے سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ میری قابلیت اور
 صلاحیت کو جیسے زنگ لگ گیا ہے۔ میں کسی کو کیا
 سناؤں گا؟ لیکن، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم
 سے محبت نہیں کرتا۔ بس میں مجبور!“ وہ جھٹکے
 سے پلٹا تھا۔ اور پھر اسے جھٹکا لگا تھا۔ ساتھ والی
 چھت ویران بڑی تھی۔ حرم جا چکی تھی۔ اس کا دکھ
 جانے بغیر کس کا اعتراف سنے بغیر!!

اس نے بے حد آزدگی کے ساتھ بادلوں سے
 بھرے آسمان کو ٹکا۔ بارش کا ایک قطرہ اس کے گال
 پر پڑا اور آنکھ سے بہہ جانے والے آنسو میں
 مدغم ہو گیا۔

☆☆☆

جب وہ خود سے خمالوڑ لڑتے تھک گیا تو نیچے
 آیا۔ وہ بے حد آزدہ تھا، یہ اس کے چہرے سے
 صاف ظاہر تھا۔ اس کا بیڈ روم لاؤن بھار کرنے کے بعد
 آتا تھا اور جس وقت اس نے لاؤنچ میں قدم رکھا
 وہیں ٹھک کر رک گیا تھا۔ نواب حسین احمد خان او
 زمنب بی۔ دونوں ہی وہاں بیٹھے تھے۔ یقیناً ”آ
 کے انتظار میں۔ وہ ایک گہرا سانس بھرتا۔ سپاٹ
 چہرے کے ساتھ ان کے قریب چلا آیا۔ ماحول

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے نواب زادہ
 احراز حسن خان۔ کہ میاں جی نے میرا رشتہ طے کر دیا
 ہے۔ میں جو آپ کی تمھاری آس کی ڈوری تھامے اتنی
 آگے نکل آئی تو کیا اس لیے کہ آپ وقت پڑنے پر پیٹھ
 موڑ کر کھڑے ہو جائیں۔ یا میری محبت کو سستا جان
 کر تماشا بنائیں۔“

”تو پلٹ جاؤ واپس، واپسی کا راستہ ابھی کھلا اور
 ہموار ہے۔ میں آج سے۔ ابھی سے وہ ڈوری کاٹنا
 ہوں جسے انجانے میں نہیں تھا بیٹھا۔“

پر نیچے اڑنا کیا ہوتا ہے۔ یہ آج حرم نے جانا تھا۔
 اس قدر اہانت۔ اتنی ناقدری۔ اتنی دور اگر کیا وہ
 واپس پلٹ سکتی تھی۔ کیا وہ کسی اور کی ہو سکتی تھی؟
 وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے یک ٹک احراز کے گھنے
 براؤن بالوں والے سر کی پشت کو تکتے جا رہی تھی اور
 آنسو قطار در قطار کنوڑوں سے چھلکتے چلے گئے۔ اس
 کے پاس سارے لفظ ختم ہو گئے تھے جیسے۔ اور وہ
 اسے مہتی بھی کیا۔؟ منت ساجت کرتی۔؟ کیوں۔؟
 تاکہ اس کا دل پھل جائے۔؟ اور اگر اس کے دل کو
 موم ہوتا ہی ہوتا تو کیا وہ اسے اتنی بڑی بات کہہ دالتا۔؟
 نہیں ہرگز نہیں۔۔۔ وہ کسی صورت مزید خود کو نہیں
 گرائے گی۔ مزید اپنی عزت نفس کو روندنا اس کے
 اختیار میں نہیں تھا۔ وہ میکانیکی انداز میں دو قدم پیچھے
 ہٹی۔

احراز نے اس کی مسلسل خاموشی پر ایک ذرا سا سرخ

”کیسی لاشی تانا جان؟ چرا لئی ہوئی؟ رات کی سیاہی میں شب خون مارتے ہوئے کسی کی امیدوں اور تمنائوں کا مرکز آپ چرا لائے۔ یہ سوچ کر کہ آنے والے کل میں وہ آپ کے بجھتے چراغ کی لو بنے گا۔ کیا کبھی جائز کو ناجائز کی کوکھ میں پٹپٹے دیکھا آپ نے؟ جو ایسی آس لگائے بیٹھے رہے۔“

لفظ نہیں تھے۔ گرم پتی سلاخیں تھیں جو نواب حسین احمد خان کے جسم کے آپار ہو گئی تھیں۔ ان کا رول رواں تکلیف کی شدت سے بلبلاتا تھا۔ اتنی شدید نفرت۔ اتنا زہر۔ کس نے بھر دیا تھا ان کے نواسے کے اندر؟

ان کی پتلیاں ساکت تھیں اور زبان مفلوج۔ نہ نوبلی سینے پہ ہاتھ دھرے فوراً ”نواب صاحب کی طرف لگیں اور ان کے کندھے سہلانے لگیں۔ بے پنی کی کیفیت میں وہ احرار کے چہرے کو کٹے جا رہی تھیں جس پر شرمندگی کے ریتی برابر بھی آثار واضح نہیں تھے۔ کندھ خرابی ہوئی تھی؟ کس کا داؤ چلا تھا؟

ساری عمر پروں میں چھپائے رکھا تھا اپنی بیٹی کی اس نشانی کو۔ گرم ہوا کا جھونکا بھی اسے چھو جائے۔ یہ ان دونوں میاں بیوی کو گوارا نہ تھا۔ تو اب ایسا کیا ہوا تھا کہ لال احمد میاں ان کا آشیانہ پھونک ڈالنے کے درپے تھی۔

انہوں نے نواب صاحب کے سرو کاندھوں کو گرم شال سے ڈھکتے ہوئے ایک نادبی نظر احرار پر ڈالی۔ جو اب ”وہ نظر اُڑ گیا تھا۔“

”ان سے کیسے نہ نوبلی۔ کہ ہمارے سہمنے سے ہٹ جائیں۔ جو آنسو ان کی دی ہوئی چوٹ پر ہماری آنکھوں سے چھلکا چاہتے ہیں۔ وہ ہم ان کے سامنے ہمارا رزاں نہیں کرنا چاہتے۔ جائیں، چلے جائیں یہاں سے۔“

نواب صاحب کی بھنپی بھنپی آواز میں انجانا کرب بلکورے لے رہا تھا۔ نہ نوبلی ان کے پیچھے کھڑی۔ اپنے ہی کاندھے پر لب رکھ کر سسکا اٹھیں۔ صرف

مکمل سکوت طاری تھا۔ برا اثر اور پرہشت! ”آئیے بر خوردار۔! آئیے۔ آپ ہی کے لیے آج دو ضعیف و دُزار وجود اپنی توانائیاں جمع کیے بیٹھے ہیں۔ قسمت نے یہ دن بھی ہمیں دکھانا تھا کہ ہمیں اپنے نواسے سے ملے ہوئے کئی دن بیت چکے ہیں اور آج ہمیں مجبوراً۔“ رات کے اس پہرے ٹھنڈے چٹتی بوڑھی بڑیوں کو نظر انداز کر کے۔ محض آپ سے اس سرد جنگ کی وجہ جانی ہے جو کئی دن سے آپ کے اور ہمارے بیچ جاری ہے۔

ساگوان کی لکڑی سے بنی منقش چھتری۔ دونوں ہاتھ ٹکائے۔ بالکل سیدھ میں غیر مرنی نقطے کو تکتے ہوئے نواب صاحب نے بے حد ہموار اور بے پلک انداز میں گلے کیا تھا۔

احرار نے ایک تھکی تھکی بے تاثر نگاہ اپنے تانا جان پر ڈالی اور لب بھینچ کر سر جھکا لیا۔ نہ نوبلی کی کھٹی کھٹی سسکیوں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا اُترا گلے ہی پل کسی خیال نے اس کے نرم پڑتے احساسات پر برف ڈال دی تھی۔

”ہمیں جواب چاہیے بر خوردار۔!“ نواب صاحب اس کی چپ سے ٹٹک آکر دوبارہ گویا ہوئے۔ ”آخر ایسا بھی کیا ہو گیا کہ آپ اتنے کھو ہو گئے کہ آج آپ کی تلی جان کو بخار میں تپتے تیرا دن ہے اور آپ کو ان کا احوال دریافت کرنے کی بھی فرصت میں۔ کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ جسے ہم نے عصائے رومی (برصائے کی لاشی) جان رکھا تھا۔ اسے مدیٹھوں کی دیمک نے چاٹ لیا۔ نفروں کی سلگتی ٹٹی کا ایندھن بننا اس کا نصیب ٹھہرا۔!“

نواب صاحب کی آنکھوں میں تیرتی نمی ان کے رونی غلغلاہ کی گواہ تھی۔ ان کا بدن ہولے ہولے زہر تھا۔ لاشی پہ ہاتھوں کی گرفت مزید سخت ہو گئی۔

احرار نے نگاہیں اٹھا کر بے حد کڑخی اور تنفر سے ب صاحب کو دیکھا۔ جسم کی رگوں میں دوڑتا خون لگا۔ بیجان پہ طیش غالب آیا اور وہ پھٹ پڑا۔

وہی تھیں جو اس وقت اپنے خاوند کی دلی کیفیت سے آگاہ تھیں۔

”چلا جاؤں گا۔۔۔ جلد چلا جاؤں گا یہاں سے۔۔۔ پھر آپ اپنے کیے پر آسو ہمارے کے لیے بالکل تمہا ہوں گے نانا جان۔۔۔ ویسے ہی، جیسے آج تک میری جدائی میں، میرے دادا حضور نے ہمائے ہیں۔!“ احزاب سفاکی سے کہتا ہوا۔۔۔ تیز قدموں سے چلتا، لاؤنچ پارک کے اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔۔۔ اور پیچھے سکتے کی حالت میں زد جانے والے دو بوڑھوں کے دل جیسے دھڑکنا بھول گئے تھے۔



میاں جی نے حرم کی شادی کی تاریخ طے کر دی تھی۔ گھر کی پہلی بیٹی کی شادی تھی۔۔۔ سوائے بے جی کے سب ہی راضی تھے۔ ہاں! عہس، حرم اور احزاب کے لیے فکر مند تھا مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔۔۔ ویسے بھی فوزیہ پھوپھو سب کچھ بھلائے ایک دفعہ پھر سلمان باندھے۔۔۔ وارد ہوئی تھیں اور ساتھ میں بلاشبہ کینڈی بھی تھی جسے دیکھتے ہی عہس کا منہ میٹھا ہو گیا تھا۔۔۔ جمال تایا نے پر اسرار سی چپ سا دھ رکھی تھی۔۔۔ اور اجمل صاحب تو شروع سے ہی مرغیاں مرغی مرغی کے انسان تھے۔۔۔ جدھر اب نے لگایا ادھر ہی سرسایا۔۔۔ تو اب بھلا کیسے چوں چرا کر سکتے تھے؟ گھر کی خواتین پورے جوش و خروش کے ساتھ شاپنگ میں جت گئی تھیں۔۔۔ مشورے کے لیے بے جی کے پاس آئیں تو وہ سر تک لحاف تان لیتیں۔۔۔ بات چیت مکمل بند کر رکھی تھی انہوں نے۔۔۔ خاص طور پر میاں جی کو دیکھتے ہی لعل نماز کی نیت باندھ لیتی تھیں۔۔۔ میاں جی براسا منہ بناتے، سر جھٹک کر وہاں سے ہٹ جاتے مگر اپنی خند سے ہنسنے کو تیار نہ تھے۔

حرم نے کان سے استغنیٰ دے دیا تھا۔۔۔ اور اب سارا سارا دن کمرے میں گھسی نہ جانے کیا کرتی رہتی تھی۔۔۔ اس کی مٹور م آنکھیں اور حلقے صرف بے جی کو دکھائی دیتے تھے۔۔۔ مگر وہ بے بس تھیں۔۔۔ صرف

انہونی کے لیے دعا گو رہتی تھیں۔۔۔

میاں جی نے ارجنٹ ٹوس پر زارون کو بلا لیا تھا۔ آخر کو حرم کا بڑا بھائی تھا۔۔۔ ہن کی شادی کے موقع پر اس کا ہونا بے حد لازم تھا۔ جس دن سے زارون آیا تھا، فوزیہ پھوپھو اس کے واری صدقے جاری تھیں۔۔۔ اس کے آگے پیچھے پھرتی وہ اسے بھی حیران کیے دے رہی تھیں۔۔۔ ماں الگ نظروں ہی نظروں میں بلا میں لیتی رہتیں۔۔۔ وہ خاصا ٹھہر گیا تھا۔۔۔ اسے پردیس کی آب و ہوا خاصی راس آئی تھی۔۔۔ گال سرخی مائل اور رنگت مزید سفید ہو رہی تھی۔۔۔ بول چال میں بھی واضح تبدیلی آئی تھی۔۔۔ اپنے چھ حرنی جملے میں چار حرف انگریزی میں جھاڑنا وہ ہو ہو فوزیہ پھوپھو کا ہی جھنجھاک رہا تھا۔ اور انگریزی بولتے ہوئے جس قدر اس کا منہ بگڑتا تھا اس سے ڈرنا۔۔۔ میاں جی کا اس کے انداز دیکھ کر بگڑ رہا تھا۔۔۔ وہ دن تو انہوں نے خاصے حوصلے سے برداشت کیا اور تیسرے دن اسے آڑے ہاتھوں لیا۔۔۔

جس دن زارون آیا تھا۔۔۔ اسی دن شام میں اس نے میاں جی کے فرمائشی پیپ (سگار) ان کے ہاتھ میں تمھائے تھے۔۔۔ میاں جی بڑے خوش! اسی وقت سوچ لیا کہ جس وقت ان کا دشمن حسین خان اپنے گیٹ سے باہر آتا ہے۔۔۔ عین اسی وقت وہ ٹھہرے پہنچتی ڈھاکے اس سوغات کے سونے لگائیں گے اور اسے جلائیں گے!

اگلے دن صبح گیارہ بجے کے آس پاس زارون بے جی کے پلنگ کے قریب بیٹھا مالٹے کھا رہا تھا۔۔۔ وہ کٹ چھیل کے دھرتی جاری تھیں اور صاحب بملور ہڑی نزاکت و نفاست کے ساتھ پھانک پھانک پھانکتے جا رہے تھے۔ میاں جی ہاتھ میں سگار کا ڈبہ پکڑے اندر سے برآمد ہوئے اور ذرا فاصلے پر بڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔ دوزیدہ نگاہوں سے بے جی کو دیکھا تو وہ مٹن سی پوتے کے لیے مالٹے چھیل رہی تھیں اور ہلکی سی آواز میں بات بھی کر رہی تھیں۔۔۔ میاں جی کو مکمل نظر انداز کیے، میاں جی کو کھدب دی لگ گئی مگر پوچھتے انا

آئے آتی۔۔۔ پوتے پہ ناقدانہ نگاہ ڈالی تو تیر بدل گئے۔
 زارون کی جینز گھٹنوں سے پھٹی ہوئی تھی۔۔۔ میاں
 جی نے ارد گرد دیکھا کہ کوئی گھر کی پچی تو نہیں ہے وہاں،
 جی ہی جی میں زارون کو بے حیا اور بے شرم کہا۔ ہاتھ
 میں تھامے ڈبے کی تاثیر بھی ورنہ انہیں بہانگ دہل
 کہنے سے بھی روک کون سکتا تھا۔۔۔ قدرے نرم لہجے
 میں پوتے سے مخاطب ہوئے۔۔۔

”زارون پتر۔۔۔!“
 ”جی۔۔۔ جی گرینڈا۔۔۔!“
 ”انگریز دا پتر۔۔۔“ ”ایک دفعہ پھر دل میں اسے

خطابات سے نوازا۔۔۔ جس دن سے آیا تھا اسی منحوس
 لفظ سے انہیں یاد رہا تھا۔ اور وہ اس ڈبے کی مروت
 میں کڑوی گولی نگلے جا رہے تھے۔

”پتر۔۔۔! صبح جب تو سیر کے لیے گیا تھا تو کیا تجھے کتے
 بڑگئے تھے؟“ زارون نے بوکھلا کے یوں ٹانگیں نیٹیں
 جیسے وہاں کہیں آس پاس کتے ہی ہوں۔
 ”نہ۔۔۔ ناٹ ایٹ آل گرینڈا۔۔۔! آپ نے ایسا

کیوں کہا۔۔۔؟“
 ”تیرے منہ سے گوڈے ویکہ کے۔۔۔!“
 ”اوہ۔۔۔! یہ فیشن آج کل ان کے گرینڈا۔۔۔!“ اس

نے تسلی سے جواب دیا اور اپنے گئے گوڈے پہ تھمبی کی۔

”میاں جی نے بظاہر بے نیاز بنی بیٹھی ہے جی کے
 چہرے پہ گھبیاتی دل جلانے والی مسکراہٹ کو کینہ توڑی
 سے ہور اور پھر انہوں نے ناک چڑھا کے، تنہے پھلا
 کے ہو سو اس انداز میں پوتے کو نازا جس طرح فکر
 مارنے سے پہلے تیل شکار کو تالو تالے۔۔۔

”اٹھ اوئے۔۔۔ اٹھ اوئے ذرا ادھر سے انگریزی
 گندے (لیاز)۔۔۔!“ ”میاں جی اونچی ٹولالیں ڈپٹ کے
 زارون سے بولے۔۔۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ پہ کھڑا
 ہوا تھا۔۔۔

”وہ ذرا اپنی منج کے پڑے جا اور میرا حقہ پھر کے لا۔۔۔
 ہیں پڑا ہے۔۔۔!“ ”میاں جی حکما“ بولے۔۔۔ زارون کو
 بے حد کوفت ہوئی۔۔۔ بھلا بھینس کا کیا بھروسا۔۔۔ اس
 کے اتنا قریب تو پڑا ہے حقہ۔۔۔ لے کے دم مار دی تو۔۔۔

اور جیسے ہی زارون کا ہاتھ حقے پر پڑا۔۔۔ عین اسی
 وقت بھینس کے گوبر پہ پاؤں بھی جا پڑا۔۔۔ سارا دھیان
 تو حقے اور بھینس کی دم پر تھا۔۔۔ کسی اور طرف نظری
 نہیں گئی تھی۔۔۔

”او۔۔۔ مین! واٹ دا ہیل۔۔۔!“ اس نے کراہت
 سے آنکھیں پتچ کر سر اونچا کیا۔

”پتر۔۔۔! یہ وہی ہیل ہے جسے تو ہی چکا (اٹھانا) کرتا
 تھا۔ بوہتی میں میں کیتی نا۔۔۔ تو اس ہیل میں تیرا سر
 دے دوں گا۔۔۔ سمجھا۔۔۔!“ ”میاں جی نے دو منٹ میں
 ساری فون فال نکال کر رکھ دی تھی۔ انہوں نے بھلا
 کہاں اتنے نخرے برداشت کیے تھے۔

”اب میں کیا کروں۔۔۔ گرینڈا۔۔۔؟“ زارون
 کر لایا۔

”میاں جی بول۔۔۔ میاں جی۔۔۔!“

”اب کیا کروں میاں جی۔۔۔! بے جی۔۔۔ ی۔۔۔!“
 زارون نے روہنا سا ہوتے ہوئے لگے ہاتھوں بے جی کو
 بھی آواز دے ڈالی۔۔۔ مگر انہوں نے شاید کاتوں میں
 تیل ڈال رکھا تھا۔۔۔ مجال ہے جو ذرا بھی ہمدردی سے
 پوتے کو دیکھا ہو۔۔۔ شاید انہیں بھی زارون کے
 اوپرے انداز و اطوار نہیں بھار ہے تھے۔

”کرنا کیا ہے تو نے۔۔۔ مشغذ ہے۔۔۔ وہی کر جو سلطان
 کیا کرتا تھا“ ہاتھ ڈال میرا پتر اور چار تھاپاں بنا کر دیوار پر
 لگا دے۔۔۔ میرے حقے کی چمک کے لیے۔۔۔!“

میاں جی ایسی غضب کی لاہروانی سے بولے کہ
 زارون کا دم خشک ہو گیا۔۔۔ اب بھلا دو سال انگریز
 آنے کے بعد وہ یہ کام کیسے کر سکتا تھا۔۔۔ وہ سچ میں رو
 دینے کو تھا۔۔۔ میاں جی نے اس کے لیے تھوڑی کو
 بہت جان کے اس کی گلو خلاصی کرائی۔۔۔

”پاؤں نکال اب باہر۔ اور کھرے میں دھو۔ آئندہ کے واسطے بندے کا پتہ بن۔ بوہتی منہ ڈنگا کر کے گٹ مٹ کیتی نا۔ تو سارا شہر پوتا (شوخیوں) کھلاڑ (پھیلا) کر رکھ دوں گا۔ سمجھا۔ وڈا آیا۔ دکی کتی تے ولاتی چوں چوں۔ ہونہ۔“

زارون کا بس چلتا تو اتنی شرمندگی اٹھانے سے بہتر تھا کہ پاکستان آسانی نا۔ برآمدے کے ستون کی اوٹ میں کھڑی کینڈی اور ٹوپہ بھالی کی ہنسی کی آوازیں مسلسل اس کے کانوں میں بڑ رہی تھیں۔ اس نے خود پر نفرت بھیجی اور بمشکل اپنا تھڑا پاؤں گھسیٹ کر کھرے کی طرف چل دیا۔ بقایا ایام اسے انگریز کا نہیں بندے کا پتہ بن کے رہنا ہے۔ اس نے پکارا وہ کر لیا تھا۔



فوزیہ پھوپھو کا زارون کی طرف جھکاؤ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں رہا تھا۔ ہر وقت وہ زارون کی تسبیح کرتی رہتی تھیں۔ جتنی دیر وہ گھر میں موجود ہوتا۔ اتنا وقت فوزیہ پھوپھو اس پر پروانہ وار غار ہوتی رہیں۔ یہ صورت حال بیگم جمال کے لیے جتنی مایوس کن تھی بیگم اجمل کے لیے اتنی ہی حوصلہ افزا۔ بیگم جمال تو بے جی اور میاں جی کے کلن میں کینڈی اور عمیس کے رشتے کے حوالے سے بات ڈال بھی چکی تھیں اور اس بات کا اندازہ کچھ کچھ فوزیہ پھوپھو کو بھی تھا مگر یہاں پہنچ کر زارون کا بہتر اور روشن مستقبل دیکھتے ہوئے وہ کھلم کھلا ڈالواں ڈول ہوئی جا رہی تھیں۔ جبکہ کینڈی کا رویہ غیر جانبدارانہ تھا۔

حرم اور عمیس اس وقت ایک سی کیفیت میں گھرے گھر بند ہوئے بیٹھے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا غم سمجھ ضرور سکتے تھے لیکن کچھ بھی نہیں پارہے تھے! عمیس بڑی شیو اور لمبے کپڑوں کے ساتھ کمرے میں گھسا پانے المیہ نغمے سن کر غم ہلکا کر رہا تھا۔ آنکھیں موندے نیم دراز سائیکے کو سینے سے لگائے وہ ہو کے بھرنے میں مگن تھا جب زارون ہناوٹک کے

اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ خوب حد آکتا ہوا تھا فوزیہ پھوپھو کی ہر وقت کی اوپری محبتوں سے۔ ایسے میں عمیس کا اجڑا حلیہ اور کمرے میں گونجتے روتے سورتے گلنے نے اس کی طبیعت مزید مکدر کر دی تھی۔ وہ اس کی ٹانگ پر زوردار دھپ مارنا خود بھی دھپ سے بیڑ پر کر گیا۔ عمیس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔ اپنے سامنے زارون کو دیکھ کر بے رخی سے منہ پھیر لیا۔ ”رقتب روسیاہ جی ہی جی میں اسے وہی گھسا پانے عینیت کیا۔“

”کیا ہے بے۔ ایسے کیوں گھور رہا ہے مجھے۔ اب تو میں اپنی جون میں بھی لوٹ آیا ہوں۔“

زارون کو کل میاں جی کے ہاتھوں بنی درگت یاد آ گئی۔ حلق چھوڑ یادداشت تک کڑوی ہو گئی۔

”ہونہ۔! میری پیٹھ میں چھرا گھونپ کے چاہتا ہے کہ میں تجھے گھوروں بھی نا۔ واہ رے زمانے۔! سارے جہاں کا زور اپنے ڈانڈلاگ میں اندیل کر عمیس نے ناکام عاشق ہونے کا ثبوت دیا۔

”اے او۔ دیو داس کے مالی! اسیدھی طرح بک کہ کس بات کا ماتم مٹا رہا ہے۔! زارون نے کس کے ایک مکا اس کے سینے پہ مارا اور اس کے چوہہ طبق روشن فرمائے۔

”عمیس کیا ظالم غاصب۔ تم جاؤ اور اپنی ہونے والی بھابھی کے ساتھ کلچھوڑے اڑاؤ۔! عمیس نے کلائی آنکھوں پر دھر کر کراؤں کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے آزدی سے کہا۔ زارون نے ہونفوں کی طرح اس کو دیکھا۔ آنکھیں پٹپٹائیں اور بولا۔

”ہائیں۔! کون سی ہونے والی بھابھی۔ گو ٹنگو کی منگنی کر ڈالی اور مجھے بتایا بھی نہیں۔ حد ہے۔ ابھی تو اسے تے باندھنے نہیں آتے اور لے کر بندھن میں باندھ دیا۔“

”وہ تاسف سے سر دھننے لگا۔ جب ہی عمیس نے ایک زوردار جھٹ اس کی گردن پہ دھرا۔ وہ ہلکا کر رہ گیا۔

”اے او گدھے۔! انگریزوں کے بیچ رہ کر تیرا داغ

بھی کھوتا ہو گیا ہے۔ میں اپنی بات کر رہا ہوں۔ اور
ہونے والی بھابھی، یعنی کینڈی! عیس جلا کٹا سا ہاتھ
لہرا لہرا کر بولا۔

”لو۔۔۔ وا!“ زارون نے اوکو خاصا لمبا کھینچا۔
 تو یہ معاملہ ہے، جب ہی تو پورے نشین ہوا پر اڑے۔ تو
 کینڈی پر لٹاور کینڈی کی لٹاں مجھ پر۔ ہاہا۔۔۔ لیکن کہ
 میں نے اوھر آکر تیرا پتا کلاٹ دیا۔ ہاہا۔۔۔ زارون
 ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا تھا۔ ساری کہانی اس کی
 سمجھ میں آگئی تھی۔ اب جب ہمیں نے اپنا دل
 کھول کر رکھا تھا تو اس نے بھی سوچا کہ لگے ہاتھوں وہ
 بھی اپنے دل کی کہہ سنائے تاکہ دونوں کی بنیاد لگ سکے
 ۔۔۔ اس نے ہمیں کی خفا نظروں سے سہم کر بمشکل
 ہنسی کشنول کی اور تھوک نکل کر جملہ ترتیب دیا۔

”ایسا ہے یار۔ کہ تیری کینڈی تجھے ہی مبارک کیونکہ میں اپنی کھچ پند کر چکا ہوں۔ مجھے تیری لوکل کینڈی میں کوئی دلچسپی نہیں!“ عیس جو بھولی سے اس کا منہ کئے جا رہا تھا۔ زارون کی بات سننے کے بعد اس کا دل کیا کہ اس کا منہ جو ہم لے۔ وہ مینڈ کی طرح چھدک کے بیڑھے اتر اور کھینچ کر زارون کو کھڑا کیا اور وہاں نہ کھٹے سے لگایا۔ اس سے پہلے کہ واقعی وہ جوش التفات میں اس کا منہ جوڑتا۔

”تو سوچ نہیں سکتا یا راکہ تو نے مجھے کتنے بوسے دکھ سے نکالا ہے۔ میرا تو کھانا حرام ہو گیا تھا۔۔۔ فوزیہ پھوپھو کا تیری طرف جھکاؤ دیکھ کر میری راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ اب تو سچ سے نکل گیا ہے تو بلی سارا معاملہ میں سنبھال لوں گا۔۔۔ بے رحمی اور میلن جی کو آگے لگانے کی دیر ہے بس۔ اب تو مجھے یہ بتا کہ یہ لکھی کون ہے اور کب سے یہ چکر چل رہا ہے۔ اور غیبت مجھ سے بھی چھپایا۔۔۔“ وہ مطمئن اور شلو سا زاروں کے کندھے پر مکا جڑتے ہوئے بولا۔ اعصاب یکدم بے ہلکے ہو گئے تھے۔

”بس یار۔۔۔“ زارون نے سر کھجاتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ ”اصل میں جس گھر میں میں پے انگ کیسٹ کے طور پر رہ رہا ہوں۔۔۔ یہ ان ہی صاحب کی

بھتیجی ہے۔۔۔ رہنے والی فیصل آباد کی ہے مگر تنویر صاحب کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے اسپیشل پاکستان سے وہاں آئی تھی۔ کشملا نام ہے۔۔۔ پار سے سب کھکی بوتے ہیں۔۔۔ بس وہیں آتے جاتے ایئر اسٹینڈ تک ہوئی اور بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک آ پہنچی۔ اب بس اسے انتظار ہے کہ میں کب گھر کے بزرگوں سے اس پارے میں بات کرتا ہوں اور رشتہ لے کر اس کے گھر آتا ہوں۔ مگر میری ہمت ہی نہیں ہو پارہی کہ میں کوئی بات چھیٹوں۔۔۔ اوپر سے میری والدہ محترمہ۔۔۔ فوزیہ پھوپھو کے آگے پیچھے پروانہ وار یوں ٹار ہو رہی ہیں کہ مجھے نہیں لگتا وہ کھکی کو اتنے آرام سے قفل کریں گی۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کون تو کیا کول۔۔۔“

”لو۔ تو چچی کی بالکل فکر نہ کر۔ اللہ لوک خاتون ہیں۔ لن کو مٹتا بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ اور فوزیہ پھوپھو سے تو ہماری والدہ امیں شروع سے مرعوب رہی ہیں۔ اصل مسئلہ بے جی اور میاں جی سے کھجی کی بات کرنا ہے تو اس سلسلے میں اور کس بھائی کام آسکتے ہیں۔ بس سمجھ ہو گیا یہ مسئلہ حل!“ ہمیں نے چٹکی بجاہے ہوئے گویا اس کی مشکل آسان کی تھی۔ زامون نے اسے امید افزا نظروں سے دیکھتے ہوئے سروھٹا۔ اور پھر کچھ یاد آنے پر ایک دم عیس سے پوچھ بیٹھا۔

”یار! ایک بات تو بتا۔ یہ اصرار آج کل کدھر غائب ہے؟ جس دن سے آیا ہوں، دکھائی نہیں دیا۔ دو دفعہ گھر بھی چکر لگایا ہے اس کے۔۔۔ صرف زینب ثانی سے ملاقات ہوئی۔۔۔ وہ بھی خاصی بیمار پڑی لگیں۔“

عمیس سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کیا جواب دے۔ حرم اور احرار اُن کے سلسلے سے زارون بے خبر تھا اور حرم آخر اس کی بہن تھی۔۔۔ وہ کس طرح زارون کو دونوں کی آپس کی پھیندیک کے بارے میں بتا سکتا ہے۔۔۔ اس نے گول مول سے جواب برا کھنکھایا۔

• ”ہم۔۔۔ م، اکل دن ہوئے مجھ سے بھی نہیں ملا۔۔۔ آج کل کا دیار جمانے کی کوششوں میں لگا ہوا ہے۔“

ڈھل گیا۔ یہ شخص کیا ساری عمر انہیں اپنا زیر بار رکھے گا۔۔۔ انہوں نے اپنے مقابل کے پیروں پر نظریں جماتے ہوئے دکھ سے سوچا۔۔۔

”آپ کا آخر ارادہ کیا ہے۔۔۔ آپ ہم پر مزید کتنے احسانات کریں گے۔۔۔؟“

”وہ جو محبتوں کا قرض سر پر اٹھائے پھرتے ہیں نا۔۔۔ وہ احسان نہیں کیا کرتے۔۔۔ بس خراج چکاتے ہیں۔۔۔ وہی میں بھی کر رہا ہوں۔۔۔ میرا انتظار بیچے گا۔۔۔ یہیں۔۔۔ اسی بساط پر۔۔۔“

اور وہ چلے گئے۔ پیچھے الٹی ہوئی بساط پر ماتم کنال نواب حسین احمد خان کی حقیرانہ اپناچی تھی۔۔۔



”ہمیں پوری امید تھی کہ خون کی کشش آخر آپ کو ہمارے پاس بھیج کر لے ہی آئے گی۔۔۔ ہمارے دل کی تڑپ کو آپ کے دل کی کک بننے کی دیر ہے بس، دیکھو۔ دیکھو شیراز قلن! یہ ہے ہمارا پوتا نواب زادہ احرار حسن خان۔۔۔ ذی شان۔۔۔!“

یہ فخر و غور سے راجہ نواب تیرک حسین خان کا تھا جن کی سفاک آنکھوں میں اس وقت محبت کا جہاں آباد تھا۔ احرار کو دونوں بازوؤں سے تھامے وہ اپنے بائیں جانب کھڑے اپنے خاندانی ملازم شیراز قلن سے مخاطب تھے۔! ایسا نہیں تھا کہ احرار پہلی دفعہ اپنے دادا سے ملاقات کر رہا تھا۔ بلکہ پچھلے ڈھائی ماہ میں وہ کئی بار یہاں آچکا تھا۔ نواب تیرک حسن خان ٹھیک تین ماہ پہلے ہندوستان سے پاکستان آئے تھے اور اس گھر میں رہائش پذیر تھے جو ان کے مرحوم دوست کے بیٹے کا تھا۔ نواب صاحب کو زیادہ تر وہ نہیں کرنا پڑا تھا۔ اپنے دوست کے بیٹے کی انگیسی میں قیام کرنے کے لیے دوست تو کافی عرصہ ہوا فوت ہو چکے تھے مگر ان کے بیٹے بخود محمود قریشی نے ان کا بھرپور خیر مقدم کیا تھا۔۔۔

چند ہی دن میں شیراز قلن نے احرار کو نواب صاحب کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ بس پھر وہ تھے اور ان کی

بتا رہا تھا کہ یونیورسٹی سے ریزائمن کر رہا ہے۔۔۔ چل دیکھتے ہیں، کسی دن مل کر دھرتے ہیں اسے۔۔۔!“ زارون کی تو اس نے نسلی کروادی تھی مگر خود یک دم بے چین سا ہو گیا تھا۔ حرم اور احرار اسے دونوں بے حد عزیز تھے۔ ایک بہن جیسی کزن تھی تو دوسرا بھائی جیسا دوست۔۔۔ دونوں کی معصوم محبت کا امین تھا وہ۔۔۔ مگر حالات نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ کچھ دیر پہلے جس دل میں شادمانی کا بھرپور احساس جاگتا تھا۔ ایک دفعہ پھر تاسف نے وہاں گھر کر لیا تھا۔ وہ جج میں آرزو ہو گیا تھا۔



شطرنج کی بساط کے مہرے آج بالکل خاموش پڑے تھے۔ بے جان، ساکت و جامد! آج کھلاڑیوں کو چال چلنے میں، کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نواب حسین احمد خان کے تھکے ہوئے اور سلوٹ زدہ چہرے پر اپنی ہار کا غم ثبت تھا۔ زندگی کے اس موڑ پر ایک دفعہ پھر حالات اور تقدیر نے مل کر انہیں بچھا ڈیا تھا۔ ان کے مقابل بیٹھے ان کے حریف کی نگاہیں مسلسل ان کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں جو ہرگز بھی دلچسپی سے عاری نہیں تھیں۔

”آج ہمیں یہ کہنے میں کوئی عذر مانع نہیں کہ ہم تھک گئے۔ ہم میں اب اتنی سکت نہیں کہ ہم اپنے ہی خون کو لکار سکیں۔ بس! اب ہم ہتھیار چھینکتے ہیں۔“

نواب صاحب نے بے تاثر لہجے میں کہا اور لرزتے ہاتھوں سے بساط الٹادی۔ مقابل نے آنکھیں سکیڑ کر انہیں دیکھا اور ان کے ہاتھ پر ہاتھ دھرتے ہوئے رمان سے کہا۔

”یاد ہے میں نے آپ سے کہا تھا کہ شطرنج کی بساط میں آپ کے ہاتھ ایک بازی ایسی ضرور آتی ہے جس میں آپ کے سارے مہرے داؤ پر لگ جاتے ہیں۔ وہ بس ایک موقع۔۔۔ ایک موقع۔۔۔! سب کچھ لٹا دو۔ یا پالو“

نواب حسین احمد خان کا سارا وجود گویا برف میں

ساتھ ہندوستان جاؤں گا اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔۔۔
مجھے اب واپس نہیں آنا۔۔۔ بظاہر مضبوطی سے کہتے
احرار کے لہجے میں جیسے کانچ پروئے تھے۔۔۔ اور اسے
صرف وہی محسوس کر سکتا تھا۔

”بالکل۔۔۔ بالکل! جیسا آپ کہیں۔۔۔ آپ کا حکم
ہمارے سر آنکھوں پر ہے۔ ہم نے یہاں سے جانے کے
مکمل انتظامات کر رکھے ہیں۔ بس آپ ہی کے
اشارے کے منتظر تھے۔ بس ایک بات کا خیال رہے
ہمارے تخت جگہ۔ کہ آپ اپنے نانا کو بے خبر کر دیں
گے۔۔۔“ احرار نے یک دم چونک کر ان کی شکرے
جیسی آنکھوں میں جھانکا۔۔۔ اور حیرت سے انہیں
دیکھا۔

”ہم نہیں چاہتے کہ وہ راہزن آپ کے ارادوں کو
کنزور کرے۔۔۔ آپ شش و پنج میں مبتلا ہو جائیں۔۔۔
دوسرے ہم چاہتے ہیں کہ انہیں وہی اذیت دے کر
کے یہاں سے کوچ کریں جو گزشتہ کئی سالوں سے
ہمارے حصے میں آئی ہوئی تھی۔۔۔“

اپنے ایک ابو کو اچکاتے ہوئے اور منہ چھپا کر
موڑتے ہوئے نواب تبرک حسن خان سامنے دیوار پر
آویزاں ڈوبتے سورج کے عکس کو دیکھتے ہوئے بولے۔
ان کا لہجہ لطف لیتا ہوا تھا۔ حفظا اٹھا تا ہوا۔۔۔ احرار
کو ایک عجیب سی ناگواری کا احساس ہوا۔۔۔ اس کا ہرگز
ایسا ارادہ نہیں تھا کہ وہ اپنے بوڑھے نانا اور نانی کو ایسی
کڑی سزا دیتا۔۔۔ (حالانکہ سزا تو وہ ابھی بھی دے رہا تھا)
ایسا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انہیں بے خبر رکھ کر
ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے۔ لیکن نجانے کیوں فی
الوقت اس نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔ اسے
گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ نواب تبرک
حسن خان مسلسل شیرا گلن اور اس کے ساتھ آئندہ
کے لائحہ عمل پر گفت و شنید کرتے رہے۔۔۔ وہ بس
ہول ہول میں جواب دیتا رہا اور آخر کار اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں اب چلوں گا دادا حضور! آپ مجھے فون پر
تاریخ دن اور وقت سب بتا دیجیے گا۔ میں پہنچ جاؤں
گا!“ نواب صاحب نے اس مضبوط چوڑی ہاتھائی والے

شاطرانہ فطرت کی مہارتیں۔۔۔ انہوں نے کچھ اس
انداز میں اپنی اور طلال حسن خان کی مظلومیت کے
قصے احرار کے گوش گزار کیے کہ احرار بری طرح حد نظر
ہو گیا۔ نواب صاحب نے سارا ملہ نواب حسین احمد
خان پہ ڈال دیا تھا۔

نواب زاوی عانشہ یعنی اس کی ماں کی شخصیت کا
ایسا نقشہ کھینچا کہ احرار حق دق بیٹھا رہ گیا تھا۔ اسے تو
آج تک کچھ اور ہی پتا تھا۔۔۔

”ان ہی پریشانیوں اور تفکرات کے زیر اثر نواب
زاوہ طلال حسن خان ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ ریاست کا
سارا بوجھ نواب تبرک حسن خان کے بوڑھے
کاندھلوں پر آن پڑا۔۔۔ اور اسی چیز کا فائدہ نواب حسین
احمد خان نے اٹھایا اور ان کی ریاست کے وارث ان
کے بھلائے کی لالچی کو راتوں رات ہندوستان سے
غائب کروا کر پاکستان میں خود بھی روپوش ہو گئے۔۔۔
طلال خان اپنے بیٹے کے غم میں مر گئے اور انہوں نے
اپنی زندگی صرف اور صرف اپنے پوتے کو ڈھونڈنے
میں صرف کر دی۔۔۔“

احرار کی مربوط اور مضبوط شخصیت دھجیوں میں
بکھر گئی تھی۔ واقعات کا ربط اس قدر مضبوط تھا کہ
احرار کے پاس ان کی نفی کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی
اور پھر اوپر تلے کئی بار کا ملنا آخر رنگ لے ہی آیا۔
نواب تبرک حسن خان ایک دفعہ پھر نقب لگانے میں
کامیاب ٹھہرے۔۔۔ احرار کلی طور پر اپنے نانا سے
برگشتہ ہو چکا تھا۔ اور اب وہ تیار تھا انہیں چھوڑ دینے
کے لیے۔۔۔ وہ غم و غصے سے انتہا پاگل ہو چکا تھا کہ اسے
اس وقت حرم کی بھی پرواہ نہیں تھی۔۔۔ وہ بس یہاں
سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔ اور آج وہ
یہی سب طے کرنے کے لیے نواب تبرک حسن خان
سے ملنے یہاں آیا تھا۔ وہ جلد از جلد پاکستان سے جانا
چاہتا تھا۔ جس اذیت اور تکلیف سے وہ اس وقت
گزر رہا تھا اس کا ایک ہی حل اس کی نظر میں تھا کہ وہ
کھو جائے۔ ہمیشہ کے لیے گم ہو جائے۔۔۔
”میں نے سوچ لیا ہے دادا حضور۔! میں آپ کے

سانس پوری کر لیتے جو اتفاق سے مجھے کھوج نہ لیتے۔“

”اتفاق سے نہیں۔ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کھجے۔“ لیا جمل نے قدرے سنجیدگی کے ساتھ ٹوکنے ہوئے کہا۔

”جو بھی ہو۔ لیکن اب میں ان ہی کے ساتھ ان ہی کے پاس بیٹھ بیٹھ کے لیے جا رہا ہوں۔ اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“

”ہم! اچھی بات ہے۔ آپ نے جو بھی فیصلہ کیا ہے، یقیناً ہر پہلو سے سوچ سمجھ کے ہی کیا ہو گا۔ اور ظاہر ہے آپ نے اپنے نانا، نانی کی پیرانہ سالی کو بھی خوب دھیان میں رکھا ہو گا۔ ہے نل؟“ ان کے دھیمے لہجے میں کیے استفسار پر احرار کسمسا کر رہ گیا۔ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

”انہوں نے آپ کو کھو دینے کے ڈر سے اپنی جائیدادیں بیچ ڈالیں اور ایک طرح سے روپوشی کی حالت میں زندگی گزار دی۔ اور اب جب آپ جوان ہو چکے تو یہی صلہ ملنا چاہیے تھا انہیں کہ آپ ان کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائیں۔ اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ ایک بیٹا تو فضا میں منتشر ہو گیا۔ لاش بھی نہ ملی اور بیٹی! آپ کی والدہ۔ انہیں نواب خاندان کے محل میں لٹنے والی سازشوں نے نقل لیا۔ لاش تو دور کی بات۔ قبر کا سراغ بھی نہ مل سکا۔ اچھا ہوا۔ بہت صحیح ہوا۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا ان دونوں میاں بیوی کے ساتھ۔ یہ اسی قتل تھے!“

بولتے بولتے لیا جمل کی سانس پھول گئی۔ چو شدت جذبات سے دکھتا انگارہ بن گیا۔ ویسے بھی وہ بے حد بچنے لہجے میں بات کر رہے تھے کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں ان کی آواز اندر کمرے میں موجود نواب تبرک حسن خان کے کانوں میں نہ پہنچ جائے جبکہ مکمل ابھی بولی تھا!

احرار کے ماتھے پر پسینے کے چند قطرے نمودار ہوئے۔ جنہیں اس نے ہاتھ سے پونچھ ڈالا اور سرسرائی آواز میں گویا ہوا۔

کو اپنے سینے سے لگایا۔ چند بل اس کا چہرہ دیکھتے رہے۔ لٹل خلیں کا عکس تھا۔ صرف چہرے پہ رعوت نہیں تھی۔

”آجائے گی۔ آجائے گی۔ ایک دفعہ ہم اپنے پوتے کو یہاں سے نکل لے جائیں۔ اپنی ریاست کی گلدی پر بٹھا دیں تو پورے کروڑوں کے ساتھ حکومت کرنا ہم سکھا دیں گے۔“ نواب صاحب نے دل ہی دل میں اپنی پلاننگ خود پرواضح کی اور اپنے پوتے کو رخصتی کا عندیہ دیا۔

احرار پلٹ کر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ یہ کوریڈور تھا اور نیم اندھیرے میں تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا تھا کہ یکدم پشت سے کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور کھینچ کر کچھ فاصلے پر لے گیا۔ صرف ایک لمحے کو احرار بدحواس ہوا تھا مگر اگلے ہی بل اس نے پلٹ کر مقل پر وار کرنا چاہا تھا اور اسی لمحے جیسے زمین اس کے پیروں کے نیچے سے سرک گئی!

”لیا جمل۔ آپ؟“

”ہاں میں۔ اکیس! کیوں کم ہو گئی صاحبزادے؟“

”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں؟“ وہ خیر زندہ سا پوچھ رہا تھا۔ جواباً لیا جمل نے دھیمی سی مسکرت ہونٹوں پہ سجاتے ہوئے کہا۔

”میں تو اس دن سے باخبر ہوں جس دن آپ نے یہاں پہلی دفعہ اپنے نانا جان سے چھپکے قدم رکھا تھا۔ بس آپ ہی بے خبر رہے۔ ہر احساس سے اور ہر حقیقت سے۔“

”میں بے خبر پہلے تھا۔ اب نہیں!“ وہ مغر سے سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”میرا سارا بچپن اسی کمرے میں گزر گیا کہ میرا باپ کون ہے؟ کہاں ہے؟ ان کے کہاں باپ کون ہیں؟ نانا جان نے ہمیشہ مجھے اپنی ذات کے گرد الجھائے رکھا۔ میرا باپ میری یاد میں سسک سسک کر جان کی بازی ہار گیا۔ اور اب یہ دادا کا بوڑھا وجود! یہ بھی تشنہ کالی کے سائے میں اپنی آخری

”یہ آسانی باہر سنائی دے سکے۔ آخری چال چلے کا وقت آیا تھا۔“



دستک کی کوازن سنائی دی۔ شیرا گلن کو برا سرا رہے اور جیسے جوتن لیے ہدایت دیتے ہوئے نواب تھمرک حسن خان نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ نووارد کو دیکھ کر بھروسے مزید سکر گئیں۔

”کون ہیں آپ؟ کیا ہم آپ کو جانتے ہیں جو یوں ہمارے میزبان کے بغیر ہمارے پاس چلے آئے ہیں؟“
ٹانگ پر ٹانگ دھر کر سوال کیا گیا۔ جمل صاحب چند قدم پیچھے سے اٹھاتے ایک کلاچ کے قریب آئے اور پورے اعتماد سے اس پر برا بھلا ہو گئے۔
نواب صاحب کا چہرہ ان کی اس حرکت پر متحیر ہوا۔ ناگواری صاف متحیر ہوئی۔

”آپ کا میزبان محمود محمود قہریش میرا بگڑی دوست ہے لہذا اس نے میرے ہمراہ آنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ویسے میرے تعارف کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں نواب حسین احمد خان کے بے حد قریبی عزیزوں اور خیر خواہوں میں سے ایک ہوں۔ میرا بچپن ان ہی کے سامنے طویل کرچا ہوا ہے۔ میرا پہلا آنے کا مقصد محض یہ جانتا تھا کہ۔“
”کہ ہم نواب زادہ احراز حسن خان کو کیوں درغلا رہے ہیں۔ ہے نا؟“ یک دم نواب صاحب نے جمل صاحب کو ٹوک کر جملہ مکمل کیا تھا۔ انداز میں لاپرواہی اور بے نیازی جیسے کی حد تک زیادہ تھی۔ جمل صاحب کے ہونٹوں پر بڑی نفیس سی مسکراہٹ آ کر پھرتی ہوئے حد محل سے گویا ہوئے۔

”نہیں، ہرگز نہیں! احراز آپ کا پوتا ہے، آپ کا خون۔ اس پر حق ہے آپ کا۔ نواب حسین احمد خان بخوبی جانتے ہیں کہ ان دونوں وہ آپ سے نہ صرف مل رہا ہے بلکہ وہ آپ کے ہمراہ ہندوستان جانے کا بھی خواہش مند ہے۔ انہیں اس بات پر چند ای اعتراض نہیں۔“

”میری والدہ نے تو ملکوں ہی زندگی بسر کی۔ وہ شادی کے کئی برس تک اولاد ہی پیدا کرنے کے حق میں نہ تھیں۔ بلکہ میری پیدائش کو لے کر بھی وہ خاصی ناخوش تھیں۔ کئی بار انہوں نے محل کے دوران ہی مجھے نقصان پہنچانے کی بھی کوشش کی۔ وہ تو اتفاق ایسا ہوا کہ میری پیدائش کے وقت ہی ان کی موت ہو گئی ہو کہ نہ شہید وہ زندہ رہیں تو کبھی بھی مجھے نہ اپنا تھیں۔ میرے والد لڑا لڑا حسن خان چونکہ ان سے بے حد محبت کرتے تھے اور ان کی غلط روش کی وجہ سے خائف بھی تھے لہذا ان کی اچانک موت نے ان کے ذہن کو مفلوج کر ڈالا۔ اور وہ بھی عین جوانی میں داغ مفارقت دے گئے۔ اس کے بعد بتانا جانے نے علم کی انتہا کر دی اور مجھے میرے آبائی محل سے انکار کر لائے! کیا ایسا ہی نہیں ہوا جمل تیا۔ بولے۔ کیا میں نے یہ سب غلط کیا؟“

احراز کا کئی انداز میں پوری کہانی لفظ بہ لفظ ویسے ہی سناتا چلا گیا جیسے نواب تھمرک حسن خان نے اس سے کہی تھی۔ اور اب آخر میں وہ محل ساسوال کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اندیشے ہلکورے لے رہے تھے۔

ایک پل کو ان کے جی میں آیا کہ کس کے ایک تھمر احراز کے چہرے پر لگائیں۔ مگر وہ سختی کے ساتھ اپنی مٹھی بھینچ گئے۔ وہ کیسے اس چہرے کو گزند پہنچاتے جس میں نواب زادی عائشہ جملکتی تھیں۔ ایک طویل سانس کھینچ کر انہوں نے خود کو قدرے نارمل کیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔

”اس کمرے کے دروازے سے ایک انچ بھی ادھر ادھر مت سرکنا۔ بس کان لگائے رکھنا۔ آپ پر سب کی اصلیت کا پول کھل جائے گا سا جواز ہے۔“
یہ کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے احراز کا ہاتھ تھما اور دپے پاؤں چلتے دروازے کے قریب چلے آئے۔ ایک نگاہ اس کے پریشان چہرے پر ڈالی اور اس کا کاندھا تھمتھا کر دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہو گئے۔ یوں کہ اسے اتنا کھلا رہنے دیا کہ اندر کی آواز

اس قدر ٹھیسے اور ٹھنڈے جواب پر نواب صاحب کے دل میں سوئی سی چچی تھی۔ نواب حسین احمد خان کا ایسا ساہ رو عمل وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے تلخ لہجے میں استفسار کیا۔

”تو پھر یہاں کیا لینے آئے ہیں آپ۔۔۔ گھر جائیے اور نواب حسین احمد خان سے کہیے کہ ہمارے پوتے کو ابھی واپس روانہ کر دیں۔ اب جب بات کھل ہی گئی ہے تو ہم مزید تاخیر نہیں چاہتے۔ بہت سال ہم نے اپنا ہلو جلا لیا۔ اب ان کی باری ہے۔ ویسے بھی اپنے میزبان کی اس درجہ گری ہوئی حرکت کے بعد ہم ہرگز یہاں قیام کرنا پسند نہیں کریں گے۔ ہماری جاسوسی کر کے ہمارے دشمن کے کان کھڑے کیے ہیں انہوں نے۔!“

نواب تبرک حسن خان کا تحس تیز ہوا تھا۔ ان کا بس چلتا تو سب کچھ سمس سمس کر دیتے۔ لیکن ابھی انہیں ذرا تحمل درکار تھا۔!

”مخدوم محمود قریشی بچپن سے احرار کو جانتے ہیں۔۔۔ میرے گھر آنا جانا ہے ان کا۔۔۔ جب یہاں غیر معمولی آمدورفت دیکھی تو مجھ سے استفسار کیا۔ سو گرنہ انہوں نے آپ کی جاسوسی کی نیت سے ہرگز مجھے کچھ نہیں بتایا۔۔۔ وہ وضع دار آدمی ہیں۔۔۔ آپ الزام مت دھریے۔!“ جمال صاحب کے چہرے پر گو مسکراہٹ پانے والی تھی مگر لہجہ ابھی بھی دھیمہ اور ہموار تھا۔

نواب صاحب بھڑک اٹھے۔ شیر افگن اپنی سرکار کے تیور دیکھتے ہوئے ہائی الرٹ ہوا مگر نواب صاحب کے خفیہ سے اشارے پر وہیں جمنا کھڑا رہا۔

”ہمارا وقت بہت قیمتی ہے محترم۔! بہتر ہو گا کہ آپ کلام کی بات کریں۔۔۔ ورنہ ہمارا پالتو غصہ آنے پر غرانے کے علاوہ جھینے کا کام بھی بخوبی کرتا ہے۔!“ ان کا اشارہ شیر افگن کی طرف تھا جو بڑے فخر سے گردن اکڑائے اس بات کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہوئے چھاتی چوڑی کر رہا تھا۔ جمال صاحب نے ترجیحی نظروں سے اسے دیکھا اور استہزائیہ انداز میں بولے۔

”ہمارے ہاں پالتو کو بٹاؤ ڈال کر رکھا جاتا ہے۔۔۔ خیر چھوڑیے۔! میں جو بات آپ سے کرنے آیا ہوں وہ یہ کہ آپ احرار کو کسی بھی وقت کسی بھی دن اپنے ہمراہ لے جائیے۔ یہ آپ پر منحصر ہے۔ لیکن اس کے بدلے نواب حسین احمد خان کی شخص اتنی سی چاہ ہے کہ وہ اپنی بیٹی نواب زاوی عاتشہ کی آخری آرام گاہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ نشان دہی کر دیجئے تاکہ وہ ہندوستان جا کر اپنی بیٹی کی لحد پر فاتحہ خوانی کر سکیں۔ ایک بوڑھے باپ کی التجا ہے۔۔۔!“

”ہا۔۔۔ ہا۔۔۔!“ نوردار فقہہ نواب تبرک حسن خان کے حلق سے برآمد ہوا اور ایک الٹی سی دروازے کے پار کھڑے احرار کے دل میں گڑ گڑی۔!

”کیسے بلکے پڑ گئے نواب حسین احمد خان۔ دیکھو شیر افگن ہمارے دشمن نے کیسی ہلکی شرط رکھی ہے۔۔۔ اور ہم۔۔۔ انہوں نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ ہم ان کی یہ شرط ماننے سے انکار کرتے ہیں۔!“ نواب صاحب نے سکون سے کمر ٹیکتے ہوئے آخری فقرہ ادا کیا اور چھٹی نگاہوں سے جمال صاحب کو دیکھ گئے۔ جمال صاحب نے چند لمحوں تک نگاہیں چار کیے رکھیں اور بے تاثر لہجے میں گویا ہوئے۔

”کیوں۔۔۔! کیوں انکار کرتے ہیں آپ نواب صاحب؟ آخر کب تک آپ نواب حسین احمد خان کو ناکروہ جرم کی سزا دیتے رہیں گے۔۔۔ بگاڑا کیا ہے انہوں نے آپ کا۔۔۔ پہلے دھوکے سے آپ نے نواب زاوی عاتشہ کی شادی اپنے نیم پاگل بیٹے سے کی۔ جس نے انہیں بے تحاشا تشدد کا نشانہ بنائے رکھا۔۔۔ آپ اور آپ کی بیگم نہ صرف اس پر پردہ ڈالے رکھا بلکہ ظلم کی انتہا یہ کہ ان کا رابطہ یہاں پاکستان میں ان کے بے کس و مجبور والدین کے ساتھ مکمل طور پر ختم کروا دیا۔۔۔ نواب حسین احمد خان اور ان کی بیگم اپنی بیٹی کی آواز تک سننے کے لیے ترس گئے اور آخر کار تقریباً سال بھر بعد احرار کی پیدائش کا وقت قریب آیا تو آپ کے پاگل بیٹے نے نواب زاوی عاتشہ کو جان بوجھ کر میڑھیوں سے دھکا دے ڈالا۔۔۔ وہ زخموں کی تاب نہ

لائے ہوئے جاں بحق ہو گئیں۔۔۔
 احرار کی زندگی بھی جو وہ بچ گیا ورنہ جس پوتے کو
 جھوٹی کمائیاں بنا کر آپ ہندوستان لے جا رہے ہیں
 ۔۔۔ آج اس کا بھی نام و نشان نہ رہتا۔۔۔ نواب حسین
 احمد خان اور ان کی بیگم کو بیٹی کا آخری دیدار بھی نصیب
 نہ ہو سکا۔۔۔ اور اس حد تک سہانہ سلوک کے بعد بھی
 آپ فرماتے ہیں کہ انہیں ان کی بیٹی عائشہ کی لحد تک کا
 پتہ نہ دیں گے۔۔۔ ان کی بیٹی کی آخری نشانی تو آپ ہتھیا
 کر لے جا ہی رہے ہیں۔۔۔ پھر بھی آپ کا دل اس قدر
 بے رحم ہے۔۔۔“

نواب تبرک حسن خان مارے طیش کے اٹھ
 کھڑے ہوئے۔ صندلی چھڑی پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ
 ڈال کر اپنی انہی رعوت سے گویا ہوئے۔۔۔
 ”ہمیں تب تک چین نہیں پڑے گا جب تک
 ہمیں ہندوستان میں یہ اطلاع نہ مل جائے کہ نواب
 حسین احمد خان اپنے نواسے کی یاد میں جاں سے گزر
 گئے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہمارا بیٹا عین جوانی میں اپنی
 اولاد کے غم میں جاں سے گزر گیا۔“

”اپنی اہلاد کے نہیں نواب صاحب۔۔۔ اپنی بیماری
 اور دن رات کی بے نومی کے باعث۔۔۔ اور اگر ایسی
 ہی بات ہے تو جوان اولاد کے گزر جانے کا صدمہ تو
 نواب حسین احمد خان نے بھی سہا!“ جمال صاحب
 بات کاٹتے ہوئے بولے۔۔۔ نواب تبرک حسن خان
 نے مل کے مل نگاہ چرائی مگر ان کا خمیر ہی سفاکی سے
 اٹھا تھا۔ گردن اُکڑاتے ہوئے بولے۔

”ہمارے ہاں بیٹیاں۔۔۔ نواب خاندان پر قربان
 ہونے کے لیے ہی پیدا ہوتی ہیں۔۔۔ نواب زادی عائشہ
 اگر مر گئیں تو ایسا بھی کیا غضب ہو گیا۔ ہمارا
 احسان ماننا چاہیے نواب حسین احمد خان کو کہ ہم نے
 ان کی بیٹی کو نواب خاندان سے باہر نہیں جانے دیا۔۔۔
 ان کی قبر کے کتبے پر زوجہ نواب زادہ طلال حسن خان
 لکھا ہے۔۔۔ اور کیا چاہیے!“

عائشہ کا ذکر اس انداز میں ہو۔۔۔ بھلا جمال صاحب کو
 کب گوارا ہوا تھا۔ آنکھیں میچتے اور مٹھیاں میچتے وہ
 بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔ سس خوروں
 والی آنکھوں میں نمی کی واضح تہ تھی۔ ایک دفعہ پھر
 عائشہ کی بے کسی اور کرب ناک موت کا خیال ان کے
 دل کی رگوں کو کاٹ گیا۔۔۔ ایک گیلا سا طویل سانس
 کھینچ کر بمشکل خود کو مربوط کیا۔۔۔ بس! اب کھیل
 سمیٹنا چاہیے۔۔۔
 ”احرار۔۔۔ اندر آؤ۔۔۔“

دروازے کے پیچھے سے احرار کا چہرہ نمودار ہوتے
 ہی نواب تبرک حسن خان کا چہرہ فاق ہوا تھا۔ وہ
 لڑکھڑائے تھے۔۔۔ شیرا قلن نے فوراً آگے بڑھ کر
 انہیں سنبھالا دیا مگر یک دم ان کی ٹانگوں میں ایسی
 لرزش اتری کہ انہیں واپس کر سی رہا تھا۔۔۔ وہ سفید
 ہونٹوں اور پھٹی آنکھوں کے ساتھ یک ٹک احرار کا
 چہرہ تکتے جا رہے تھے جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی
 قطار لگی تھی۔۔۔ وہ سب کچھ سن چکا ہے اس بات کی
 تصدیق کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ کیسی بات دی
 تھی قسمت نے انہیں۔۔۔ فارخ بن کر آئے تھے۔۔۔
 سکندر بن کر جانا مگر عین وقت پر بازی پلٹ گئی تھی۔

الف۔۔۔ اوہ کیسے بھول گئے کہ ابھی چند منٹ پہلے تو
 ان کا پوتا اس کمرے سے باہر گیا تھا۔۔۔ وہ کہیں قریب
 ہی ہو سکتا تھا۔۔۔ واپس بھی آ سکتا تھا۔۔۔ کچھ سن بھی
 سکتا تھا۔۔۔ اور اس نے سب ہی کچھ سن لیا تھا! کوئی
 ایسے بھی ہمارا ہو گا جیسے انہیں شکست ہوئی تھی۔۔۔
 چاروں شانے جت۔۔۔ ایک دم جت۔۔۔!

وہ اپنی صفائی میں کیا کہتے؟ ان کی زبان تو کچی گئی تھی
 جیسے۔۔۔ شیرا قلن بھی پتھر کا مجسمہ بنائی سرکار کی پشت
 پر کھڑے فرس پر بچے اور اپنی قاتلین کو گھورے جا رہا تھا۔
 اس میں نواب صاحب کا چہرہ دیکھنے کی ہمت ختم ہو
 گئی تھی۔۔۔

”میں آپ سے کچھ نہیں کہوں گا۔۔۔ میں کہنا ہی
 نہیں چاہتا۔۔۔ صرف ایک خواہش شدت سے دل میں
 اٹھ رہی ہے کہ کاش میں بھی اپنی ماں کے ساتھ ہی قبر
 میں اتر گیا ہوتا۔۔۔!“

گئے۔ پیچھے کمرے میں اعصاب شکن خاموشی تھی...
 مامی خاموشی۔ ایک بت پاش پاش ہوا تھا۔ جو
 آپ اپنا بچاری تھا۔ خدائی چھوٹی تھی۔ جو محض خود
 ساختہ بولتی تھی۔



آج رات احرار گھر نہیں آیا تھا۔ اور زینب کو
 صبر نہیں آیا تھا۔ ساری رات وہ لوں میاں بیوی نے
 ہال کمرے میں بیٹھے گزار دی۔ نواب حسین احمد خان
 نے خود کو لا پروا ظاہر کیا تھا۔ یوں جیسے وہ جانتے تھے کہ
 ایک دن احرار انہیں چھوڑ کر جانے والا تو ہے ہی۔ سو
 وہ چلا گیا۔ گھر میں کہیں ایک چھوٹی سی امید کشمائی
 رہی تھی کہ شاید۔ شاید وہ ابھی نہ گیا ہو، شاید وہ اپنا
 ارادہ بدل دے!

زینب کی کو ساری رات وہ کمرے میں جا کر آرام
 کرنے کا کتنے رہے مگر وہ کہیں فجر کی آذانوں کے ساتھ
 ہی وہاں سے اٹھیں اور جب حد نہ حال سی۔ روتی۔
 سسکیاں لیتی کمرے میں چلی گئی تھیں۔ اور وہ
 کمرے میں گئیں اور دھر نواب صاحب کی آنکھیں
 جھلک گئیں۔ چند آنسو ہما کے۔ بڑی بے دردی کے
 ساتھ آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے رگڑ ڈالا۔ خود
 اٹھ کر مسجد کا رخ کیا۔ ملازم لڑکا اپنے کوارٹر میں تھا۔
 اسے آواز دینا مناسب نہ سمجھا اور خود ہی آہستگی کے
 ساتھ گیٹ کھولا اور یوں ہی پیدل ہی کڑا کے کی سردی
 میں مسجد نکل لیے۔!



برکت اللہ صاحب نے پوچھنے سے پہلے بھینس کی
 خاطر واری کی۔ اس کے چارے پانی سے فارغ ہو کر
 برآمدے میں سگتی انجیٹھی کے پاس کھڑے ہو کر نماز
 ادا کی اور شروہ (ایٹو بلا) کو بعل میں دیا کر گیٹ سے باہر
 کھڑے پر چھٹی چارپائی پر خلف اوڑھ کر۔ گاؤ تلیے
 سے گئی ٹکا کر۔ بڑے مست انداز میں حقے کے کش
 لینے لگے۔ یہ یونی بھی کئی دن سے زاروں ہی ادا کر رہا
 تھا۔ فجر کے وقت مسجد جاتے ہوئے کھڑے پر چارپائی

ٹپ۔ دو قطرے۔ دو قطرے پانی کے زندگی
 میں پہلی بار نواب تبرک حسن خان کی آنکھوں سے
 نکلے تھے۔ جو ان کے سنی چہرے پر بے حد اجنبی
 محسوس ہو رہے تھے۔

”میں نے آپ کی جھوٹی داستان الم سن کر اپنے نانا
 اور نانی کے دل پھٹتی کر دیے۔ اپنے لفظوں کے
 تیوں سے۔ اتنا سفاک اور بے رحم ہو گیا تھا میں۔
 ظاہر ہے خون کا اثر تو اتنا تھا مجھ میں۔

میں نے ان کی کئی سالوں کی تربیت کے منہ پر
 طمانچہ دے مارا۔ اور آج چلت کر وہی پھٹر میرے منہ
 پر پڑا ہے۔ تھ ہے مجھ پر۔ کہ میں نے آپ کی
 باتوں میں آکر اپنی پاکیزہ اور بے قصور میں تک کے لیے
 براسو چا۔ غلط قیاس کیا۔ میں اس کے لیے خود کو کبھی
 معاف نہیں کروں گا۔ اور آپ کو میں آپ کے ضمیر
 کے حوالے کرتا ہوں۔ یہی سزا آپ کے لیے کافی ہے۔“

کسی چھوٹی بچی کی طرح اپنی آستین سے آنکھیں
 پونچھ کر بغیر کسی کو دیکھے وہ تیزی سے کمرے سے باہر
 نکل گیا۔ جمال صاحب نے تفس سے نواب تبرک
 حسن خان کے حیرت سے ادھر سے چہرے کو دیکھا۔
 جس کی سفیدی واضح طور پر زردی میں تبدیل ہو رہی
 تھی۔

”نواب صاحب! زندگی شطرنج کی وہ بلا ہے جس
 میں آپ کے ہاتھ ایک بازی ایسی ضرور آتی ہے جب
 آپ کے سارے مہرے داؤ پر لگ جاتے ہیں۔ اور
 یہی وہ وقت ہوتا ہے جب تقدیر آپ کو ایک موقع دیتی
 ہے۔ تدبیر کرنے کا۔ وہ ایک موقع! جس میں آپ
 سب کچھ گنوا دیں یا پالیں! میں تمام عمر اپنی تقدیر سے
 کبھی نہیں الجھا مگر آج وقت نے تدبیر کا جگنو میری
 منہ میں لا تھمایا۔ یہ بازی آپ جیت سکتے تھے جو
 بدینتی کا مظاہرہ نہ کرتے۔ آپ نے اپنے مہرے خود
 ہی پڑا لیے نواب صاحب! اب اجازت دیجیے۔ چلتا
 ہوں۔ لیکن آپ کے لیے دعا گو رہوں گا۔“
 جمال صاحب آرزو سے سر جھکا کر وہاں سے چلے

”اوئے۔۔۔ اوئے! ہوش کر میرے یار۔۔۔ کی ہوا تجھے۔۔۔؟“ ان کے گل تھمتھمتے ہوئے برکت اللہ نے ایک زور دار پکار اور پس اور عیمس کو لگائی۔۔۔ حسنین احمد کی زبان بل کھائی ہوئی تھی اور اذیت سے ان کے چہرے پر پید نہ چک رہا تھا۔ ہاتھ سے دل والی جگہ کو تھام رکھا تھا۔

”اوئے کبوتر! مجھے نیزے (قریب) بلانے کے بہانے نہ بنا۔۔۔ میرا تاء (غصہ) ایسے ننیں اترنے والا۔۔۔ اکھل کھول۔۔۔ اوئے کھول اکھل۔۔۔“

برکت اللہ مسلسل چوہ تھمتھمتے اور ہاتھ ملتے ہوئے بولے جارہے تھے۔۔۔ آنکھوں میں آنسو تھے، لب پھڑپھڑا رہے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے ان کا سینہ بری طرح جکڑا گیا ہے حسنین احمد کی تکلیف انہیں اپنے دل میں محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ دھڑکے سے حسنین احمد کے ماتھے سے نکالا اور بارے ہوئے لمبے میں بولے۔

”گل سن میری۔۔۔! مجھے جھڑکنے نہ چاہیے۔۔۔ لے میں نے ہار من لی۔۔۔ توجیت گیا کبوتر۔۔۔ لیکن اب لمبی اڈاری نہ مار۔۔۔ یار انسانی عمر کل گئی دور دور سے نکلتے۔۔۔ آج میرے گل ہی تو تھ نہ چھڑا۔۔۔ تجھے یاد ہے۔۔۔ میں نے تیرے سے وعدہ لیا تھا کہ میری منجی کو موہ دھا تو نے نہ دیا ہے۔۔۔ تو اب مکر نہ کر۔۔۔ ہوش کر پیا۔۔۔ میں کیسے جیوں گا تیرے سے لڑنے بغیر۔۔۔ رس کے نہ جا پارا۔۔۔!“

جیسے چھوٹا بچہ اپنا ٹوٹا کھلونا ہاتھوں میں لے لے بیسی سے سسک اٹھتا ہے۔ بالکل ویسے ہی برکت اللہ حسنین احمد کا سر گود میں دھرے آنکھیں میچے روئے جا رہے تھے۔ انہیں کچھ ہوش نہ رہا کہ کب اور پس نے گاڑی ان کے قریب لا کر روکی۔ عیمس کے ساتھ مل کر بھاگ بھاگ حسنین احمد کو گاڑی میں ڈالا، اگلی سیٹ پر برکت اللہ کو زبردستی سڑک سے اٹھا کر بٹھایا۔۔۔ جمال نیلا کے بیٹھے ہی اور پس نے گاڑی دوڑا دی تھی۔ اگلے دس منٹ میں قریبی ہسپتال کے کارڈیالوجی بوآرڈ میں حسنین احمد ڈاکٹرز کے رحم و کرم پر

بھی بچھانا اور حقہ بھی سلگا کے دیتا۔۔۔ آج کل وہ میاں جی کو رام کرنے کے ایک سو ایک طریقوں پر عمل کر رہا تھا۔!

ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔۔۔ صرف صبح کا ہلکا ہلکا اجالا نمودار ہوا تھا۔۔۔ حقے کے لمبے سے کش کے بعد چھوڑے گئے دھوئیں میں میاں جی کو ایک ہولاسا دکھائی دیا۔۔۔ آنکھیں جچی کر کے دیکھا تو بے اختیار چٹکارہ سا اُٹھا۔

”بڑے دن بعد نظر آیا۔۔۔ اپنا کبوتر۔۔۔!“

نواب حسنین احمد خان کو آمادیکہ کردہ شیرو کی گردن سلاتے ہوئے بندھائے۔ نواب صاحب کا چہرہ اترا ہوا تھا اور قدم بھی ڈھیلے پڑ رہے تھے۔ اپنے گھر کے گیٹ کے قریب آتے آتے ٹانگوں نے تھک سا کھلایا۔۔۔ وہ لڑکھڑائے۔ نگاہ چند فٹ دور چارپائی پہ مزے سے نیم دراز برکت اللہ کے مسکراتے چہرے پر پڑی۔ ایک وقت تھا کہ یہ چہرہ نگاہوں سے او بھل ہو جاتا تو چین نہ پڑتا تھا۔ اور اب یہ وقت ہے کہ کسی دن دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تو سارا دن بیڑا تلے جاتے۔! ان کا یارانہ گردن نہانہ کی نذر ہو گیا۔! نواب حسنین احمد خان کی آنکھیں بھر آئیں۔۔۔ لمبے کے ہزارویں حصے میں ان کے دل نے خواہش کی کہ ڈوبنے سے پہلے اپنے یار کو آواز دیں۔ اس کے سینے پر سر رکھیں اور پھر پھلے وقت کی طنائیں ہاتھ سے چھوٹ جائیں۔!

برکت اللہ کے دونوں ابو ذوق گئے۔ مسکراہٹ سمٹ گئی اور دل نے کسی انہونی کے احساس سے ہچکولا سا کھلایا۔۔۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر حسنین احمد کو دیکھ گئے۔ کچھ ہو رہا تھا۔ ہاں! کچھ ہو چلا ہے۔۔۔ برکت اللہ نے حسنین احمد کو سڑک کے پیچوں پیچ مگرتے دکھا۔ ایک بھیجی بھیجی سی آواز ان کے منہ سے خارج ہوئی اور وہ کسی چست دھو شیار کرتب بازی کی مانند خلاف اچھالتے پھلانگ سی مارتے حسنین احمد کی طرف لپکے۔ ان کے سر کو نیچے سے اٹھا کر اپنی گود میں دھرا۔ اور اب کے بولے تو آواز قدرے پھٹی ہوئی سی

تھے۔ جبکہ باہر ٹھنڈے رخ میخ پر بیٹھے برکت اللہ روتے کر لاتے ایک ہی گردان کیے جا رہے تھے۔
رس کے نہ جایا راسے!



نواب حسنین احمد خان کو ہارٹ انیک ہوا تھا۔ اس وقت وہ سی سی یو میں تھے۔ اگلے بارہ گھنٹے ڈاکٹرز نے اہم قرار دیے تھے۔ گھر اطلاع پہنچے ہی بے جی، زینب بی، حرم اور فوزیہ پھوپھو کو لے کر زارون کے ساتھ ہسپتال پہنچ گئی تھیں۔ پیچھے بچوں کے پاس ٹوبہ بھائی اور کینڈی تھیں، عمیس مسلسل احزار سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کا سبیل آف تھا۔

بڑی تنگ و دو کے بعد اس کے ایک کولیک سے رابطہ ہوا تھا جس نے صبح احزار کو ملے جلے حلیے میں بے حال سائیونورشی کی لائبریری کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ عمیس نے کولیک سے نواب صاحب کی حالت بیان کرنے کے بعد درخواست کی تھی کہ کسی طرح احزار تک یہ خبر پہنچا دے۔

اس نے دس سے پندرہ منٹ انتظار کرنے کو کہا تھا۔ ٹھیک گیارہویں منٹ اس کی کال آگئی کہ احزار یونیورسٹی سے نکل چکا ہے!

زارون اور عمیس کڑے تیور لیے ہسپتال کی انٹرنس پر جا کھڑے ہوئے تھے۔ دونوں کا ارادہ اسے آڑے ہاتھوں لینے کا تھا۔ تھوڑی دیر مزید انتظار کے بعد انہیں اس کی ہوائیاں اڑی صورت دکھائی دی۔ وہ نہ صرف بوکھلایا ہوا تھا بلکہ یقیناً "رویہ ہوا بھی تھا۔ زارون اور عمیس کو دیکھ کر وہ تقریباً "بھاگتا ہوا ان تک پہنچا تھا۔ بڑی بے چینی سے نانا جان کا پوچھا تھا۔ ان کی سنجیدہ شکلیں اس کو ہولا رہی تھیں۔

عمیس کا جی چاہا کہ ایک زوردار مکاس کے جڑے پہ ٹھونک دے۔ وہ عمل درآمد بھی کر گزرتا لیکن اس وقت جمال تیار وہاں چلے آئے۔ دونوں کو آنکھوں سے ٹھنڈے رہنے کا اشارہ کیا اور احزار کے کندھوں پر

بازو پھیلائے اسے اندر لے کر چلے گئے! کوئیڈر میں بے جی کے ساتھ زینب بی اور حرم موجود تھیں۔ حرم نے اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا تھا۔ وہ پہلے ہی دکھ کا شکار تھا، مزید اذیت میں گھر گیا۔ سی سی یو کے دروازے میں لگے شیشے کے پار نواب حسنین احمد خان کے بے حس و حرکت وجود کو دیکھتے ہی وہ خود پر سے کنٹرول کھو بیٹھا۔ جمال تایا کے گلے لگ کر ایسا بلک بلک رویا کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

میاں جی جو بڑی ضد کر کے سی سی یو کے باہر ہی گئے بیٹھے تھے۔ اپنی جگہ سے اٹھے۔ جمال تایا کے سینے سے لگے احزار کو بھیج کر اپنی طرف پھیرا اور زندگی میں پہلی بار اسے پوری آبادی اور محبت کے ساتھ سینے سے لگا کر بھیج لیا۔ دونوں کی چپکلیاں بندھی تھیں اور دونوں نچانے کیا بیڑیوں لے جا رہے تھے۔ جمال تایا نے اپنی آنکھوں کی نمی انگلیوں کی پوروں سے صاف کی اور چہرہ آسمان کی طرف اٹھا کر پورے دل سے مسکرا دیے۔ یوں جیسے کسی ناپیدہ وجود کے ساتھ مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا تھا! وہ کوئی ماہر کھلاڑی نہیں تھے مگر جن کے سر میں عشق کا سودا سما ہوا۔ وہ داؤ کہاں آزماتے ہیں، جگر آزماتے ہیں اور تخت نخت ہو جاتے ہیں۔



سارے حالات آنا "فانا" بدلے تھے۔ پلک جھپکنے میں جیسے کسی نے جاو کی چھڑی گھمائی تھی اور منظر بدل گئے!

نواب حسنین احمد خان دل کے شدید دورے سے جانبر ہونے کے بعد ڈسچارج ہوئے تو برکت اللہ پورے مان کے ساتھ انہیں سیدھا اپنے ہی گھر لے آئے۔ بے جی کی خود ساختہ ناراضی کسی کو نے میں جا گھسی۔ وہ اتنی خوش تھیں کہ میاں جی کو سو خون معاف کر دیتیں۔ سارا دن زینب بی ہوتیں اور وہ ہوتیں۔ گھر کی عورتیں نواب صاحب کی خدمت میں پیش پیش تھیں۔ اور میاں جی تو جیسے نواب صاحب کو گود لے بیٹھے تھے۔ بالکل اس طرح سے

مستنی بھی کریں۔ مگر میاں جی نے سہاؤ سے منع کر دیا۔۔۔ شادی میں دو ہفتے ہی تو تھے لہذا سارے شوق اور ارمان تب تک کے لیے ملتوی کر دیے۔ احرم احتجاجاً ایک بار پھر کمرہ بند ہو گئی۔ دیکھ تو یہ تھا کہ عمیس جیسے غم خوار نے بھی پیٹھ دکھادی تھی۔!

فوزیہ پھوپھو آج کل بے جی کے خوب آگے پیچھے تھیں۔۔۔ وہ زارون کے حوالے سے بات کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے اپنے میاں۔۔۔ ارشد صاحب کو بھی دونوں ہوئے بلوایا تھا۔۔۔ ویسے بھی اگلے ماہ وہ کینڈا جانے والے تھے سو ملنا ملنا بھی ہو جاتا۔۔۔! بے جی بھی کائیاں تھیں۔۔۔ سب سمجھتی تھیں وہ عمیس اور کینڈی کے دلوں سے بے خبر نہیں تھیں۔۔۔ پھر ایسی صورت میں جبکہ زارون بھی میاں جی اور بے جی کو اعتماد میں لے چکا تھا اور تو اور جمال تیا بھی اس راز میں شریک تھے تو پھر بے جی کیسے اپنے دونوں پوتوں اور نواسی کا دل اجاڑتیں۔۔۔ اس سے پہلے کہ فوزیہ پھوپھو کوئی ذکر چھیڑتیں۔۔۔ بے جی اور میاں جی نے جمال تیا کے ساتھ مل کر ارشد صاحب سے عمیس کے لیے کینڈی کا رشتہ طلب کر لیا۔۔۔ ارشد صاحب تو پھولے نہ سائے کہ سسرال والوں نے اپنی بیٹی سے ہٹ کر دلاؤ کو اس قدر اہمیت دی ہے۔۔۔ وہ اتنے شوئے ہوئے کہ اسی لمحے ہاں کہہ دی۔۔۔ ایک دم سارے میں مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ بیگم جمال نے آگے بڑھ کر فوزیہ

خیال رکھ رہے تھے جیسے کوئی ماں اپنے نوزائیدہ بچے کا رکھے۔۔۔! دونوں دوست ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ماضی کھنگالتے رہتے اور آنکھوں میں نمی چمکتی رہتی۔۔۔ نواب صاحب کی بیماری ایک ایسا جھٹکا ثابت ہوئی تھی جس نے کبھی کی جام ہوئی دوستی کی گاڑی دوڑادی تھی۔!

اور اب میاں جی کسی بھی معاملے کو التوا میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔۔۔ پہلی فرصت میں انہوں نے ڈاکٹر بلال کے گھر والوں سے حرم کے رشتے کے لیے معذرت کی تھی۔۔۔ گو کہ یہ خاصی معیوب حرکت تھی کہ شادی میں وقت ہی کتنا رہ گیا تھا مگر ہر پار کی طرح میاں جی نے بے جی کے کندھوں پر بندوق دھردی۔۔۔ انہیں غصہ تو بے حد آیا مگر مینا پر داکو نہ کہ خود بھی تو وہ یہ ہی چاہتی تھیں۔۔۔! وضع دار لوگ تھے۔۔۔ براتو بے حد بنا کر تکرار میں نہیں پڑے۔۔۔ خاموشی سے سامان بھجوا دیا اور اپنا منگوا لیا۔۔۔ ڈاکٹر بلال کو عمیس اور احرار نے سنبھال لیا۔۔۔ بالا ہی بالا اس کے کلینک میں اس کے دوبرہ بیٹھ کر۔۔۔ باتوں کی کچھ کھٹی، کچھ میٹھی اور ذرا سی کڑوی خوراک دے کر چلے آئے۔۔۔ عمیس نے احرار کا تعارف حرم کے ہونے والے شوہر کے طور کروایا، ساتھ ہی دونوں کی باہمی رضامندی کا ذکر کیا تو ڈاکٹر بلال جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔۔۔ بھلا وہ اپنی زمین پر مکان کیسے تعمیر کر سکتا تھا۔!

حرم کو معلوم ہوا تو اس نے ہر قسم کی لوائسٹوری کی طرح خوب دواؤں کیا اور صاف انکار بھی کر دیا۔۔۔ بے جی نے انکار سن کر ناک پر سے کبھی اڑائی۔۔۔ بیگم جمال نے لاپرواہی سے سر جھٹک دیا اور بیگم اجمل نے غصے سے گھورنے پر اکتفا کیا۔ اس کے علاوہ کسی نے بھی کچھ نہ کہا۔۔۔ کسی کو بھی حرم کے انکار سے ہرگز دلچسپی نہیں تھی۔!

میاں جی نے شادی کی وہی تاریخ رکھی جو پہلے سے طے تھی۔! نواب حسین احمد خان اپنے گھر شفٹ ہو چکے تھے اور چاہتے تھے کہ نواسے کی دھوم دھام سے



مستریا
محمد میا

قیمت -/400 روپے

کتبہ مران لاہور: 37 - 37/35021 لاہور

پھوپھو کو گلے لگایا۔ منہ بیٹھا کرایا اور قریب کھڑی کینڈی کی انگلی میں اپنی انگوٹھی ڈال دی۔ تمام لڑکوں نے عیس کے کانڈھوں پر اٹھا کر وہ شور مچایا کہ فوزیہ پھوپھو کھسائی سی بس دیکھتی رہ گئیں۔

اس وقت ان کا دل کر رہا تھا کہ خالص دہلی انداز میں بیچ مکن کے پھسکڑا مار کر بیٹھیں اور اونچا اونچا روئیں۔ وہ ایسا کر بھی گزرتیں جو کینڈی کی کھلتی صورت پر نگاہ نہ جا رہی۔ کیسی گھل سی ہو رہی تھی وہ، ایسا رد عمل تو انہوں نے تب بھی نہ دکھا تھا جب

زاروں کے بارے میں رائے تھی۔ تب تو یک دم چپ سی ہو گئی تھی وہ! بس۔ فیصلہ ہو گیا تھا۔ ان کی کینڈی کے لیے عیس ہی بہترین تھا وہاں تھیں اپنی انا کا جھنڈا اونچا زکھنے کے لیے بیٹی کی زندگی سے انشام کیوں لیتیں بھلا! اگلے کچھ ہی ہفتوں میں فوزیہ پھوپھو عیس کے واری صدفے جا رہی تھیں! زندگی میں رشتوں کی جگہ کبھی مختصر نہیں ہوتی بلکہ دلوں میں تنہائی کم رہ جاتی ہے۔ اور جب دلوں میں جگہ نہ رہے تو تعلق چھٹکنی کے ٹکڑوں کی مانند زندگی سے خارج ہو جاتے ہیں!

بے جی اور میاں جی۔ اجمل صاحب اور بیگم اجمل کے ساتھ جا کر زاروں کی پسند کو اوٹے کر آئے تھے۔ بیگم اجمل کے دل سے سارا قلق جاتا رہا تھا کیشملہ عرف لکھی کو دیکھ کر وہ کینڈی جیسی نہیں تھی بلکہ کینڈی سے بھی زیادہ پیاری اور معصوم صورت تھی!

ان لوگوں نے بھی بے حد آؤ بھگت کی تھی۔ گھر نہ کھانا پیتا تھا مگر بے حد سوز بھی تھا۔ میاں جی نے زاروں کے دوبارہ پاکستان آنے پر شادی طے کی تھی! زاروں کو پتا چلا تو بیچ مکن میں عیس اور اورس بھائی کے ہمراہ بھگڑے ڈالے تھے۔ ساتھ میں گونگو بھی گول گول گھومے جا رہا تھا۔ اور اسی گھومنے میں تین دفعہ ہٹ کے گرا تھا۔

بے جی کے پٹنگ پر ان کے ساتھ بڑی ہمار محبت سے بیٹھے میاں جی کی آنکھیں یہ منظر دیکھ کر جھللا گئیں۔ یہ سوجھی انہیں کند چھری سے منہ کیے ہوئی تھی کہ اگر ان کا پار ناراضی کی حالت میں ہی انہیں چھوڑ کر چل دیتا تو؟ آج جو ان کے گھر کے کونے کونے سے خوشیوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے اس کی ایک بڑی وجہ دونوں گھرانوں کے مابین تعلق کی بحالی تھی۔ بیجا وقت تو کوئی لوٹا نہیں سکتا مگر گزرتے وقت کو پا ضرور سکتا ہے۔

کینڈی اور ثوبہ بھابی کے پر زور اصرار پر حرم کی شادی کے سلسلے میں گھر میں ڈھولک رکھی جا چکی تھی۔ ثوبہ بھابی کے تورنگ ڈھولک ہی آج کل جھلکا تھے۔ مشکینی طرز کی زندگی جیتے اورس بھائی کو بھی گلنے لگا تھا کہ ان کی اور ثوبہ بھابی کی شادی کی گاڑی کو اگر بروقت محبت و الفت کا پیڑول نہ ملا تو بھی ابجن کے نکل پر زے رنگ آلود ہو کر جام ہو سکتے تھے۔ لہذا آج کل بلاتھا اورس بھائی ثوبہ بھابی کے لیے مونہے کے ٹنگن پکڑ لاتے تھے۔ تو بھی چپکے سے کسی اوٹ میں بیٹھا بان کھلاتے دکھائی دیتے۔ اور تو اور رات کو بچوں کو سلا کر خود کالونی کے چکر کاٹنے نکل جاتے۔ اس صورت حال نے ہونو سی ثوبہ بھابی میں بے حد اضمح پیدا کیا تھا۔ سارا دن بچوں کے ساتھ گلابی اردو میں لعن طعن کرنے والی اور ہر ایک کا حکم نہمواہونٹوں سے سن کر آنکھیں پٹھانکا۔ بجا آوری کرنے والی ثوبہ بھابی آج کل ہر گز بھی گاؤدی نہیں لگتی تھیں بلکہ وہ بوے مان اور اضمح کے ساتھ ہر معاملے میں بہترین مشورہ دیتی دکھائی دیتی! اعتبار وہ آب حیات ہے جسے پی کر محبت کو کبھی موت نہیں آتی۔ اور سر شام ہی کالونی سے حرم کی اسٹوڈنٹس اور سہیلیاں آن چلتیں۔ پھر تو وہ خلق بھانڈا کرنا ہنر آزمائے جاتے کہ بس ڈھولک پھاڑنے کی کسر نہ جاتی لگے ہاتھوں بے جی، زہنب بی کو بھی ادھر ہی پلا

لیتیں۔۔۔ دونوں پٹنگ پر بیٹھی سر جوڑے سب کو دیکھ دیکھ بنے جاتیں اور رخ موڑ کر چادر کے پلو سے آنکھوں کے تکیے کوئے بھی رگڑ دیتیں!۔۔۔
 احرار نے بہتری کو شیشیں کر ڈالی تھیں کہ کسی طرح اسے بھی اجازت مل جائے کہ وہ کم از کم صحن تک ہی آجایا کرے۔۔۔ مگر میاں جی کے ہوتے یہ بھلا کب ممکن تھا۔۔۔ بس بالکونی میں کھڑا دیوار پار کے حسین مناظر دیکھا کرتا۔۔۔ نگاہیں حرم کو کھوجتی رہتیں مگر وہ ایسی غائب ہوئی تھی کہ بھولے سے بھی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔۔۔ اس وقت بھی وہ اپنے کمرے کے ٹیرس پر ریٹنگ سے کنڈیاں نکائے دیوار پار صحن میں زور زور سے ڈھولک بجاتی ایک طرح دار حسینہ کے حسین چہرے میں حرم کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔۔۔ جب یکایک ایک خیال نے اسے چونکایا۔۔۔ جینز کی جیب سے موبائل نکالا اور نمبر ڈائل کر کے کان سے لگایا۔۔۔ کافی دیر کے بعد عمیس نے کال اینڈنگ کی اور جب اینڈنگ کر لی لی تو بوئے بے حروت انداز میں پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ ہیلو۔۔۔ کون بول رہا ہے۔۔۔؟“
 ”تیرا بہنوئی!“ احرار کا جواب بھی لٹھ مار تھا۔
 ”اوہ۔۔۔ اور میری اپنے بہنوئی سے نہیں بنتی۔۔۔!“
 وہ دوسرے کان میں انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔
 ”تو کواں بند کر۔۔۔ اور یہ بتا کہ کیا کر رہا ہے؟“ احرار نے چڑ کر پوچھا۔

”بس جانی! قدرت کے اسرار کھوج رہا ہوں۔۔۔!“
 وہ اس وقت چن کی لاٹھ آف کر کے جالی والے دروازے سے ناک نکال کر باہر بیٹھی لڑکیاں ناظر رہا تھا۔
 ”اچھا۔۔۔ بس یہی پتا کرنے کا کہا تھا کینڈی نے۔۔۔ رکھتا ہوں اب۔۔۔ ذرا اسے کال کر لوں۔۔۔!“

”اوئے۔۔۔ اوئے۔۔۔ پاگل ہوا ہے کیا۔۔۔ کیوں کنارے پر ہی میری کشتی ڈبو نا چاہتا ہے۔۔۔ بول کیا کام ہے۔۔۔؟“ عمیس رخ میں بوکھلا کر بولا۔

”ہاں۔۔۔! یہ ہوئی تاباں۔۔۔ ہزار بار بولا ہے قیص کے شن میں رہا کر۔۔۔ اچھا وہ ایسا ہے کہ۔۔۔ مجھے منانا

ہے۔۔۔!“ وہ ذرا سا جھجکتے ہوئے مدد سے پر آیا۔
 ”دیکھ! میں صوفی کی بریانی کے دو ڈبوں اور چمن کی آکس کریم سے کم پر ہرگز ہرگز نہیں ماننے والا۔۔۔ بتائے دے رہا ہوں!“ عمیس نے اپنے گال پر بیٹھے پتھر کو چمٹ مار کر گال سے چٹایا۔۔۔

”تیری اوقات اتنی ہی ہے غبیث۔۔۔! واپسی پر تجھے درجن کچھ بھی لے دوں گا جن کے ساتھ دو دو روپے والے کھلونے بندھے ہوتے ہیں۔۔۔ اب خوش۔۔۔ اُنی الحال حرم کو منانے میں تو شرافت سے میری مدد کر۔“

”میں بے چارہ کیا مدد کروں۔۔۔ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ تجھے زنانہ جوڑا بھیج دیتا ہوں۔۔۔ پن کر آجا اور ذرا ڈھولک سنبھال لے آکر۔۔۔ دو چار سریلے ہاتھ جما دے یا۔۔۔! ورنہ یہ لڑکیاں تو تھیں گلے پھاڑ رہی ہیں، قسم لے لے۔۔۔!“

”اب اگر تو نے ایک بھی لفظ بے کار میں پھونٹا تو میں تیرا سر پھاڑ دوں گا اور پھر کینڈی یقیناً“ تیرے جیسے بچے کنستری شادی نہیں کرے گی۔۔۔!“

”یہ تو بار بار مجھے کینڈی کی دھمکی کیوں دیے جاتا ہے۔۔۔ اچھا بول کیا کروں۔۔۔؟“ اب کے عمیس شرافت سے مانا تھا۔۔۔ اس سے زیادہ وہ احرار کو تنگ کرتا تو اس سے کوئی بعید نہ تھا۔۔۔ حج میں آکر اس کی گردن دو بوج لیتا۔

”پھت پر پنچو۔۔۔ میں بھی آ رہا ہوں۔۔۔!“
 مختصر کہہ کر احرار نے کال منقطع کر دی تھی۔
 دو دفعہ عمیس کی اوئے۔۔۔ اوئے بھی سنی تھی مگر اس وقت اسے کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔۔۔ اسے حرم کا دل صاف کرتا تھا۔۔۔

☆☆☆

چودھویں کے چاند پہ نگاہیں جمائے اس کی ذہنی رو بھگی ہوئی تھی۔۔۔ اس نے ملک تک نہیں جھپکی تھی۔
 چہرے پہ اداسی رقم تھی جس نے اس کے حسن کو چودھویں کے چاند سی جلا بخشی تھی۔۔۔ موتیا رنگ کی

دنیا کو تباہ کر دوں یا خود کو فنا کر لوں۔۔۔ میرا رشتوں سے،
جذبوں سے۔۔۔ محبت سے، ہر چیز سے اعتبار اٹھ گیا
تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ساری دنیا محض ایک ہی
تعلق کے زیر اثر ہے اور وہ ہے غرض کا تعلق۔ اس
کے علاوہ باقی سب جھوٹ ہے، ٹکڑا ہے۔ میں کیا
کر تا حرم۔۔۔ کس کے پاس جانا۔۔۔ مجھے ان دنوں کوئی
بھی اپنا نہیں لگتا تھا۔ کیونکہ مجھے میرے اپنوں سے
ہی بدگمان کیا گیا تھا۔ میں اپنی کمزوری مانتا ہوں حرم!
لیکن خدا را میری محبت کی سچائی پہ شک مت کرو،
میں کل بھی تم سے۔۔۔

”آہم۔۔۔ آہم۔۔۔“ ”موگ پھلی کا دانہ ہوا میں
اچھال کر منہ کھول کر چیخ کرتے ہوئے۔۔۔ زور سے گلا
صاف کر کے عمیس نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا
۔۔۔ حرم جو پلکیں موندے دم سا دھبے بے خود سی احرار
کو سننے جا رہی تھی۔۔۔ سٹپا گئی۔۔۔ غیر محسوس انداز میں
آنکھوں میں اتری نمی کو چھٹکی کی پور سے پونچھ کر
گردن میں تاقوید کیا۔ اور اتر کر بولی۔
”عمیس۔۔۔! انواب صاحب سے کہو کہ ہمیں ان
کی کسی بات پر یقین نہیں۔۔۔ لفاظی سے کام نہ لیں۔“

”ابن کا بہن بول رہے لاکھ چل پھٹ لے یاں
سے۔۔۔ کلٹی ہو شاباش!“ ”عمیس نے کالر کھڑے
کر کے واو گیری اشائل میں حرم کا جواب پہنچایا مگر
اس سے پہلے وہ دیوار سے اتر کر احرار کی زد سے دور ہونا
نہیں بھولا تھا۔ حرم کو اس جواب پہ غضب کی ہنسی
آئی مگر یاد آئی جبکہ احارادانت چپکاتے ہوئے بولا۔
”اس نے یہ نہیں کہا۔۔۔ تم اپنا منہ بند رکھو ورنہ
بتیسی توڑ دوں گا۔“ پھر وہ حرم سے مخاطب ہوا۔
”حرم! میں کوئی لفاظی نہیں کر رہا۔۔۔ یہ میرے اندر کی
سچائی ہے جو زبان سے بیان کی ہے اگر تمہیں میری
بات کا یقین نہیں تو۔۔۔ تو۔۔۔ تم۔۔۔!“

اسے آگے کوئی لفظ نہیں سوچ رہا تھا۔ چہرے پر
بے چارگی چھائی تھی۔ عمیس اسے بڑی کمینی
مسکراہٹ سے دیکھتا بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔

شمال نے اس کے سرخ و سپید عارضوں سے مس ہو کر
گویا ہالہ سا بنا رکھا تھا۔۔۔ اگر اس کی صورت پر بے
زاری اور آکٹا ہٹ تھی۔۔۔ اس کا دل اچاٹ تھا۔
عمیس زبردستی اسے چھت پر لے کر آیا تھا کہ چل کر
تھوڑی دیر تازہ ہوا میں سانس لے۔۔۔ ساری کلفت
دور ہو جائے گی۔۔۔ لیکن اوپر سردی اس قدر تھی کہ
ہڈیوں کا گودا جتنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے نکلتا تے
دانتوں کو بھیج کر ایک نظریار یک سا وہنلا غلاف
اوڑھے چاند کو دیکھا اور دوسری نظر عمیس پر ڈالی جو
مزے سے دونوں گھروں کی مشترکہ دیوار پر چڑھ کر بیٹھا
جیب سے چھلی ہوئی موگ پھلی نکال نکال کر ٹونگے جا
رہا تھا۔

اس نے تپ کر اسے دیکھا اور بازو پر دھپ مارتے
ہوئے بولی۔

”یہ تم میری طبیعت فریش کرنے کے لیے اوپر
لائے ہو یا فریز کرنے کے لیے۔۔۔ میری ہڈیاں کڑکڑا
رہی ہیں اور تم مزے سے منہ چلائے جا رہے ہو۔۔۔!“
اس پر رتی بھر اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی تسلسل سے
موگ پھلی ٹونگے چل رہا تھا۔ حرم زنج ہو گئی۔
”عمیس۔۔۔ میرا دل بگ خراب مت کرو مزید۔۔۔“

میں جا رہی ہوں نیچے۔۔۔
”آہم۔۔۔!“ اس کے قریب ہی نیکدم کسی کے گلا
کھنکھارنے کی آواز ابھری۔۔۔ وہ گھبرا کے پلٹی۔
احرار کو دیکھ کر اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔
”عمیس۔۔۔! تم انتہائی کہینے ہو۔۔۔ مجھے تم سے یہ
امید نہیں تھی جا رہی ہوں میں نیچے۔۔۔!“ وہ عمیس
کو گھرتے ہوئے بولی اور واپسی کے لیے مڑنے ہی لگی
تھی جب پیچھے سے احرار نے بڑی محبت سے اس کا نام
پکارا تھا۔

”حرم۔۔۔!“ اس نے اذیت کے احساس سے
مغلوب ہو کر آنکھیں میچ لیں مگر خاموش رہی۔
”حرم! پلیز، میری بات سننے بغیر مت جانا۔ میں
مانتا ہوں میرا انصوہ ہے۔۔۔ مگر یقین مانو مجھے اس بری
طرح سے الجھایا گیا تھا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ میں ساری

”عمیس! نواب صاحب سے کہو۔ ہمیں کسی صفائی کی حاجت نہیں۔ اب جو بات ہوگی، دوبدو ہوگی۔ ذرا یہ بھی انتظار کا مزہ کشید کریں۔“

”ابن کا بن بول رہے لاکہ اسے کس کام والی بائی (صفائی والی) کا ضرورت نہیں رہے۔ ہاں۔ تیرے کو کام کرنا مانگتا تو، تو آکر ہماری میچ (بھینس) کی کھد مت کر دیا کر رہے۔ پھوٹ میں!“ حرم نے فوراً ”شال کا پلو منہ پدھر۔ اس سے ہنسی روکنا بے حد شہوار ہو گیا تھا۔ وہ اس نے رخ موڑ رکھا تھا وگرنہ احرار کا چودہ دیکھ لیتی تو لوٹ بوٹ ہو جاتی۔ اس نے عمیس کو دوبارہ بک بک کرتے سنا جو نجلے کب کے بدلے لے رہا تھا۔

”اب اور (ادھر) کانے کو کھڑا رہے۔ چل شلباش تہی علی سے نکل لے۔ چھپو رہے۔“

”جیری تو۔“ احرار کی برداشت اسی قدر تھی۔

نوالی خون تھا۔ ایک حسرت میں دیوار پھلانگ کر ادھر تھا اور اگلے ہی بل عمیس کی گردن اس کے مضبوط بازو کے گھبے میں تھی۔ عمیس کو کھٹکنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ حرم اس کی درگت پر اب کھل کر رہے جا رہی تھی۔ احرار یک ٹک اسے تنگے جا رہا تھا اور اس کے بازو میں پھنسا عمیس حرم کی طوطا چشمی اور دوست کی خداری کی پہلی پیچے جا رہا تھا۔

احرار اور حرم کی نظریں ملیں۔ اور تعین کی شمع پوری تب و تاب سے جل اٹھی۔ دل کے ناول نے جلتے جگ سا بجلیا اور محبت نے مرثیت کی۔ وہ اک دو بے کے لیے تھے اور ہمیشہ کے لیے تھے! حرم شرمیلیں مسکراہٹ لیے احرار کی وارفتہ نظروں سے دامن بجاتی نیچے بھاگی۔ پیچھے عمیس اور احرار نوراً کشتی گئے لیے بالکل تیار تھے! چودھویں کا چاند مزید روشن ہو گیا تھا!

چھوٹی سی اسٹڈی میں رانگ چیر بریٹھے وہ بہت آہستگی سے جھولتے ہوئے مسلسل کھڑکی سے نظر

آتے پورے چاند کو تک رہے تھے۔ انہیں آج بھی پورے چاند کی رات اتنی ہی بھاتی تھی جتنی اس وقت جب جھکے والان میں حوروں جیسی پاکیزہ اور حسین عانثہ بیٹھی بے خودی کے عالم میں چودھویں کا چاند نہارا کرتی تھیں اور وہ اتنے ہی مستو بے خود سے اپنی بالکونی سے انہیں دیکھ دیکھ کر سیر ہو کر تھے!

ان کی محبت ان کا زور دار ہو گئی۔ ان کی متاع حیات، اور عانثہ سے تو انہوں نے عشق کیا تھا۔ اور یہ عشق لا حاصل نہیں تھا۔ یہ عشق ان کی مدح میں سرايت کر چکا تھا۔ اسے دوام حاصل تھا۔ اور یہ ان کی زینت کا حاصل تھا! اجل صاحب ایک جذب کی کیفیت میں اپنی جگہ سے اٹھے اور کھڑکی کے پاس آن کھڑے ہوئے۔ انہیں اپنے ارد گرد الوہی سی محکم محسوس ہونا شروع ہوئی۔ ان کے عشق کی آگ جب لودیتی تو خوشبو کی پشیں رقص کیا کرتیں! وہ آج بھی ماضی میں جیتے تھے۔ حل تو بس جھپٹتے تھے!

وہ وقت بہت کرا تھا جب نواب حسین احمد خان نے تمام موت بلائے طاق رکھتے ہوئے عانثہ کے لیے بیسے کئے ان کے رشتے سے انکار کیا تھا۔ انہیں ہرگز ایسی امید نہ تھی۔ وہ جو عانثہ کے ساتھ خوشبو بھری باتیں کیا کرتے تھے۔ تئلیوں کے رنگوں کو چٹا کرتے تھے اور مستقبل کے سنہری جگنو ٹھیلوں میں بھرا کرتے تھے۔ جیسے ایک جھکے سے منہ کے بل

نہن پر آ رہے۔

دلوں میں رجشیں نمودار گئیں اور تعلقات کے بیوڑے ہو گئے۔ وہ اپنے غم کو دل میں دبائے اذیت ناک حد تک تعمیلی پسند ہو گئے۔ مہی باپ نے ایک دیہاتی اور واجبی سے بھی کم پڑھی لکھی لڑکی سے نصیب باندھ دیے۔ انہیں چنداں پروا نہ ہوئی۔ وہ چاہتے بھی یہی تھے کہ اگر عانثہ نہیں تو پھر کوئی ایسی جو فوق دہری سے نا آشنا ہو۔ جس کو ان کی ذات کی پرتوں تلے چھپے نارسائی کے غم سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ اور بیگم جمال ہو ہو ایسی ہی تھیں! اور پھر جب جدائی کا نشہ سروں بن کر گردنوں میں دوڑنے لگا تو عانثہ کے مرنے

اور ایسا ہوتا تو وہ عائشہ کو کیا منہ دکھاتے! جن کی صورت وہ روز نکا کرتے تھے۔ سر شام جب بھی وہ اپنی اس چھوٹی سی پنہ گاہ میں آکر بیٹھے تو ملکجے اندھیرے میں یکدم روشنی پھوار کی صورت برسنے لگتی۔ ایک چاندی میں ڈھلا ہوا اپنے ان دیکھے لمس سے انہیں سرشاری کی کیفیت میں مبتلا کر دیتا۔ وہ دھیرے سے آنکھیں موند لیتے۔ اس لمحے انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے وہ غیر مرئی لبوے میں ملبوس خلا میں معلق ہیں۔

اس استغراق میں ایک عمر تمام ہوئی تھی۔ ایک لمبا عرصہ تھا جو انہوں نے وقت کے لمبے سے بچ کر تیا تھا۔ اب کچھ ہی وقت جا تا تھا جب یہ موج کنارے پہ آن ٹھہری!

ست و بے خود سے وہ ملن کا ہنڈولا جھول رہے تھے۔ کچھ کہہ رہے تھے تو کچھ سن رہے تھے۔ جب ہلکی سی تھر تھراہٹ ان کے پیلو سے ابھری اور وہ بری طرح چونے۔ ان کے سیل پر نواب صاحب کا میسج تھا۔ اپنی بیٹھک میں شطرنج کی بساط بچھائے بیٹھے تھے اور ان کے منہ پر تھکڑی! جمل صاحب پیغام پڑھ کر آرزو سے مسکرا اٹھے اور کھڑے ہو گئے۔

”اے زندگی! تو نے ہمیں کیوں نہ استحقاق میں ڈالا۔“ دھیمے سے پیر پڑاتے انہوں نے اجازت طلب نظروں سے روشنی میں ملفوف نازک ہیولے کو دیکھا۔ کھڑکی پہ پڑے ریسی پردے کی سرسراہٹ کے ساتھ ہی ایک خفیف سا خوشبو کا جھونکا ان کے وجود سے ٹکرایا۔ گویا جلنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ وہ بھرپور مسکرا اٹھے اور سر کو ذرا سا خم کرتے عقیدت سے موجزن دل لیے باہر کو چلی دیے۔

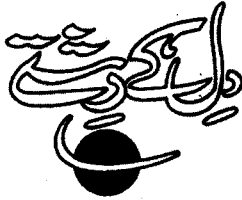
آج کی بازی نواب صاحب کے نام تھی۔ کیونکہ اب انہیں ہار جیت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ اپنے حصے کی بازی کھیل آئے تھے۔ اب ان کی بلا سے جو بھی ہو کیونکہ عرصہ ہوا ان کی زندگی کی بساط کے تمام مہرے قسمت کے ہاتھوں پٹ چکے تھے۔ کھیل ختم شد!

کی خبر آگئی۔ سب سرور زہر نگل گیا۔ وہ ہار ہار کے ٹوٹے اور ٹوٹ ٹوٹ کے ہارے۔ عشق ملک بن کر ان کے اندر بیٹھ گیا جو غم غبار میں دیوانہ وار رقص جاری رکھتا اور دھڑکنیں زخم زخم ہوتی رہتیں!

کتنی ہی زندگی پیچھے کی مانند سک سک کر گزر گئی۔ اور پھر ایک اتفاق نے انہیں نواب حسین احمد خان کے سامنے لا کھڑا کیا۔ دونوں ہی اک دو بے کو دیکھے چلے گئے اور دل نے دل سے دلوں کی بات کہہ دی۔ دونوں کے دکھ ساٹھے تھے۔ دونوں کو ایک ہی وجود سے بے پایاں محبت تھی مگر نوعیت مختلف تھی۔ دونوں کو اپنی محبت نے جو دیا۔ ایک کے انداز میں شیر مندی تھی (انکاری) تو دوسرے کے انداز میں دلجوئی تھی۔ یوں ایک دوسرے کا مہربن بن کر دونوں نے زندگی کرنے کا سہارا پیدا کیا۔ بیٹھک سج گئی۔ شطرنج کی بساط بچھ گئی۔ مہلوں نے اپنی اپنی کمان سنبھالی تو چالیں چلنے کا لطف آنے لگا۔ مہلوں کو پٹنے سے بچاتے بچاتے بات رشتوں کو پٹنے سے بچاتے پر آئی تو جمل صاحب نے زندگی کا سب سے بڑا داؤ کھیلا۔ احرار ان کو عزیز تھا، اتنا کہ ان کے پاس پیانا نہیں تھا جس سے وہ اس آفت کو ملتے جو انہیں احرار سے تھی۔ وہ عائشہ کی اولاد بنے بس کی اول آخر تھا!

وہ کیسے اسے خود کی بھی نگاہوں سے دور ہونے دیتے جس کے چہرے کے نقش نقش میں عائشہ بولتی تھیں۔ جس کی آواز میں عائشہ گنگنائی تھیں۔ جس کی چال میں ویسا ہی ٹھہراؤ تھا اور جس کے وجود نے عائشہ کا سر چڑایا تھا!

وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی یہ چال کامیاب ہوگی یا نہیں کیونکہ وہ کھلاڑی نہ تھے۔ انہیں تو شطرنج سے بھی رغبت محض نواب صاحب کی خاطر تھی۔ مگر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے ناکہ کھلاڑی بے سوچے سمجھے ایسا داؤ کھیل جاتا ہے جو بس آریا پار کے چکر میں کھیل جاتے ہیں۔ بالکل یہی کام جمل صاحب نے کیا تھا۔ جمل صاحب نے بھی اندھیرے میں تیر چلایا جو ٹھیک نشانے لگا۔ بصورت دیگر وہ سب احرار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھو دیتے۔



جب ہم اپنی زندگی کی کمائی کو اپنی مرضی کا سن دیتے ہیں تو انجام کو بہت دھمی کر دیتے ہیں۔ آہستہ آہستہ مجھے اس کے سب کاموں سے چڑھنے لگی۔ اس کی ہر حرکت سے۔ کمرے میں پکھا اور لائٹ جلتے رہنے سے، رات رات بھر کمپیوٹر پر بیٹھے رہنے اور آرڈر دے کر باہر سے کھانا منگوانے سے بھی۔ اس کا کمرہ ہر وقت بکھرا رہتا تھا۔ بلکہ گھر کا ہر وہ حصہ بکھا ہوا ملتا تھا جہاں جہاں وہ بیٹھ کر میوزک سنتی اور بے ہنگم ڈانس کرتی تھی۔ ہر دو سرے دن اس کی سہیلیاں گھر آجاتیں اور وہ سب مل کر خوب ہنگامہ کرتیں، کھاتی پینیں اور سارا گھر بکھیر کھلی جاتیں۔ میرے دو بچوں کے اتنے کام نہیں تھے، جتنے اس سولہ سال کی لڑکی کے تھے۔

اب میں اس سے اتنا لگے لگی تھی، بلکہ وہ مجھے بری لگنے لگی تھی۔ مجھے اس سے خواہ مخواہ کی چڑھ چکی تھی۔ اس کی ہر حرکت، ہر ادا سے۔ میری دو بہنیں کنواری تھیں، ہمیں ان کی شادی کی بہت فکر رہتی تھی، لیکن پھر بھی وہ مجھے بوجھ نہیں لگتی تھیں، جتنی مجھے سولہ سال کی ماہا بوجھ لگنے لگی تھی۔ بیس سال کا ہونے سے پہلے اس کی شادی نہیں ہو سکتی تھی اور یہ چار چھ سال مجھے صدیوں جتنے لیے لگتے تھے۔

میں اب اسے اکثر ڈانٹ دیتی تھی اور وہ آگے سے ہنس دیتی تھی۔ ”آپ اتنا غصہ کیوں کرنے لگی ہیں بھابھی؟“

”تم کب بڑی ہوگی؟“

”آپ نے سنا نہیں کہ اولاد، ماں، باپ کے لیے کبھی بڑی نہیں ہوتی۔“

زیادہ وقت نہیں لگا اور جیسے سب کچھ ہی بدل گیا۔ وہ پہلے جیسی نہیں رہی اور میں بھی۔ ایک لمحے میں دل کا رشتہ، زبان کے رشتے میں بدل گیا۔ رشتوں کے سمندر میں اٹھنے والا جوار بھانا، محبت کی لمبوں سے ٹکرا کر تازہ دم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر رشتوں میں محبت ہی نہ رہے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ بس فاصلہ اور بے نام تعلق۔

جب تک وہ مجھ سے تعلق کو محبت سمجھتی رہی، کھلی کھلی اور تروتازہ رہی۔ جیسے ہی اس پر حقیقت کھلی۔ وہ مرجھا گئی اور اب اتنے سالوں بعد میں بھی۔

ساس، سر حیات نہیں تھے، ایک میرے شوہر، ایک شادی شدہ پردیس، لا تعلق سادہ پور اور ایک دس سال کی چلیائی گڑیا جیسی، وہ میری مند ماہ۔ وہ اپنی خوب صورت تھی کہ ہماری شادی میں، میرے میکے میں ہر زبان پر بس اس کی خوب صورتی کا ہی چرچا تھا۔ سب نے کہا کہ مجھے ملی پلائی بیٹی مل گئی ہے۔

شادی کے شروع کے دنوں میں تو وہ مجھے بیٹی ہی لگی تھی۔ لیکن جو کوکھ سے پیدا نہ ہوا ہو، وہ کوکھ والے جیسا بھی نہیں ہو سکتا۔ دو تین سال میں نے اس کے بہت تازہ خمرے اٹھائے۔ اسے بستر پر سلانا، دودھ کا گلاس دینا، اس کے بالوں کی چوٹیاں کرنا تو بالے بنانا کر اسے کھانا کھانا، اس کی اسکول ورن تک بھاگتے ہوئے اسے جوس کا گلاس ختم کرنے کے لیے کہنا۔ اسکول سے واپسی پر اسے اچھی طرح لچ کر دانا اور سلا دینا۔ شام کو اسے پڑھانے کے لیے بیٹھ جانا۔ رات کو سونے سے پہلے اس سے باتیں کرنا، بھی کمائی سنا دینا، کبھی کوئی اپنے چہن کی یاد۔



زار تھی۔

پھر ایک وقت آیا کہ مجھے اس کی سانسوں کی محک
اپنی سانس سے زیادہ عزیز ہوئی، لیکن پھر وہی
فاصلہ لاٹھلی۔

امریکہ سے اس کی خالہ آئی تھیں۔ آخری بار وہ
میری سانس کی وفات پر آئی تھیں۔ فلورن پر توبہات ہوتی
رہتی تھی، لیکن ملاقات اب ہو رہی تھی۔ وہ تھوڑی
تک مزاج تھیں۔ کچھ پیسہ ان کے پاس بہت زیادہ تھا۔
کہیں کوئی نقص تو نہیں نکالتی تھیں، لیکن نگاہیں
جلاوتی تھیں کہ انہیں کیا کیا پسند نہیں آ رہا۔ تاک ان
کی ضرورت سے زیادہ اونچی تھی۔ جیل نے ان کی آمد
کے لیے اچھے خاصے پیسے گھر کی آرائش پر خرچ کیے
تھے، لیکن پھر بھی انہیں گھر میں نقص ہی نظر آ رہے
تھے۔ مابا سے وہ پیار کرتی تھیں، لیکن اس کے لیے بھی
ان کا انداز تنقیدی ہی تھا۔ کڑی نظروں سے اس کا

جائزہ لیتی رہتی تھیں۔

ان دنوں مابا بالکل پیل مٹی تھی۔ وہ صبح جلدی اٹھتی
اور کچن میں چلی جاتی تھی۔ ناشنے کی تیاری میں میری
مدد کرتی۔ سارے گھر کی صفائی اپنے سامنے کرواتی۔
خالہ کے کپڑے استری کرتی، ان کے سر میں تیل
ڈالتی۔ ان کے ساتھ خریداری کے لیے جاتی۔ اب
بس وہ اور خالہ۔ آج کل اس کی کوئی سہیلی بھی گھر
نہیں آ رہی تھی۔ اس کا گھر بھی بہت اچھی حالت میں
رہنے لگا تھا۔ احمد اور فمد سے جو وہ اونچی اونچی آواز میں
باتیں کرتی تھی، چینچتی چلاتی اور بلند فیسے لگاتی تھی وہ
سلسلہ بھی مؤخر ہو چکا تھا۔ اب تو وہ اتنی دھیمی آواز
میں بات کرتی کہ اپنے لگتا تھا جیسے سرگوشی کر رہی ہو۔
بہت بالواب، باتیں بڑی دی اور کمپیوٹر جیسی خرافات سے
دور رہنے والی پیاری سی لڑکی بن گئی تھی۔

پتا نہیں کیوں مجھے مابا کا یہ ڈھونگ بہت برا لگا۔
چھٹی والے دن جس لڑکی کی صبح بارہ بجے سے پہلے
نہیں ہوتی تھی، اب وہ فجر کے وقت اٹھ کر نماز پڑھ کر
اپنی خالہ کو سلام کر کے ان کے لیے چائے بناتے جاتی

جو بات اس نے سن لی تھی، وہ میں نے سن کر بھی
نہیں سمجھی تھی۔ اسے یقین تھا کہ میں اس کی ملا
ہوں۔ اسے یقین تھا کہ میں جو اسے ڈانٹتی ہوں تو وہ
در اصل محبت میں ڈانٹتی ہوں۔ اسے یہ بھی یقین تھا
کہ میں جو آج کل اس کے بھائی کے سامنے اس کی
شکایتیں لگاتی ہوں تو وہ بھی ”ملا، پاپ اور اولاد“ کے
درمیان چلنے والا معمول کا چلن ہے۔ وہ اپنی فرینڈز سے
سنی ہوئی کہ کہیں ان کی ملا جان ان کے بلایا جانی سے
ان کی شکایتیں کرتی ہیں۔ کیسے وہ بظاہر غصے سے، لیکن
دل ہی دل پیار میں اپنی لاڈلی کے کان کھینچنے کے لیے
کہتی ہیں۔ اب مجھے یاد آتا ہے کہ جب جب میں اس
کی شکایت لگاتی تھی، تب تب وہ بہت خوش ہوتی
تھی۔ اس کے بھائی اسے ڈانٹ دیتے تھے تو بھی وہ
مسکراتی رہتی تھی۔

”مجھے ڈانٹ بڑا کر آپ نے ٹھیک نہیں کیا۔“ وہ
مصنوعی نکلے سے کہتی اور پھر بھی خفا نہیں ہوتی تھی۔
میری پیشانی پر پڑنے والے مل اور میری آواز کی
کٹ کا اثر نہیں لے رہی تھی یا اس میں آتی سمجھ ہی
نہیں تھی کہ وہ یہ سب جان سکتی۔

وہ خود کو میرے بیٹوں کی پھوپھو نہیں، آپنی کہتی
تھی۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا تھا۔ میرے میکے والے
بھی اس پر ناک بھوں چڑھاتے تھے کہ میں کیا ہر وقت
اپنی نند کا دم چھلا اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔ میں اسے
اپنے ساتھ نہیں رکھتی تھی، وہ خود میرے ساتھ رہتی
تھی۔ جس دن مجھے اسی کے گھر بندھی جانا ہوا تھا، مجھ
سے پہلے وہ اپنی تیاری مکمل کر چکی ہوئی تھی۔ اپنے
کپڑے، جوئے، بیگ میں پیک کر کے بیکری کا سلمان
بھی منگوا چکی ہوئی تھی۔ کراچی ماموں کے پاس جانا
ہوا تھا اور وہ اپنے بھائی کے ساتھ جاکر ٹیلر کو اپنے
کپڑے مجھ سے پہلے دے آئی تھی۔ میرے بہن،
بھائیوں کو وہ ماموں اور خالہ کہتی تھی۔ ان سے
فرمائشیں کرتی، لاڈ اٹھواتی تھی۔ وہ میری سانس کے
ساتھ سانس لے رہی تھی اور میں اس سے کتنی بے

نہی۔ پہلے تو مجھے دل ہی دل ہی آتی رہی، پھر میرا دل
چاہا کہ میں اس کے ڈرامے کا پردہ چاک کر دوں۔
میں نے خود کو باز نہ رکھا اور ایک دن بظاہر ہذا
میں، لیکن دراصل سنجیدگی سے خالہ کو اس کی عادتیں
مکناؤں میں نے یہ تک بتا دیا کہ یہ اتنی بڑی ہو گئی
ہے، لیکن آج بھی چھت پھلانگ کر اپنی سہیلی کے گھر
جاتی ہے۔ وہاں اس کے جوان بھائی ہیں، سو بار منع کیا
ہے، لیکن باز نہیں آتی۔

پتا نہیں خالہ پر کس بات نے زیادہ اثر کیا کہ وہ اگلے
ہی دن اسلام آباد اپنے دیور کے پاس چلی گئیں۔ چندہ
دن بعد وہیں سے اپنے بیٹے کے نکاح پر ہمیں مدعو
کر لیا۔

”چلنا ہے نکاح پر ملا؟“

اس نے ظفر سے اٹھا کر مجھ پر دکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ
وہ پہلے ہی سے اس نکاح کے بارے میں جان چکی تھی۔
وہ یہ بھی جان چکی تھی کہ میں اس کی خالہ کو کیا چھ کر
چکی ہوں۔

”نہیں بھابھی!“

”کیوں؟ اگر سمان تمہارا فرسٹ کزن ہے تم تو
شاید کافی کلوز بھی ہو اس سے۔ نیٹ پر چیٹ وٹ
میں کر رہی رہتیں اس سے۔“
”نہیں نہیں کرنی۔ پھر گھر کا خیال کون رکھے گا۔
آپ بھائی اور بچوں کے ساتھ چلی جائیں بھابھی!
میرے اگیزہ بزمیں مجھے تیاری کرنی ہے۔“

جمال بھی نکاح میں نہیں گئے، انہیں بھی ماما کی
طرح چپ سی لگی ہوئی تھی۔ پھر میں اکیلی کیوں جاتی۔
اس نکاح کے بعد جیسے گھر کی ہر چیز بدل گئی اور اتنی بدل
گئی کہ مجھے چڑوں سمیت خود سے بھی نفرت ہو گئی۔ سہا
بھر کے وقت اٹھتی۔ سب کے لیے ناشائستگی۔ پھر گھر
کی صفائی کرتی اور کچل چلی جاتی۔ دوسرے کے لیے آناؤہ
گوندھ کر جاتی تھی، روٹی اگر تازہ تھی۔ رات کا کھانا
ہی اس نے بنانا شروع کر دیا تھا۔ بچوں کو شوٹن دیتی۔
پلٹے میں دوبارہ مشین لگاتی اور سارے گھر کے کپڑے

دھوتی۔ دو مہمان آتے یا دس، وہ سب کے لیے اکیلی
کھانا بنانے لگی۔ گھر کو چکا کر رکھتی۔ پتا نہیں اس نے
کیسے اور کب یہ سب کرنا سکھ لیا تھا۔ کب اس نے
بھاری پردوں اور لمبی چھت کو دھونے کی ذمہ داری
اپنے ذمے لے لی تھی۔ اسے کیسے یہ احساس ہو گیا کہ
اس کی وارڈروپ میں کپڑوں کا ڈھیر بڑا ہے اور اب
اسے بازار جا کر فضول خریداری نہیں کرنی چاہیے۔
اسے میوزک سے نفرت ہے۔ وہ اونچی آواز میں ہنس
بول نہیں سکتی۔ وہ ان سب سے کب دور ہو گئی، میں
معلوم ہی نہیں کر سکی۔

اس نکاح کے بعد کوئی ایک بھی دن تو ایسا نہیں گزرا
تھا کہ جب وہ دن ٹوبے سو کر اٹھی ہو۔ کوئی ایک بھی
دن تو ایسا نہیں آیا تھا کہ وہ میرے میکے میرے ساتھ
آئی ہو، کوئی ایک ہی دن ایسا ہوتا جب اس کی
سہیلیاں گھر آئی ہوتیں، وہ چھت پھلانگ کر اپنی
سہیلی کے گھر گئی ہوتی۔ فون پر اس نے کھانا آرڈر کیا
ہوتا۔ گلا بھاڑ کر قہقہے لگائے ہوتے۔ فل والیوم میں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

حساب دل رہے دو



نبیلہ عزیز

قیمت - 400/- روپے

مکتبہ اے کاہنہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر:
32735021

37، اردو بازار، کراچی

میوزک لگا کر بچوں کے ساتھ مل کر اُدھم مچایا ہوتا۔ کوئی ایک بھی دن ایسا نہیں آیا کہ مجھے پرانی ماہا کی جھلک نئی ماہا میں دکھائی دی ہوئی۔ میری اماں اور ہمیش تک اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہونے لگی تھیں۔

”اللہ نے تمہاری کوئی دعا سن لی ہے موش! دیکھو، کیسا سکھ دیا ہے اس نے تمہیں۔“ اماں نے ایک دن کہا۔

کیسا دکھ دیا تھا میں نے اسے۔ اس نے لی اے کر لیا تو اپنی فرزند کے ذریعے اپنے بھائی کو پیغام بھجوایا کہ وہ مزید آگے نہیں بڑھنا چاہتی، اس لیے اس کی شادی کر دی جائے۔ جمال سے زیادہ میں حیران تھی۔

”تمہارے بھائی تمہارے ایم بی اے کا سوچ کر بیٹھے ہیں اور تم شادی کی بات کر رہی ہو۔“ یہی صحیح عمر ہوئی ہے شادی کی بھابھی نہیں پڑھ لیا جتنا بڑھتا تھا۔

”مقتنی یا نکاح کر دیتے ہیں۔ تم ایم بی اے کر لو۔“ ”نہیں۔ مجھے آگے نہیں پڑھنا۔“ اس نے نری سے کہا۔

وہ پہلی رات تھی جب اس کے رخصت ہونے کے خیال نے میرے دل کو ہلادیا تھا۔ ان تین سالوں میں اس نے میرے پیروں کے نیچے ہاتھ ہی نہیں رکھے تھے، باقی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ جمال نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ نہیں مانی۔

جمال کو اس کی شادی کر دینا پڑی۔ وہ گھر سے رخصت ہو گئی اور پھر وہ بارہ بھی واپس نہیں آئی۔ وہ شادی کے بعد کویت چلی گئی تھی۔ کویت جانے سے پہلے وہ ایک مہینہ اپنے سسرال میں رہی تھی۔ جاتے ہوئے ایر پورٹ پر ہم سے ملی اور بس۔ آج چھ سال ہو گئے ہیں۔ وہ لوٹ کر اس گھر میں ہمیش آئی۔ میری ساری خدمت گزاری، میرے احسان، میرا پیار وہ لوٹا گئی تھی۔ جتنا میں نے اس کے لیے کیا تھا، اس سے بڑھ کر وہ کر گئی تھی۔

ایک دن میں نے اس سے فون پر کہا۔ ”تم ارسلان سے محبت کرتی ہو، اس کا احساس مجھے بہت بعد میں ہوا تھا ماہا۔“

”آپ مجھ سے محبت نہیں کرتیں، اس کا احساس بھی مجھے بہت بعد میں ہوا تھا بھابھی!“

اس نے گہری سانس بھری اور فون بند کر دیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے گھر کے کونوں میں اس کی خاموشی گونجتی سنائی دیتی ہے۔ میں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھ نہیں پاتی۔ نظریں نہیں ملا سکتی۔

گھر میں بارہ ہزار ماہوار پر ایک ملازمہ آتی ہے جو سب کام کر جاتی ہے۔ جمال کی پروموشن ہو چکی ہے۔ گاڑی بھی آئی ہے اور گھر بھی بدل لیا ہے۔ میرے بیٹے سارا سارا ان اے سی چلا کر رکھتے ہیں۔ میری چھوٹی بیٹی دن بارہ بجے سے پہلے سو کر نہیں اٹھتی۔ کیا بھی کھانا پکاؤ اسے بس گھر کا کھانا پسند ہی نہیں آتا۔

اپنے فن اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ وہ اتنی مصروف رہتی ہے کہ اسے یہ تک دیکھنے کی فرصت نہیں ہوتی کہ اس کی ماں بیمار ہے اور مسلسل ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہے۔

اپنے میکے میں اکیلی ڈرائیور کے ساتھ جاتی ہوں۔ چھوٹی بہن کے بیٹے کی شادی میں بہت مشکلوں سے تینوں بچوں کو بارات پر تیار کروا کر لے کر گئی تھی۔ تینوں بچوں کو اپنی خالہ، ماموں وغیرہ میں کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے مجھے اپنے بچوں سے بہت سی شکایتیں ہیں، لیکن پھر بھی میں ان کے لیے کچھ برا نہیں سوچ سکتی۔ جس سے شکایتیں تھیں، چڑھتی، جو بری لگتی تھی اس کے ساتھ برا کر دیا، لیکن یہ جرات بیٹی کے لیے نہیں کر پاؤں گی۔ میں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھ نہیں پاتی۔ نظریں نہیں ملا سکتی۔



آسیہ رزاقی

سہرا حقیقہ ہے



Art
© 1999

”نہیں۔ میں نے ٹیک دیکھا ہے لندن کا بنا ہوا ہے۔“

”اچھا۔ پھر تو انگلش بولتا ہو گا۔“ لہجے میں مایوسی تھی۔

”بھئی۔ تم لوگوں کو پریشانی کیا ہے؟ جو تمہارے لیے آئے ہیں۔ تم پہنوں میں منع تو نہیں کر رہی۔“

”اصل میں ہم آپ کو ان سیکنڈ ہینڈ سوئٹروں میں دیکھ کر بور ہو گئے ہیں۔“

”خیر۔ ہیں تو یہ بھی انگریز۔ یا امریکی، یقیناً انگلش بولتے ہوں گے۔“ اما نے ناگاہک اڑائی۔

”تم اپنی خیر متاؤ۔ کل انگلش کاٹیسٹ ہے، جاؤ بیٹھ کر پڑھو۔“

”ابھی ابو آتے ہوں گے۔ دیکھنا کتنا خفا ہوں گے۔“ حمنہ اسے پکڑ کر لے گئی۔

”ابو کو۔ اور آنا کیا ہے ڈانٹنے کے سوا۔“ وہ چڑکر کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔

شادی کے چند سال تو بے حد خوش گوار گزرے۔

سرودی اس سال کچھ زیادہ ہی تھی۔ پارشوں نے ملک بھر میں ایک سرد لہر دوڑا دی تھی۔ ٹھکان بھی تھی۔ شہزاد کو کئی ماہ بے روزگاری کے بعد یہ دوسری نئی ملازمت ملی تھی۔ وہ کچھ شوق میں، کچھ اپنی کارگزاری دکھانے کی نیت سے آئس کو وقت بھی زیادہ دینے لگا تھا۔ شکر کرتا کہ زیادہ عرصہ غالی نہیں رہا۔ ورنہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ فضا کو نمردینے پر مجبور تھا۔ جس کی سادگی، کفایت شعاری اور سلیقے کی وجہ سے وہ کافی رقم پس انداز کر چکا تھا۔

گھر کا خرچ حسب معمول پرانے طریقے پر چلتا رہا۔ کسی کو خبر نہ ہوئی کہ وہ بے روزگار ہے۔ منج حسب معمول گھر سے نکلتا۔ نوکری کی تلاش میں کیا گیا نہ پاپڑ نیلے۔ بس یہ ضرور ہوا کہ اپنی پریشانی کو بد مزاجی میں تبدیل کر دیا۔ بچے حیران ہوتے کہ یہ ابو کو کیا ہو گیا ہے۔ انہیں ہر بات پر غصہ کیوں آنے لگا ہے۔ فضا نے یہاں بھی خاموشی مٹا پروائی اور بے غرضی کا مظاہرہ کیا۔ (شہزاد کی نظر میں بے حسی) نہ احتجاج نہ کوئی سوال، کبھی خود ہی شہزاد کو اس کی حالت پر شرس آ جاتا۔

سرودی میں اسے پرانی مثال میں پٹنا دیکھ کر وہ ایک نئی مثال لے آیا۔ وہ بھی اس نے اندر رکھ دی۔ کہیں آنے جانے میں پہننے کے لیے بڑی آیا لندن سے ایک سوئٹر لائیں۔ فضا بھلا اتنا نیا انگلش سوئٹر بیتی سوئٹر گھر میں پہنتی نہ جی نہ۔

”ہی! یہ لندن سے آیا ضرور ہے۔ ہے مگر چائنا کا۔ انگلش بولتا نہیں۔ اگر آپ کو چینی زبان آتی تو چیں چیں چال چال میں جواب ضرور دیتا۔“ یعنی کی

کوشش کہ مال پہن لے۔

میکل ٹاول

میکل ٹاول

میکل ٹاول

میکل ٹاول

میکل ٹاول

میکل ٹاول

میکل ٹاول

میکل ٹاول

میکل ٹاول



لگیں بولیں۔

”اے بے چھوٹے گھر کی ہے غریبی کی پٹی ہوئی۔ اسے ان نزاکتوں کی کیا تمیز۔ جو پسنائے گئے، بننے گی، جو کھلاؤ گئے، کھائے گی۔ اسی لیے تو اسے لے کر آئی ہوں کہ ہر حال میں خوش رہے گی۔“

”اما! مگر بھی تو کسی ضرورت کی فرمائش کرے۔ یا پیسے کم ہونے کا شکوہ۔ لگتا ہے روٹ ہے۔ بس کام۔ کام۔ میری غلط بات پر ہی ٹوک دے۔ مگر نہیں۔“

”مے نہیں ان چیزوں کا پتا۔ کبھی ماں سے فرمائش کی ہو تو جانے۔ بھی بیٹی کی پالی ہوئی لڑکیاں ایسی ہی بے زبان ہوتی ہیں۔ اب تم کہہ کہہ کر زیادہ سر پر نہ چڑھانا۔ ورنہ بڑی بھادوں کا جو حال ہے۔“

جب ہو گئیں۔ وہ منتظر رہا کہ اماں آگے کچھ بتائیں۔ کیا حال، کیا حال، مگر وہ پان بنانے میں لگ گئیں۔ یوں تو دونوں بھابھیوں کا سلوک بہت اچھا تھا۔ خصوصاً ”شنزاد اور فضا پر وہ دونوں مہربان تھیں۔ اماں کا بھی خیال رکھتی تھیں۔ پھر۔ اور بھی الجھ گیا۔

بھابھی سے فضا کی شکایت کی۔ انہوں نے کہا۔ ”وہ فرشتے سے شنزاد! بہت سمجھ دار اور معاملہ فہم ہے۔ قدر کرو اس کی۔ بڑی اچھی تربیت کی ہے اس کی آئی نے۔“

منجھلی بھابھی نے بھی ماں میں ہاں ملائی۔ ”یہ تو اس کی اعلا ظریفی ہے کہ کچھ مانگتی نہیں۔ مگر ہمیں اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا چاہیے۔ وہ تمہاری ہر بات پر عمل کرتی ہے، تو تمہارا بھی فرض ہے بغیر کے ضرورت کی اشیاء میا کرو۔“

ضرورت کی اشیاء۔ اسے کیا پتا، اسے کس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ تو اخراجات کے لیے جو رقم اسے دیتا تھا۔ اسی میں وہ نہ جانے کیسے اپنے اور بچیوں کے کپڑے بھی بتا لیتی تھی۔ شاید اس کے پاس جادو کی چھڑی تھی۔ جو ہر چیز مہیا کر سکتی تھی۔ اب وہ خود بھی کبھی کبھی بچیوں کے لیے کچھ لے آتا۔ فضا کے لیے

سب ساتھ رہتے تھے۔ فضا کی سادگی، انکساری، ادب و احترام، فرماں برداری۔ سب اس سے خوش تھے۔ ہنس کھ اور خوش مزاج تھی۔ بڑی کیا کوہ بہت اچھی لگتی تھی۔ بڑی بھابھی تو دوستوں کی طرح مشورے، بہنوں کی طرح نصیحتیں بھی کرتی تھیں۔ پھر۔ بچے بڑے ہو گئے۔ گھر میں جگہ کی تنگی ہو گئی۔ منجھلی بھائی تو خیر فوج میں تھے۔ آئے دن شہر دلتے۔ بھائی جان کے چار بچے۔ اماں بھی تھیں۔ نندیں سب شادی شدہ تھیں۔ لیکن سیکنہ سب سے چھوٹی، بد مزاج، اکثر سسرال سے لڑ کر میکے آجاتی۔ شنزاد نے ایک چھوٹا مناسب مکان کرائے پر لے لیا۔ دو بیٹیاں حسنہ، عینتی تھیں۔ دوسرے گھر جا کر آئے وال کا بھاء معلوم ہو گیا۔ کرایہ، بل، چھوٹی بچیوں کی ضروریات، اخراجات، سب ساتھ تھے۔ وہ تو ایک محدود رقم دے کر فراغ ہو جاتا تھا۔ اسے علم نہ تھا، بجلی کا بل کتنا ہے، فون کیس کا کتنا، کھانے پینے پر کتنا خرچ ہوتا ہے۔ بھائی جان نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ وہ سربراہ تھے۔ بھابھی ذمہ دار۔

الگ گھر میں اسے ہوش رہا منگانی کا انداز ہوا۔ افس۔ اس منگانی نے زندگی کی کتنی خوشیوں سے محروم کر دیا تھا۔ اخراجات کے سلسلے میں وہ اکثر فضا سے الجھتا۔ فضا خاموشی سے سن لیتی۔ پھر شنزاد کی عادت بن گئی الجھنا۔ نکتہ چینی، اعتراض فضا کو ہر خرابی کا ذمہ دار ٹھہراتا۔ وہ کیا کرتی۔ بولنا، جواب دینا، آتا نہ

تھا۔ اگر بولتی تو یقین تھا کہ جھگڑا بڑھ جائے گا۔ اس کی یہ عادت بھی شنزاد کو بری لگتی۔ کم آمیزی، تابعداری سے جھنجھلا جاتا۔ وہ کبھی کہیں جانے کی یا کسی چیز کی فرمائش نہ کرتی۔ کبھی شکوہ کیا نہ خواہش کا اظہار۔ شنزاد کے نامناسب اور غلط اعتراض بھی بلا عذر برداشت کر لیتی۔ وہ چڑھتا۔ کیسی عورت ہے، بے منہ، بے زبان، کبھی اپنی ضرورت ہی کی کسی چیز کا اظہار کر دے۔ بچیوں کے لیے ہی کچھ مانگ لے۔ خود ہی نیٹ لیتی ہے۔ شنزاد نے اماں سے شکایت کی تو وہ ہنسنے

کہ اللہ خدا۔ شکر ہے۔

شام کو ہی آفس سے فراغت ہوئی۔ دوڑا ہوا اسپتال پہنچا۔ کچھ دیر پہلے ای کے فون نے بیٹے کی آمد کی خوش خبری نے رگوں میں طاقت کا انجکشن لگا دیا تھا جیسے امی وہاں مٹھائی تقسیم کر رہی تھیں اسے تو یہ بھی خیال نہ آیا۔ فراز سمنہ، یعنی کو لے آیا تھا۔ جو چھوٹے سے سنے بھیا کو اگلیوں سے چھو کر محسوس کر رہی تھیں کہ وہ کچھ کچھ کا ہے۔ گڑیا نہیں ہے۔

پتا چلا کہ کسی بچہ کی کی وجہ سے آپریشن ناگزیر تھا۔ فضا کے چہرے پر زردی تھی۔ نقابست۔ ناٹوئی۔ وہاں موجود لیڈی ڈاکٹر نے بتایا۔

”بے حد کمزوری۔ خون کی کمی تھی۔ نارمل پیدا ہونے کا خطرہ نہ لیا جاسکتا تھا۔ اس لیے آپریشن ضروری تھا۔“

اس کا وہ گلاب کی ہینکڑی جیسا رنگ نہ جانے کیسے سروس کے پھول میں بدل گیا تھا۔ شہزاد کو لگا۔ فضا نے اسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لی ہیں۔ اسے دھکا سالگا۔ ایسا کیوں؟

ڈاکٹر سے اس نے کہا تو اس نے بتایا۔ ابھی وہ اس کی وجہ سے غفلت میں ہیں۔ آنکھ کھولتی ہیں، مگر پہچانتی نہیں۔ اس لیے آپ کو ایسا لگا۔ ایک گھنٹے تک ہوش آئے گا۔ ان کی غذا کا خاص خیال رکھنا ہے۔ احتیاط ضروری ہے۔ بے وجہ وزن اٹھانا یا طاقت سے زیادہ کام کرنا اچھا نہیں ہے۔

کالی ہدایتیں دے کر وہ چلی گئی۔

وہ باہر نکل آیا۔ جہاں بڑی آیا اور ماندہ آئی ہوئی تھیں۔ مبارک باد دے کر چلی گئیں۔ فراز بچپن کو لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ امی نے بتایا تھا وہ رات کو گھر چلی جائیں گی۔ اسپتال میں نرس کا انتظام ہے۔ بچیوں کی وجہ سے ان کا گھر پر رہنا ضروری تھا۔

شہزاد پریشان ہو گیا۔ پتا نہیں کتنے دن اسپتال رہنا پڑے گا۔ نارمل ہوتا تو اگلے دن گھر آجاتی۔ شہزاد بھائی حان کی طرف چلا گیا۔ بھابھی اسی وقت کہیں سے آئی

تھیں۔ پوچھنے لگیں۔ آپریشن کا سن کر اخراجات کے بارے میں پوچھا۔ اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ بھابھی چونک گئیں۔

”کیوں۔ تمہیں کیوں خبر نہیں۔ ساس سے پوچھا ہوتا۔ آپریشن کی فیس ہی بت ہوئی ہے۔ پھر اور بھی اخراجات۔ آئی کی کھل کھینچ لیتے ہیں اسپتال والے۔ آخر تمہیں پتا تو ہے تو معلوم تو کرتے۔“

”مجھے کیوں۔ فضا کی امی نے بلایا تھا، وہی سب کریں گی۔ میکے میں بچہ ہو تو ان ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہی قاعدہ ہے۔“ امی کا جملہ دہرا دیا۔

”یہ کس دنیا کا قاعدہ ہے؟ ہمارے تو چاروں بچے میکے میں ہوئے۔ امی تو صاف انکار کر دیتی تھیں۔

چاروں دفعہ تمہارے بھائی نے اخراجات اٹھائے۔ واہ شہزاد! اولاد آپ کی۔ ذمہ داری دوسروں پر۔ کیوں

بھی۔ اور جبکہ ان لوگوں کی پوزیشن بھی نہیں آپریشن کی فیس دینے کی۔ تمہیں معلوم تو ہے۔ فراز کو ابھی چار ماہ ہوئے ہیں جاب ملے ہوئے۔ بہت غلط

بات ہے۔ ابھی جاؤ اور معلوم کر کے رقم جمع کرواؤ۔ پہلے تو فضا کی بہن نوکری کر کے گھر سنبھالے ہوئے تھی۔ اس نے ماں کو گھر بٹھا دیا تھا، یہ کہہ کر آپ نے

بہت دن کام کر لیا۔ اب مجھے اپنی تعلیم کو کام میں لانا ہے۔ اسی نے بھائی کو پڑھایا۔ فضا کی شادی کی۔ اب تو

اس کی بھی شادی ہوئی۔ باپ کی پشیم پر ہی نر بھر تھی۔ فراز تو اب جا کے۔ اور تم نے اسے وہاں بھیجا

کیوں۔ یہاں لے آتے۔ آئی کو بھی میں بلاتی تانکہ بیٹی کا خیال رکھیں۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ اتنے

خود غرض تو نہیں تھے تم۔“

بھابھی دیر تک اسے شرمندہ کرتی رہیں۔ ”ابھی جاؤ یا صبح“ رقم مجھ سے لے لو، ان کو پریشانی نہ ہو۔ بے

چاری فضا کتنی پریشان ہوگی۔ تمہیں ذرا احساس نہیں؟ افسوس۔“

”رقم تو ہے، پوچھ کہہ۔ میں اسپتال سے گھر لے جاؤں گا۔ آپ چھوڑیں۔“ اوٹ پٹانگ جملے۔ بوکھلا

گیا تھا ان کے تابدوڑ حملوں سے۔

”وہ تو اجازت نہیں دے رہی تھیں۔ میں خود ہی اپنی ذمہ داری پر اُٹھی۔ کمرہ مل گیا تھا۔ تو رات کو امی اور بچیاں رہ گئیں۔ لیکن بہت زیادہ منگوا کر کھا۔ میں نے سوچا۔ امی پر اور زیادہ بار نہ ہو۔“

”یہ سہم کر کیا رہی ہو۔ حالت دیکھو اپنی، چلو لیو امی۔ امی کہاں ہیں؟“

”امی۔ اپنے گھر چلی گئیں۔ میں فراز کے ساتھ ادھر آئی۔“

”تم۔ تم۔ کچھ احتیاط بھی تو۔ ارے گر جاؤ گی، چلو لیو۔“

”نہیں۔ چلے، پھر نے کی تو اجازت ہے۔ بس ذرا احتیاط۔“

”تم۔ تم کو احتیاط۔ یہ سب کام تو۔ میں کر لوں گا۔ امی کیوں نہیں آئیں؟“

”میں نے ہی کہا آپ چلی جائیں۔ تھک گئی تھیں۔ وہ راتوں سے مسلسل جاگ کر۔“

”اور وہ اسپتال کے بل دیو۔ میں تو ابھی جا کر ادا کرنے والا تھا۔“

”وہ تو۔ آپریشن سے پہلے ہی جمع کرادیے تھے امی نے۔ ہو گیا تھا انتظام۔“

”انتظام۔ کس۔ یعنی کیسے۔ میں خود جا کر دیتا۔“ شرمندگی ہوئی۔

وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ”آپ نے ہی تو کہا تھا۔ میکے والے بناتے ہیں تو خود ہی۔ امی نے پھر کچھ۔ خون کی کمی۔ تھابت۔ اور آتے ہی مصروف۔“

”ارے مذاق کر رہا تھا میں۔ آپریشن کا تو علم ہی نہ تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ آپریشن کے بعد کئی دن رونا پڑتا ہے۔ آخر آفت کیا تھی۔ اتنی جلدی آنے کی۔“

فصیحہ پر نکان کا غلبہ تھا۔ بے بسی سے بچپوں کو دیکھ رہی تھی۔

”امی ان کی دیکھ بھال، گھر کے کام، کھانا ناشنا، بنانا۔“

بچپوں کے لیے وہ نئی جگہ تھی۔ دروازہ کھلتے ہی باہر نکل جاتی تھیں۔ انہیں پکڑ کر لانا، بھلانا، پھر اسپتال جاتے

”گھر؟ کیوں مارنا چاہتے ہو اسے۔ اتنی جان ہے اس میں کہ تمہارا گھر سنبھالے۔ بھی میں یہاں لے آؤں گی۔ پہلے ہی ہلدی کی گانٹھ ہو رہی تھی۔ آپریشن نے اور بھی حشر کر دیا ہو گا۔“

شہزاد کو اس کی شکل یاد آئی۔ آنکھوں کا رنگ یاد آیا۔ بے رونق، مایوسی کا رنگ، مٹاؤں کے کمرے میں گیا تو وہ کسی اور ہی خیال میں تھیں۔

”ارے عورتوں کی چالاکیاں تم کیا جانو۔ دیے ہی۔ بس۔ کیسا آپریشن۔ دو پہلے تو ٹھیک ہو گئیں۔ اب کیا نرالا ہو گیا۔“

”سہانہ کر دیا ہو گا آپریشن۔ کل لوجی پیٹھے بٹھائے پیسے پھٹنے کے بہانے جھوٹ بالکل۔“

وہ اکتا کر گھر آ گیا۔ اب تو رات ہو گئی۔ کل جا کر جمع کرادوں گا۔ تصدیق بھی ہو جائے گی۔ (امی کے شبہ کی) خالی گھر کانٹے کو دوڑ رہا تھا۔ فریق سے سالن نکل کر گرم کرنے لگا۔ فصیحہ کئی سالن پکا کر فریز کر رہی تھی۔

دو ذرات کو تو سسرال میں کھاتا تھا۔ دن کو آٹس میں کچھ کھا لیتا تھا۔ سارے سالن جوں کے توں رکھے تھے۔ ڈبل مدلی کے سلائس سینک لیے فصیحہ کے ہاتھ میں لذت تھی۔ شاید اس کی نیت اچھی تھی۔ وہ خود بھی۔ اتنی اچھی ہے پتا نہیں، امی کیوں ناراض رہتی ہیں۔

رات نیند کم آئی۔ صبح آفس سے بھی دیر ہو گئی۔ سوچا چلو شام کو جا کر پے مٹ کر دوں گا۔ ابھی تو کئی دن رونا ہے اسپتال میں۔ آفس سے نکلا تو گھر چلا گیا۔

ماکہ ذرا آتھن انار کر پھر اسپتال جائے۔ ابھی جی بھر کر بیٹے کو دکھا ہی نہیں تھا۔ گھر میں۔ حیرانیاں منتظر۔

فصیحہ بچوں سمیت موجود۔

”ہائیں۔ یہ۔ کیا۔ کیسے آگئیں؟“ ابھی ڈاکٹر

نے اجازت بھی کیسے دی۔ یعنی کسے فصیحہ کمرے میں

گھری ہوئی چیزیں اٹھا رہی تھی۔ پیر لڑکھارے تھے۔

بھی دیوار کا سہارا لیتی۔ کبھی الماری کا پٹ پکڑتی۔

ہوئے بچوں کو پڑوس میں چھوڑا۔ فراز کو فون کیا تو وہ گھر آیا بچوں کی وجہ سے۔ کب تک آفس کی چھٹی کرتا۔

ای کو گھر جا کر کھانا پکا کر اسپتال بھی لانا ہوتا تھا۔ ابھی تو دوسرا دن تھا۔ وہ کب تک ڈیوٹی دیتیں۔ آپریشن کے بعد اطمینان ہونے تک تو وہ وہاں سے ہٹ ہی نہیں۔ پھر فراز اطمینان ہوا تو فراز کو فون کر کے مصلحتی منگائی، شہزاد تو شام کو ہی آیا۔ ان کے مذاق۔ اگر وہ مذاق تھا، کتنی اذیت پہنچائی اسے، مذاق کا لہجہ ایسا ہوتا ہے؟ کروا کیسا۔ وہ تھک کر لیٹ گئی۔ آتے ہی تو چیزیں سینٹی بڑی تھیں۔ ایک کمرہ صاف کر کے اس کمرے میں آئی تھی۔ شہزاد آفس جاتے ہوئے کچھ ڈا پھیلا گیا تھا۔ ابھی چند سائینس لی تھیں کہ چھوٹے نے ہاتھ پیر بار کر بد مزگی کا اظہار کیا۔

شہزاد نے جلدی سے کہا۔ ”اوہ۔۔۔ لیٹی رہو۔ میں دیکھتا ہوں۔“ بہت فکر کر رہا تھا۔ بچے نے بستر کیلا کر دیا تھا۔ شہزاد سے بھلا کیا ہوتا۔ فضا کو ہی اٹھاندا۔

”تم ابھی آرام کرو۔ میں حمیٰ یعنی کو دودھ، بسکٹ کھلا دوں گا۔ بلکہ ابھی انہیں ساتھ لے جاتا ہوں۔ بیکری سے کچھ چیزیں لے آؤں۔ لوگ بھی آئیں گے مبارک باد کے لیے۔ یہ تمہیں تنگ کریں گی۔ تم چائے پیو گی، میں بناتے جا رہا ہوں۔“

”آپ بیکری سے ہو آئیں۔ میں بنالوں گی چائے۔“

”نہیں۔ بالکل نہیں۔ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ دونوں تمہیں تنگ نہ کریں اس لیے لے جاتا ہوں۔“

”صبح سے تو تنگ نہیں کیا، میں کام کرتی رہی۔ یہ حمیٰ مدد بھی کرتی رہی۔“

”صبح سے؟ تم گھر کب آئی تھیں۔“ وہ حیران ہوا۔

”بھیا رہ بجے آئی تھی۔ فراز یہاں چھوڑ گیا۔ اسی اپنے گھر لے جانا چاہتی تھیں۔ میں نے کہا۔ وہاں یہ

بست اودھم مچاتی ہیں۔ آپ گھر جا کر آرام کریں۔“

”اوہ۔۔۔ تو۔۔۔ تم نے کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔“

”نہیں۔ میں نے فریزر سے نکال کر کھالیا تھا۔“

فراز کی، بسکٹ، ڈبل روٹی، انڈے بھی لے آیا تھا۔

”اسپتال میں ہی امی نے ہم تینوں کو ناشتا بھی کرا دیا تھا۔ میں نے آتے ہی پہلے کچن سمیٹا۔ انڈا ابال کر کھایا۔ سالن گرم کر کے سلاکس کے ساتھ کھالیا۔“

”افوہ، کیا غضب کیا۔ باسی سالن؟ کوئی نقصان نہ پہنچے۔“ فکر مندی سے بے حال تھا۔

فسخہ خوش تھی۔ بیٹے نے شہزاد کو بدل دیا تھا۔

بچوں کی دفعہ تو بھابھی جان نے ہی اس کی دیکھ بھال کی تھی۔ شہزاد کو کچھ کرنا ہی نہیں پڑا تھا۔ مگر اب۔۔۔ بہت خیال کر رہا تھا۔ وہ اندر تک سیراب ہو گئی۔ کاش۔۔۔ یہ تبدیلی عارضی نہ ہو۔

☆ ☆ ☆

وہ بیکری سے آیا۔ تو گھر میں آوازیں تھیں۔ بھابھی جان آئی ہوئی تھیں۔ حسب توقع فضا کو ڈانٹ رہی تھیں۔

”کیلے گھر میں کیا سوچ کر آگئیں۔ کوئی فرشتہ تمہیں پکا کر کھلائے گا۔ ارے۔۔۔ نارمل ڈیوٹی میں بھی کچھ دن آرام کروایا جاتا ہے۔ تم نے تو خود کو ہر کوئیس سمجھ لیا۔ گھر داری کرنے کے لائق تم ہو نہیں۔ آخر کیا آفت تھی وہاں سے بھاگنے کی۔ کیسے سنبھالو گی سب۔“

”بھابھی۔ میں۔۔۔ کچھ کر رہی لوں گی۔ تھوڑا بہت۔“ وہ منہ ماری تھی۔

”ہاں۔۔۔ کچھ نہ کچھ۔ یعنی اپنے اور بچوں کے ساتھ دشمنی۔ بلکہ تنھے بچے پر ظلم۔ پتا ہے آپریشن سے ہونے والا لہجہ بہت نازک ہوتا ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں تو اس ڈاکٹر کی خبر دیتی رہی۔“

لوں کی جا کر۔ کیسے اس حالت میں ڈسپانر کیا۔
 ”وہ تو منع کر رہی تھی۔ میں نے مجبوری بتائی تو۔۔۔
 پھر۔۔۔ وہ چپ ہو گئی۔“

”کیسی مجبوری؟ خیر کچھ بھی بتایا ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ کمرے کا خرچ بچانے کے لیے خطرہ مول لیا تھا۔ مگر میں تمہیں یہاں چولہا جھونکنے کے لیے اکلی نہیں چھوڑوں گی۔ تم چھوٹے کی چیزیں بیگ میں رکھو۔ میں بچیوں کے کپڑے وغیرہ رکھتی ہوں۔“

انہیں وہیں چھوڑ کر وہ پن میں آیا۔ افسوسہ کس طرح چھوڑ کر گیا تھا اور اب۔۔۔ صاف ستھرا برتن دھلے خدا یا، وہ اس حال میں بھی یہ سب کرتی رہی۔ چیزیں جو وہ لایا تھا۔ ڈبوں اور جار میں رکھیں۔ مٹھائی فریق میں۔ پھر اگر دیکھا۔ بھابھی، بچیوں کے کمرے میں ان کے کپڑوں اور سامان کے ڈھیر کے بیچ میں بیٹھی تھیں۔ شیزاد کو سلام کا جواب دے کر بولیں۔

”لو دیکھو میں نے کہا، حمنہ! میں تم دونوں کے کپڑے رکھ رہی ہوں۔ دونوں نے لا کر سارے کھلونے، جوتے، سینڈل، گڑیاں جمع کر دیں اور ضد یہ کہ سب ضروری چیزیں ہیں۔ اب کیا چھوڑوں، کیا رکھوں؟ ہاں، بتانا بھول گئی، میں تمہاری بیوی، بچوں کو اغوا کر کے لے جا رہی ہوں اپنے ساتھ، تم تو اس کا شہر کرو گے۔ میں تو گئی اسپتال، خیریت کے لیے یہ غائب، افوہ جلد بازی، اگر اب کوئی بے احتیاطی یا غلطی ہو گئی، تو تم ذمہ دار ہو گے اس کی صحت کی خرابی کے، ملا بتاؤ، خرچ بچانے کے لیے صحت اور زندگی داؤ پر اوی۔“

”میں تو خود حیران تھا۔ جب یہاں آیا تو یہ موجود رہا تھا، ابھی جا کر بے منت کر دیں گا۔“

”تم نے کل۔۔۔ میں کہہ رہی تھی مجھ سے لے لو۔۔۔ آپریشن کا خرچ ہی پچاس ہزار سے کیا کم ہو گا۔ اسپتال کے چار جنس۔ وہ آٹنی بے چاری نے کس حادوانی کی ہوئی شیزاد! بہت زیادتی کی تم نے۔ مجھے ہنسنگی ہو رہی ہے۔ اسی لیے فضا نے خطرہ مول

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

500/-	آمدنی	بامداد
1000/-	راحت جبین	درہم
500/-	رخسانہ رحمان	دعائی اکدمشی
200/-	رخسانہ رحمان	خوشبو کا کوئی کر نہیں
500/-	شادی چھری	شہر دل کے دروازے
250/-	شادی چھری	تیرے نام کی شہرت
450/-	آسہ مرزا	دل ایک شہر جوں
500/-	قادرہ افکار	آنکھوں کا شہر
600/-	قادرہ افکار	ہول بھلاں تیری بکلیاں
250/-	قادرہ افکار	پھلاں دس دنگ کالے
300/-	قادرہ افکار	یہ گلیاں یہ چارے
200/-	فرخ العزیز	صحن سے عورت
350/-	آسہ رانا	دل آئے دھڑلایا
200/-	آسہ رانا	تھرنا چائیں خواب
250/-	فوزیہ یاسمین	دھم کو خدھی سمیٹا لے
200/-	شازی سید	لادوں کا چاند
500/-	انصاف آفریدی	رنگ خوشبو ہوا ہوا
500/-	رضیہ جمیل	درد کے قاسمے
200/-	رضیہ جمیل	آج صبح پرچا نہیں
200/-	رضیہ جمیل	دو کی جنونی
300/-	نجم عرقینی	میرے دل میرے سارے
225/-	سمونہ غلامی	تیری منادہ منوں گی
400/-	انیم سلطانہ	شام آرزو

”تو کیا ضرورت تھی اتنے مہنگے اسپتال جانے کی۔“ وہ یکدم بے مروتی سے بولا۔

”اچھا۔! بجائے شکر ادا کرنے کے، یہ بھی شکوہ باقی ہے۔ بروقت اسپتال پہنچنا اور آپریشن کے مراحل سے گزرتا، معمولی بات ہے؟ یہاں ہوتی، تم تو آٹس میں تھے۔ اللہ نہ کرے جنازہ اٹھاتے تو شاید خوش ہوتے۔ احسان مانو فضلہ کی امی کا۔ مگر نہیں، فضول ایک ناشکر گزار سے بات کر کے کھو رہی ہوں۔ یاد رکھو! جو مرد بیوی کی عزت نہیں کرتا، وہ اس کی محبت سے محروم ہو جاتا ہے۔ بیوی اگر وفا شعار ہے تو کھر شوہر کے لیے ایک مشین بن جاتی ہے۔ اس میں کوئی جذبہ باقی نہیں رہتا۔ بے جان، بے روح، پر نہ لگتا ہے، تمہاری زبان کے تیرے فضلہ کا دل بھی چیرتے ہوں گے جب ہی اس بھی نہ کوئی لگن رہی، نہ شوق۔ میں حیران تھی کہ اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ سوکھ کر کھو کھلی تری بن گئی ہے۔ اب اندازہ ہوا، یہ تم ہو جو دن رات اسے افسوس تمہارا گھر چمکاتی ہے، بچے پالتی ہے، تمہاری اطاعت گزار ہے۔ اپنا سکہ چین لٹا کر اسے کیا ملتا ہے؟ تمہارے اعتراض۔ واہ، کیا مروا گئی ہے، کیا واقعی شنزاد، تمہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کی خدمت، قربانی، ایثار، اس حالت میں بھی اگر گھر کی حالت درست کی۔ عورتوں کے خرمے نہ دیکھے ہی نہیں۔ سیکنہ سے ہی سیکھ لیتے۔ وہ مہینے پلنگ سے نیچے نہیں اترتی، ہر دفعہ بچے کی بار۔“

شنزاد شرمندہ سر سمجھانے لگا۔ ”اوہ۔۔۔ آپ کے خیال میں میں ظالم مرد ہوں؟“

”ظالم شوہر، قاتل، اربانوں کا، شوق کا قتل بھی گناہ سے کم نہیں۔ تاہم تم اتنے بے حس کیوں ہو؟“

وہ جھینپ گیا۔ ”چھوڑیں، بس میں تو فضول۔۔۔ اچھا چلیں، میں چائے کا پانی رکھ کر آیا تھا۔ چائے لاتا ہوں، وہیں فضلہ کے پاس چلیں۔“

گھبرا کر بچن کی پناہ میں آگیا۔ چائے بنا کر ٹرالی میں رکھی۔ سیب کا جوس نکالا۔ بیکری کی تمام چیزیں ہلٹھوں میں رکھ کر ٹرالی سجا کر لایا۔ فضلہ آنکھیں بند

کے لیٹی تھی۔ زرد رنگ، پیٹری زہ ہونٹ، سوکھا ہوا چہرہ، کیا یہ وہی فضلہ ہے جسے گھونکھٹ میں دیکھتے ہی وہ سو جان سے عاشق ہو گیا تھا۔ کیا وہ اس کے تیز تند جلوں سے گھائل ہوئی ہے؟ کیا وہ جذلوں سے خالی ہو گئی ہے۔ بے جان، بے روح پرزے کی مانند، نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے، میں اس کے جذبات زندہ کروں گا۔“

بھابھی بولتی ہوئی آئیں۔ ”لو بھی۔۔۔ بچیوں کا سامان تو رکھ دیا میں نے۔ ارے تم تو اسی طرح پڑی ہوئی ہو۔ اچھا خیر ہو جائے گا سب۔“

شنزاد نے سیب کے جوس کا گلاس فضلہ کی طرف بڑھایا۔

”تم۔۔۔ یہ بی لو۔ پھر چائے کے ساتھ ایک لے لیتا۔ ابھی تازہ نکال کر لایا ہوں۔“

”واہ شنزاد! تم تو بڑے سلیقہ مند ہو گئے ہو۔ چائے اور ساتھ میں اتنا کچھ۔ فضلہ! تم جو بس بی لو۔ تمہیں طاقت کی ضرورت ہے۔ لگتا ہے شنزاد کو میرے لیکچر کی اکثر ضرورت پڑے گی۔ کیوں؟“ وہ شریر نظروں سے شنزاد کو دیکھ کر چائے پینے لگیں۔

شنزاد جھینپ گیا۔ ”سوری بھابھی! میں فضلہ سے بھی معافی مانگ لیتا ہوں۔ اسے میرا اعتراض برا لگتا ہے تو۔۔۔“

فضلہ گھبرا کر اٹھی۔ شنزاد کے ہاتھ سے گلاس پکڑ لیا۔ ”نہیں، نہیں، آ۔۔۔ آپ کیوں۔ مجھے معافی مانگنی چاہیے۔ اتنے دن آپ کو تکلیف ہوئی۔“

”کوئی ضرورت نہیں معافی مانگنے کی۔“ بھابھی ڈپٹ کر بولیں۔ ”جتنی تکلیف تم نے برداشت کی، اس کا کسی سے مقابلہ نہیں، چلو یہ ایک بھی کھالو اور بیٹھو بھی۔“

”بھابھی، وہ پرہیز۔“ فضلہ منمنائی۔

”مجھے معلوم ہے کس چیز کا پرہیز ہوتا ہے، کھاؤ تم۔“

بھابھی کو چھوڑ کر وہ بچیوں کے کمرے میں آیا، جہاں حسنہ سو رہی تھی۔

”بوجی بادی ای نے یعنی کا بھالو تو رکھ لیا۔ میرا ایل
 فینٹ نہیں رکھا۔“ نہیں بھلا کر پھر کمرے میں آیا۔
 ”بھابھی! آپ اہل کو بھی لے آئیں۔ اصل خوشی
 تو ان کو ہونی ہوگی۔“

”تم جیسے جانتے نہیں اہل کو۔ وہ کب کسی کی خوشی
 میں شریک ہوتی ہیں نہ خود خوش ہوتی ہیں۔ نہ
 دوسرے کی خوشی انہیں برداشت ہوتی ہے۔ میری
 خالہ ہیں۔ میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ میں
 نے کہا تھا چلیں۔ پوتے کو دیکھ آئیں تو بولیں۔
 ”تو۔ کوئی ان کو کھا پاتا ہے میں کیا ترسی ہوئی ہوں پوتوں
 کی۔ اللہ رکھے پہلے بھی تین پوتے ہیں۔ ایسا خاص
 کارنامہ تو بی بی فضا نے کیا نہیں کہ دو فی ہلائی جاؤں
 اپجیل گھر آئے کی توجہ جانا ہو گا شہزاد کے گھر۔ دیکھ
 لوں گی میں بھی۔“ پھر میں نے کہا۔ ”اہل آریشن سے
 ہوا ہے۔ اللہ کی مولیٰ کہ صبح وقت پر اپجیل چلی گئی
 تھی ورنہ خاصا مسئلہ ہوتا۔“ تو کہا۔ ”ہزاروں بچے
 آریشن سے ہوتے ہیں۔ اب سب کو دیکھنے تو جانے
 سے رہی۔“

شہزاد کے لیے صبح کا دن شرمندگی کا دن تھا۔ پہلے
 بھابھی نے شرمندہ کیا اب اہل کے جواب نے
 فضا کے چہرے پر مزید زردی بکھری۔ بھابھی سب
 کو لے کر اپنے گھر آئیں۔ چھوٹا بچہ تو کھلونا ہوتا ہے
 بھابھی کی بیٹیوں کے لیے تو خصوصی تحفہ تھا۔ ایک
 کے بعد ایک گود میں لٹی رہیں۔ ملازمہ بھی کیوں پیچھے
 رہتی۔ بھابھی نے بڑی بیٹی سے کہا۔
 ”جائو۔ دادی کو بتا دو۔ ہم نے کو اپنے گھر لے
 آئے ہیں۔“

بچی نے کہا۔ ”آپ کا فون آیا تھا میں نے تب ہی
 جا کر بتا دیا تھا کہ امی نے کو لے کر آری ہیں۔ تو انہوں
 نے فوراً ”مامہ پھوپھو کے گھر بروگرام بنالیا۔ سیکند
 پھوپھی ساتھ چلی گئیں۔“

”اہل کی پھرتیاں دیکھتے جاؤ۔ کیا کہا تھا میں نے نہ۔
 خود خوش ہوتی ہیں نہ کسی دوسرے کی خوشی انہیں
 برداشت ہوتی ہے۔ پتا نہیں فضا سے انہیں اتنی چڑ

کیوں ہے۔“

”بھابھی میں۔۔۔ چھوٹے گھر کی یتیم لڑکی ہوں۔ اس
 لیے اہل مجھے برابر کا نہیں سمجھتیں۔“ فضا بولی۔

”تو بھئی۔۔۔ اس میں کیا برابری۔ خود ہی پسند کر کے
 لائی ہیں۔ خیر ہاں میں پھرے گاؤں گاؤں۔ جس کا ہاتھی
 اس کا نام۔ کتنی ہی بے زاری دکھائیں۔ پوتا ان ہی کا
 کھلائے گا۔ ہو اسی خاندان کی۔“

شہزاد رات ہی مائدہ کے گھر گیا۔ اہل کا رویہ ناقابل
 فہم تھا۔ خوشی ظاہر کرنے کی تو عادت نہ تھی۔ اعتراض
 البتہ۔

”آریشن کی ضرورت کیا تھی۔ تمہارا ممبر کر لیتی۔
 نارمل ہونا۔ مگر آج کل عورتوں میں ممبر نہیں۔
 آریشن کا تاج پہننا تھا اہل کی بولہ بولہ کرانے کے لیے
 کہ دیکھو۔ میری اہل اتنی پیسے والی ہے۔ آریشن کی
 فیس دے سکتی ہے۔ ارے شہزاد۔ تم کیا سمجھو گے
 ان پچھلے خاندان کی عورتوں کے چتر۔ چلا کیوں
 مکاریاں کیسے سب کو اہل بنایا ہے۔“

کیا تھا اہل کی خوشی کو بچنے ان کا تو دکھ ہی بڑا تھا۔
 فضا کی امی نے سب کو چت کر دیا۔ وہ جلتا بھناتا اپنے گھر
 گیا۔ اکیلا گھر سناٹا۔

دیکھو ذرا۔ فضا نے بھابھی کے ساتھ جانے کے
 لیے اجازت بھی نہ لی۔ ان کے ایک دفعہ کے کہتے ہی
 چل پڑی۔ کیا میں آرام نہ پہنچاتا؟ اگر دو ہفتے فضا نے
 بھابھی کے گھر آرام سکون اور خوشی کے جمولے
 جھولتے گزارے۔ تو شہزاد میاں نے جلتے بھنٹے، مگر وہاں
 تو وہ بھی خوش گاہوں میں ہی مگن رہتا تھا۔ گھر آکر
 سارے دکھ اور شکوے یاد آجاتے۔ بھابھی نے بہت
 چاہا کہ وہ بھی رات کو وہ جایا کرے، لیکن اسے یہ مشورہ
 پسند نہ آیا۔ اہل بھی مائدہ کے گھر سے آگئی تھیں۔
 پوتے کو دیکھ دیکھ کر نمل ہوتیں۔ ہر وقت گود میں
 اٹھائے ہلاتی رہتی تھیں۔ بھابھی ان کی گود سے لے کر
 اسے بستر پر لٹا دیتی تھیں۔

”اماں! اسے گود کی عادت ہو گئی، تو فضا کو بہت مشکل ہوگی۔ اسے گود میں لے گیا گھر کے کام کرے گی۔“

اماں، بھابھی سے دینی تھیں۔ ایک تو وہ بھانجی تھی، دوسرے ان کا زیادہ وقت ان ہی کے گھر گزرتا۔ گھر میں نوکر چاکر تھے۔ آرام تھا۔ کبھی کبھی بڑی آپا، کبھی مامہ کے گھر چلی جاتیں چند دن کے لیے۔ یا پھر شہزاد کے گھر۔ بہنو تو فوجی آدمی۔ ان کے گھر آرام نہ ملتا۔ وہاں بچی بھی جو بہن بن گئی۔ انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی۔ کیونکہ بہزاد کی پسند سے شادی ہوئی تھی۔ مگر وہاں بھی انہیں منہ کھولنے کی اجازت نہ تھی۔ ساری کسر شہزاد کے گھر نکال لیتی تھیں۔



فضہ کو گھر لا کر شہزاد نے بھابھی کی نصیحتوں پر عمل کرتے ہوئے اسے ہر طرح آرام پہنچایا۔ خوش تھا۔ فضہ بھی خوش رہنے لگی تھی۔ بیٹا بالکل تنگ نہ کرتا۔ ایک روز شہزاد گھر آیا۔ سڑک پر اس نے رکشے سے فضہ کی امی کو اترتے دیکھا۔ وہ اندر چلی گئیں۔ رکشا وہیں کھڑا تھا۔ وہ رکشے والے سے کچھ مذاکرات کر کے اندر آیا۔ اندر امی، فضہ سے شکوہ کناں تھیں کہ اس نے ایک بار بھی ماں کے گھر آنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ وہ دلی زبان سے جواب دے رہی تھی۔

”امی اُتے ہی تو بھابھی مجھے اپنے ساتھ لے گئیں۔ میں نے فون کیا تو تھا آپ کو۔ اگر کیا کرتی اپنا مطلب نکل گیا۔ شرمندہ رہتی ہوں۔ آپ کا سامنا کرنا مشکل لگتا ہے۔ میری وجہ سے آپ کو ہفتی مشکل رہی۔ حمنی، یعنی کی فرمائشیں۔ کھانے، ناشتے پر اہتمام۔۔۔ پھر اس چھوٹے کی وجہ سے زیر بار ہو گئیں۔ کس منہ سے جاتی آپ کے پاس پھر۔“

”بس خبردار۔ آئندہ ایسا کوئی لفظ منہ سے نہ نکالنا۔ میں نے جو کیا وہ میری مامتا کا تقاضا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میں تمہارے کسی کام آئی۔ تم نے ہی وہاں سے بھاگنے میں اتنی جلدی کی۔ مجھے اتنی فکر

رہی۔ اس حال میں تم کس طرح گھر سنبھالو گی اور کیسے بچوں کا خیال رکھو گی۔ دیکھ لو اللہ نے ہمدی، تمہاری جھٹلی کو فرشتا بنا کر بھیج دیا۔ ان کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے مجھے۔“

”امی۔۔۔ آپ نے۔۔۔ میرے لیے۔۔۔ کچھ بھی ہوتا۔ آپ کم از کم آپریشن کے لیے راضی نہ ہوتیں تو۔۔۔ جو فراز کی دلہن کی امانت میری وجہ سے۔۔۔ مجھے بہت دکھ ہے امی بہت۔۔۔“ آواز بھاری ہو گئی۔

”بس۔۔۔ ایک لفظ نہیں۔ آئندہ بھابھی بھی نہ نکالنا منہ سے۔ کیا میں آپریشن منع کر دیتی۔ پاگل ہو۔ اپنی بیٹی کو اذیت سے مرنے دیکھتی؟ کوئی ماں، ایسا کر سکتی ہے؟ مائیں تو اولاد کے لیے جان دے دیتی ہیں۔ وہ ذرا سا زیور میری بچی کی جان سے پیارا نہ تھا۔ اگر میں اسی طرح سوچتی کہ آئندہ کیا ہوگا۔ کل کیسے گزرے گی، تو پھر تو میں ناکارہ ہو جاتی، کچھ کرنے سکتی، بیٹا! میرا یطین ہے، مجھے برا بھروسا اللہ پر ہے جو بڑا ہی مہربان ہے، اس کی عنایتوں، رحمتوں کی بدولت میرا ہر کام آسانی سے ہو جاتا ہے۔ مجھے کبھی کوئی کچھ بتاؤ ہوتا ہے نہ پریشانی۔“

”امی! آپ۔۔۔ شاید دنیا کی سب سے اچھی ماں ہیں۔“ فضہ جذباتی ہو رہی تھی۔

”ہر ماں بہت مطمئن اور اللہ کی شکر گزار ہوتی ہے اور جس کی اولاد تم جیسی نیک، پارسا، خدمت گزار اور سعادت مند ہو، میرا اللہ گواہ ہے۔ میرے نیتوں پہنچے، بہت حساس اور مجھ سے محبت کرنے والے ہیں۔ میں تو اللہ کی نعمتوں سے لبالب بھری ہوئی ہوں، کوئی کمی نہیں ہے مجھے۔ یاد رکھو سعادت مند اولاد کی ماں بھی خالی ہاتھ نہیں ہوتی۔ اس کے ہاتھ اس کی جھولی، سکھ چین سے بھری ہوتی ہے۔ بس مجھے تمہاری فکر تھی۔ چلتی ہوں۔ رکشہ روکا ہوا ہے۔ وہ بڑبڑا رہا ہوگا۔“

شہزاد دم سادھے باہر کھڑا ماں، بیٹی کی گفتگو سن کر متاثر ہو رہا تھا۔ اندر جھانک کر اس نے کہا۔

”السلام علیکم امی، بیٹھیں نا، کھڑی کیوں ہیں۔ میں تو ابھی آیا ہوں۔“

ای جھگی پلکوں سے مسکرائیں۔ لفافے لے کر اس کے ساتھ کوچوا۔ ”جیتے رہو۔“
 ”دیکھ لیں ای۔ مجھ پر کتنا ظلم ہو رہا ہے۔ اب رات کے کھانے کے لیے بھی کچھ کرنا ہو گا مجھے۔“ چائے ایتھلتے ہوئے فکر مند عورت کی طرح بسور کر بے چارگی کا اظہار کیا۔

اتنی سر قہام کر رہ گئیں۔ ”اے ہٹے میں ادھر کے ارادے سے اتنی جھگی تو کچھ پکا کر ہی لے آئی۔“
 ”ہی! یہ مذاق کر رہے ہیں۔ بھابھی کھانا بھیج دیتی ہیں۔“ فضا نے ہنسی روک کر بولی۔

”آج تو میں بھیجا دیکھا ای! کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔“ ہونٹ لٹکا کر بیٹھ گیا۔

ای کو اور بھی ترس آیا۔ چائے کے بعد ٹیکسی لے آیا۔ اسے کرایہ دے کر ہتا سمجھایا۔

اندر آکر ڈانس کرنے لگا۔ بچیاں بھی باپ کی انگلیاں پکڑ کر چکر کاٹنے ہو ہو کرنے لگیں۔ شہزاد بہت خوش تھا۔

”میرا بیٹا میرے لیے خوشی لایا ہے۔ ترقی۔ مجھے ترقی مل گئی۔“

”ہی کو بتایا ہوتا۔ وہ بھی خوش ہوتیں۔“ فضا نے خوش ہو کر کہا۔ ”مبارک ہو۔“

”ہاں۔ خوش تو ہوتیں کہ اتنا بڑا عددے داران کی بیٹی کا خاندان ہے۔ ارے بھئی۔ مٹھائی لے کر ان کے گھر جا کر خوش خبری سناؤں گا۔ کل چلیں گے۔“

آج حیران کرنے والا دن تھا۔ شہزاد بہت خوش، بہت مہربان ہو گیا۔ پھر وہ گھر کے کاموں میں فضا کا ہاتھ بٹانے لگا۔ بچیوں کے کام کرنے لگا۔ تاکہ فضا کو آرام ملے۔

سیکنہ کی شادی میں اماں نے اصرار کیا کہ چونکہ وہ بڑے بھائیوں نے حلیمہ اور نامہ کی شادیوں کی تھیں۔

سیکنہ کی شادی شہزاد کی ذمہ داری ہے۔ شہزاد کو قرض لینا پڑا۔ گوکہ دونوں بھائیوں نے بھی حصہ ڈالا۔ مگر شہزاد پر بہت بار پڑا۔ قرض کی ادائیگی میں بھی رکاوٹیں پیش آتی رہیں۔

”بیٹا! رکشا روک کر آئی تھی۔ دراصل میں رفعت آپا کے گھر جا رہی تھی۔ تمہارا گھر راستے میں ہے۔ میں دو منٹ کا مکہ کر آئی تھی رکشے والے کو۔“

”آرام سے بیٹھیں۔ ایسے کیسے جاسکتی ہیں۔ رکشا کا حساب کر کے میں نے اسے چلا کیا۔ آپ تو مجھے مبارک باد دینے بھی نہیں آئیں۔ دراصل میں ناراض ہوں آپ سے۔“ منہ پھلا کر اس نے کہا۔

ای کو داماد کے اپنا سیت بھرے شکوے پر پیار آ گیا۔ آگے بڑھ کر گلے لگایا۔ پیار کیا۔

”ناراض نہ ہو بیٹا! میں تو دراصل نزلے، کھانسی، بخار میں مبتلا رہی۔ تمہارے بھائی کی طرف مبارک بادی کے لیے جانے والی تھی۔ مگر بچوں کے گھرنیاری لے کر جانا مناسب نہ تھا۔ آج رفعت نے بلایا تھا۔ تو رہانہ گیا۔ اللہ خیر رکھے۔ پھر آؤں گی۔“

انہوں نے ہاتھ سے اس کا کندھا تھپکا۔ ان کی کلائی اس کڑے سے خالی تھی۔ جو وہ ہر وقت پہنے رہتی تھیں۔

”امی میں بہت شرمندہ ہوں۔ اسپتال کا بل ادا کرنے جانے والا تھا تو دیکھا ہے محترمہ گھر آ گئیں۔ امی! میرے بچے میری ذمہ داری ہیں۔ مجھے ہی ان کا حق ادا کرنا چاہیے۔ آپ کو زحمت دے کر۔“

”میرا بھئی ان سے ایسا ہی رشتہ ہے۔“ انہوں نے بات کاٹ کر کہا۔ ”کوئی بڑی بات نہیں۔ اب تو ہو گیا جو ہونا تھا۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ دراصل ڈاکٹر نے بہت خطرہ بتایا تھا۔ انتظار کی صورت میں۔“

وہ رقم کا لالچہ ان کی طرف بڑھا رہا تھا۔ ”امی۔۔۔ یہ رکھ دیجئے۔“

”ارے۔۔۔ نہیں بیٹا۔ بڑے تو چھوٹوں کو دیتے ہیں۔ ان سے لیتے نہیں۔ اگر مجھے ماں سمجھتے ہو تو اسے رکھو۔“

”اور اگر آپ مجھے بیٹا سمجھتی ہیں تو رکھ لیں۔ مائیں تو بیٹیوں سے لٹی ہیں اور بدلے میں ان کو دعا میں دیتی ہیں۔ آپ مجھے دعا دیں۔ مجھے خوشی ہوگی۔ سچا سودا کریں۔“

سیکنہ کی شادی کے کچھ عرصہ کے بعد ہی شزاو کی شادی ہو گئی۔ شزاو اتنی عجلت کی وجہ سمجھ نہ سکا۔ اماں کا فلسفہ خوب صورت لڑکیوں کو لوگ اچک لیتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اسے قائل کر لیا۔

فضہ یتیم تھی۔ ایک بڑی بہن تھی۔ فراز تو باپ کی وفات کے تین ماہ بعد پیدا ہوا تھا۔ اتفاق سے اس کے والدین اکلوتے تھے نہ کوئی سگاموں، خالہ، نہ چچا، پھوپھی، اس کی ماں نے بہت سخت وقت گزارا تھا۔ نہایت تنگ دستی میں بچے پالے، شکر ہے کہ گھر اپنا تھا۔ تعلیم یافتہ تھیں۔ گھر کا ایک کمرہ ایک نرس کو کرائے پر دے دیا۔ اس نے انہیں نرسنگ کی ترغیب دی۔ کچھ دن کورس کیا۔ پھر نرس چلی گئی۔ ایک بچہ آگئیں۔ ان ہی کے توسط سے ایک اسکول میں جاب مل گئی۔ نامساعد حالات میں تنگی میں سفید پوشی کا بھرم قائم رکھا۔ عزت سے وقت گزارا۔ بہت صابر، شاکر، مخفی خاتون تھیں۔ کبھی کسی کے سامنے کم ہائیلی کے کدھرے نہ روئے۔

بڑی بیٹی نے تعلیم سے فارغ ہو کر میدان عمل میں قدم رکھا۔ کالج میں لیکچرر مقرر ہو گئی۔ ماں کی بہ اصرار نوکری چھوڑ دی اور بہن، بھائی کی تعلیم ماں کے آرام کی خاطر شادی نہ کی۔ پھر فضہ کی شادی کی اور بھائی پر توجہ کی۔ لیکن لوگوں کے اصرار اور ماں کے محبت بھرے تقاضوں سے شادی پر راضی ہو گئی۔ اتفاق سے بہت اچھا رشتہ آگیا۔

شادی کے بعد وہ امریکا چلی گئی۔ ایک بار پھر ماں، بیٹا، چچی دھوپ میں کھلے آسمان تلے آگئے۔ مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ گھر پر ہی رول، سمو سے بنا کر آمدنی قائم کی۔ فراز کو بھی جاب مل گئی۔ محلے میں عزت تھی۔ خاندان والے قدر دان تھے۔ فضہ نے بچپن سے جو دیکھا ماں سے جو سیکھا۔ بہن کے ایثار سے سبق لیا۔ شزاو نے بھی اسے بھرپور محبت دی۔ لیکن اس کے پل پل بیدار تھے مزاج کے موسم اسے خوف زدہ کر دیتے۔ اسی نے کئی دی۔

”گھبرانا نہیں۔ وقت ایک سا نہیں رتا۔ ثابت قدمی سے حالات کا مقابلہ کرو۔“

یہ تو پرانی بات تھی۔ مگر اب بچے بڑے ہو گئے تھے۔ شزاو کبھی۔۔۔ میاں کبھی نامہاں۔۔۔ حسنہ معاملہ فہم بھی تھی اور محل کا مظاہرہ کرتی۔ جبکہ بیٹی کو بولنے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ وہ ان کے گھر آکر رہتیں۔ بیٹی کا موڈ خراب رتا۔ وہ نالصافی کے خلاف تھی۔ وادی انصاف کے شزاو کا موڈ بھی خراب رتا۔

بیٹی کہتی۔ ”وادی سے مل کر آتے ہیں تو ابو کو امی سے لڑنے کا بہانہ مل جاتا ہے۔“

دراصل اسے فضہ کی مصروفیت اور حلیے سے چڑھ جاتی۔ فضہ کیا جلتے پھرتے سر میں کنگھا نہیں کر سکتی۔ ایسی بھی کیا مصروفیت۔ حالانکہ وہ دیکھتا تھا۔ فضہ اماں کی ایک آواز پر دوڑی آتی۔ ان کے اشارے پر سارے کام چھوڑ کر ان ہی کی خوشامد میں لگ جاتی۔ توجھلائی رہتی۔ شاید ان سے ڈری ہوئی۔ نہ جانے کیوں۔ اتنا عرصہ ہو گیا۔ اسے اماں کے رویے کی عادت نہیں پڑی۔

شزاو جڑ جاتا۔ ”ارے بھی۔۔۔ اماں شہری تو نہیں۔ جو اسے پھاڑ کھا سیں گی۔ حواس پاختہ۔ خبطی سی۔“ دجہ معلوم کیے بغیر وہ فضہ پر خفا ہونے لگا۔

”میری اماں کے آتے ہی تمہارے ہاتھوں کے توتے اڑ جاتے ہیں۔ حواس گم۔ اس بار وہ زیادہ دن رہ گئیں، تو تمہیں یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔ آخر الماری میں کیا چھپایا تھا جو مل کے نہیں دے رہا۔“ وہ واقعی الماری میں ادھر ادھر ماتھ مار رہی تھی، پریشان، سیدھی ہو کر بولی۔

”پتا نہیں، کچھ یاد نہیں رتا۔ زیتون کے تیل کا ڈبا کہاں رکھ دیا اور نشوونہ پیمپ۔ کا پیکٹ بھی جانے۔۔۔ افسوس۔“ شزاو نے ڈرائنگ ٹیبل کی دروازے زیتون کا ڈبا برآمد کیا اور نشوونہ پیمپ پیکٹ بھی۔

”کچھ عقل کو بھی کام میں لاتے ہیں۔ کیا کرتا ہے اس قدر ایمر جنسی کا ہے کی ہے۔“

”اماں نے کہا کہ بیروں میں ماش۔ افسوس بتا نہیں کیوں بھول جاتی ہوں۔“ جلدی سے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اماں کے کمرے میں گیا۔ وہ پیر لٹکا ئے بیٹھی تھیں۔ شلوار گھٹنوں کے اوپر چڑھائے۔ فضا فرش پر بیٹھی ان کے پیروں پر تیل مل رہی تھی۔

”اب تم بھی ختم کر دینا سلسلہ۔ اماں آج کون سے بہاڑ سر کرنے لگی تھیں کہ تھک گئیں۔ سارا کام چھوڑ کر یہاں آ گئیں۔ حمنہ کر تے ماش۔“ شہزادہ بیٹنی کی ہر بات سے متفق تھا۔ اسے بیٹنی بہت پیاری لگتی تھی۔ فضا نے چھوٹے تو لیے سے اماں کے پیروں پر تیل کا ڈبا لے کر چلی گئی۔

”یہ کام تم حمنہ تم بیٹنی سے بھی کر سکتی ہو۔ کب سے آیا ہوا ہوں۔ ایک پیالی چائے نہیں ملی۔“

اماں کو تو موقع مل گیا۔ ”ارے بھئی تمیز اور عقل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں احساس ہی نہیں کہ گھر کا کماؤ مرد تھکا ہوا آیا ہے تو اسے چائے ہی دے دیں۔ ارے بھئی ایک پیالی چائے تو لڑکیاں بھی بنا سکتی ہیں۔ مگر ایسی تربیت ہی نہیں کی غضب ہے کہ نہیں۔“

”ارے بیٹا۔ بدھلا بڑا ظالم ہے۔ لیٹے لیٹے ہی تھکن ہو جاتی ہے۔“ اماں نے بیٹنی کو یقین دلایا۔

”ابھی دس منٹ پہلے میں آپ کے پاس سے گیا ہوں۔ جب تو تھکن کا ذکر نہیں کیا۔ میں دوا کرتا۔“

”بس وہ حمنہ آتی تو میں نے کما فضا نے تون کا تیل لا کر دے اچھی ماش کرتی ہے وہ۔“

”اماں! کبھی بڑی بہوؤں نے بھی آپ کے ماش کی؟“ وہ شرارت سے بولا۔

بیٹنی چائے کی پیالی میں چچہ بجاتی آگئی۔ ”ابو جی“ چائے حاضر ہے۔ آپ کے آتے ہی آپی نے چائے بنالی تھی۔ آپ دوا دی سے کانفرنس میں مصروف تھے۔ دروازہ بند۔ کوئی سیکرٹ میٹنگ چل رہی تھی۔ میں نے وہ چاہئے پی لی۔ اب دوبارہ بنائی ہے۔ ابو رازداری؟“ وہ بھولی بنی ہوئی تھی۔

اماں ان کے بیٹے اوچھڑنے لگیں۔ پھر موضوع بدل کر توجہ ہٹائی۔

”اے شہزاد! میں نے کہا یہ لڑکیاں صبح سے جو غائب ہوتی ہیں۔ تو شام کو نظر آتی ہیں۔ اسیں کچھ سکھایا بھی ہے ماں نے بایں زبان چلاتا ہی سکھایا ہے دیکھ لو۔ کیا پیر پیرول کے ٹی ہے۔“

”بچی ہے۔ صبح اسکول جاتے ہیں بچے۔ تین بجے آ کر کھاتی پھر اسکول کا کام کرنا ہوتا ہے۔“

”ارے تو تم جو کہتے ہو تمہاری ستخواہ کم ہے۔ تو کاہے کو پرہار ہے ہوا نہیں۔ بھاری فیسیں دے کر۔ آئیں! آپس کوئی نوکری کرنی ہے۔ گھر کے کام سیکھیں شریف بچیوں کی طرح۔“

”افسوس۔ بس ایسے ہی میں تو۔ تم آجائیں بیٹا۔ شہزاد نے چائے اس کے ہاتھ سے لے لی۔“

”مجھے کیا پتا تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے؟ دوا دی پھر کہیں کہ لڑکیوں کو تمیز نہیں سکھائی یاں نے۔ حالانکہ پورے خاندان میں ہم سے زیادہ تمیز دار لڑکیاں نہیں ہیں۔ یہ بڑی چوچو بھوکے اقوال زریں ہیں۔“

فضا نے مڑ کر غصے سے کہا۔ ”بیٹنی جاؤ۔“

”اب اتنا گیا کرنا بھی نہیں کہ بچوں کو جاہل رکھوں۔ کمال کرتی ہیں آپ۔ درزیوں کے بچے پڑھ رہے ہیں۔ موچی بھی بچوں کو پڑھا رہے ہیں۔ یہ جو سڑکوں پر جھاڑو دینے والے ہیں۔ سب کے بچے اسکول جاتے ہیں۔“ بچوں کے معاملے میں نکتہ چینی برداشت نہ تھی۔

”اوہو اچھا! اچھا۔ ہاں اصل میں ابو آپی نے تو کہا تھا کہ وہ دوا دی کے ماش کر دیں گی۔ مگر دوا دی نے کہا اونہوں فضا کو بلاؤ۔ امی وال چڑھا کر بھاگتی آتی ہیں۔ میں نہ دیکھتی تو وال جل کر کوئلہ ہو جاتی۔ پھر ای گوی باتیں سننی پڑتیں۔ ہیں ابو؟“

”میں تو تمہارے فائدے کی بات کر رہی ہوں۔ اتنی فیسیں بھرتی پڑتی ہیں۔ کچھ بچت ہوگی۔“

”کیا کہا ہے میں نے؟ جاؤ کچھ پڑھ بھی لیا کرو۔“

فضا نے ڈانٹا تو وہ منہ بناتی چلی گئی۔

”رہنے دیں اماں بچتِ فتنہ کم ہے۔ اور یہاں کون سی فضول خرچی دیکھ لی آپ نے۔“ تھاہو کر باہر آگیا۔
 یعنی کامنہ پھولا ہوا تھا۔ فتنہ نے خوب خبر لی تھی۔
 شہزاد اسے بہلانے لگا۔



عرصہ دراز بعد ایک رات دوست سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی سر راہ دونوں ٹھک کر گھلے ملے۔
 اے دوست کی ہمدردی نہ ملنا بہتر ہے ملاقات سمجھاؤ خضر۔

حامد نے برجستہ شعر بڑھا۔ باتیں شروع ہوئیں۔
 پرانی یادیں۔ حامد نہ صرف محلے میں پڑوسی تھا۔ بلکہ اسکول میں بھی ساتھ رہا۔ کالج میں بھی۔ پھر سنا کہ حامد امریکہ جا رہا ہے۔ ان دنوں وہ خاصا مصروف اور پریشان تھا۔ ملاقات نہ ہوئی۔ پھر شہزاد نے بھی محلے چھوڑ دیا۔
 حامد کے بھائی سے خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔ اب عرصہ بعد دیکھ کر خوشی ہوئی۔

حامد نے اپنے گھر کا پتا بتا کر اسے فیملی سمیت مدعو کیا۔ بہت اصرار سے۔ شہزاد کو بھی تجبیس تھا۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ بیگم دیکھی ہیں یا امریکن۔ فتنہ کو بتایا۔
 پرانے قصے دوستی کے سنائے۔

”کل چلیں گے۔ فی الحال میں اور تم۔“
 اگلے دن دونوں تیار ہوئے۔ شہزاد نے چانچتی نظر اس پر ڈالی۔ ”ارے بھئی۔ کوئی گرم شال سوئٹرز بھی لے لو۔ سردی رات کو پڑھ جاتی ہے۔ وہ تمہارا سوئٹرز جو بڑی آئی لینڈن سے لائی تھیں۔ بڑا تم نے سنبھال کر رکھا تھا۔ گتے اندر بچے دیے ہوں گے اس نے۔ حسنہ بیٹا! ماں کو سوئٹرا کر دو۔“

”ٹھیک ہے۔ کوئی خاص سردی نہیں ہے۔ چلیں۔“ فتنہ کو جلدی تھی۔ شہزاد نے حسنہ کو اشارہ کیا۔

”ابو جی! وہ والا سوئٹر۔ وہ سکیٹھ پھینکو کو پسند آگیا تو دادی نے کہا کہ تم لے لو تو وہ لے گئیں۔“
 بجلی کی سی تیزی سے فتنہ نے مڑ کر یعنی کو دیکھا۔

کڑی نظروں سے۔ ”تم سے کسی نے پوچھا تھا؟“
 حسنہ ایک ہاتھ کا بنا ہوا سوئٹر لے آئی۔ ”ای! سردی ہو جائے گی رات کو اب بھی خاصی ہے۔ پہن لیں۔ زلزلہ ہو گیا تو۔۔۔“ فتنہ کو کچھ تامل تھا۔

”او۔۔۔ آپنی کانیا سوئٹر۔ پرانا اور کراٹے لیے بنا کر رکھا تھا۔ دادی نے دیکھ لیا تو وہ مائندہ پھینکو گودے دیں گی۔ اس لیے چھپایا ہوا تھا۔“ کہہ کر یعنی منہ پر ہاتھ رکھ کر کمرے میں گھس گئی۔

فتنہ دانت پیس کر۔ ”اس کی تو زبان کانٹوں کی ایک دن۔ بہت بولنا آگیا ہے۔“ کہہ کر رہ گئی۔

حامد کا بہت بڑا عالی شان بیگلہ۔ حامد کی بیگم بچے والدہ سب نے بہت خوشی کا اظہار کیا۔ بڑی آؤ بھٹات ہوئی۔ بچوں کو ساتھ نہ لانے پر ناراضی کا اظہار۔ پھر باتیں، لطیفے، قہقہے، حامد نے امریکہ میں خوب دولت کمائی تھی۔ بیگم اور والدہ کے اصرار پر واپس آیا اور کاروبار شروع کیا۔ حامد قصے سنا رہا تھا۔ اس کی بیوی فتنہ سے باتیں کرنے لگی۔ بہت اچھا وقت گزرا۔ لیکن شہزاد کی سماعت میں یعنی کی آواز جیسے ریکارڈ ہو گئی تھی۔

واپسی میں رہانہ گیا تو فتنہ سے پوچھ لیا۔

”یعنی کوا ماں سے شکایت کیوں ہے؟“
 ”ارے پاگل ہے۔ میں اسے ٹھیک کروں گی۔ بولنے کی بیماری ہے اسے۔ بہت زبان چلتی ہے۔“
 ”جی ہے ابھی۔ تم نے اپنا سوئٹر سکیٹھ کو کیوں لینے دیا۔“ اسے اچھا نہیں لگا شاید۔

”میری چیز ہے میں کسی کو دوں نہ دوں۔ بچوں کا اس میں دخل دینا مجھے پسند نہیں۔“

حامد نے ملاقات خوشگوار رہی۔ کئی دن شہزاد کا سوڈ بہت اچھا رہا۔ بچوں سے مذاق۔ فتنہ پر بھی اعتراض نہ کیا۔

اماں نے کئی بار فتنہ پر نکتہ چینی کی مگر شہزاد۔ اس کی مصروفیت کی مثال دے کر انہیں بہلانا رہا۔ دیکھ رہا تھا۔ کس طرح وہ اماں کی خوشامد میں لگی رہتی ہے۔ ان کی ایک آواز پر سب کام چھوڑ کر آجاتی ہے۔ وہ شہزاد کو

تو کم از کم یہ کہنے کا موقع نہیں دیتی کہ اماں کے آنے سے تمہارا منہ لٹک جاتا ہے۔ پھر پتا نہیں اماں کو اس پر کیوں ترس نہیں آتا تھا۔

ادھر کچھ دن سے گھر کے روزمرہ کے طریقے بدل گئے تھے۔ پہلے تو چونکہ شہزاد رات کو ہی کھانے پر ہوتا تھا۔ دن میں آفس میں ہی کچھ کھا لیتا تھا ہلکا پھلکا۔ رات کو سب ساتھ کھاتے تھے۔ لیکن اب کافی دن سے فضا، اماں اور شہزاد کا کھانا کمرے میں ہی دے دیتی تھی۔ بچوں کا بہانہ موجود۔ بڑھ رہے ہیں۔ بعد میں کھالیں گے۔ کھانے کے بعد بھی شہزاد اماں کے پاس دیر تک بیٹھا رہتا۔ اماں پرانے قصبے کئی دفعہ کے بتائے ہوئے دہرائیں سوہ کان بنڈی کی وی کے پروگرام دیکھا کرتا۔ اماں کے آنے کے بعد لی وی ان کے کمرے میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔

اس دن وہ بور ہو کر ڈراجلدی باہر آگیا۔ ایاز کی بات پر جھگڑ رہا تھا۔ باہر سے ہی شہزاد نے سننے کی کوشش کی۔

”یہ کیا امی! پھر وہی آلو کے کباب اور دال مسور۔ دوسرے کو بھی یہی عیب بھی۔“

”بیٹا! بری بات ہے۔ کھانے میں خرابی نہیں کرتے۔ اللہ کو برا لگے گا۔ شکریا کرتے ہیں۔“ فضا سمجھا رہی تھی۔

”شکریا ادا کریں کہ ہر روز دال اور سبزی۔ صبح شام دال اور آلو۔ ہر دن صرف سبزی دال۔ آخر آپ گوشت کیوں نہیں پکاتیں؟“

شہزاد ابھی اماں کے دروازے پر ہی تھا۔ اندر سے اماں کی آواز آئی۔ وہ بھی اس کے ساتھ باہر آ رہی تھیں۔ ایاز کے شکوے سن کر بولیں۔

”اے شہزاد! روز پکنا تو ہے گوشت۔ ابھی ہم نے آلو گوشت کھایا ہے۔ یہ تمہاری بیوی آخر سے کرنی کیا ہے۔ ہیں؟ کیا بچاتی ہے کل کے لیے؟ آخر پتا تو چلے۔“

شہزاد نے ایاز سے ہی پوچھنا مناسب سمجھا۔ چھوٹی میز پر واقعی دال اور آلو کے کباب تھے۔

فضا نے جلدی سے کہا۔ ”کہا ہے نا۔ کل بتا دوں گی کباب۔“ قورمہ بھی تمہاری پسند کا۔ یہ تو کھاؤ۔“

”نئی دن سے یہی کہہ کر بھلا رہی ہیں۔ گوشت پکاتی ہیں تو وہ دوا دی، ابو اور سیکینہ پھپھو کے لیے۔“ شہزاد فضا پر بگڑنے والا تھا۔ سیکینہ پھپھو سن کر رک گیا۔ ”ابھی اس دن تو گوشت لایا تھا میں۔ بچوں کو سالن کیوں نہیں دیتیں تم؟ میں نے اور اماں نے تو گوشت کا سالن کھایا ہے۔“

فضا کے چہرے پر خالت اور بوکھلاہٹ نمودار ہوئی۔ ”وہ بس کم بڑ گیا تھا۔ کہا تو ہے۔ کل زیادہ بتا دوں گی۔ کیا ہوا اگر ایک دن۔“ جملہ بھی پورا نہ ہو سکا۔

”بناتی تو ہیں روز بگڑوہ سیکینہ پھپھو اور ان کے بچے ہمارا حصہ بڑپ کر جاتے ہیں۔“

”ہیں تو کئی نئی دن سالن نہیں ملتا۔“ یعنی ابھی بول بڑی باپ کے سامنے شیریں جاتے تھے۔

”کل بتا میں گی۔ تو کیا کل سیکینہ پھپھو نہیں آئیں گی۔ وہ تو بس چھٹی کے دن چھٹی کرتی ہیں۔“

فضا پر شرمندگی اور غصے کا غلبہ تھا۔ کیسے انہیں چپ کرے باپ کے سامنے۔ اب یہ اولاد۔

”ابو جی! سیکینہ پھپھو اور ان کے بچے آتے ہیں۔ روزانہ کھانا کھا کر، بچا ہوا سالن بھی پھپھو لے جاتی ہیں۔ ہمیں وہی سبزی دال۔“

یعنی کی زبان تو بھی ہی بے لگام۔ فضا نے تڑے اس کے منہ پر پھپھو مارا۔ ”چپ نہیں رہ سکتیں تم؟ کتنی دفعہ کہا ہے جو بات تم سے پوچھی جائے اس کا جواب دیا کرو۔ احمق! زبان ورازا۔“

منہ پر ہاتھ رکھ کر یعنی نے ایاز سے کہا۔ ”چلو تم ہی بتاؤ۔ میں کیا بچ نہ بولوں۔“ کہہ کر روتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

شہزاد الجھ گیا۔ یہ کیا معہ ہے۔ سلسلہ کیا ہے آخر۔ یہ سیکینہ۔ روزانہ۔

”حمہ! تم بتاؤ۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔“ باپ بن کر دنگ لہجے میں بیٹی سے پوچھ لیا۔ حمہ بچاری کی شامت۔ ماں سے بھی ڈرتی تھی۔ باپ کے سوال کا

قرضہ اتار رہا۔ دس سال میں اس سے نجات ملی۔ پھر منگائی میری شادی بھی جلدی کر دی آپ نے۔ بچوں کی ذمہ داری آگئی۔ اب بھی میں ایک محدود رقم فوضہ کو دیتا ہوں۔ بجٹ میں اتنی گنجائش نہیں کہ پانچ مہمانوں کو روزانہ کھانا کھلایا جائے اور وہ بھی دو وقت اس کے علاوہ فوضہ نے کبھی شکایت نہیں کی۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ دوسروں کے لیے پکا پکا کر رکھے۔ اپنے بچے ترسیں۔ اس کا حلیہ دیکھا ہے۔ سارا دن کچن میں چار چار ڈشیں پکا کر رکھے۔ اپنے بچوں کے لیے دال سبزی۔ مفت خوروں کے لیے گوشت۔ یہ انصاف تو نہیں۔ انسان ہے۔ مشین نہیں ہے۔ بہت ہمدردی ہو رہی تھی۔

اماں اور ہر لوہرا ہاتھ مارتی جیسے کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ (شاید کوئی سر ہاتھ لے لے)

”ارے بس اسکل یہاں سے قریب ہے تو آجاتی ہے۔“

”مجھ اسکل دور چلا جاتا ہے؟ بچوں کو اسکل چھوڑ کر آسکتی ہے آپ کہاں۔“

”مجھ؟ اے تو مجھ کو بھگام بھاگ بغیر ناشتے کے آتی ہے۔ پھر تمہاری بیوی کے کی۔ روز ناشتہ کرنے آجاتی ہے۔ اور تم بے غیرت۔ بہن کے لیے یہاں سے جواب طلبی کرنے کھڑے ہو گئے۔“

”میری بیوی اگر کچھ کمٹی تو آپ یہاں سکون سے بیٹھی ہوتیں۔ نہ سیکنہ روز بچوں کو کھانا کھلانے یہاں آتی ہوٹل سمجھ کر۔ فری کا ہوٹل۔ اماں بچ جاتیں۔ بھائی جان بڑی آپا یا ماندہ کے گھر میں آپ کو اتنا اختیار ہے کہ سیکنہ کو روز بلا کر کھلائیں بھی اور رات کا کھانا نقرن بھر کر لے بھی جائے۔ میں اپنے بچوں کے لیے کما تا ہوں۔ سیکنہ کے لیے نہیں۔ جو اس کا حق تھا۔ دیا جا چکا ہے۔ میرے بچے سبزی پر پلیں۔ واہ!“

”سبزی“ اے بھی سبزی بھی اللہ نے کھانے کے لیے بنائی ہے۔ نعمت ہے۔ اماں معصوم بن گئیں۔

”بے شک۔ اب یہ نعمت سیکنہ اور اس کے بچوں

کو کھائی جائے گی۔ کل سبزی اور دال کی دعوت ہوگی بن بلائے مہمانوں کی۔“ کہہ کر بچوں کو آکر تسلی دی۔ ”کل گھر میں سبزی بنے گی۔ اور میں تمہیں پڑا کھاؤں گا۔ رات کو چکن کڑھائی کیا خیال ہے؟“

”آپ نے ان بد تمیزوں کی وجہ سے اماں سے خواہ مخواہ بحث کی۔ میں نہیں تو۔“ فوضہ گھبرا گئی۔

”تم بکری بنی رہنا۔ لوگ پھر شیر تو بنیں گے۔ بہر حال۔ کل سبزی کھاؤ سیکنہ کو۔“

اور اگلے دن جب بھنڈی اور دال سامنے آئی تو سیکنہ کا منہ بن گیا۔ کچن ٹیلا۔ وہاں پکا ہوا تو کیا کچا گوشت بھی نہ تھا۔ فوضہ کو تجوی کے طعنے دیتے ہوئے بچوں کو لے کر چل دی۔

”چلو ہم راستے سے ہاں کباب لے لیں گے۔ میں نے تو میاں سے کہا تھا آج فوضہ کے کھاتھ کی چکن کڑھائی کھاؤں گی۔ لویہ نیا خرچا یہاں تو مچھا چلو۔“ اماں کو بھنڈی کھائی پڑی۔ مزانہ لیا۔

رات کو جب شہزاد پڑا لے کر آیا تو اماں کو فوضہ آ گیا۔ ”اچھا آج تمہاری حیثیت میں فرق آگیا۔“

”جی۔ اب رات کو گوشت پکا کرے گا۔ دن میں سبزی گایا زانگہ کھکھ ہے؟ سب ایک ہی چیز کھائیں گے۔ میں اماں تم لوگ اور تمہاری امی۔ رات کو سب ساتھ کھایا کریں گی۔ دن میں دو سالن بنیں گے۔ ایک سبزی کا۔ ایک گوشت کا رات کے لیے۔ یہ طے ہے۔“

بچے بھی خوش تھے۔ اماں مگر بڑے بیٹے کو فون کر کے پوتے کو بلا کر حل گئیں۔ فوضہ سے بات تک نہ کی۔ نہ سلام کا جواب دیا۔ فوضہ دانت پیس کر رہ گئی۔

”یہ جو لولا وہ ہے میری۔ افواہ فتنہ ہے اتنے دن کی بنی پٹائی عزت دو کوڑی کی کر دی۔ زبان کٹ کر رکھ دوں گی۔ آئندہ اگر کوئی۔“ سب کو ڈانٹ پڑی۔

”ناخنار بھی کہہ دیں۔ اور۔ آپاں اور کون سا برابر ٹھیل لفظ بولا جا تا ہے نا فرمان اولاد کے لیے۔“

”چپ غمی کو غصہ نہ دلاؤ۔ پٹائی ہو جائے گی۔“

”امی ہمیں بچ بولنے سے منع کر رہی ہیں۔ حالانکہ

جھوٹ تو گناہ ہے۔“

”چپ رہنا سب سے اچھا ہے۔ اور بچوں کو ہر معاملے میں بولنے کی ضرورت بھی نہیں۔ سن لیا۔“
پھر نصیحت کی بجائے خوش تھے۔ ابو تو ان کے ہمدرد تھے۔
اسی حزب اختلاف کی ممبر تھیں۔



وادئ اس بار بڑے بیٹے کے پاس زیادہ نہ رہ سکیں۔
نہ جانے کیا ہوا تھا۔ آگئیں اور آتے ہی بڑی ہوسکی
مکاریاں، چالاکیاں، بد زبانوں کی پوٹلی کھول کر بیٹھ
گئیں۔ فضلہ ان کی خدمت میں حاضر۔
”اماں بس جانے دیں۔ آرام کریں تھک گئی ہوں
گی۔ حمنہ! انار کا شربت بنا کر لاؤ۔ یعنی کنگھالا کروادی
کے بال سلجھاؤ۔ ایاز! چلوئی وی سیٹ کر دیساں۔“
سب کو کلام میں لگا دیا۔

اماں کی بات سنی نہیں۔ اسے یقین نہ تھا کہ بڑی
بھابھی نے کوئی بد تمیزی کی ہوگی۔ سگی بھانجی تھیں اماں
کی۔ مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھی اماں چپ ہو گئیں گو
کہ بردبار تھیں۔

”لو میں اپنا کلیجہ ٹھنڈا نہ کروں۔ وہاں تو میرے
بولنے پر کرفیو لگا دیا جاتا ہے۔ کیا یہاں بھی میں ہونٹ
سی کر بیٹھی رہوں۔“
”میرا مطلب ہے۔ آپ دل برانہ کریں۔ طبیعت
خراب ہو جائے گی۔“

اماں لیٹ گئیں۔ انہیں یہاں کی خاطر داریاں بھی
اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ تو قہقہے سنانے آئی
تھیں۔ فضلہ کو دچکپی ہی نہیں۔ مکار کہیں کی۔ شہزاد کو
بتاؤں گی۔ وہاں میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ بڑا بھابھی
جان بھابھی جان کرتا رہتا ہے۔

چٹھئی کے دن چونکہ سب گھر پر ہوتے تھے۔ دونوں
وقت ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ اس دن فضلہ نے
آلو کے پرائٹوں کا اہتمام کیا تھا۔ وہی کارائینہ۔ ٹماٹر کا
کچو مرچ یا زہری مرچ کے ساتھ۔ املی کی چٹنی، اچار۔
سلاد۔ سب میز کے گرد بیٹھے فضلہ گرم پرائٹ پکا رہی

تھی۔

”کافی ہو گئے ہیں۔ آجاؤ تم بھی۔“
”بس دو رہ گئے ہیں۔ آپ شروع کریں۔“ فضلہ
نے پکار کر کہا۔ شہزاد نے نظر دوڑائی۔
”ارے بھی۔ وہ جو پچھلے مہینے میں گلاس لایا تھا۔
الماری میں قید کرنے کے لیے نہیں۔ اب میز پر چار
رنگوں کے گلاس اچھے نہیں لگ رہے۔ حمنہ بیٹا گلاس
لاؤ۔“

”سب کے اپنی نشانی والے ہیں۔ آپ کھانا تو
شروع کریں۔“ فضلہ پر اٹھا رکھ کر بیٹھی۔
”جب الگ الگ کھاتے ہو۔ تو نشانی والے رکھا کرو
میرے سامنے ایک طرح کے ہونے چاہئیں حمنہ
اٹھو۔“

حمنہ کچن میں چلی گئی۔ یعنی نے سر جھکا کر چپکے سے
کہا۔
”کہاں سے لائیں گی آپ۔ وہ تو وادی نے جب ہی
مائدہ پچھو کو دینے کے لیے اٹھا کر رکھ لیے تھے۔“
وادئ کے ہاتھ سے لقمہ گرا۔ فضلہ نے دانت
کچکا پکچائے۔ ”چپ نہیں رہ سکتی یہ۔“ شہزاد حیرت
سے اماں کو دیکھنے لگا۔

”ارے تو کون سے ہیرے جڑے تھے ان میں۔
سوچا مائدہ کے گھر میں نئے گلاس نہیں ہیں۔ تو۔۔۔“
”مائدہ کے گھر میں گلاس نہیں ہیں؟“ انتہائی
حیرت سے شہزاد نے جملہ دہرایا۔ ”اور میرے گھر میں تو
فیکٹری لگی نظر آرہی ہے آپ کو۔ کمال ہے!! مائدہ کے
اسٹور میں برتنوں کے دس کریٹ رکھے ہیں۔ ڈائنگ
ٹیبیل کی الماری گلاسوں سے چھپا رہی ہے۔ وہ کیا
صرف شو کے لیے ہیں؟“

”ائے“ میں نے تو نہیں دیکھے۔ نہ کریٹ نہ
الماری۔“ اماں معصوم۔

”آپ جو دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہی نظر آتا ہے۔ جیسے
میرے گھر میں خزانے ہیں۔ بانٹھیے۔“
اگلے دن نئے گلاس لا کر شہزاد نے حمنہ کو دیے۔
”دھو کر رکھو۔ اگر سیکنہ کے گھر گلاس نہ ہوں تو اماں کو

اختیار ہے دے دیں یہ بھی۔“
اماں، ہنوں کے حقوق پر مغلز پکچر کی تیاری کر رہی تھیں۔ بڑبڑا کر رہ گئیں۔ شہزاد حیران تھا۔ اماں ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ انہیں میرے گھر کی حالت نظر نہیں آ رہی۔ فضا دن بھر گھر کے کاموں کے علاوہ اماں کے خدمت میں جتی رہتی ہے۔ اسے آرام کا وقت نہیں ملتا۔ معمولی لباس میں رہتی ہے۔ بچوں کے پاس بھی کوئی قیمتی چیز نہیں۔ نہ منگے جو نہ انعام لباس۔ گھر میں بھی چاہنے کے باوجود کوئی قیمتی ڈیکوریشن تک نہیں لاسکا۔ فضا کی محنت سے گھر صاف ستھرا نظر آتا ہے۔ ساز و سامان سے خالی۔

پہلے تو وہ اماں کے اکسانے پر فضا کو ہی ہر خرابی کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ لیکن اب کچھ بادل صاف ہونے شروع ہوئے تو اندازہ ہو گیا۔ فضا کے صبر و برداشت کے علاوہ فیشن، فرمائش، میک اپ۔۔۔ کچھ شوق نہیں، خواہش نہیں، خاموشی سے سب کی سن کر انجان بن جاتی۔ بھی رقم کی کمی کا دوا دلا نہیں کیا۔ زبان بند۔ یہ کس مٹی کی بنی ہے۔ شاید اماں ہی درست کہتی ہیں۔ چھوٹے گھر غریب کی پٹی ہوئی۔ بیٹی نے سارے شوق ختم کر دیے۔ مگر اب تو بیس سال سے وہ اس خاندان کی فرد تھی۔ جہاں سب خواتین بڑے بڑے کر فیشن اور میک اپ کے دلدادہ۔ بھرک دار لباس کی شوقین۔ شاپنگ کی عادی۔ اسے کبھی خیال نہیں آتا۔ یا نہ وہ اپنا دل مار سکتی ہے۔ شوق دفن کر دیتی ہے۔ وہ خود بھی اس کے لیے فیشن کے کپڑے جوتے پچھل مثال لے آتا۔ تو بہت خوش ہوتی۔ خاص موقعوں پر پہنتی۔ کسی محفل میں دوسروں کے مقابلے میں کم نظر نہ آتی۔ یہ اس کی سادگی بھی کبھی سلیقہ بھی۔

بڑی آپا اوو دونوں بھابھیاں فضا کی قدر دان تھیں۔ بڑی آپا تو تھے تحائف دینے میں بھی فراخ دل تھیں۔ خصوصاً لڑکیوں کے شوق کی چیزیں چمک دار گلوں کی چھیل یا خوب صورت بیک وغیرہ۔ بڑی آپا کو شہزاد سے بہت محبت تھی۔ اس کے بیوی بچوں کو بھی اتنا ہی چاہتی تھیں۔ دراصل شہزاد اور سیکھن میں ایک

سال کا فرق تھا۔ سیکھن شہزاد سے لڑتی تھی۔ مارتی تھی۔ وہ اسے ماں کی گود میں دیکھ نہیں سکتی تھی۔ شہزاد کمزور بھی تھا۔ بیمار رہتا تھا۔ بڑی آٹانے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ تاکہ سیکھن کے ظلم و ستم سے بچا رہے۔ کئی سال انہوں نے ہی نے اس کی دیکھ بھال کی۔ قدرتی لگاؤ تھا۔ وہ فضا کی بھی قدر دان تھیں۔ اماں کسی طرح انہیں اپنا حامی نہ بنا سکیں۔

شہزاد ہی ان کا فرماں بردار تھا۔ پہلے اکثر اماں کے اکسانے پر ہی فضا پر مگر جتا رہتا۔ مگر اب کچھ عقل آ گئی تھی۔ شاید بچوں کا بھی لحاظ تھا۔ مگر فضا۔ اب بھی ڈرتی تھی۔ پتا نہیں کب اماں کا وار کار گر ہو۔

”ماں کہاں ہے تمہاری۔ میاں گھر آیا ہے۔ کچھ ہوش ہے کہ نہیں۔“ ”منہ کو دیکھتے ہی ڈپٹنے لگیں۔“ ”رہنے دیں اماں! تھک گئی ہے ڈرائیٹ گئی۔ آہی گیا ہوں اب۔“

”سب چلتے پازیاں ہیں عورتوں کی۔ مرد کو دکھانے کے لیے۔ جیسے گھر کا بوجھ اٹھایا ہوا ہو۔ ارے بابا! مرد باہر جا کر کما تا ہے۔ محنت کرتا ہے۔ تھک کر گھر آئے تو اس سے ہنس کر بات کرو۔ چائے پانی کا پوچھو۔ یہ تو ہم نے اس گھر کا تیرہ ہی دیکھا ہے کہ شام کو بنو تھک کر پڑ گئیں۔ واہ بھی۔ ایسا کون سا دنیا سے زالا کام ہوتا ہے۔“

”دادی، ان کا پی پی لڑو ہو گیا تھا۔“ ”منہ نے دبی زبان سے کہا۔“ ”میں نے زبردستی کہہ کہہ کر لٹایا ہے۔ وہ کب لٹتی ہیں۔ ابو کو چائے دے رہی ہوں۔ آپ کو اور دوں؟“

دادی کو پوتیوں کی صفائیاں، وضاحتیں بالکل پسند نہیں تھیں۔ شہزاد بھی ان سے متعلق ہو جاتا تھا۔

”لو۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی۔ میں تو کہہ رہی ہوں کہ بھی ٹھیک ہے۔ کام ہوتے ہیں۔ مگر مرد کے گھر آنے کے وقت عورت کو چاق چوند ہونا چاہیے۔ ہم نے تو سب جگہ یہی دیکھا ہے۔ یہاں نزلے دستور ہیں۔“ ”دادی، ہمارے گھر کے سوا سب کے گھر کئی کئی نوکر بھی تو ہیں۔ کسی کو کیوں ٹھکن ہوگی؟“

TV ONE

aap se ushta pyar ka

#TvOnePK

چنار گھاٹی

CHANAR GHATI

تحریر: محمد احمد، عمر خطاب ہدایات: غضنفر علی
ستارے: علی خان، سمیعہ ممتاز، شمائل، انوشے

حسین بلاؤں کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور ان کا دل بھرا

رکتی ہیں۔ ان کی ساطر مدارات میں کوئی کسر نہیں

چھوڑتیں مگر ساجد محسوس کرتا ہے کہ ان کوئی آنکھی

کھلا ہوا ہے اور وہ کسی شیطانی طاقت کے جال

میں پھنس چکا ہے۔ اس کی ہر آنکھ میں اس کی

ساری دنیا ہے۔

ساجد کو پتہ چلتا ہے

گھائی میں اس کی ہے کافی پریشان ہے تو علی راؤ مائرہ

کا دل جیتنے یا کسی اور منصوبے کے تحت مائرہ سے کہتا

ہے کہ چنار گھائی میں اُس کی آبائی زمین ہے، وہ اُس

علاقے سے اچھی طرح واقف ہے اور وہاں جا کر

ساجد کو بازیاب کر سکتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ساجد بروقت اُن حسین

بلاؤں کے چنگل سے نکل آئے گا یا علی راؤ مائرہ کو

حاصل کرنے کے لیے چنار گھائی جا کر ساجد کو راستے

سے ہٹا دے گا؟ علی راؤ کا اُن بدروحوں سے کیا تعلق

ہے؟

چنار گھائی کی سنسنی خیز کہانی ہر مرحلے پر حیرت اور

تجسس کا ایک نیا درکھوتی ہے۔

سیریل چنار گھائی کہانی سب اُن کے چین

میں کی جنموں سے شروع ہوتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ

چین کے نیچے

آئیں۔

مضی اور حال کے درمیان

انی ہے جو مائرہ اور ان کے

سات کا کنوج گھائی ہے۔

اور مائرہ ایک ایڈورٹنگ ایجنسی میں کام

لاتے ہیں اور ایک دوسرے کو چاہتے لگتے ہیں۔

بروچیکٹ کے سلسلے میں چنار گھائی نامی علاقے

میں گئے ہوئے اچانک ساجد لاپتہ ہو جاتا

ایک طرف ساجد کی فیملی اور اُس کے دوست

اور ساجد کی تلاش شروع کرتے ہیں اور دوسری

ساجد چنار گھائی کی مائرہ انصاء میں حیرت

اندرات اور تجربات سے گزرتا ہے۔ چنار گھائی

دون ساجد کو رشیم و کھواب کے قیمتی اور شاہانہ

مالیوس دو حسین عورتیں ملتی ہیں جو اُس پر

نویاتی ہیں اُسے اپنی حویلی میں مہمان بنا کر

سازھے سات تک ان کے گھر پہنچنا ہے۔ دو گھنٹے آپ کے پاس ہیں۔ ہری اپ اور ہاں میری بیٹی کوچ بولنے پر ڈانٹا نہ کرو۔ ارے۔۔ میرے بیٹے نے منہ کیوں بنا لیا۔ کیا از سے پوچھا۔

”ابو! میرے پاس پارٹی لفٹیشن کے قابل پینٹ شرٹ نہیں ہے۔ میں نہیں جاؤں گا۔“ اس نے دجہ بتائی۔

”بیٹا جی! لوگ آپ کے کپڑے دیکھنے کے لیے نہیں بلاتے۔ محبت سے بلاتے ہیں۔ شلوار قمیص پہن لو۔“

”آہا۔۔ ایاز میرے پاس تمہاری پینٹ شرٹ رکھی ہے۔“ یمینی کچھ یاد آنے پر بولی۔ ”وہ بڑی پھوپھو چولانی تھیں تمہارے لیے۔ میں نے چھپا کر رکھ دی تھی کہ دادی نے دیکھ لیا تو زین کو دے دیں گی۔ پچھلی بار کی طرح۔ وہ جو تمہارے لیے اووف۔“ دانت تلے زبان دیا کر بھاگ گئی۔

فضہ دانت پیش کر۔ ”ایک دن سچ سچ اس کی زبان کانٹوں گی۔“ کہہ کر رہ گئی۔ بے بسی۔ ایاز بھی فوراً باہر نکلا۔

”آپ کے کپڑے نکال دوں؟“ فضہ شہزاد کو بسلا رہی تھی۔

”میں سوٹ پہن لوں گا۔ تم اپنی تیاری کرو۔“ ذہن الجھ گیا تھا۔ بچے اماں کے بارے میں ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ شاید فضہ کی روک ٹوک نے ضدی بنا دیا ہے۔ یا۔۔

اماں کو بتایا جلدی جانا ہے۔ حسہ سے کہتا ہوں آپ کے کپڑے نکال دے گی۔“

”اے شہزاد۔۔ پھر سالگرہ میں تحفہ بھی تو دینا ہو گا۔ جب اتنے لوگ جائیں گے تو کیا رقم دو گے۔ یا کوئی کھلونا۔“ اماں کو فکر ہو گئی۔

”رقم دینا تو اچھا نہیں لگے گا۔ چلیے آپ نماز پڑھ لیں پھر۔“ کہہ کر اٹھ گیا۔

ایاز بہت سچ رہا تھا۔ کالی پینٹ گلابی شرٹ اس پر کھل رہی تھی۔ شہزاد نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”واہ

شہزاد نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ دادی نے چپ سا دھلی۔ پہلے تو لڑکیوں میں عقل نہ تھی۔ یا بولنے کی جرات نہ تھی۔ اب پڑھنے کی حمایت میں بولا کرتی تھیں۔ اور باپ کو تو دیکھو۔ کیا کر دن ہلا رہا ہے۔ بیٹی ماں کے آگے مقابلہ کر رہی ہے۔ تو کہتا ہی نہیں کچھ۔ پہلے تو میں ذرا سی بات کرتی تھی۔ آگ بگولہ ہو کر فضا پر چڑھ دوڑتا تھا۔ اب اسے کچھ نہیں کہتا۔ زمانہ ہی خراب ہے۔ بڑوں کی عزت نہیں رہی۔ ورنہ دادی کے آگے ماں کی حمایت کریں۔ توبہ۔۔ دل میں ہی کڑکڑاتی رہیں۔ کوئی سننے والا نہ تھا۔ ایک گھوڑی نوکرانی تھی۔ اس سے کبھی دل کی بات کر سکتی تھیں۔ اسے بھی چالا کو فضا نے نکال باہر کیا۔ بیٹا ہی کب کا بن دھر کر سستا ہے۔ پتا نہیں فضا نے کون سی جاو کی بولی سگھادی ہے۔



حامد کا فون آیا۔ شہزاد آفس سے نکل ہی رہا تھا۔ حامد کے چھوٹے بیٹے کی سالگرہ تھی۔ معہ میملی کے مدعو کیا تھا۔ گھر پہنچا تو یمینی کو ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ وہ بگڑ رہی تھی۔

”میرا بولنا برا لگتا ہے۔ مگر میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔ اب بولوں گی ہی نہیں گونگی بن جاؤں گی۔“ ”ہیلو۔۔ ہیلو۔۔ میری فرشتی۔ ارے بھی آج کون سا سچ لوگوں کو برا لگ گیا۔ میری بیٹی کا۔“ لاڈ سے اسے گلے لگایا فوراً اتر اٹھی۔ شوخی سے بولی۔ ”دیکھا! میرے ابو کو میرے سچ پر غصہ نہیں آتا۔ اسی کو تو۔۔ میرا بولنا بھی پسند نہیں۔“

فضہ نے جلدی سے صفائی دی۔ ”میں تو سمجھا رہی تھی کہ دقت اور موقع دیکھ کر بات کرنی چاہیے۔ لڑکیوں کا بڑھ بڑھ کر بولنا کسی کو پسند نہیں۔ اچھا چلو۔ چائے بناؤ۔ کمرہ ٹھیک کرو۔ کباڑ خانہ بنا رکھا ہے۔“ ”ابھی کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔“ شہزاد نے ہاتھ اٹھا کر روکا۔ ”حامد کے بیٹے کی سالگرہ ہے۔ سب کو بہ اصرار بلایا ہے۔ قافٹ تیار ہو جاؤ۔ سات یا

میرا بیٹا تو شہزادہ لگ رہا ہے۔ بڑی آپا کو بھی بہت پہچان ہے۔

پھر یمنی کو بلایا ”میری بیٹی کتنی سمجھ دار ہے۔ موقع پر اتنا اچھا تحفہ نکال کر لائی ہے۔“
داوی نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے دیکھا۔ ”یہ نئے کپڑے بڑے قیمتی لگ رہے ہیں۔ تم لائے ہو۔“
”نہیں اماں! میری آپا کا تحفہ ہے۔“ شہزاد خوش تھا۔

”اوئی۔ یہ حلیمہ نے کب دیا۔ دیکھ لو۔ مجھ سے ہر چیز چھپائی جاتی ہے۔ بھلا بتاؤ۔“

”داوی! ہماری چیزیں آپ سیکھ نہ پھینچو کو نہ دیا کریں۔ تو ہم نہ چھپائیں۔“ یمنی کی زبان۔

”یمنی! اب آگے کچھ کہا تو جان لے لوں گی سن۔“

فضہ بھاری بے بسی کی تصویر بن گئی۔
”ارے! سردی ہے بیگم۔ کوئی گرم کپڑا!“
لوٹا۔ وہ تمہاری میروں شال بھوس لایا تھا۔

”میرے کپڑے خاصے موٹے ہیں اور فنکشن ان کے گھر پر ہے نا۔“ لوگوں کے مجمع میں گرمی ہو جاتی ہے۔

”پھر بھی آج کل تو فیشن ہے۔ خواتین بے ضرورت شال ہاتھ پر لٹکا لیتی ہیں۔ لاؤ حنہ شال۔“

فضہ نے سٹنا کر کہا۔ ”چلیں دیر ہو جائے گی۔ میں ٹھیک ہوں۔“ شہزاد کا ہاتھ پھینچنے لگی۔ یمنی باپ کی موجودگی میں ہمدرد بن جاتی تھی اور ابھی کچھ دیر پہلے سراہا بھی تھا اسے۔ کیوں عجب رہتی۔

”ابو جی! امی نہیں بتائیں گی۔ وہ شال بھی سیکھ پھینچو کو پسند آئی تو داوی نے انہیں دے دی۔“

فضہ ہر آگئی مگر یمنی نے باپ کو سپرنا لیا تھا۔ سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔ یہ سکند پینڈ گاڑی چند ماہ پہلے ہی شہزاد نے لی تھی۔ بہت کام آتی تھی۔ ایک اسٹور کے سامنے گاڑی روک کر شہزاد ایاز کو لے کر اسٹور میں جا گھسا۔ کچھ دیر بعد مسکراتا آیا۔ ایاز کے ہاتھ میں شاپر تھا۔ شہزاد اسٹیرنگ پر بیٹھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

”ابو تحفہ لائے ہیں دینے کے لیے؟“ یمنی کی زبان

”میں کبھی ہوتی تھی۔ ابونے بھی اقرار کیا۔“
”ہاں بیٹا جی! تحفہ دینے کے لیے ہی ہوتا ہے۔ ایاز! اپنی امی کو دے دو بلکہ اڑھا دو۔“ ایاز نے شاپر سے شال نکال کر ماں کے کندھوں پر پھیلادی۔ سیاہ شال پر رنگین نگ جگمگا رہے تھے۔

”یہ یہ آپ بھی بس۔ بچوں کے کہنے میں آکر۔ بھلا کیا ضرورت۔“ فضہ بوکھلا کر بولتی گئی۔ لڑکیاں اچک اچک کر دیکھ رہی تھیں۔
”تمہیں نہیں مجھے ضرورت تھی۔“ شہزاد سنجیدہ ہو گیا۔
”میری امی کتنی حسین لگ رہی ہیں۔ شہزادی بلکہ ملکہ عالیہ۔“
”اور میرے ابو بادشاہ سلامت۔“ یمنی اچھپائی۔
”ابو آپ نے خود کیوں شال امی کو نہیں دی۔ جیسے بادشاہ! لوگ ملکہ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تحفہ محبت

”اب میں فٹ ہاتھ پر گھٹنے ٹیک کر تحفہ دیتا اچھا لگتا کیا؟ میری پینٹ کی گریز خراب نہ ہو جاتی؟ میں نے شہزادے کے ہاتھوں دلوا دیا تحفہ۔ اچھا ہے نا؟“

”بہت بہت۔ بہت سچی خوشی سے سب کے چہرے جگمگا رہے تھے۔ حلد کے گھر کے سامنے بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ حلد ان کے اترنے سے پہلے آیا۔“

”ایاز! دراصل پروگرام کچھ بدل گیا ہے۔ اصل میں ہماری بڑی بیٹی کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ لڑکا مجھے پسند آیا۔ لڑکا لندن جا رہا ہے پرسوں۔ تو اب جیسی میں چھٹی طے ہو گئی آج کے دن۔“ حلد نے انہیں بتایا کہ اب یہ فنکشن سبزہ زار میں یعنی کسی بڑے لان میں منعقد ہو رہا ہے۔ اس نے بتا سبھا۔

شہزاد نے ہنس کر کہا۔ ”دیکھا میرا اندازہ۔ لان میں سردی سے ٹھہر تیں۔ لوگ کہتے بے چاری کے پاس شال تک نہیں ہے۔“

”بھئی داؤد مجھے بخو۔“
”میں تو سمجھی تم کوئی تحفہ لینے اترے ہو۔ اسٹور کے سامنے۔“ اماں سے رہانہ گیا۔ دل کی جلن نکال۔

”اب میں فٹ ہاتھ پر گھٹنے ٹیک کر تحفہ دیتا اچھا لگتا کیا؟ میری پینٹ کی گریز خراب نہ ہو جاتی؟ میں نے شہزادے کے ہاتھوں دلوا دیا تحفہ۔ اچھا ہے نا؟“

”بہت بہت۔ بہت سچی خوشی سے سب کے چہرے جگمگا رہے تھے۔ حلد کے گھر کے سامنے بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ حلد ان کے اترنے سے پہلے آیا۔“

”ایاز! دراصل پروگرام کچھ بدل گیا ہے۔ اصل میں ہماری بڑی بیٹی کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ لڑکا مجھے پسند آیا۔ لڑکا لندن جا رہا ہے پرسوں۔ تو اب جیسی میں چھٹی طے ہو گئی آج کے دن۔“ حلد نے انہیں بتایا کہ اب یہ فنکشن سبزہ زار میں یعنی کسی بڑے لان میں منعقد ہو رہا ہے۔ اس نے بتا سبھا۔

شہزاد نے ہنس کر کہا۔ ”دیکھا میرا اندازہ۔ لان میں سردی سے ٹھہر تیں۔ لوگ کہتے بے چاری کے پاس شال تک نہیں ہے۔“

”بھئی داؤد مجھے بخو۔“
”میں تو سمجھی تم کوئی تحفہ لینے اترے ہو۔ اسٹور کے سامنے۔“ اماں سے رہانہ گیا۔ دل کی جلن نکال۔

”اب میں فٹ ہاتھ پر گھٹنے ٹیک کر تحفہ دیتا اچھا لگتا کیا؟ میری پینٹ کی گریز خراب نہ ہو جاتی؟ میں نے شہزادے کے ہاتھوں دلوا دیا تحفہ۔ اچھا ہے نا؟“

”بہت بہت۔ بہت سچی خوشی سے سب کے چہرے جگمگا رہے تھے۔ حلد کے گھر کے سامنے بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ حلد ان کے اترنے سے پہلے آیا۔“

”ایاز! دراصل پروگرام کچھ بدل گیا ہے۔ اصل میں ہماری بڑی بیٹی کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ لڑکا مجھے پسند آیا۔ لڑکا لندن جا رہا ہے پرسوں۔ تو اب جیسی میں چھٹی طے ہو گئی آج کے دن۔“ حلد نے انہیں بتایا کہ اب یہ فنکشن سبزہ زار میں یعنی کسی بڑے لان میں منعقد ہو رہا ہے۔ اس نے بتا سبھا۔

شہزاد نے ہنس کر کہا۔ ”دیکھا میرا اندازہ۔ لان میں سردی سے ٹھہر تیں۔ لوگ کہتے بے چاری کے پاس شال تک نہیں ہے۔“

”بھئی داؤد مجھے بخو۔“
”میں تو سمجھی تم کوئی تحفہ لینے اترے ہو۔ اسٹور کے سامنے۔“ اماں سے رہانہ گیا۔ دل کی جلن نکال۔

”صحیح کہا۔ تحفہ ہی لیا ہے۔ بیگم کے لیے اکلوتی ہے تو ذرا۔ خیال کرنا پڑتا ہے نال۔ امل۔“

”اور پھر کہتے ہو۔ تمہاری آمدنی کم ہے۔ حیثیت صفر ہے۔ اس۔ اتنی مہنگی شال فصول خیرجی ہے کہ نہیں۔“ امل بدل کے پھپھو لے پھوڑ رہی تھیں۔

”جی، آمدنی بے شک مہنگائی کے حساب سے کم ہے۔ لیکن اس میں برکت ہے۔ ایک وجہ تو میری بیگم کی نیک نیتی، محنت، مشقت، کفایت دوسرے بچوں کا صبر اور نیت سیری۔ شکر ادا کرنا ہوں اس باری تعالیٰ کا جس نے مجھ بے حیثیت کو ایسے قیمتی بہرے جو اہرات سے نوازا ہے۔ میری بیٹیاں۔ میرا بیٹا اور بیگم۔“

”آبی آبی کچھ پڑھ کر پھونک دو ای۔ پر۔ نظر نہ لگ جائے کسی کی۔ کیسی چاند چو ستارہ آنکھیں ہیں۔“

یعنی حمنہ کو ہلائے جا رہی تھی۔ دلدی کی پُرخیز لفظوں کی پروا کیے بغیر۔

”چکی پیچی رہو۔ میں نے گھر سے نکلتے وقت ای ابو دلدیوں پر پڑھ کر پھونک دیا تھا۔ لالہ لطف نظر نہ لگنے کے لیے۔“

شہزاد کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ”ویسے کہیں کی بات ہے۔ جتنا میرے بچوں کو میرے حسن کا احساس ہے۔ اور جس طرح یہ سراپے ہیں۔ میری امل کو کبھی مجھ پر پیار نہیں آیا۔ نہ انہوں نے مجھ پر پڑھ کر پھونکا کبھی۔ میں نے تو ان کی ڈانٹیں اور صلواتیں ہی سنیں۔ تلاقی نافرمانی کی۔ سند کے طور پر۔“

”اے۔ اے۔ اے۔“ ہم ظاہر نہیں کرتے۔ بس یہ ہے کہ۔ ارے کوئی اکلوتے تو تھے نہیں تم۔“ ہٹا کر سنبھل گئیں۔

”اچھا نہیں لگتا بغیر تحفہ دیے پرانی میں۔“ فضا موضوع بدلنے میں کامیاب ہو گئی۔

”بھئی تم اپنی شال دے دینا۔ جتنی رقم تھی اس سے خرید ل۔ اب جیب خالی ہے۔“

”نائیں نائیں۔“ پچھلے بچوں والے عوام بے قرار تھے۔ دادی دانت پیسنے لگیں۔ (ملی تھے۔ مگر رگڑ تو کھاتے تھے) سا لگرہ یا متکئی والا لان دور سے نظر آ

گیا۔ گاڑیاں ہی گاڑیاں۔

”میں نے کہا شہزاد! امل فکر مندی سے بولیں۔“

”لوگ تو بہت پیسے والے لگ رہے ہیں۔ دیکھو تو۔ بڑی بڑی گاڑیاں اور کتنے لوگوں کو بلا لیا ہے۔ پتا نہیں۔“

”کوئی بات نہیں دادی۔ ہماری گاڑی بھی خاصی بڑی ہے۔ ہم کسی سے کم نہیں۔“ ایاز پُرجوش تھا۔

”اچھا سب اترو۔ ایاز دادی کا ہاتھ پکڑ کر چلو۔“

سانے حلد کی بیگم کھڑی ہیں۔ میں گاڑی پارک کر کے آتا ہوں۔“

حلد کے گھروالے سامنے ہی تھے۔ بیگم حلد فضا کو پہچان کر آگے بڑھیں۔ سب کو اندر لے گئیں۔ کافی وسیع لان تھا اور لوگ بھی زیادہ تھے۔ دلدی کو ایک صوفے پر بٹھا کر سب ادھر ادھر ہو گئے۔ حمنہ کو ایک دوست مل گئی۔ یعنی کو اپنی نچر نظر آ گئیں۔ فضا کو منر حلد اپنی سدر من سے ملانے لے گئیں۔ ایاز شہزاد کے پاس چلا گیا۔ جو حلد کے ساتھ تھا۔ حلد کھو کر رہے تھے۔

”یار! سا لگرہ تو چھوٹی سی رسم تھی بس۔ یہ تو متکئی کے شوشے نے فضا کشن بڑا بنا دیا۔ بچے کے لیے تمہارا تحفہ بہت بڑا ہے۔“

”بچہ تو خوش ہے۔“ شہزاد نے حلد کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ”بس یہی میرا مقصد تھا۔“

حلد کا بیٹا سا نیل چلا رہا تھا۔ کھنٹی بجا کر شہزاد اور حلد کو بھی خوش ہو کر دیکھ رہا تھا۔ ایاز نے فخریہ انداز میں باپ کو دیکھا۔ ابو نے تحفہ یقیناً پہلے ہی لے کر ڈنگ میں چھپایا ہو گا۔ گو کہ لوگ تو بہت تھے۔ مگر حلد صاحب عرصہ دراز امریکہ میں رہ کر بھی پرانے خیالات کے ختمے سا لگرہ میں کب نہیں۔ مٹھائیاں تھیں اور حاضرین کی دعائیں۔ متکئی کی رسم کے بعد کھانا ہوا۔ گھر آتے آتے دیر ہو گئی۔ ٹھنڈ خاصی بڑھ گئی۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے شہزاد نے دیکھا۔ فضا جھرجھری لے کر شال کو جسم سے لپیٹ رہی تھی۔ مسکرایا۔

امل نے کہا۔ ”متکئی میں کسی نے بھی کچھ نہ دیا۔ رقم نہ تحفہ، یہ کیسی متکئی تھی بھلا؟“

پکوانی رہی۔ آپ نے فضاء کی اکلوتی مثال بھی سیکھ کر دلوادی۔ یہ کوئی خاص بڑی بات نہیں۔ لیکن ان کے لیے جن کے پاس سب چیزیں وافر ہوں۔ کہنے پر مجبور ہوں کہ سیکھ کر آپ جتنا بھی غریب ظاہر کریں۔ اس کے چاروں بچے جس اسکول میں پڑھتے ہیں۔ وہاں کی فیس یعنی کیا ان کے اسکول سے چار گنا زیادہ ہے۔ آپ کو سیکھنے کی غمت نظر آتی ہے۔ میرے گھر میں شہنشاہی جہاں وہ بچوں کو لاکر کھاتی کر رات کے لیے بھی اٹھالے جاتی رہی۔ میرے بچے دال سبزی کھاتے رہے اور اس بات کی خبر مجھے مہینہ بھر کے بعد ہوئی۔ کسی نے بتانا درکنار اشارہ بھی نہیں کیا۔ فضاء کی وجہ سے اماں میں نے بہت کوشش کی آپ کو خوش کرنے خوش رکھنے کی۔ آپ مجھے فضاء کے خلاف شکایتیں کر کے غصہ دلاتی تھیں میں آپ کی ہدایت پر اس سے لڑتا تھا۔ چننا چلا آتا تھا۔ آپ چاہتی تھیں میں اسے حقیر مکر سمجھوں۔ اس کی اوقات یاد دلاتا ہوں۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں اپنی وفا شعار نیک سرشت بیوی کو بے جا ذلیل کر کے اس کے حوصلے پست کر رہا ہوں۔ وہ خوف زدہ رہتی ہے۔ وہ کب ہنسنا بھول گئی۔ مجھے اندازہ ہی نہیں۔ ”سائنس درست کرنے لگا۔“

”خیر۔ اب تو تم نے اتنی مستی مثال لے کر اس کے حوالے کر دی۔ پھر وہ اب کیا چاہتی ہے؟“ اماں کا کلیجہ جل رہا تھا تعریف سن کر۔

”وہ کچھ چاہتی ہوتی۔ تو۔۔۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں۔ بچوں کے سامنے ان کی ماں کی یا خود ان کی بھی چیز لے کر کسی سیکھنے کسی مائدہ کے لیے نہ لے لیا کریں۔ پھر وہ ہر چیز آپ سے چھپایا کریں گے اور پھر۔۔۔ ان کی عادت بن جائے گی۔ میں نے کب آپ کے کسی حکم سے سرباکی کی۔ آپ نے کیا سیکھنے کی شادی میرے ذمے ہے۔ میری حیثیت نہ تھی مگر میں نے قرض لیا۔ وہ قرض میں دس سال تک ادا کرنا رہا۔ کبھی نوکری ختم ہو گئی۔ کبھی منگانی نے جینا حرام کر دیا۔ پھر میرے اخراجات بڑھ گئے۔ جب جب آپ نے کہا۔ میں مائدہ سیکھنے اور ان کے بچوں کو تحائف بھی دیتا

”بہت سادہ لوگ ہیں۔ حامد نے سختی سے منع کیا تھا۔ یہ لوگ شان و شوکت دکھانے کے قائل نہیں ہیں۔ سادگی میں تصنع نہیں ہوتا۔ میں بھی ایسے ہی کروں گا۔ بہانہ بھی ہے کہ کبھی مذہب سادگی کا حکم دیتا ہے۔“

”اوتی لوگ کیا کہیں گے۔“

”اماں! اتنا قیمتی بہانہ ہے۔ میرے پاس تو دکھانے کے لیے شان ہے نہ شوکت۔ نبھ جائے گی۔“

گھر آکر سب نے لباس تبدیل کیے۔ شہزاد نے فضاء کی تہ کی ہوئی مثال اٹھائی اور اماں کے کمرے میں چلا گیا۔ یعنی اچھا اتر گیا۔ حمزہ کو دیکھا۔ وہ بھی متاثر تھی۔ اماں لیٹ چکی تھیں۔ شہزاد نے ان کے پاس مثال رکھ دی۔

”یہ مثال بس آپ کی ہوئی۔ میں دراصل صرف اس لیے آپ کے پاس آیا ہوں کہ واضح کر دوں میں آپ کا۔ میرا گھر میری ہر چیز آپ کی جو چاہیں یہاں سے لے لیں۔ کسی کو دے دیں۔ پھینک دیں۔ مجھے اعتراض نہیں ہو گا۔ لیکن بس اتنی درخواست ہے کہ بچوں کے سامنے ایسی کی ماں کی کوئی چیز لے کر کسی کو نہ دیا کریں۔ وہ آپ سے کچھ کہتے نہیں۔ لیکن انہیں بہت محسوس ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کی طرف سے ان کا دل برا ہو۔“

”آئے ہائے۔ لو اب کیا میرا اتنا بھی حق نہیں۔“

اماں کچھ گڑبڑا گئیں۔

”میں کہہ رہا ہوں۔ میں میرا گھر آپ کا ہے۔ جو چاہے لیں۔ لیکن اماں! جب آپ مائدہ اور سیکھنے کی غمت اور ضرورت کا ذکر کرتی ہیں۔ بچے ہنستے ہوں گے جیسے مجھے آپ کی بات پر ہنسی آتی ہے۔“

”لو تو میں کیا جھوٹ کہتی ہوں اور اے یہ جو تمہاری بیوی ہے تھڑکی۔ وہی سکھاتی ہے بچوں کو۔“

”یہ غلط فہمی بھی دور کر لیں۔ وہ کسی سے کچھ نہیں کہتی۔ اس نے مجھ سے بھی کبھی نہیں کہا۔ آپ نے اس کا سوئیٹر لے لیا۔ گلاس بھی مائدہ کو دے دیے۔ سیکھنے یہاں روز آکر کھانے کھاتی رہی، فرمائش کر کے

رہا۔ جو ظاہر ہے ان کی حیثیت کے نہیں ہوتے تھے۔ آپ نے جو گلاس مائدہ کو دیے۔ وہ مائدہ نے اپنی ملازمہ کو دے دیے۔ ترس کھا کر کہ تو کر کے بچے بھی بیٹھے کے گلاس کا لطف اٹھالیں۔ کیونکہ ان کے گھر دیسی برتنوں کا دخل نہیں۔ رکھ کر کہاڑ کیوں جمع کریں۔“

”اے لو۔ یہ تو وہی مثل ہوئی۔ لو کمخت یادداشت۔ آ۔ یہ بڑھاپا بھی۔“ پنڈلی مچھانے لگیں جیسے یادداشت پیروں میں مثل ہو گئی ہو۔

”میں بہت روک کر فضا کو خرچ دیتا ہوں۔ پتا نہیں۔ کیسے وہ پورا کرتی ہے۔ حیران ہوں۔“

”خیر اب اتنی ہنسی محسوس بھی نہیں۔ لو بھلا پھر جب نہیں پتا ہے تو کیوں اتنا کہہ دیتے ہو۔“

”کیونکہ میں نے قسطوں پر ایک پلاٹ خریدا ہے۔ اس کی قسطیں ادا کر کے ادھ موا ہو گیا۔ اپنے بچوں کو اور کچھ تو دے نہ سکا۔ کم از کم ایک گھری دے دوں۔ سوچا تھا آدھا پلاٹ بیچ کر اس رقم سے گھر بنالوں گا۔ وہ بھی۔ ممکن ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ یہ حالات ہیں میرے۔“

”اچھا! مگر بیوی کے لیے شال تو لے لی۔ اتنی مہنگی۔“ شال کا صدمہ نکلتا نہ تھا دل سے۔

”وہ بھی اپنی عزت بچانے کے لیے۔ دے تو رہا ہوں آپ کو۔ دے دیں اپنی کسی غریب غریبا بیٹی کو۔“

شہزاد کا دل بھی دکھ گیا تھا۔

”اے اللہ نہ کرے کوئی بیٹی غریب ہو۔۔۔ اے واہ! بس بھیا، دیکھ لیا تمہارا حوصلہ۔ بہت حقوق ہوتے ہیں بہنوں کے۔ ذرا سادے کر غریب ہو جاتے ہو تم۔“

”حقوق تو سب کے ہوتے ہیں۔ ایک صرف میری بیوی بچوں کے نہیں یہی چاہتی ہیں آپ اور سنیچے۔“

مائدہ کے میاں نے اپنی چاروں بیٹیوں کے لیے بنگلے لے لیے ہیں۔ جینز میں فریضہ کر کے دیں گے۔ بیٹوں کے لیے جھی کروٹوں کے بنگلے لیے جا رہے ہیں۔ پجاری سیکنہ کے گھر نئے ماڈل کی گاڑی آگئی ہے۔ میرے پاس گھر بنانے کے لیے رقم نہیں۔ میری بیوی کے پاس نئے کپڑے نہیں۔ اس کے پاس کوئی اچھا

سوٹر نہیں۔ اماں مجھے آپ سے صرف دعائیں ہی چاہئیں۔ انصاف چاہیے۔ لیکن وہ بھی آپ دینے کو تیار نہیں۔ بچپن سے اپنے نکتے پر نالا لٹی، نافرمانی کے الزام سنا آیا ہوں۔ میری شادی بھی ایک کمر خانہ ان کی لڑکی سے آپ نے کر دی کیونکہ مجھے جیسے ناکارہ آدمی کو خاندان والے اپنا پرتیار نہ تھے۔ آپ کو خوش کرنے، آپ کی خواہشیں پوری کرنے کے شوق میں اپنی بیوی بچوں سے نا انصافی کرتا رہا۔ پتا نہیں میرا کون سا گناہ تھا کہ آپ کو خوش نہ کر سکا۔ فضا بدنیت ہوتی۔ تو نہ جانے کیا ہوتا۔ اب اور کچھ نہیں کہنا۔ سوائے اس بات کے کہ بچوں کو خود سے دور نہ کریں۔ انہیں آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کے دست شفقت کی۔ مجھے صرف دعائیں۔“

شہزاد نے اماں کے پیر پکڑ لیے تھے۔ اب وہ جذباتی ہو کر رو رہا تھا۔ اماں کا دل بھی گداز ہوا۔ شہزاد کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

”ارے ارے اٹھ، کیا بچوں کی طرح ٹسوے بہا رہا ہے۔ چل معاف کیا۔ امیرے پاس بیٹھ۔ ہائیں مرد ہو کر آسو۔ توبہ توبہ۔“

شکوے تمام ہوئے۔ اماں نے بھی نرمی برت کر گلے لگایا۔



کچھ عرصہ پہلی کی بات ہے۔ وہ بہت پریشان تھا۔ یوں ہی بھائی جان کے گھر چلا گیا۔ وہ سرحال ایک تجربہ کار ماہر تعمیرات تو تھے ہی۔ محبت کرنے والے خیر خواہ بھائی بھی تھے۔ ان کے پاس ایک شخص بیٹھا تھا۔ وہ کچھ دیر حمزہ اور ماہم سے باتیں کر کے اس شخص کے جانے کے بعد بھائی جان کے پاس گیا۔ ان کے سامنے مسئلہ پیش کیا۔ کچھ دیر تفصیلات بیان کیں۔ بھائی جان نے بتایا۔

”یہ شخص جو اٹھ کر گیا ہے۔ یہ براہی ڈیلر تھا۔ مجھے ایک اچھا سہا پلاٹ جو بہترین علاقے میں ہو۔ درکار ہے۔ حمزہ کے لیے الگ گھر۔ کنجائش والا۔ کیونکہ یہ

بات بھی جان لیتے تھے۔ بیوی کے لیے تم نے کیا کیا؟“
 شہزاد حیران تھا۔ ”اس نے آپ سے کچھ کہا۔“
 ”افسوس تو یہی ہے کہ اس نے مجھے جھٹائی سمجھا،
 بس نہیں۔ بھی زبان نہیں کھولی۔ جب آئی تھی تو
 کیسی کھلے گلاب جیسی شلوار تھی۔ ہنس کھ پھرتی تھی۔
 ہر کام میں پیش پیش۔ حمزہ اور ایمان سے بھینتی تھی۔
 سب کے ساتھ تمیز تہذیب انہایت سے ملتی
 ۔ تم نے کیا کر دیا ہے بات کا جواب دیتے بھی
 اس کی زبان اٹکتی ہے۔ ہر وقت سہمی ہوئی۔ جیسے اسے
 کوئی خوف ہو۔ کیوں آخر؟“

شہزاد ماضی میں کھو گیا۔ شادی ہو کر آئی تو لوگ کہتے
 تھے۔ ایسی حسین، سو تو خاندان میں کسی کی نہیں۔ شہزاد
 کو اس سے عشق ہو گیا تھا وہ اس کے عشق میں شاعری
 کرنے لگا۔ آتے ہی سب کو اپنا گرویدہ بتا لیا۔ وہ اسے
 شعر سناتا۔ کھل کر ہنست۔ یا شرمناک رہا کرتی۔ لوگ
 کہتے۔ شہزاد مجتوں ہو گیا ہے۔ اب اب کیا ہوا کہاں
 گئے وہ مجھے دن سہلی راتیں۔

”مجھے تم سے بات کرنی تھی۔ مگر مناسب نہیں لگا۔
 تم یہ نہ سمجھو کہ میں تمہارے گھریلو معاملے میں
 مداخلت کر رہی ہوں۔“ بھابی کچھ دیر ٹھہر کر گویا
 ہوئیں۔

”نہیں نہیں بھابی کہہیے۔ میری کوئی غلطی۔ خطا
 آپ کا مجھ پر میرے گھر پر حق ہے۔ بولیں۔“
 ”شاید اب بھی میں نہ بولتی۔ اگر۔“

وہ پھر چپ ہو گئیں اس اثنا میں بھائی جان باہر چلے
 گئے تھے اور کسی کو فون کر رہے تھے۔ وہ منظر نظروں
 سے بھابی کو دیکھنے لگا۔

”ہو ایہ کہ۔۔۔ تین چار دن پہلے بلکہ شاید ہفتہ ہوا۔
 بس اسٹاپ پر یا ہم کو حتمہ نظر آئی۔ ماہم نے اسے لفٹ
 کی آفر کی۔ حتمہ کی دین خراب ہو گئی تھی۔ ماہم اسے
 گھر لے آئی۔ میں نے فضا کو فون کر دیا۔ حتمہ تو فوراً
 گھر جانے کے لیے بے قرار تھی مگر میں نے روک لیا۔
 میرے بہت پوچھنے پر اس نے بتایا کہ سارا دن کام کر کر
 کے تھکان کی وجہ سے امی کالی پی لو ہو جاتا ہے تو میں ان

والا گھر میں بیٹیوں کے نام کر چکا ہوں۔ خواہش تو یہی
 تھی کہ تم بھی قریب رہو۔ پہلے تم نے بتایا ہی نہیں کہ
 کوئی پلاٹ تم لے چکے ہو۔ میں خواہ مخواہ ادھر ادھر بھٹکتا
 رہا۔ اسی پلاٹ میں دونوں گھر بن سکتے ہیں۔ درمیان
 میں لان مشترکہ ہو گا۔ فیصلہ۔“
 شہزاد دنگ رہ گیا۔ ایسا صحیح فیصلہ سوچا بھی نہ تھا۔ نہ
 ہی علم تھا کہ بھائی جان کی پلاٹ کی تلاش میں ہیں۔
 ”بھائی جان۔ لیکن میں تو فی الحال گھر بنانے کی
 پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”بھئی۔ تم سے کون بنانے کا کہہ رہا ہے۔ جو زمین
 میں لوں گا۔ اس کی قیمت میں تمہارا گھر بنے گا۔ شاید
 رقم بچ بھی جائے۔ چلتے ہیں کل پھر۔“ وہ سرشار ہو
 گیا۔ بھائی جان نے بھابی کو آواز دے کر خوش خبری
 سنائی۔ منصوبہ ان کے گوش گزار کیا۔ وہ منتظر ہو
 گئیں۔

”تم نے فضا سے پوچھ لیا ہے؟“
 ”فضہ سے۔۔۔ اسے تو یہ بھی علم نہیں کہ میں پلاٹ
 لے چکا ہوں۔ اور یہ پروگرام تو ابھی بھائی جان نے بتایا
 ہے۔ یوں بھی دھڑکے کسی معاملے سے اختلاف
 نہیں کرتی۔“

”شہزاد! تم نے اسے بہت دباؤ میں رکھا ہے۔ زیادتی
 ہے اس کے ساتھ۔ کہیں تو اسے بولنے کا حق ہونا
 چاہیے۔ اس کی مرضی کوئی خواہش۔ کوئی اختیار تو وہ۔
 وہ تو ایک مشین بنی ہوئی ہے۔“

”اس میں ایسی کوئی صلاحیت ہی نہیں۔ اگر اس کی
 کوئی مرضی ہے۔ بھی تو ظاہر نہیں کرتی۔“

”جو عورت بیس سال سے تمہارے بھلے پرے
 وقت کی ساتھی ہے۔ خوش اسلوبی سے کم آمدنی میں گھر
 چلا رہی ہے۔ بچوں کی اعلا تربیت کر رہی ہے۔ ہمیں
 اس کے خیالات، اس کی مرضی کا علم نہیں؟ افسوس
 شہزاد! تم پہلے اتنے بے حس تو نہ تھے۔“ بھابی واقعی
 متاسف تھیں۔ ”یائتم نے اسے اس قاتل سمجھا ہی
 نہیں۔ تم ایسے تو نہ تھے شہزاد۔ مجھے یاد ہے۔ تم میری
 ولایت میں بہنوں سے لڑ پڑتے تھے۔ میرے دل کی

کی کچھ مدد کر دیتی ہوں۔ خصوصاً جب دوا دی ہوتی ہیں تو امی کو ایک لمحے کی فرصت نہیں ملتی۔“ وہ جب یہ کہہ رہی تھی تو مجھے حیرت ہوئی کہ کون سی اہم بات ہے۔ جب میں نے کئی بار پوچھا تو گھبرا گئی۔ کہ شاید اس نے غلط بات کر دی ہے۔ میرے اصرار پر

حنہ کا حوصلہ بڑھا۔ یا اس کا ضبط جواب دے گیا۔ اس شرط پر کہ میں اس کی کئی باتیں فوضہ کو ہرگز نہ بتاؤں گی۔ اس نے میرے سامنے دل کھول کر رکھ دیا۔ اس نے بتایا کہ عام دنوں میں تو جو ابو خرچ کی رقم دیتے ہیں۔ اس میں اسی کچھ بچا بھی لگتی ہیں۔ لیکن جب دوا دی آتی ہیں۔ وہ فرمائش کر کے نئی نئی چیزیں بنواتی ہیں۔ لیکن اگر دوا کی کا معاملہ ہی ہوتا تو کچھ خرچ نہ تھا۔ وہ تو دراصل سیکنہ پچھو کی فرمائش ہوتی ہے۔ وہ اسکول سے بچوں کو لے کر دوا دی سے ملنے آتی ہیں۔ کھانا کھا کر بچا ہوا گھر لے جاتی ہیں۔ ان دنوں امی بہت مشکل سے خرچ چلائی ہیں۔ کچھ بچتا ہی نہیں یہاں تک کہ ہمیں بچ کے لیے بھی کچھ بنا کر نہیں دے سکتیں۔ ہمیں بچے ہوئے یا مکی کے دانوں سے گزارا کرنا پڑتا ہے۔ اور بھی کیا کیا بتاتی رہی۔ تمہاری فوضہ سے قحطی۔ دوا دی کی شکایت پر فوضہ سے لڑنا جھگڑنا۔ امی خوف زدہ رہتی ہیں۔ کیونکہ دوا دی نے کئی بار ان کو دھمکی دی ہے کہ وہ جب چاہیں امی کو طلاق۔ کچھ بولتی اس لیے نہیں کہ کچھ بتائیں کس بات کا براہنہ کر ابو کوئی انتہائی قدم نہ اٹھالیں۔“

حنہ بہت رنجیدہ تھی۔ احساسات زخمی ہیں۔ شہزاد! مجھے افسوس ہے۔ تم بغیر کسی تحقیق کے فوضہ سے الجھتے ہو۔ اسے صفائی کا موقع بھی تو دو۔ یہ کون سی مراد لگی ہے۔ تمہیں علم ہے فوضہ کی ماں نے یتیم بچوں کی کفالت میں کتنے دکھ اٹھائے ہیں۔ وہ ڈرتی ہے کہ اب اس عمر میں طلاق کا نیکہ لگا کر وہاں گئی۔ تو ماں تو برداشت ہی نہیں کریں گی۔ اچھا ہاں ایک بات اور اس نے بتائی۔ میں پھر کہتی ہوں کہ میرا مقصد تمہیں ماں کے خلاف بھڑکانا ہرگز نہیں۔ پہلے انہوں نے مجھے پھر

رعتا کو بھی بلکہ تمہارے بھائی جان بھڑاؤ کو بھی اپنے طریقوں پر چلانے کی کوشش کی۔ مگر ان کی ایک نہ چلی۔ پھر وہ کمزور کو قابو کرنے کے لیے ایک کم عمر یتیم لڑکی تمہارے لیے لے آئیں۔ جو ان کی مشاکے مطابق دب کر رہے۔ خیر میں تو وہ قصہ بتانا چاہتی ہوں۔ ہوا یہ تھا کہ ماں نے ملازمہ سے فوضہ کے بارے میں نامناسب الفاظ میں کہا کہ فوضہ ایک معمولی گھر کی غریب لڑکی ہے جس کی ماں نے نوکری کر کے بچے پالے۔ ہمارا جوڑ نہ تھا مگر مجھے شکل پسند آئی۔ فوضہ کو بہت شرم آئی وہ ماں سے پوچھ بیٹھی کہ جب کوئی جوڑ نہ تھا۔ تو مجھے کیوں پسند کیا جبکہ آپ کے خاندان میں تو بہت اچھی خوب صورت لڑکیاں بھی ہیں۔ جوڑ بھی ہے۔ یہ جرات اسے مہنگی پڑی۔ ماں نے تم سے شکایت کی اور تم فوضہ پر چڑھ دوڑے۔

فوضہ نے ملازمہ کو جواب دے دیا۔ حنہ بتا رہی تھی۔ امی نے کہا۔ ماں خود جو چاہیں کرتی رہیں۔ مگر میں ملازمہ کی باتیں نہیں سنوں گی۔ بہت کتروں۔ مگر اتنی نہیں کہ اپنی عزت نوکروں کے سامنے ڈاؤن لگا دوں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ خدا کے لیے فوضہ کے ساتھ توازن قائم رکھو۔ ماں سے ناانصافی نہیں کرو مگر بیوی کو اس کا جائز مقام دو۔ بچے سے رشتے ہیں۔ تمہارے تعاون اور تعاونی سی حمایت فوضہ کو خوف سے نجات دے سکتی ہے۔ دیکھو حنہ کو نہ بتانا۔ وہ بہت متاثر ہے۔“

شہزاد خاموشی سے سنتا رہا۔ کہیں بھی کوئی بات غلط نہ تھی۔ ایک ایک لفظ درست۔ بھابھی نے کچھ بھی بڑھا چڑھا کر نہیں کہا۔

”کیا کروں بھابھی! واقعی میں بتا نہیں کیوں ماں سے بحث نہیں کر سکتا فوضہ کی قربانی! تیار خد مت! محنت سب جانتا ہوں۔ مگر ماں کچھ ایسے پیرائے میں بات کرتی ہیں کہ میں۔“

”عقل بھی ہے۔ آنکھیں بھی اللہ کے فضل سے۔ پھر زبان کہاں چلی جاتی ہے۔ کبھی اس کے منہ پر تعریف ہی کر دیا کرو۔ عورت تو شوہر کے ایک لفظ پر ہی

اپنی زندگی وار دیتی ہے۔“



پھر گھر بن گیا۔ شہزاد تو خوش تھا ہی۔ فضا تو نہ تھی۔ اپنا ذاتی گھر۔ اسے شہزاد سے بالکل یہ توقع نہ تھی کہ وہ گھر فضا کے نام کرے گا۔ اسے اپنی غلط فہمیوں پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ اہل نے تو بڑے بیٹے کو بھی ڈانڈا۔ کہ وہ شہزاد کے برابر اپنا گھر کیوں بنا رہے ہیں۔
”اہل! زمین شہزاد کی ہے اور آپ کو پتا ہے آج کل لڑکے ترقی کے لیے امریکہ چلے جاتے ہیں۔ میں بڑھاپے میں شہزاد کے ساتھ رہ کر مطمئن تو رہوں گا۔“
شہزاد نے گھر سمجھ لایا تو سب کی دعوت کی۔ سب بے حد خوش تھے۔ سب لوگ تحفے لائے تھے عموماً اشیاء ضرورت۔

بڑی تپا سب کے جوڑے بھی لائیں پھلوں کا ٹوکرا اور سبزی۔ مٹھائی کے ڈبے۔ زبردست دعوت ہو گئی۔ بچوں نے خوب رونق لگائی۔ حمزہ اور ایاز نے گانے گائے۔ بڑی تپا کا بیٹا نکلیں کر کے ہنسا رہا۔ پھر بڑی تپا نے کھڑے ہو کر اعلان کیا۔ مجھے کچھ کتنا ہے۔ سب چپ ہو گئے۔

”صاحبو! بات کچھ یوں ہے۔ کہ میں اپنے بیٹے عاصم کے لیے شہزاد اور فضا سے ان کی بیٹی حمزہ کا رشتہ مانگنے آئی ہوں۔“

سانا۔ ہر سمت سانا۔ اہل کے ہاتھ سے چمچہ فرش پر گرا۔ اہل نے بیٹی کا بازو جھٹکا۔

”ناگل ہو گئی حلیہ۔ یہاں سے کچھ ملنے والا نہیں۔“ سرگوشی تھی۔

انہوں نے غور نہ کیا۔ عین فضا کے سامنے بیٹھ گئیں۔ دوپٹے کی جھولی پھیلا کر۔

”فضا! عرضہ سے خواہش لیے بیٹھی ہوں کہ وہ وقت آئے اور تم سے سوال کروں۔ آج پورے

خاندان کی موجودگی میں جھولی پھیلائے بیٹھی ہوں۔ تمہیں پورا اختیار ہے۔ جو بھی فیصلہ کرو گی۔ مجھے جان دو

دل سے قبول ہو گا۔“ فضا دم بخود۔

”فضا کو کیوں باپ کا اختیار ہوتا ہے۔ شہزاد سے

شہزاد پر تک بھابھی کے جلال کا شکار بیٹھا رہا۔ پھر ان سے وعدہ کر کے اٹھا اور اس دن کے بعد سے سب کچھ درست بھی ہونے لگا۔ شہزاد اہل کو شل دے کر گیا۔ یعنی کچھ بولی بھی تو فضا نے اسے ڈانٹ کر چپ کرادیا۔ شہزاد سکون سے لیٹا رہا۔ تسلی دیتا ہوا کہ اہل کی عزت و حرمت پر حرف نہیں آیا۔ اب بہت سی نقائص سرک رہی تھیں۔



صبح بڑی دل فریب تھی۔ ناشتے کے وقت جب اہل آئیں۔ اہل کے ہاتھ میں شل تھی۔ فضا کے کندھے پر ڈال کر کھلا۔

”ہاں بہت اچھی ہے۔ لٹفہ اوڑھنا نصیب کرے۔“

سب کے چہرے جگمگ گئے۔

پھر بھائی جان نے گھر کی تعمیر شروع کرادی۔ اہل بڑے بیٹے کے گھر جا چکی تھیں۔ وہیں انہیں یہ روح فرسا خبر ملی کہ شہزاد نے اپنا گھر فضا کے نام رجسٹر کروا دیا ہے۔ تیر تھوڑا زائد ہو گیا عین کیلچہ میں۔

”ہوں ہوں، جنم نہ دیکھا ہو یا۔ سنے آئی کھاٹ۔ ارے کو بھی اس کے نام کر دی۔ مٹی کی رہنے والی م سے کیا تمیز مگر کیا کہوں شہزاد کی عقل تو ایزی میں پڑی ہے۔ ہائے ہائے۔“

بڑی ہو پلو سے منہ چھپا کر ہنس پڑیں۔ ”اہل نصیبوں کے کھیل ہیں۔“

”شہزاد تو حمزہ کے نام سے بنا رہا ہے۔ شہزاد بھی ایاز کے نام کر دیتا۔ دیکھنا کیا چونا لگا لگے گی۔“

”ہیں؟ آپ کو کیا خطرہ ہے۔“ وہ دنگ رہ گئیں۔

”ارے۔ بڑی چٹ ہوئی ہیں یہ چھوٹے گھر کی عورتیں۔ کو بھی اچھیا کرے۔ ٹھیکانہ دیکھا دے شہزاد کو۔“

”اہل! آپ نہیں بدل سکتیں۔ دنیا بدل جائے۔“

ایوس ہو گئیں بڑی بہو۔

بلند ہوئے۔ بڑی آپا نے شہزاد سے انگوٹھی لے کر حمنہ کو پہنادی۔ اس کا منہ چومنا دعائیں دیں۔
”بڑی آپا! مجھے تو خبر نہ تھی۔ اور میرے پاس انگوٹھی ہے نہیں عاصم کے لیے۔“ شہزاد کو شرمندگی ہو رہی تھی۔

”ماموں! میں کوئی لڑکی ہوں۔ جو انگوٹھی پہنوں۔“
عاصم نے شور مچایا۔ ”آپ تو ایسا کریں۔ مجھے اس ملک کی صدارت کا بیج پہنائیں۔“
پھر قہقہے اور ہنسنے لگا۔ عاصم کے والد اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے لہکارے۔

”ادھر آؤ میرے بیٹے! میں تمہیں پہناتا ہوں جو تینوں کا تاج۔ جو تم بچپن سے پہنتے آ رہے ہو۔“
عاصم نے بھاگ کر جان بچائی۔

بھابھی جان کو بھی موقع ملا۔ انہوں نے میاں سے کھسک پھسکی اور کھڑے ہو کر کہا۔ ”ہنو اور بھابھو! میری بھی ایک درخواست ہے۔ مجھے موقع دیا جائے کہ میں اپنا مدعا پیش کروں۔“

”ضرور۔ ضرور۔ ضرور کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اماں نے سیکنہ کا کندھا روک دیا۔ ”لو! یہ نہ شدد و شد۔ اب یہ کونسا مدعا پیش کریں گی۔“

”میں آج اس مبارک ساعت اور خوشی کے موقع پر شہزاد اور فضہ سے اپنے بیٹے حمنہ کے لیے یمنی کا رشتہ طلب کرنا چاہتی ہوں۔ بڑی آپا! آپ کی تھلید کر رہی ہوں۔ بزرگ کہتے ہیں۔ اچھی بات کی تھلید میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں نے دیر نہیں کی۔“

”کچھ جھنجھٹا ہٹ تحیرت بھری آوازیں۔ لڑکوں کا ہلکا ہو ہو۔ ہاتھ کے اشارے سے بھابھی نے روکا۔

”ہاں! یہی فضہ! کچھ بولو گی۔ یا جو بتائیں گھسواؤ گی۔“

”اے لو۔ بڑے بزرگ زندہ موجود۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ مجھ کج بحث کو خبر تک نہ دی۔ خود ہی۔۔۔ ارے

شہزاد کہہ رہا ہے۔ یہ تمہاری بیوی کیا فیصلے کر رہی ہے۔

لو! تاؤ۔“ اماں دہائی دے رہی تھیں۔ انہیں تو یہ بات ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

بڑی بھابھی نے اماں کے پاس آ کر کہا۔ ”اماں! بے وقوف! حمنہ کو پہناؤ۔“ بڑی آپا خفا ہوئیں۔

”ہیں؟ یہی تو بے وقوف حمنہ۔؟“ وہ برکت چلا دیا۔

”کو۔“ اماں نے ٹوکا۔

”نہیں۔ ماں کا حق افضل ہے۔ مجھے فضہ سے ہی جواب لینا ہے۔ ابھی فیصلہ کرو۔“

”ارے۔ کیا فیصلہ کرے گی۔“ اماں سیکنہ کے

ٹھوکا دینے پر بولیں۔ ہم ابھی زندہ ہیں۔“

”نہیں! مجھے فضہ سے ہی جواب لینا ہے۔“ بڑی آپا

ضدنی لہجے میں بولیں۔ ”انکار بھی قبول ہے۔“

فضہ کی اماں نے اس کو بلایا۔ فضہ جو دم بخود تھی۔

گویا ہوش میں آگئی۔ نظر اٹھا کر شہزاد کو ڈھونڈا۔ وہ

بڑے مطمئن پرسکون انداز میں کشمیری چائے کے

مزے لے رہا تھا۔

”آپا! فضہ نے گلا صاف کیا۔ خشک جو ہو رہا تھا۔

”میری کیا مجال کہ میں آپ کے سوال کے جواب میں

انکار کروں۔ آپ میری بڑی ہیں۔ قابل عزت ہیں۔

میری تقدیر دان ہیں۔ میرے بچے آپ کے ہی ہیں۔ ان

کے لیے جو بھی فیصلہ آپ کریں گی، مجھے قبول ہو گا۔

آپ نے مجھے اختیار دے کر جو میری عزت افزائی کی

ہے۔ اس کے لیے تا زندگی ممنون رہوں گی۔ حمنہ۔

آپ کی ہی ہے امانت کے طور پر میرے پاس ہے۔

جب چاہیں اپنی امانت طلب کر لیں۔“

محفل میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ مبارک

سلامت باؤ ہو۔ پھر عاصم نے فضہ کے گلے میں بازو

ڈال کر تصویر بنوائی۔ آپا نے فضہ کو لپٹا لیا۔ ایک اور

تصویر۔ حمنہ کو بلا کر فضہ کے ساتھ بٹھایا گیا۔ شہزاد کو

حمنہ کے دوسری طرف۔ آپا نے انگوٹھی نکالی۔

عاصم نے پیچھے سے اچکی۔ ”میں پہنائوں گا۔“

ہائیں ہائیں کرتی بڑی آپا مڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔

وہ شہزاد کے سامنے جھکا اور ان کے ہاتھ میں انگوٹھی

ٹھونسنے لگا۔ موٹی انگلی۔ انگوٹھی چھس گئی۔ شہزاد نے

اس کو دھب رسید کی۔

”اماں! انگوٹھی تو بہت چھوٹی ہے۔“ وہ بے چارگی سے

بولے۔

”بے وقوف! حمنہ کو پہناؤ۔“ بڑی آپا خفا ہوئیں۔

”ہیں؟ یہی تو بے وقوف حمنہ۔؟“ وہ برکت چلا دیا۔

”ہائے کتنی اچھی ہیں آپ۔ بڑی امی۔ شادی پر کیا آپ اس کے ساتھ کے بندے اور فیصلہ کس مجھے دیں گی؟“

”ہاں ضرور میری گڑبا۔“ بھابھی ہنس رہی تھیں۔
فضہ بھنارہی تھی۔ ”افوہ اس کی زبان تو میں کانوں گی۔“

خوشیوں کے ریلے میں سارے شکوے تمام دکھ بہہ گئے۔ اب ہر سمت سکھ اور چین تھا۔ آہ کتنی فکر تھی فضہ کو۔ لڑکیوں کی شادی کیسے کہاں ہوگی۔ نہ گھر کے حالات ایسے ہیں کہ کچھ چیز بنالیں۔ نہ آٹارہی اچھے تھے لیکن قدرت کے ٹھیل۔ کس آسانی سے خاندان کے دو بہترین ہیرے خود بخود جھولی میں آ گئے۔ تعلیم یافتہ باسحور۔

وہ کمرے میں شکرانے کے نفل ادا کر رہی تھی۔ مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ حلیمہ اماں کے پاس ان کی شکایتیں سن رہی تھیں۔

”حلیمہ! میں کہتی ہوں۔ تمہارا دماغ کہاں سویا ہوا ہے۔ تمہیں مائدہ کی بیٹیاں نظر نہیں آئیں؟ سبکی بہن کے بجائے اس۔ اس جلدو گرنی کی بیٹی پر رنجھ گئیں۔ ارے عقل گم ہے کیا؟ اس فتنی نے کون سی بوٹی کھلا دی۔ پہلے تم پھر وہ حسہ۔ ارے وہ تو ہمیشہ تمہاری نقل کرتی ہے۔ سینکھ کی بیٹی بھی یمنی سے بڑی ہے۔ کچھ نظر نہ آیا تم دونوں کو بتاؤ ذرا۔ شہزاد کے پاس کیا دھرا ہے۔ کو بھی کار اور جوا ہر اہت۔“

حلیمہ نے منہ بنایا۔ ”اماں مجھے گھر کی ضرورت نہیں۔ اللہ کے فضل سے میرا گھر ہے۔ مری میں کابج ہے۔ بیٹا امریکہ جا رہا ہے۔ وہ خود گھر بنالے گا۔ مجھے چیز نہیں چاہیے۔ گھر نہ کار۔ مجھے جو چاہے وہ مل چکا ہے۔ دعا کریں ہمارے بچے خوش رہیں۔“

”ارے عاصم سے پوچھا تھا؟ وہ جو دوڑو ڈکرامندہ کے گھر جاتا تھا۔ میں تو بھی پسند ہوگی کوئی۔“

”ارے نہیں۔ وہ تو انہیں بہن کہتا ہے۔ کوئی چھوٹی بہن نہیں ہے اس لیے چھوڑ چھاڑ کے لیے چلا جاتا تھا۔“

شک آپ بڑی ہیں۔ اپنی اولاد کے لیے آپ نے خود فیصلے کیے تھے۔ اب ہم اپنی اولاد کے لیے کچھ بھی کریں۔ ہاں اگر ہم کوئی غلطی کریں۔ تو آپ بے شک ٹوک سکتی ہیں۔ بڑی آپا نے خاندان کا ہیرا مانگ لیا تو میں بھی اس گھر سے موتی مانگنے کا حق رکھتی ہوں اور یہ میں شہزاد کی خواہش پر ہی مانگ رہی ہوں۔“

فضہ کو تو خوشیوں کی بھار نے اچانک ہر سمت سے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ فخر نے اس کو سر اٹھانے کا حوصلہ دیا۔ اس نے کھڑے ہو کر بھابھی کو پکارتا ہوا۔

”بھابھی! آپ کا اشارہ بھی میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ بھائی جان کی خواہش کو رد کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤں۔ اماں میری بھی بزرگ ہیں۔ مجھے ان کی اجازت درکار ہوگی۔“

”ضرور“ فضہ مجھے کب انکار ہے۔ شہزاد سے بھی جواب لینا چاہتی ہوں۔“

شہزاد پیچھے اپنے دوست حامد کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہیں سے ہاتھ ہلایا۔ ”بھابھی میں راضی ہوں۔“

پھر مبارک سلامت کا غلغلہ اٹھا اور اماں کو رائے دینے کا موقع ہی نہ ملا۔ سب گلے مل رہے تھے شہزاد بھائی جان سے عجز شہزاد سے۔ اماں کے چہرے پر تناؤ۔ سینکھ غصے میں لالوں لال۔ مائدہ ماپوسی کی تفسیر۔ بہن بھائی کسی نے بھی اس کی امیر کبیر کو بھی کار والی بیٹی کو لینے کے لیے اشارہ تک نہ کیا۔ ہائے یہ فقہی فضہ کے نصیب تو دیکھو۔ چالاکی سے سب کو منھ میں لیا ہوا ہے۔

”مگر میں اتنی خوشی تو لاتی نہیں۔ چوڑی پہنا دیتی ہوں۔“ وہ اپنی سچے ٹکوں والی چوڑی انار نے لگیں۔ یمنی کو وہ چوڑیاں بہت پسند تھیں۔ ہر سوٹ کے ساتھ مچ کرنے والی۔

یمنی خوشی میں سرشار چوڑی کلائی میں گھما رہی تھی۔ ”بڑی امی! یہ آپ واپس تو نہیں لیں گی؟ کیا یہ ہمیشہ کے لیے میری ہو گئیں؟“

بھابھی نے اس کا منہ چوم لیا۔ ”نہیں لوں گی یہ تمہاری ہو گئی۔“

”اچھا تو سیکھنے کی صائمہ۔ کیا اٹھان ہے ماشاء اللہ۔ اب بھی صاف نہ تھا۔“



شہزاد نے رات کو فضا کی تھکی تھکی صورت دیکھی۔ ”کیا ہو گیا ہے۔ اب تو خوش ہو جاؤ۔ شکر ادا کرو رب کی ذات کا۔ کس آسانی سے دونوں کے رشتے ہو گئے۔“

”برابر شکر ادا کر رہی ہوں۔ مگر ہم برابر ہی تو نہیں کر سکتے ان دونوں کی۔ جینے کے نام پر تمکا نہیں اور ہو گا کیسے؟“

”فضا۔ کیا تم نے سوچا تھا کبھی کہ اپنے ذاتی گھر کی مالک بنو گی؟ یہ اللہ کا کرم ہے۔ میں بھی ماپوس تھا۔ بھائی جان نے مدد کی۔ تعاون کیا۔ اللہ نے کیا نوازا ہے۔ یہ سب تمہاری قربانیوں اور وفاؤں کا اجر ہے۔ تو بس اسی طرح آسانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بچیوں کے نصیب بھی ان شاء اللہ اسی طرح جگمگائیں گے۔ عاصم بہت ہی نیک اور محبت والا بندہ ہے۔ حمزہ کیسا شوخ ہے۔ دونوں لڑکیوں کے ہم مزاج ہم مذاق۔“ وہ بولے۔ جارہا تھا۔ فضا سکھ کی نیند سوچتی تھی۔



رمضان شریف کی تیاری کرتے ہوئے مسلمان گھر کی طرح فضا بھی رمضان شروع ہونے سے پہلے اشیاء ضرورت منگا کر اشاک کر لیتی تھی۔ اس بار تو جذبات بھی رجوش تھے۔ نیا گھر، اپنا گھر، کچن بھی خوب صورت امریکن اسٹائل کا۔ الماریاں، درازیں، خوب صورت ٹائلوں سے مزین۔ لڑکیوں نے بھی پروگرام بنائے ہوئے تھے۔ یہ بتائیں گے۔ وہ کریں گے۔ افطار پارٹی تو ضرور دیں گے۔ بھینٹی زیادہ رجوش تھی۔

”بھئی آخر اللہ کے فضل سے ہم سرسرا والے ہیں۔ سرسرایوں کو دعوت تو دینا چاہیے۔ ہیں نا آپ۔“

حمزہ نے اس کے سر پر چپت رسید کیا۔ ”باز نہ آتا۔ امی زبان کاٹ لیں گی۔ کھٹنا ایک دن۔“

”ہائے اللہ تو اس میں جھوٹ کیا ہے۔ امی بھی تو اپنی سرسرا والوں کی افطار پارٹی کرتی ہیں ہر سال۔ اب

”رہنے دیں اٹھان کو لے کر کیا کرنا ہے۔ عقل نہ شعور۔ فیشن کی ماری۔ سیکھنے کے گھر کا ماحول ہی مجھے پسند نہیں۔ بد مزاج میاں بیوی۔ حسد کی ماری سیکھنے۔ نہ مندوں سے بنا کر رہی نہ دیورانی سے اور تو اور بھلا جوں سے بھی جلتی ہے۔ اور ماندہ سے ہی کب بنتی ہے اس کی۔ میں پاگل ہوں جو عاصم کو مصیبت میں ڈالوں۔ بس ہو گیا نا۔ اب کیا میں بات کہہ کر پھر جاؤں؟“

”اور اس کو تو دیکھو۔ بھانجی، میری ارے بھاپ نہ لگنے دی مجھے۔ وہی لے لیتی ماندہ کی بنی۔“

”اماں! ماندہ کی فکر نہ کریں۔ امیر لوگوں کی لڑکیوں کو شادی کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ ہو جائیں گی ان کی شادیاں۔ جیسی وہ ہیں۔ غرور کی ماری۔ کسی کو اپنے برابر کب سمجھتی ہیں۔ بھائی جان کو ان کے طور طریقے پسند نہیں۔ شہزاد تو سب کالا ڈالا ہے۔ فضا نے اور گھر کو چار چاند لگا دیے۔“

”چار چاند اے خاک۔ دھول مٹی، چار چیزیں تو لڑکیوں کے لیے جمع نہ کر سکی پھوٹر عورت۔“

”چار چیزیں چار دن چلتی ہیں۔ بچوں کی جو تربیت فضا نے کی ہے۔ وہ آئندہ نسلوں تک چلے گی۔ اور اماں تربیت ہی اچھے خاندان کی نشانی ہوتی ہے۔ مان لیں آپ کہ فضا نہ صرف تیز دار، صابر، شاکر بلکہ اعلا ظرف، اعلا دماغ ہے۔ جس طرح گھر کو چمکایا بغیر کسی مدد کے۔ جیسی تربیت کی۔ اور شہزاد کی عزت کا بھرم رکھا۔ یہ آپ کے امیر خاندان کی لڑکی بھی نہ کرتی۔ کم آمدنی، محدود وسائل، شکوہ نہ شکایت، لڑکیاں بھی ہیرے موتی میں تولے جانے والی۔ کسی سے بھی رائے لے لیں۔“

”بس بس۔ بہت کرلی مدح سرائی۔ پہلے بھی تم شہزاد کی حمایتی تھیں۔ اب فضا کی، ایک معمولی خاندان کی لڑکی کو ہم نے اپنے برابر لا بٹھایا۔ اب اسے آسمان تک نہ چڑھاؤ۔“ کچھ چھی ہو۔ اماں کا دل فضا کی طرف سے

ہماری سرال بھی شامل ہوگی۔
”تم بھول گئیں۔ وہ سب ایک ہی خاندان ہے
ای کی میری تمہاری۔“

”سرال بھی کھئے۔ اس میں شرم کی کیا بات
ہے۔ ویسے ایک سرال ہونے سے کچھ نقصان تو
نہیں ہو گیا آپ! ہیں۔ تین الگ الگ سرالیں
ہوتیں۔ بہت سارے لوگ ہوتے۔“

”چپ امی آ رہی ہیں۔“ حمنہ نے خبردار کیا۔
دسویں روزے کو بھائی جان کے گھر افطار ڈنر تھا۔
فضہ نے کہا۔ ”آپ لوگ میرے گھر بھی افطار کے
لیے آئیے۔ جس دن کا کہیں۔“

بڑی تپانے کہا۔ ”ہلے میرے گھر افطار پارٹی ہو
گی۔ پھر تم رکھ لیتا۔ ایسا ہے کہ میں حمنہ کی عیدی لے
کر آؤں گی۔ تو یوں بھی افطار ہی ہو گیا۔ سب کو بلا لیں
گے۔ تمہاری طرف سے دعوت بھی اور میری طرف
سے عیدی۔ بلکہ حمنہ بھی یعنی کی عیدی اسی دن لے
آئیں۔“

سب نے اسے منظور کیا۔ ہلے بڑی تپانے کے ہاں
بن بھائی جمع ہوتے۔ فضہ کے گھر آنے کا طے نہیں
ہوا۔ عیدی کی چیزیں اکٹھی ہو جائیں۔ اس کے بعد تپا
دیا جائے گا۔

بیسویں روزے کو شہزاد نے آکر کہا۔ ”دو دن بعد
بڑی آیا عیدی لارہی ہیں۔“

”تم افطاری بنا لیتا۔ باورچی آکر کھانا پکالے گا۔
افطار کا ہلکا پھلکا ہی رکھنا۔ بس تم بیٹھا بنا لیتا۔“ فضہ کھیر
بنا کر دو کوئٹے فرق میں رکھ چکی تھی۔ تب اس کی امی
آگئیں۔

فضہ جانتی تھی۔ بڑی آیا اور بھابھی اس کی ماں اور
بھائی کو ہر موقع پر یاد کر کے بلاتے ہیں۔ اور اب تو فراز
کی شادی بھی ہو گئی تھی۔

”امی! دو کوئٹے کھیر کافی ہو جائیں گے۔“
”فراز کی دلہن نے بھی کھیر بنائی ہے۔ لے کر آئے
گی۔ شام کو فراز آئے گا اس کے ساتھ۔“ امی نے
بتایا۔

”امی! لکنتی اچھی ہو ہے آپ کی۔ اتنی کم عمر ہے
اسے موقع مناسب کا کتنا خیال ہے۔“
”اللہ کا شکر ہے۔ بہت سمجھ دار۔ نیک اور سعادت
مند ہے۔ مجھے تو اس نے پلنگہ بٹھا دیا ہے۔“

واقعی قاتل تعریف تھی۔ فضہ کی امی کی خالہ زاد
بہن کی بیٹی تھی۔ اس کے والد پنجاب کے زمین دار
تھے۔ لیکن پاک آرمی میں کرٹل تھے۔ انہیں فراز
بہت پسند تھا۔ انہوں نے از خود بیٹی کا رشتہ دیا تھا۔ بہت
اصرار اور احترام کے ساتھ۔

فضہ کی امی خود بہت حیران ہو گئیں۔ انہوں نے
صاف بتا دیا۔

”ان کی پوزیشن ایسی نہیں کہ آپ کی بیٹی خوش رہ
سکے۔ نہ میرا گھر اس قابل ہے۔“

انہوں نے کہا۔ ”میری بیٹی آپ کی بھانجی ہے۔
آپ کی بہن آپ کے خاندان کی ہے پھر کیا تامل۔“
غرضیکہ سب کے اصرار پر وہ رضامند ہو گئیں۔
شادی سادگی سے کرٹل صاحب کے گاؤں میں ہوئی۔
رخصت کرا کے آئیں۔ تو لڑکی کے جینز کی کھٹی میں
پنچا دیا گیا۔ سلامی میں فراز کو کار ملی۔ شہزاد اور فضہ
شادی سے واپس آئے تو شہزاد نے اماں کو بتایا۔
”اماں! وقت کیسے بدلتا ہے۔ دیکھئے آج فراز
کو روٹوں کی کوٹھی، لاٹھوں کی کار کا مالک ہے۔ اب
آپ فضہ کو غریب غریبا کہنا چھوڑ دیں۔“
اماں کو یقین ہی نہیں آتا تھا۔

فضہ کی امی نے ولیمہ کی دعوت گھر کے لان میں ہی
رکھی تھی۔ اماں پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ فراز کی
دلہن سادہ مزاج تھی۔ گو کہ گھر میں نوکر تو تھا مگر بیشتر کام
خود کرنا پسند تھا۔ اسے۔ چونکہ گاؤں میں رہائش تھی۔
خصوصاً ”عید بقر عید یا خاندان میں شادیوں کے لیے
گاؤں آکر رہنا پڑتا تھا۔ اس لیے مزاج میں رعوت نہ
تھی۔



فضہ ملازمہ سے مچھلی میں مسالہ لگوا رہی تھی۔

مہمان آنا شروع ہو گئے۔ بھابھی جان اس کی مدد کے لیے کچن میں ہی آگئیں۔ منہ، یعنی دن کے شروع میں ہی کچن کے کچھ کام کر چکی تھیں۔ چونکہ وہ اس تقریب کی اہم رکن تھیں۔ تیار ہو رہی تھی۔ یعنی سٹیلائی ہوئی آکر رہی۔

”ای! ابو! پھولوں کے بار اور گجرے بھی لے آئے ہیں۔ کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟“ فضا کچھ حیران ہوئی۔ بھابھی بننے لگیں۔

”بھئی شہزادو کچھ زیادہ ہی رُجوش ہو گئے ہیں۔ فضا کو گجرے پہنانا چاہتے ہوں گے۔ سوچا کس بہنیں پرانہ مان جائیں۔ ان کے لیے بھی لے آئے۔“ فضا مگر الجھ گئی تھی۔

”بڑی امی! ہار پھول بھی۔“
”بھئی تم بہنوں کے ہوں گے۔“ مال گئیں۔

فضا کی امی تو جا چکی تھیں مہمانوں کے پاس۔ شاید کچھ اور لوگ بھی آگئے تھے۔ آوازوں سے پتا چل رہا تھا۔ بھابھی برتن میز پر رکھ چکی تھیں۔ افطاری کی خشک چیزیں بھی جالی سے ڈھانک دیں۔ کافی مدد کر رہی تھیں۔ ورنہ وہ مجبوراً ’لو کیوں سے کروائی۔‘
”السلام علیکم آبی۔“ فراز کو دیکھ کر وہ کھل کر مسکرائی۔ ”آبی! بڑی کیا آگئی ہیں۔“

”ارے اچھا اچھا میں بس۔“ وہ پھرتی سے چمچے کانٹے ٹرے میں رکھ رہی تھی۔

”آبی! وہ بڑی کیا کارو گرام ہے کہ آج ہی نکاح ہو جائے۔ اور رخصتی بھی۔“ فراز جھجکا۔

”کیا؟ کیا کیا تم نے۔“ فضا کی سمجھ میں نہیں آیا۔
”آبی! بھائی جان کو تو بتا دیا تھا۔ وہ تو خوشی خوشی سب کو ہار پہنارہے ہیں۔“

فضا لمحہ بھر کو برف بنی۔ پھر آگ کا شعلہ اس کے دماغ سے اچھل کر باہر آیا۔ بھابھی مسکرائی تھیں۔ سامنے سے بڑی آیا آ رہی تھیں۔ ان کے پیچھے اماں بھی آ رہی تھیں۔ شاید فضا کو بلانے۔

”بڑی آیا۔۔۔ یہ فراز کیا کہہ رہا ہے۔“
بڑی۔ آپا سمجھ گئیں۔ شاید وہ بھی یہی بتانے آ رہی

ہوں گی کہ شہزاد نے منظور کر لیا ہے۔ وہ سب کو ہار پہنا رہا ہے۔ مسکرا دیں۔ گلے لگانے آگے بڑھیں۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ خشک چہرہ۔

”بھئی میں نے سوچا جو کام کل ہوتا ہے۔ وہ کیوں نہ آج ہی ہو جائے۔ عید کی خوشیاں دو بالا ہو جائیں گی۔ تمام خاندان جو جمع ہے ہی۔“

فضا ہونٹ چبانے لگی۔ ہمت کر کے بولی تو آواز بھی خشک تھی لہجہ بھی۔ ”بڑی آپا! آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اس تجویز کو منظور کر لوں گی؟“

”اگر کوئی رکاوٹ۔۔۔“ بڑی آپا نے کچھ کہنے کو منہ کھولا۔ ادھوری بات فضا نے پوری ہوئے نہ دی۔

”میں تو آپ کی بہت مشکور تھی۔ آپ نے ہمیشہ میرے ساتھ تعاون کیا۔ میری مدد کی، لیکن آج۔۔۔ آپا

بیس سال سے میں اپنے بارے میں یہی سنتی آئی ہوں گھٹیا خاندان۔ چھوٹے گھر میں یشمی میں پٹنے والی

جس کی ماں نے نوکری کر کے بچے پالے۔ ماں بہ بچ ہے۔ مگر آپ کے منہ سے کبھی میں نے یہ الفاظ نہیں

سنے تھے۔ تجھے یقین تھا کہ آپ میری عزت کرتی ہیں لیکن آج محسوس ہو رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ آپ بھی

مجھے اسی درجے میں رکھتی ہیں۔ غریب غریب۔ حقیر گلی میں چھوٹے گھر میں رہنے والی۔ بھئی تو میری بیٹی کو

یوں۔۔۔ لینے آگئی ہیں۔ ماں کو بتائے بغیر اس سے پوچھے بغیر بغیر کسی تیاری کے۔ اس لیے نا۔ کہ وہ ایک

گھٹیا ماں کی بیٹی ہے۔ جو آپ کے شایان شان بارات کا استقبال نہیں کر سکتی۔ بے مایہ، حقیر، وہ کیا جانے عزت

کس چیز کا نام ہے۔ مفت میں بیٹی کی شادی پر بہت خوش ہو جائے گی۔ مگر آپ بھول رہی ہیں۔ یاد دلا دوں

وہ آپ کے بھائی کی بیٹی ہے۔ صرف مجھ بے زر، بے مایہ کی ہی نہیں۔ آپ کا اعلا و ارفع خاندان میری بیٹی کا بھی تو ہے۔“

جوش اور اشتعال میں بولتے بولتے سانس پھول گیا۔ صبح سے افطار کی تیاری میں مصروف تھی۔

روزے کی حالت میں اس کا پی پی بھی اوپر نیچے ہو تا رہتا تھا۔ اس وقت شاید وہ ہالی ہو گیا تھا۔ بڑی آپا کچھ کہنے کو

آگے بڑھیں۔ انہوں نے اسے کچھ سمجھانے کے لیے منہ کھولا۔ ہاتھ بڑھائے۔ وہ دودھ پیچھے ہو گئی۔
 ”نہیں بڑی آیا! اب بہت کچھ سمجھ میں آ گیا ہے۔ اس دن آپ نے مجھے جو عزت بخشی۔ مجھے فیصلے کا اختیار دے کر حوصلہ بڑھایا۔ میں احق بے وقوف، اونچی ہواؤں میں اڑنے لگی۔ لیکن نہیں میں ایک مزدور ماں کی کسرت بنی، میری بیٹی کی بھی یہی اوقات ہے آپ کی نظر میں۔ لیکن غریب کی بھی عزت ہوتی ہے۔ مجھے اپنی بیٹی کا تماشا ہونا منظور نہیں۔ میری جسارت معاف کر دیں۔ مجھے۔۔۔ آج کے اس پروگرام سے انکار ہے۔“

وہ ضبط کر رہی تھی۔ سرخ چہرہ۔ رگیں پھولی ہوئی۔
 بھابھی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
 ”فصہ۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے۔ تم سن تو لو آپا کی بات۔“

”مجھے کچھ سنتا ہے نہ سمجھتا، بھابھی۔“ وہ بھرے گلے سے بول اٹھی۔ ”آج تو ثابت ہو گیا۔ اس خاندان کے سب لوگ مجھے وہی سمجھتے ہیں۔ وہی وقعت ہے آپ سب کی نظر میں میری۔ جس کا بار بار مجھے احساس دلایا جاتا ہے۔ میں چپ رہی۔ کیونکہ اس میں کچھ غلط نہ تھا۔ سب سچ تھا۔ میں یتیم تھی۔ ایک گلی کے چھوٹے سے گھر کی معمولی حیثیت والی۔ جس کی ماں نے محنت مشقت سے اپنے بچے پالے۔ ایک بیوہ عورت، نوکری کرتی رہی۔ عزت نہیں بنی۔ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ کوئی مجھے بتائے اگر شیشی ایسی ہی بری چیز ہے۔ تو میرے آقا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیوں یتیم تھے۔ غریبی اگر کوئی گناہ ہے تو اللہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں دو لہند نہیں بنایا۔ انہیں تو دو وقت پیٹ بھر کھانا بھی نہیں ملتا تھا۔ اگر۔۔۔ چھوٹے گھر کے رہنے والے حقیر ہیں۔ تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محلوں میں کیوں نہیں رہتے تھے۔ محنت کر کے نوکری کرنے والی مائیں ذلیل ہیں۔ تو پھر محنت میں عظمت کا سبق کیوں دیا جاتا ہے۔“

اس نے اماں کی طرف اشارہ کیا۔ ”اماں! آپ ہمیشہ مجھے میری اوقات یاد دلا کر شرمندہ کرتی رہیں۔ میں چپ رہی۔ لیکن آج ایک کم زور ماں اپنی بے وقعتی پر منہ کھول کر سوال کرے تو کون جواب دے گا۔ مجھے بے خبر رکھ کر میری اوقات یاد دلا دی۔ ٹھیک ہے۔ میں واقعی آپ لوگوں کی برابر نہیں کر سکتی۔ اتنا بڑا فیصلہ ایک ماں کی مرضی کے بغیر۔ بڑی کیا؟ آپ عیدی لائی ہیں۔ میری بیٹی کی عزت افزائی کا شکریہ۔ چاہے تو۔۔۔ دے دیں اور۔۔۔“

جوش خطابت میں اس نے دیکھا ہی نہیں۔ تمام مہمان خواتین جمع ہو گئی تھیں۔ جذبات بے قابو ہوئے تو وہ راستہ بتاتی ہوئی سب کے درمیان سے نکل کر کمرے میں گھس گئی۔ بڑی آپا ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئیں۔ بھابھی نے فصہ کی امی سے کہا۔
 ”آپ سمجھا میں۔“

وہ تو دم بخود کھڑی تھیں۔ اماں البتہ آپے سے باہر ہو کر شہزادی کی تلاش میں باہر نکلیں۔ فصہ بے قابو ہو کر رو رہی تھی۔ اس کی امی نے جا کر اسے پیار کیا۔ پانی پلا نہیں سکتی تھیں روزہ تھا۔ کیلے تو لیے سے اس کا چہرہ صاف کیا۔ کچھ تھمر کر گویا ہو گئیں۔

”بیٹا! تم نے یہ جانے بغیر کہ یہ اچانک کیوں پروگرام بن گیا۔ تقریر شروع کر دی۔ ویسے دلائل تو خوب دیے تم نے۔“

وہ مسکرا رہی تھیں۔ فصہ بے چین ہو گئی۔
 ”امی! آپ ہنس رہی ہیں۔ کیسے ایسا بھی ہوا ہے کہ ماں کو خبر نہ ہو۔ بارات آجائے۔ نکاح رخصتی۔ واہ لڑکی پر اس کا کیا اثر ہو گا۔ یہ بھی نہیں سوچا۔ کیا ان کے اعلا خاندان کی کسی لڑکی کے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے۔ مجھے ہی سب نے دبا کر میرے جذبات کچل کر ہمیشہ من مان کی۔ میں چپ تھی۔ مگر میں ماں ہوں۔ کوئی غیر نہیں انہوں نے کیسے سوچ لیا کہ۔۔۔ اور کیا اس میں میری بیٹی کی ہتک نہیں ہے۔ ماں باپ کو اطلاع ہی نہیں اور نکاح رخصتی کا پروگرام بنایا۔“
 ”اچھا! اچھا! ماں لیا۔ میری بھی سنو۔“ امی اس کے

بال سمیٹ رہی تھیں۔

کر دیا۔ ”ناراض۔

”آ، آپ۔۔۔ بتا نہیں سکتے تھے مجھے اصل بات۔“

وہ ہکا بکا گئی۔

”میں نے سوچا تم خدی بللی کی طرح خبیثہ مارو گی۔

چونگی۔ تم تو مکر لڑاکا بکری ہو۔ سب کو پیٹتیں مار کر

زخمی کر دیا اووف۔ بڑی کیا سے جو دامت ہوئی۔ میں

تو سربراہ کے قہے میں لطف لے رہا تھا۔ تم نے سب

کی خوشی ملیا میٹ کر دی۔ اب عاصم اکیلا امریکہ جائے

گا اور پانچ سال بعد آکر چاہے گا تو شادی کرے گا سورنہ

لیے بیٹھی رہنا پڑی گی۔ ٹھیک؟ مسوچ لو۔“

فضہ کا دل پیٹنے لگا۔ ”ہاں یہ تو سوچا ہی نہیں۔ لیکن

کسی نے بتایا تو تو نہ بتانا چاہتی تھیں بڑی کیا۔ میں

نے تو سننے ہی سے انکار کر دیا۔ پہلے ہی اگر شہزادہ ای ہی

بتا دیتیں۔ حمنہ کی بیٹی۔ منہ بند کیے بیٹھی رہی۔ اف

اللہ اب کیا کرے۔“

”بڑی کیا اپنی خوشی ہم سب کی خوشی بتانا چاہتی

تھیں۔ ہمدرد ہیں۔ آسانی چاہتی تھیں۔ تم نے تو

پرسوں کا غبار ان پر نکل دیا۔ وہ تمہاری مداح تھیں اور

تم نے سب کے سامنے ان پر الزام لگا دیا۔ شرم آ رہی

ہے مجھے۔“

شہزادہ ای نہیں فضہ بھی پریشان ہو گئی۔ بھابھی حمنہ

کو پکڑا لیں۔

”لو بھئی فضہ یہ اصل مجرم آگئی ہے۔ اسے جو چاہو

مزاد۔“ حمنہ بجاری نانی اور باپ کے سامنے اور بھی

شرسار سار کے کندھے سے لگ کر منمنانے لگی۔

”امی! پھپھو نے مجھ سے پوچھا تھا۔ میں، میں کیا

کہتی۔ وہ سب صحیح بات کر رہی تھیں۔ امی اگر آپ

نہیں چاہیں گی۔ تو۔۔۔ آج یہ سب کچھ نہیں ہو گا۔ میں

آپ کی خوشی کے بغیر۔ کچھ نہیں کرنے دوں گی۔ پلیز

امی۔ مجھے معاف کر دیں۔“ فضہ پر حیرتوں کے پہاڑ آ

گرے۔

بیٹی کا چہرہ دکھا۔ پھیکا پھیکا۔ بے رونق آنکھیں۔ کیا

۔۔۔ اگر آج نکاح نہ ہوا۔ حمنہ کی ہتک نہ ہوگی؟ پھر۔

عاصم چلا گیا، ٹوئک۔۔۔ انتظار۔۔۔ بے قرار ہو کر ماں سے

”میں بتاتی ہوں۔ حلیمہ میرے گھر آئی تھیں۔

انہوں نے باقاعدہ مجھ سے اجازت لی۔ اس پروگرام

کے بارے میں۔ مجھے کیا اعتراض ہوتا، سنو، سنو بات

نہ کاٹو۔ ہوا یہ کہ عاصم کو امریکہ میں جاب مل گئی ہے۔

جس کی وہ کو خوش کر رہا تھا۔ چار ماہ بعد اسے چارج لینا

ہے۔ حلیمہ نے چاہا۔ ان چار ماہ کے دوران حمنہ کے

پاسپورٹ ویرا کا مرحلہ بھی ہو جائے۔ ظاہر ہے دویا

میں ماہ بعد شہزادہ شادی کے لیے کیا تیاری کر سکے گا۔

کیوں نہ ابھی عیدی کے بہانے یہ فرض ادا ہو جائے۔

نکاح کے بعد ہی تو حمنہ کا پاسپورٹ بن سکے گا بطور

عاصم کی بیوی کے۔ یہ چار ماہ یہ بچے ایک ساتھ وقت

گزاریں گے۔ جب ویرا آئے گا۔ حمنہ چلی جائے

گی۔ مجھے تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ پٹا

حلیمہ بہت ہمدرد خاتون ہیں۔ تم سے بہت محبت کرتی

ہیں۔ تمہارے لیے آسانی چاہتی ہیں۔ تاکہ تم پر کوئی

بوجھ نہ پڑے۔ عاصم کی جاب کے بہانے سے یہ بڑا کام

ممکن ہو جائے۔ البتہ تمہیں سربراہ کو دینے کا خیال

عاصم کا تھا۔ ویسے شہزادہ کو بتا دیا تھا۔ اسے کیا اعتراض

ہوتا۔ سربراہ کا سن کر بہت ہنس۔“

فضہ چونک گئی۔ حیرت۔ ”ہاں تو انہیں بھی مجھے

ذلیل کرنے میں مرزا آتا ہے۔ اچھا بت ہی ہار پھول لا کر

۔۔۔ تیار رہاں۔ افوہ۔“

”ایسا نہ کہو۔ یہ سب کے لیے سربراہ تھا۔ اس

بات سے حلیمہ کے گھر والے میں اور شہزادہ ای واقف

تھے۔ حلیمہ نے یہاں آکر سب کو بتایا۔ اچھا ایک اور

بات بتا دوں۔ انہوں نے خود حمنہ سے بھی رائے لی

تھی۔ اسے بھی اعتراض نہ ہوا۔ وہ اس رائے سے

متفق تھی کہ چار ماہ کے اندر تم یا شہزادہ شادی کی تقریب

کے لیے خاطر خواہ تیاری نہیں کر سکو گے۔ یہ موقعہ

مناسب ہے۔“

فضہ ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ ملی بھگت۔ شہزادہ

سے دروازہ کھول کر اندر آیا۔

”یہ کیا ڈرامہ شروع کر دیا تم نے۔ مجھے بھی شرمندہ

فریاد کی۔
 ”ای! اب کیا کروں۔ مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی۔
 افسوس کیا کر دیا میں نے۔ کبھی تو منہ نہ کھولا اور اب۔“
 ”کرو یہ۔“ امی نے رساں سے کہا۔ ”حلیہ سے
 معافی مانگو اور روزے کا وقت قریب ہے۔ اظہار کے
 بعد نکل ج کی اجازت دے دو۔ اب حلیہ میرے یا شہزاد
 رعنی تھیں کہ مائدہ کی کون سی بیٹی مناسب رہے گی۔
 موقع اچھا ہے۔ حلیہ بھی تیاری کے ساتھ آئی ہے۔
 یہیں اسی جگہ نکاح کروا کر فضاء کے منہ پر کالک
 تھوپوں گی۔ عمر بھائے فضاء پھر بازی لے گئی۔ مکار کہیں
 کی۔ مجھے سب کے سامنے ذلیل کیا ہے۔ بخشش کی
 نہیں۔

”بچی ہے۔ جب وقت آئے گا خود ہی تمہاری جیسی ہو جائے گی۔“

خوشیوں کی برسات ٹوٹ کر برسی۔ جل تھل ہو گیا۔ شہزاد کو بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ ایک پختہ دو کاج۔ بلکہ تین کاج۔ افطار کے بعد نماز سے فارغ ہو کر اب نکاحوں کی تیاری۔ دھڑا دھڑ نکاح نامے لکھے جارہے تھے۔ اصل مشکل تو حتمہ کو ہوئی۔ نہ دولہا نہ تیار ہوئی۔ عاصم کے نکاح کے بعد اس کا پروگرام گلے اور ڈانس کا تھا۔ وہ پہلے بھی اعتراض کے سبب کہ رمضان میں خرافات مگر سٹے کر لیا تھا کہ کمرہ بند کر کے اپنے فن کا مظاہرہ کرے گا۔ وہ بھی ممکن نہ ہوا۔

یعنی روزہ کھول کر میک اپ کے دوران اپنی دوستوں کو فون کیے جارہی تھی دھڑا دھڑ فوراً آجاؤ۔ فنافٹ آجاؤ۔ ہاں بھی اچانک سے۔ فنافٹ نکاح ہو رہا ہے۔ فنافٹ آجاؤ۔ اور اس کی ساری سہیلیاں بندرہ منٹ میں آگئیں۔ انہیں نہ کوئی گلے سے منع کر سکا۔ یہ کیا بات ہوئی۔

”رمضان شریف میں خوشی منانے پر پابندی تو نہیں۔ ہم تو ناچیں گے بھی۔“

نئی نسل بھلا کس کے قابو میں تھی۔ حمزہ و مل موس کر رہ گیا۔ اس پر تو دولہا کا ٹھہرا لگ گیا تھا۔ شرافت سے پیٹھے رہنے کا حکم ابوجان نے صادر کیا۔ مگر بعد نکاح جب سب کھانا کھا رہے تھے۔ وہ یعنی کی گلے گاتی سیلیوں میں شامل ہو ہی گیا۔ ماں کے آنکھیں دکھانے پر معصوم بن کر کہا۔

”میں تو حتمہ اور عاصم بھائی کی شادی کے گلے گا رہا ہوں۔“ کھانے کے بعد تصویروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دولہا دلہن بٹھائے گئے۔ چھوٹے دولہا نے اپنے ساتھ بیٹھی دلہن کو کہنی ماری۔

”تم بھی رخصتی کرو الوناں۔ چچی سے کہو۔“

”تمہاری جو چچی ہیں، جلا دیں۔ میری گردن کٹ دیں گی۔ تم کو نا۔“ شرما کر کہا اور انگلی دانتوں میں دبالی۔

دولہا نے آنکھیں نکالیں۔ ”اچھا میری گردن فالتو

کس کے لیے ہے۔ یہ بدھی ہوتی کیا ہے؟“ یعنی نے دیکھا نہیں۔ فضلہ اندر آ کر چپ چاپ حتمہ کا بتاؤ سنگھار دیکھ رہی تھی۔

”بدھی اسے کہتے ہیں جو تمہارے ابو نے پھولوں کے پار کو عاصم کے گلے میں کر اس کی شکل میں پرستانی ہے تم نے خود ہی تو کہا تھا ابھی۔ ابو نے کبھی پرستانی۔ وہ کبھی نہیں بدھی ہے۔ کبھی تو اس گھوڑا گاڑی کو کہتے ہیں جس میں ایک سے زیادہ گھوڑے جوتے جاتے ہیں۔ کبھی دو کبھی چار۔“

”اچھا؟ آہی۔ ویسے مزا تو آ رہا ہے نا۔ فنافٹ شادی۔ ہائے۔ کاش میری بھی شادی ایسے فنافٹ ہو جائے تو کیسا مزا آئے۔“

تالیاں بجانے لگی۔ حتمہ آنکھوں سے اشارہ کر رہی تھی بے سود۔ بڑی امی بھی فوراً اس کو چٹا چٹ بوسوں کے ہار پرستانے لگیں۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں تمہاری بھی ایسے ہی کر سکتی ہوں۔ کرنی ہوں انتظام۔ اے فضلہ ابو یہیں کھڑی ہو۔ سن لو بھی۔ میں تو اپنی لڑکیا کا شوق پورا کروں گی۔ چل مری لاؤ۔ اپنی عیدی والا جوڑا پہن آ فنافٹ۔ بس میں اب کسی کی نہیں سنوں گی۔ شہزاد کو بلاؤ۔ ارے حتمہ کے بعد یعنی کامیک اپ بھی کر دیں گی آپ؟ پلیز۔“

انہوں نے پورا پروگرام طے کر لیا۔ فضلہ کے تاثرات پر غور ہی نہیں کیا۔ مزاحہ ہنس رہی تھیں۔

”ہائے اللہ۔ عید کا جوڑا اور پھر عید پر کیا پسوں گی بڑی امی! امی نے تو میرے کپڑے بنائے ہی نہیں۔“

یعنی ٹی کی پریشانی پر سب نے قہقہہ لگایا۔ سوائے فضلہ کے جو سرہانوں میں تھام کر بیٹھ گئی تھی۔

”فکر نہ کرو میری جان۔ عید پر دو سرا جوڑا لاؤں گی۔“ یعنی نے بڑی امی کی یقین دہانی پر دانت نکالے اور بھاگ گئی۔ اب اسے تیار ہونا تھا۔

”اس لڑکی کی زبان میں تو نہ کٹ سکی۔ بھابھی، پلیز آپ ہی اسے کنٹرول کریں۔“ بھابھی کی ہنسی کی جھنکار باہر تک سنی گئی۔ انہیں تو اس کا بے دھڑک بولنا معصومانہ انداز بہت پسند تھا۔

کے گھر کے ساتھ بہت شاندار کوٹھی حمزہ کی تیار ہوئی اسی میں رخصتی ہوئی۔ بھائی جان کا خیال تھا کہ حمزہ بھی امریکہ چلا جائے گا تو یہ نہیں ہوا۔ اس نے ماں باپ کو چھوڑ کر جانے سے انکار کر دیا۔ اس کا جرج بھی ایک بہت اعلیٰ پوسٹ پر تقرری کی صورت میں ملا۔ یعنی نے پتے گھر کو جنت بنانے میں ماں کی تقلید کی۔ اس کی خوش مزاجی، سچائی اور نیکی نے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ایک جانب ماں باپ دو سری جانب ساس سر سب کی خدمت میں کوشاں۔

ماہم، چچا ہنزول کے بیٹے سے بیاہ کر کراچی گئی۔ چند سالوں میں بہت سی تبدیلیاں آ گئیں۔ حمزہ کی بڑی بہنیں بھی وطن واپس آ گئی تھیں۔ انہوں نے باپ کے نزدیک گھر لے لیا۔ وہ بھی یعنی کی عاشق زار۔

سیکنہ کی بیٹی۔ دوبار شادپوں اور طلاق کے بعد مستقل میکے میں ہے۔ بد زبانی اور بد اخلاقی اس کی سرشت میں تھی۔ کہیں نباہ نہ ہو سکا۔ سیکنہ کے شوہر اچانک فوت ہو گئے۔ کاروبار شراکت میں تھا۔ وصیت بھی نہ کر سکے۔ سیکنہ کو کچھ نہ ملا۔ پارٹنر سب لے اڑے۔ اب گھر بچ کر چھوٹا سا گھر لے کر رہ رہی ہے۔

باپ کے بعد زن کو آزادی ملی۔ بری صحبت میں پڑ گیا۔ چھوٹا بھائی کچھ کم عقل، بدھو سا ہے۔ غرضیکہ۔

سیکنہ اب بھائیوں کے رحم و کرم پر ہے۔

اماں سب دیکھ رہی ہیں اور بے بس، مگر اب ان کا مزاج بھی بدل چکا ہے۔ فضا کے ساتھ رہتی ہیں اور اس کے گن گاتی ہیں۔ فضا کو بھی اب ان سے کوئی شکایت نہیں۔ شہزاد اور فضا کی خوشگوار زندگی حمزہ، یعنی کی محبت۔ جو وہ ساس سرماں باپ اور دادی پر لٹائی رہتی ہے۔ حمزہ بھی چچا، چچی کا خیال رکھتا ہے۔ سب اتحاد اتفاق کی برکت۔ لیکن انسان کم فہم ہے۔ جانتا نہیں جو بویا جاتا ہے۔ وہی کاٹنا پڑتا ہے۔ اور یہی حقیقت ہے۔



ہے کٹوانے کے لیے۔
”یہ تم کیا کھارے ہو۔ کٹر کٹو۔“
”چھوہارا ہے۔ کھانا تو ملا نہیں۔ میں وہاں گانے جو لگا تو امی نے کہا سزا ہے تمہاری۔“
”چھوہارا۔“ دلہن کے حلق سے چیخ نکلی۔ ”میں؟ مجھے کسی نے چھوہارا کیوں نہیں دیا۔“
”بہت سخت ہیں۔ تمہاری طرح۔“ دولہانے دانت نکالے۔

”آپی تم نے انی۔ اے اپنے نکاح کے چھوہارے کھائے تھے؟ مجھے کیوں نہیں دیے؟“
”چپ رہو۔ سب ادھر دیکھ رہے ہیں۔“ حمنہ نے چپکے سے ڈپٹا۔

مگر یعنی ہی کیا جو اب کی کھال نہ نکالے۔ ”بڑی امی مجھے چھوہارا کیوں نہیں دیا کسی نے۔“
بڑی امی سے زیادہ قدر دان کون ہو گا۔ جھٹ بیٹے کے ہاتھ پر جھٹلا کر چھوہارا برآمد کیا۔
”لے میری بچی۔ کھالے۔“

”امی سے کہو نا، رخصتی بھی کر لیں آج۔“ دولہا کی بے قراری عروج پر تھی۔

”بڑی امی نے کہا ہے۔ وہ دو سال بعد بارات ملائیں گی دھوم دھام سے پھر ہوگی رخصتی۔“
”ائینشن پلزز۔ خاموش ہو جائیں۔ تصویریں لینے دیں ورنہ خراب ہو جائیں گی۔“ فوٹو گرافر نے ان پر پابندی لگا دی۔ یوں بھی یعنی کو امی کی شعلہ افگنی آنکھیں نظر آئی تھیں۔

قسمت کے انوکھے کھیل۔ کون غیب کا علم جانتا ہے۔ وقت بدلتا ہے۔ انسان بدل جاتا ہے۔ ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ کس کے نصیب میں کیا ہے۔ سب پردہ غیب میں مستور ہے۔ فضا جیسی صابر شاکر مگر جیسے سرال سے شکوے بہت تھے۔ وہی سرال اس کی ڈھال بن گئی۔

حمنہ امریکہ گئی۔ اس نے ایاز کو بلا لیا۔ اس کا وہاں یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا۔
یعنی کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ شہزاد

بھی امر کے ذمے تھا، کھر کے بچے تھے اور اپنی چاچی
 تھی کیا فرق پڑتا تھا۔ بچوں سے فراغت کے بعد چائے
 بنائی ہوئی پھر ساس اور جیٹھانی بچے کو گود میں دباۓ امر
 کے کمرے میں محفل جمائیں۔ گاؤں کے قصے، گھر
 - تمباکو، گھنے کے کھیت، گاجر، مولیاں، تازہ دودھ،
 گوشت، پیچیریاں، مرے اور آج کے دور کی خرافات، امر
 ساتھ دیتی جاتی رات بیتی جاتی، محفل ہنوز گرم بلکہ
 گرم تر، ساس کا جوش خروش بڑھتا ہی چلا جاتا اور
 جیلہ اپنا تباہ داری سے سنے جاتیں وہ سنائے جاتیں اور
 اور خود امر زور زور سے سر ملاتی، برادری کے گلے
 شکوے میں برابر کا ساتھ دیتی۔ کولڈ ڈرنک تک بات
 آتے آتے گھڑی رات کے ڈھائی بجاتی اور احمد پہلے
 سو جاتا۔ امر نیند میں جھولا جھولنے لگتی بلکہ بے دم ہو کر
 گر جاتی تو ساس معذرت کرتی جیلہ آپا کو لیے رخصت

شازیلہ لطاف ہاشمی

لیکھی جیلہ

جیلہ آپا کیسی تھیں یہ امر سے زیادہ کون جان سکتا
 تھا۔ شادی کے پہلے دن جھاٹو پکڑا کر انہوں نے امر کی
 عزت افزائی کا آغاز کر دیا تھا۔ نئی دلہن کے ہاتھ میں
 جھاٹو دیکھ کر جیاں محلے کی خواتین نے لیوں میں
 انگلیاں داب لی تھیں، وہیں امر کو خوش دیکھ کر حیران
 بھی تھیں۔ دہلی برتن جھاٹو سے لے کر گھر بھر کے
 کپڑے دھونے تک سے فراغت حاصل کر کے بیٹھنے
 والی جیلہ آپا انتہائی زیرک پھوٹے سے قد کی عورت
 تھیں تو وہیں امر لیے قد سے لمبے لوگوں کے بے وقوف
 ہونے کا مقولہ سچ ثابت کرتی نظر آتی تھی دیوہ کی تنخواہ
 بھی وہ امر سے چھپ کر گنتیں آسے ہوا تک نہ لگنے
 دیتیں بے چاری امر اس میں بھی خوش تھی۔ تھوڑا سا
 حساب کا سامن اور گن کے دی گئیں دو روٹیاں آسے
 خود اپنے ہاتھ سے جیلہ آپا دیتیں۔ رہی ساس تو ساس
 اور بڑی بہو کی مثالی دوستی ایسی کہ نہ سنی نہ دیکھی،
 دونوں ٹالٹی کے درخت تلے ٹھٹھا مار کے ہنستیں تو امر
 بھی ہنسی میں خود بہ خود شریک ہو جاتی۔ دیور دفتر سے
 آکر لکڑیاں کاٹتا اور عام پھلکے بنانے میں تیز۔ کیا غضب
 کا جوڑ تھا جو جیلہ آپا کی منظوری کے بعد وجود میں آیا
 تھا۔ گھر بھر میں جھاٹو پونچھا کرنا اور شام میں بچے پڑھانا



ہوئیں کہ ”بھئی اب سو جاؤ رات بہت ہو گئی۔ صبح ناشتے کے لیے جلدی اٹھ جانا تیرا بابا جلدی بچا دیتا ہے۔“ جاتے جاتے بھی وہ نصیحت کرنا نہیں بھولتیں۔ امی روز فون کر کے پوچھتیں ”نصیحتیں کرتیں اور اسے مطمئن پا کر فون رکھ دیتیں۔ احمد اور امرون کے وقت بات کرنے کا کوئی لمحہ ہرگز نہیں پاسکتے تھے اگرچہ کبھی وہ اکٹھے پائے جاتے مایں جی فوراً ”اسے مصروف کر دیتیں“ چاؤل لے آؤ، گوشت لے آؤ“ تاکیں یاد۔

اس گھر میں کام سونہلے کا تھا اور امرا کیلی بچاری کیا کیا کرتی۔ احمد کو کسی کام سے لاہور بہن کے گھر جانا پڑا نہی نو ملی دلہن چھوڑ کر گیا تھا۔ تب ہو کر فون کیا تو جیلہ آپا نے فون اسے پکڑنے کے بجائے ساس کو تھما دیا کہ احمد اپنی ماں سے بات کرنا چاہتا ہے حالانکہ وہ سن چکی تھی کہ اسے امر سے بات کرنا تھی۔ جیلہ آپا فون اماں کو تھما کر اسے چاؤلوں کی صفائی پر لگا گئیں اور امر ہونفوں کی طرح نکتی رہ گئی احمد اب اماں جی سے بات کر رہا تھا اور وہ سن رہی تھی۔

دل کو کچھ کھٹکا سا ضرور تھا احمد نے اسی سے بات کرنی تھی مگر جیلہ آپا نے فون اماں کو دیا تھا وہ جتنی بھی بیوقوف ہوتی یا بتائی جاتی محبت کو سمجھتی تھی اس محبت کو خوشی پر اور بیوی کے درمیان روز روشن کی طرح عیاں تھی۔ دونوں بہت کم باتیں کر سکتے تھے مگر دل کی لگن سچی تھی تڑپ حقیقی تھی جو احمد کو راتوں رات بڑی بہن کے سنہری حال سے نکال لے آئی تھی۔ آبا ماہم کی باتیں جتنی بھی چکنی چرنی ہوئیں اس میں امر نہیں نہیں تھی۔ سوہا آکر کھاگ نکلا تھا وہ لبالبہائی کی کام چوری احمد کے سوا کسی کو نظر نہیں آتی تھی۔ بھائی اور با بعد ار بھائی اگر بیوی کی محبت میں گرفتار ہو جائے اور اسے فقط بیوی نظر آنے لگے تو ان ہی حالات سے بچنے کے لیے انہوں نے بہتیرے جال بچھائے تھے۔ بڑے بھائی اور جیلہ آپا کی زندگی کا دار و مدار اسی پر تھا۔ ”نخوست چھا گئی ہے اس گھر پر۔“ جھٹھ بیٹھے بیٹھے چلانے لگا تھا امر جو لمبے پروں یاں پکائے بیٹھی تھی۔

تنخواہ میں سے پورے دو ہزار کم تھے اور وہ دو ہزار احمد نے امر پر خرچ کیے تھے۔ اس کے دو جوڑے گرمی کے اور ہوائی چپل۔ ورنہ وہ تو وہ بھی لینے کی روادار نہیں تھی جیسی سب روکھی سوکھی کھا کر پہن کر جی رہے تھے۔ بے چاری امر دل و جان سے ان کے ساتھ جینا چاہتی تھی مگر احمد کو احساس تھا اور نجائے کیسے ہوا تھا کہ وہ اسے کسی طرح برتنوں اور باتوں کے جال سے نکال لے گیا تھا اور اپنی پسند کے دو سوٹ سلوائے تھے اور وہیں جیلہ کو نخوست کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ کھٹک گیا تھا ماں کے دیے تسلی دلا سے بمسلاوے شادی کے بعد نہ بدلنے کی قسمیں عمر بے سارے ناکام ہوتے نظر آتے تھے۔ آج دو ہزار نکلتے تھے وہ بھی پوچھے۔ بغیر کل دس ہزار خرچ کر ڈالے تو کون کسے والا تھا خود کماتا تھا بیوی بھی خرچ کر لے، ہر طرف نخوست نے ڈیرے ڈالے تھے باس جیلہ اور جیلہ کے چہرے تلخی سے اٹ گئے تھے سب اگلے قدم پر غور کر رہے تھے مگر جیلہ ذرا بے صبر واقع ہوا تھا وہ چپ رہنے والا نہیں تھا۔

امرنے جلدی سے دو روز شریف پڑھنا شروع کر دیا تھا تاکہ نخوست کے سائے جلد از جلد چھٹ نکلیں۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اصل نخوست تو وہ خود بھی اور خود ہی نخوست دور کرنے کی تدبیر کر رہی تھی۔ نخوس نہ ہو تو زندگی دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ ساس اور جیشانی جیلہ کے گٹھ جوڑنے احمد اور امر کو حتی المقدور دور رکھا مگر دور رہ کر بھی الجھ کر بھی وہ کتنے قریب قریب تھے کون جانے آہستہ آہستہ کام کرتے وہ پھٹنے لگی۔ اس کی زندگی میں کسی کی آمد کی نوید تھی۔ وہ کمزور ہونے لگی تھی کام کے دباؤ اور ساس اور جیشانی کے تلخ رویے کی وجہ سے بھی وہ پریشان تھی۔ آہستہ آہستہ گھر کے کام بٹ گئے، برتن چونکہ ایک بڑا ڈھیر ہوتا اس لیے وہ امر کے ذمے بٹھا ڈیا جیلہ آپا کے ذمے۔ امر کی ایمان داری اور جی لگا کے کام کرنے کی وجہ سے برتن صاف ستھرے چمکدار اور آدھے وقت میں دھل دھلا کر اپنی جگہ پر پہنچ جانے

لگے۔ جیلہ آپا نے آسان کام سمجھ کر اسے برتنوں سے ہٹا دیا اور جھانڈ پکڑادی۔ ان کے بچے بے حد تیز اور گندے تھے جو بڑے بڑے قد نکالے نمدیدے پن کی آخری حدوں کو چھوئے۔ بچوں جیسی حرکتیں کرتے تھے۔ امر کے لیے انہیں روکنا اور گھر صاف رکھنا مشکل تھا۔ کیونکہ جیلہ اپنے بچوں کے معاملے میں کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کرتی تھیں۔ جو جہاں ہے جو کر رہا ہے کرنے دو۔ ان کے بچے تک امر سے خائف تھے وہ کیوں یہاں آگئی تھی کب جائے گی۔ اور تو اور انہیں چاچا اور امر ساتھ اپنے بھی نہیں لگتے تھے وہ بے حد تیز اور بد زبان بچے تھے۔

وہ بے خبر تھی مگر اپنی بے خبر نہیں تھی کہ نماز نکلتے تو پکڑے غائب کنگھی کرنے لگے تو کنگھی نہ ملے نہانے جائے تو پانی بند۔ وہ میلی پھیل رہنے لگی اور غور کرنے لگی نہ چاہتے ہوئے بھی کہ یہ کام جیلہ آپا اور ساس کا ہی تھا وہ دونوں اسے صاف بھی نہیں رہنے دیتا چاہتی تھیں اسے یقین نہیں آتا تھا کہ بوڑھا بھریوں بھرا چہرہ سفید بالوں سمیت یہ کھڑا حرکت بھی کر سکتا تھا۔ احمد اسے سوچا جس دینے لگا تھا جیلہ آپا وہ پیسے غائب کرنے لگی تھیں جیلہ آپا اور ان کے بچے یہ کام اس قدر صفائی سے کرتے کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی جو ایک دن وہ خود نہ دیکھ لیتی۔ اس بات پر وہ دایلا کرتی مگر جیلہ آپا زور زور سے بولنا شروع ہو گئی تھیں۔

امراں بننے والی تھی ظاہر ہے کہ خرچا بڑھ گیا تھا۔ ساس اور جیلہ اس مسئلے کے توڑ کا سوچنے میں مصروف تھیں۔

اسے پتا تھا وہ جان چکی تھی کہ جیلہ آپا کی قناعت پسندی کے پیچھے چھپی اصل صورت کتنی بھیانک ہے۔ اس کھٹیا عورت کی سوچ بونی سے شروع ہو کر بونی پر ہی ختم ہوتی تھی۔ وہ دیور پر قبضہ کر کے اسے گھر میں ہی بے حیثیت کر دیتا چاہتی تھیں ہر مشکل اور الجھا ہوا کام وہ امر کے حوالے کرتیں اور وہ جانتیں کہ اسے کون سا کام کرنا برا لگ رہا ہے کس کام کو کرنے میں اسے مشکل درپیش آ رہی ہے۔ وہ سارے کام کر رہی تھی۔

وقت گزر رہا تھا مگر اسے جیلہ آپا کی شکل سے نفرت ہو گئی تھی اور ساس کے سوسے اپنی حقیقت آپ بیان کرتے تھے وہ کتنے بیٹے کو چھوٹے بیٹے کی زندگی میں کعبہ بنا کر رکھنا چاہتی تھیں ایسا شخص جو کھائے بھی اور کسی کا احسان بھی نہ رہے جو صرف کھانے اور رعب ڈالنے یا چھوڑے سرے بسن بھائیوں کا خون چوینے کے لیے پیدا ہوا تھا انہیں سب سے بری امر لگتی تھی کیونکہ اسی نے احمد کی کمائی اور اس کی توجہ بانی تھی اور جیلہ آپا جو شوہر کو ہمیشہ بیساکھیوں پر چلاتی آتی تھیں، یہ بیساکھیاں کسی طرح چھیننے نہیں دیتا چاہتی تھیں وہ ہر صورت امر کو راستے سے ہٹانا چاہتی تھی مگر امر اس راستے میں ایک اور کو بھی لے آئی تھی اپنی پیاری بیٹی نیلم کو۔

وہ اور نیلم اب دو تھے اسے نیلم سہارا لگی تھی اور ساس اور جیلہ نے نیلم کو اپنے قبضے میں کرنے کا سوچا تھا۔ نیلم تائی کے پاس سوئے گی ڈاڈی سے کھانا کھائے گی تو امر جو ان کی خباثت کو فطری محبت سمجھتی اور کیا کرے۔ سازا دن۔ اس کی بیٹی اس سے دور کی جانے لگی تھی اتنا تو اسے پتا چل گیا تھا کہ یہ محبت نہیں تھی اسے بے دخل کیا جا رہا تھا۔

زندگی چھوٹے کم ظرف لوگوں کے بغیر کتنی آسان تھی یہ احمد اور امر دونوں کو ہی پتا چل گیا تھا مگر کما کسی نے نہیں۔ کتنے دن یوں ہی گزر گئے تھے ایک دن جیلہ آپا اور غفران بھائی چلے آئے تھے اور ان کا اصرار تھا کہ انہیں واپس چلنا چاہیے مگر احمد نے انہیں کسی نہ کسی طرح قائل کر لی لیا تھا۔ وہ شدمیں دو بے نشتر لے کر واپس چلے گئے تھے۔ کچھ رشتے بکتے ہوئے بوجھ میں بدل جاتے ہیں ناں جو کسی طرح قابل قبول رہتے ہی نہیں۔ کاش وہ دوسروں کے ساتھ جینا سیکھ جاتے۔ خود جیتے اور دوسروں کو بھی جیتے دیتے ان کے پورے حقوق کے ساتھ امر نے سوچا اور دروازہ بند کر دیا تھا۔



کرایا اور تاب نہ لا کر فرزند ارجمند کی حسین گہری براؤن آنکھیں جھکتی چلی گئیں اور دل ہی دل میں خود کو ملامت کا سلسلہ جاری کیا کہ کیوں نہ بکواس کرنے سے پہلے حاضریں پر ایک نگاہ ڈال کر تسلی کر لی۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔

”کیوں میاں صاحبزادے! تم کیا کنواں کھودنے پر لگا دیے گئے ہو؟“

”نہیں تو ابو جان!“ ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر انہوں نے پر زور انداز میں تردید کی۔

”پھر کیا بل چلانے پر لگائے گئے ہو؟“

”اوہ نہیں نہیں وہ تو بی بی یونہی مذاق کر رہا تھا میاں

گھر میں اک ہنگامہ برپا تھا کیا بڑے کیا چھوٹے سب ہی باتیں کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے بول بول کر تھک جاتے تو کھانے پر ٹوٹ پڑتے ادھر سے فارغ ہوتے تو پھر بلا مکان گفتگو۔ کل دس کلو چینی، کوئنگ آئل کاڈیہ اور چائے کی پتی کا میڈیم سائز منگوا یا تھا اور آج برکتے کہہ رہی تھی۔

”ٹیاب میاں! سب ختم ہو چکا ہے بیگم صاحبہ سے پیسے لو اور ایک چکر بازار کا لگاؤ۔“

”ہاں بی بی! آپ کو بھی اس بھرے پرے گھر میں

ایک میں ہی فارغ نظر آتا ہوں۔“

غزہ بخاری

خواتین کی قسمت

جلن سے۔“

”خوب بہت خوب“ تو ماں سے مذاق ہو رہا ہے۔ یہی احترام رہ گیا ہے شہساری نظر میں بزرگوں کا ہم نے تو اپنی ماں سے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی اور ادھر دیکھیے مذاق ہو رہا ہے۔“

”چھوٹے بچے“ اب جانے دیجیے۔ بچہ ہے ابھی اور پھر سارے کام بلا چوں چر کر رہا ہے۔“ آخری کی مانتا جاگ اٹھی اور باپ بیٹے کے درمیان آگئی۔

”اگر یہ کوئی کام کر رہا ہے تو احسان نہیں ہے ہم پر۔ یہ سب کچھ کرنا اس کا فرض بنتا ہے۔ رخصتی میرے چھوٹے بھائی کی بنی ہے اور یہ تالاق میرا بیٹا ہونے کے ناتے یہ سب کام سنبھالنے کا ذمہ وار ہے۔“

وہ صبح سے احکامات کی تعمیل میں مصروف تھا۔ اب جو ایک گزارش غریب ماسی برکتے نے بھی کر دی تو چڑ گیا۔ برکتے نے سوچا۔ اس سے کہتا بے کار ہے، کبھی نہیں مانے گا، جا کر کہتی ہوں، اس کے والد بڑے صاحب سے۔ بس پھر تو ٹیاب صاحب سر کے کل بازار جائیں گے۔ ”اف توبہ! یہ رخصتی کی شادی ہے یا قیامت۔ سچ میرا تو دماغ گھوم کر رہ گیا ہے۔“ یہ ڈافلا لگ ادا کرتے ہوئے ٹیاب صاحب کو یہ بالکل علم نہیں ہو سکا تھا کہ ابا حضور بھی کچھ ہی فاصلے پر تشریف فرما ہیں اور جناب کا ادا کیا جھنجھلاہٹ سے بھرپور فقرہ ان کی حساس سماعت کو چھوچکا ہے۔ بات علم میں تب ہی آئی جب انہوں نے ڈرامائی انداز میں سامنے آکر رخ روشن کا دیدار



تھماتے ہوئے کہا۔
”بھائی صاحب! یہ کانڈ آپ قادر بخش کو دیں، وہ لیتا آئے گا۔“ ثریا پھوپھو جیسے کوئی روز سے ادھر سے ادھر چکراتے دیکھ رہی تھیں، مارے ہمدردی کے بول اٹھیں۔

”مجھے ملازموں پر بھروسا نہیں ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر چل پڑے۔ ثیاب جلا بھنا ہاتھ میں لسٹ پکڑے اپنے کمرے میں کپڑے بدلنے کے لیے چلا آیا۔ دیکھا تو اس کے بیڈ پر رنجش صاحبہ براجمان ہیں۔ اور آٹھ آٹھ آنسو بہائے جا رہے ہیں۔
”جہاں تک میرا خیال ہے، ابھی تمہاری رخصتی میں پورا ایک ہفتہ باقی ہے۔“

موڈ خوشگوار بنا کر وہ سامنے ٹک گیا۔ آنسو تو اتار سے بتے رہے۔ یہ تھکنے کا انتظار کرتا رہا مگر جب دیکھا کہ امکان نہیں تو پوچھ لیا۔ جواب میں ہچکیوں کے درمیان آج کا ناخ اخیار اسے پکڑا دیا۔ ثیاب نے سامنے والی خبر پر نظردوڑائی۔ خبر تھی۔
”دو ماہ فراڈ ثابت ہوا۔ لاکھوں کا چیز لے کر فرار ہو گیا۔ دس من صبح بے ہوش پائی گئی۔“
”ہاں واقعی! اچھی خاصی افسوس ناک خبر ہے۔“
اخبار ایک طرف ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہائے ثیاب! اگر میرے ساتھ بھی ایسا ہوا تو پھر؟“
خوشے زبان پر آگئے۔
”تمہارے منہ میں خاک، لڑکی! یہ کیا بک رہی ہو۔“

”ہو بھی تو سکتا ہے۔“ آنسو دوپٹے میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

”تم کوئی اچھی بات نہیں سوچ سکتیں۔“
”کیسے سوچوں اچھی بات، کتنا کہا تھا آبی جان سے، اچھی طرح چھان بین کر لیں، ابھی شادی نہ کریں۔ کم از کم ایک سال کی مہلت تو دیں۔ فاسٹل ایئر ہے میرا مگر منتا کون ہے۔“

”اچھا تمہارا مطلب ہے کہ ایک سال چھان بین میں لگا دیتے۔“

”ثیاب! ثیاب بیٹا!“ چھوٹی پھوپھو کی آواز اس وقت سارے جہان کی آواز سے بہتر لگ رہی تھی، سنتے ہی بھاگا اور جا کر ان کے سامنے حاضر ہوا۔
”بیٹے! تمہاری بڑی پھوپھو کا فون آیا ہے۔ وہ آج شام سرگودھا ایکسپریس سے آ رہی ہیں۔ تم اسٹیشن چلے جانا۔“

”توبہ! ابھی سے یہ مصیبت رشتہ دار آنے شروع ہو گئے ہیں۔ ابھی تو شادی میں اتنے دن باقی ہیں اور یہ بڑی پھوپھو، ان کی بیٹیاں تو انتہائی کام چور، بھگڑالو اور ندیدی ہیں۔ اللہ رحم کرے۔“ کیونکہ پریشانی کا اظہار جی جی میں ہو رہا تھا اس لیے چھوٹی پھوپھو بے خبر تھیں اور کہہ رہی تھیں۔

”بیٹا! کل صبح چار بجے خالہ سکینہ بھی آ رہی ہیں۔ تاہم یاد رکھنا، ہمیں وہ اسٹیشن پر انتظار کرتی ہی نہ رہ جائیں اور میرے ماموں رزاق کل شام کو پہنچ رہے ہیں۔ تم چھ بجے ایر پورٹ چلے جانا۔“

”جی لے آؤں گا سب کو، ویسے کیا یہ سب ایسے چنے منے ہیں کہ خود گھر تک نہیں آسکتے۔“

”اے ہے بیٹے! ہمسائوں سے بھرا گھر ہے، ایسی باتیں نہ کرو کسی نے سن لیا تو برا ہو گا۔“

”کیا ہوا ثریا! تم اتنی دیر سے کیا سمجھا رہی ہو، اس نالائق کو۔“ والد صاحب چلے آئے۔

”کچھ نہیں اختر بھائی! وہ دراصل بڑی آپا، خالہ سکینہ اور ماموں رزاق آ رہے ہیں تو میں کہہ رہی تھی کہ تم تاہم پر لینے چلے جانا۔“

”ہوں! جب ہی نواب صاحب کا موڈ بگڑا ہوا ہے صاحبزادے! یہ ہم پر کوئی احسان نہیں ہے۔ نہیں لینے جانا تو مت جاؤ۔ ہم خود ریو کر لیں گے۔“

”نہیں نہیں ابو جان! میں تو بالکل تیار ہوں۔“

جھٹ سے کہنا بڑا کہ اب اگر ابو چلے جاتے تو پھر ساری عمر بخشش ممکن نہیں تھی۔

”اب چل کہاں پڑے۔ یہ لسٹ پکڑو اور بازار جا کر یہ چیزیں خرید لاؤ۔“ انہوں نے لمبا سا کانڈ اسے

طرح بہن کے ساتھ ساتھ رہے ہیں۔“ ناصر پچھلے دو برس سے لندن میں تھا۔

”یہ طفر کا وقت نہیں ہے۔ میرے اچھے بھیا! بس تم سے یہ کہنا ہے کہ۔“

”کہ میں رخصتی کی شادی پر انتظامات کی طرف خاص توجہ دوں اور کسی کو شکایت کا موقع ہرگز نہ دوں اور رخصتی کے وقت بہن کو سینے سے لگا کر دعاؤں کے سائے میں رخصت کر دوں۔“

”ارے! تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہ سب کہنے والا ہوں۔“ ناصر نے بے حد حیران ہو کر دریافت کیا۔

”ان چند دنوں کی بھاگ دوڑ نے میری چھٹی ساتویں بلکہ آٹھویں حس بھی بیدار کر دی ہے، کمینہ پوچھ رہا ہے کیسے پتا چلا ارے ہمارے اتنے دنوں سے تو بار بار فون کر رہا ہے اور یہی ڈانڈ لاگ ادا کر رہا ہے۔ اب تو مجھے زبانی یاد ہو گئے ہیں۔“

”صرف یاد ہی نہیں رکھنے بلکہ عمل بھی کرنا ہے ان باتوں پر۔“

”ہاں ہے مجھے اور خبردار جواب فون کیا۔“

حسن چچا یعنی رخصتی کے والد سے گاڑی کی چابی لی اور بازار چلا آیا سوچا کہ خوب دیر لگا کر واپس آؤں گا۔ تاکہ کچھ دیر تو ان بھانت بھانت کی بولیوں اور کاموں سے جان چھوٹے۔



آخر علی اور حسن علی اوپر تلے کے بھائی تھے مگر اختر علی رعب یوں ڈالتے چھوٹے بھائی پر جیسے لبا لگتے ہوں۔ دونوں ہمیش طاہرہ اور ثریا بھی اپنے بڑے بھائی کے سامنے بولنے کی جرات نہیں رکھتی تھیں۔ وہ شروع ہی سے تیز مزاج واقع ہوئے تھے۔ شام کی امی بے چاری ہر بات کئی مرتبہ سوچ کر بولتیں مگر پھر بھی وہ کسی نہ کسی بات کو بنیاد بنا کر شکامہ کھڑا کیے ہی رکھتے۔ دو بچے تھے۔ بڑی نازیہ جس کی شادی سے فارغ ہو چکے تھے اور اس سے چھوٹا شام جو ہمیشہ باپ کے عتاب کا شکار ہوتا تھا۔ حسن علی کے تین بچے تھے، ناصر، رخصتی

”میں نے کب کہا ہے ایک سال لگانے کو مگر رشتہ کرنے کے بعد شادی ایک سال تک روکی جاسکتی تھی۔“

”اچھا! بس اب چپ کر جاؤ، اگر میرے ابو حضور نے سن لیا تو تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ سارا الزام میرے سر آجائے گا کہ ان کی بیٹی کو درغلز رہا تھا۔“

”نہیں، ویسے ثیاب! تم بتاؤ دیکھنے میں وہ لوگ کیسے لگتے ہیں۔“

”اوئے ہوئے کوئی ایسے ویسے حسن تو جیسے ڈل ڈل پڑتا ہے جدھر دیکھتے ہیں جاؤ سا کر دیتے ہیں۔“

”مذاق مت کر۔ سہیل مجھے تسلی دو۔“

”میں ضرور تمہیں تسلی بلکہ تسلیاں دیتا مگر افسوس میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ بڑے کام ہیں میرے سر پر۔“

”ثیاب! بھیا! کمرے سے باہر نکلا تو رخصتی کی پھوٹی بہن حرا نے پکارا، وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔“

ناصر بھائی کا فون آیا ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”ف! ایک تو یہ ناصر آج کل میرے لیے مصیبت بن گیا ہے۔ کتنی بار کہہ چکا ہوں۔ سارے کام اپنے ہاتھوں سے کر رہا ہوں۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی جا رہی۔ خود تو جناب لندن جا بیٹھے ہیں اور میری جان کھائی ہوئی ہے۔“

وہ تیزی سے فون کی طرف جھپٹا اور پھاڑ کھانے والے انداز میں مخاطب ہوا۔

”اتنے غصے میں کیوں ہو؟“ جناب ناصر نے حیرت سے فرمایا۔

”تم بتاؤ غصہ کیوں کیا ہے؟“

”بس یار! بہن کی جدائی کے خیال سے پریشان ہو رہا ہوں۔“

”جی جی بالکل! آپ پریشان نہیں ہوں گے تو اور کون ہو گا۔ آخر پچھلے دو برس سے آپ سائے کی

خوب کر رہا تھا جبکہ اباحضور خوب صحت مند توانا ہونے کے باوجود احکامات جاری کرنے کو بہتر سمجھتے تھے۔ باقی ایک ثیاب ہی بچتا تھا اور اس کی شامت ہی آگئی تھی۔ ابھی ایک کام پورا نہیں ہوا تھا کہ اباجان دوسرے کا حکم دے ڈالتے تھے دراجودیر ہو جاتی تو اتنے لوگوں کے سامنے ڈانٹ پڑتی اور کیے کرائے پر منٹوں میں پانی پھیر کر رکھ دیتے۔



ابو کے غصے سے نہ صرف یہ کہ گھر کے لوگ گھبراتے تھے بلکہ خاندان کے دوسرے لوگ بھی پناہ مانگتے تھے۔ کئی ایک رشتہ داروں سے صرف ان ہی کی وجہ سے بول چال بند تھی اب چونکہ بیٹی کی شادی کا موقع تھا تو امی اور پھوپھو کا خیال تھا کہ روٹھے ہوئے عزیز و اقارب کو منانا ضروری ہے۔ دونوں ہمت کر کے اباحضور کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور ڈرتے ڈرتے اپنے اس خیال کا اظہار کیا۔ خلاف توقع چپ سے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بولے۔

”کہہ تو آپ دونوں ٹھیک ہی رہی ہیں مگر میں کسی کو منانے ہرگز نہیں چاہوں گا اگر میں چلا گیا تو یہ ٹکے ٹکے کے لوگ مزید اکر جائیں گے۔“

”پھر کون جائے گا بھائی صاحب؟“ چھوٹی پھوپھو بولیں۔

”میرا خیال ہے محسن علی کے ساتھ ثیاب کو بھیج دو۔ اس طرح میری نمائندگی بھی ہو جائے گی اور یہ ثیاب ہے کہاں؟ کالی دیر سے مجھے نظر نہیں آیا۔ ضرور کمرے میں پڑا سو رہا ہو گا۔“

”نہیں نہیں وہ تو بازار گیا ہے۔“

”کیا کہا بازار، یعنی ابھی تک وہ بازار سے ہی نہیں لوٹا۔ میں کہتا ہوں فہمیدہ بیگم! تمہارا یہ لاڈلا کر پونسی ست اور کاٹل رہا تو ناگ کٹا کر رکھ دے گا سارے خاندان میں ہماری۔“

”اتنا سعادت مند اور اچھا بیٹا ہے ہمارا، آپ دیکھ لیجئے گا بھائی صاحب! ایک روز نام روشن کرے گا

اور حرا بیوی کی وفات کے بعد وہ بچوں کو بڑے بھائی کے اصرار پر ان کے ہاں لے آئے تھے کہ رختی اس وقت چھوٹی تھی مگر داری سے ناواقف اور یوں سخت مشکل پیش آ رہی تھی۔ ثیاب کی امی کی یہ دلی خواہش تھی کہ رختی ثیاب کی دلسن بنے۔ خود رختی کے والد بھی یہی چاہتے تھے مگر ابھی چند ماہ پہلے کچھ خواتین نے ایک تقریب میں رختی کو دیکھا اور رشتہ لے کر آ گئیں۔ لڑکا اچھی پوسٹ پر تھا اور وہ لوگ اصرار بھی بہت کر رہے تھے۔ حسن علی نے ساری بات بڑے بھائی کے سامنے رکھ دی۔

”اگر اچھے لوگ ہیں تو پھر ہاں کرنے میں دیر نہیں کرنا چاہیے۔“ انہوں نے فیصلہ سنایا۔

ثیاب کی امی نے شوہر کے سامنے دلی زبان میں ثیاب کی بات کی، اور حسن علی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی مگر وہ توستہ ہی بھڑک اٹھے۔ صاف کہہ دیا۔

”بے شک ثیاب میرا بیٹا ہے مگر رختی مجھے اس سے زیادہ پیاری ہے۔ میں بھی یہ یہ ظلم ہرگز نہیں کر سکتا۔ وہ آوارہ، کالہ، پاتلی لڑکا۔ نہ کام کا نہ کالج کا۔ رختی کو جان بوجھ کر کنوئیں میں دھکا نہیں دے سکتا۔

کتنا کہا تھا اس لڑکے سے۔ بہت پردہائی ہو گئی۔ اب گاؤں جا کر دادا کی زمینیں سنبھالو، میں اور حسن تو شہر میں مصروف رہتے ہیں۔ تم ہی دادا کی مدد کو خوش کر دو مگر اس ناخجار کو بزرگوں سے محبت ہی کب رہی ہے۔ اپنی مرضی چلائی اور لے لیا نیکسائل انجینئرنگ میں داخلہ۔ چلا لے اپنی مرضی، بے شک ساری عمر

دھتار رہے مگر دیکھ لیتا، باپ کی بات ٹھکرانے والا زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہو گا۔ حسن علی! تم میرے اس رخ چلی بیٹے کی بات چھوڑو اور اس رشتے کے لیے ہاں کرو۔“

اور یوں اچانک یہ رشتہ طے ہوا اور پھر بہت جلد ہی شادی کی تاریخ بھی رکھ دی گئی۔ چچا کی صحت کچھ بہتر نہیں رہتی تھی۔ زیادہ کام کر نہیں سکتے تھے۔ ناصر لندن میں بیٹھا صرف ہدایات جاری کر سکتا تھا اور

خاندان کا۔

”اوہو! ایک تو ظاہر ہونے پر کام غلط وقت پر کیا ہے۔ اب آج ہی آنا کیا ضروری تھا۔“ ابو بھلا گئے۔

”پھر بھائی صاحب! ہم کل صبح چلے جائیں گے۔“ کل خالہ سیکھ آ رہی ہیں۔ ”چھوٹی پھوپھو نے

اب کے دبے دبے انداز میں یاد دلایا۔

”اوہ تو پھر یہی ہو سکتا ہے کہ ظاہر کو لینے میں اسٹیشن چلا جاؤں اور صاحبزادے اپنے چچا کے ساتھ چلے جائیں۔“

”جی، آپ کی تجویز بہت اچھی ہے۔“ امی نے خوشامدی۔

”نہ لڑکیاں کہاں سو گئی ہیں! ان سے کو، کچھ صفائی ہی کر لیں۔ کیسا گند اڑتا ہے گھر اور صاحبزادے! تم نے بھی سارا اسٹیشن لاکر یہاں ڈھیر کر دیا۔ بھلا یہ جگہ ہے تھیلے رکھنے کی۔ جن میں لے جاؤ یہ سب۔“

ابھی ابا حضور کچھ اور بھی کتنے لگے تھے کہ مہمانوں کی ایک فوج رنگ برنگی بولیاں بولتی اور ہر چلی آئی اور ان کی بات محل ہی میں رہ گئی۔

وہ گھر اس لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ کمرے سے نازبہ آئی وغیرہ کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے جھانک کر دیکھا اور کمرے میں نازبہ آئی کے ساتھ ساتھ ”را، چھوٹی پھوپھو کی سجدہ اور رخصتی کو موجود پایا۔

”کیا سازش ہو رہی ہے؟“ اتنی تھکن کے باوجود اس کا لہجہ خوش گوار تھا۔

”رخصتی باجی ہو رہی ہیں۔“ حرا نے اپنے آنسو روکتے ہوئے اطلاع دی۔

”اسے رونے کے علاوہ کوئی کام جو نہیں ہے ہمیں

”ہاں یہ تو صاحب زادے کے لخصن ابھی سے ہوتا رہے ہیں۔“ انہوں نے منہ بنا کر نہایت طنزہ انداز میں فرمایا۔

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ثیاب ڈھیروں پیکٹ اور تھیلے اٹھائے لاؤنچ میں داخل ہوا۔

”کہاں رہ گئے تھے تالا نٹ؟“ اختر علی نے ان الفاظ کے ساتھ استقبال کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا پھوپھو کہنے لگیں۔

”بیٹے! تم نے ناشتا کر لیا ہے یا ابھی تک یونی پھر رہے ہو؟“

”کر لیا تھا پھوپھو!“ وہ آہستگی سے بولا اور والد صاحب فرماتے لگے۔

”ہاں بھلا یہ ناشتے کے بغیر رہ سکتا ہے مجھے یقین ہے اس نے سب سے پہلے کیا ہو گا اور حسن علی! تم کہاں غائب ہو صبح سے! کیسی لاپرواہی! اچھی نہیں بیٹی کی شادی ہے ڈر اہوش میں رہو۔“

”جی جی بھائی صاحب! میں تو ہوش میں ہوں۔“ وہ بے چارے اس اچانک یلغار پر گھبرا گئے۔

”اچھے ہوش میں ہو بھی، میلے کپڑے، بکھرے بال، ارے بھی لوگ آتے جاتے ہیں۔ کچھ تو حلیہ ٹھیک رکھو اور سنو۔ آج تمہیں اپنے اس نتیجے کے ساتھ ان تمام زشتہ داروں کو منانے جانا ہے جو ہم سے ناراض ہیں۔“

”کس وقت بھائی صاحب؟“ حسن علی نے تو بڑے بھائی کی کوئی بات ٹالنا سیکھا ہی نہیں تھا۔

”جب فرصت ملے چلے جانا۔ جی تو نہیں چاہ رہا ان بد خواہوں کو منانے کا مگر مجبوری ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر راضی کرنا ہی پڑتا ہے۔“

”ٹھیک ہے بھائی صاحب! ہم دونوں آج شام کو چلے چلیں گے۔“

”مگر آج شام تو بڑی آیا آ رہی ہیں اور ثیاب کو انہیں لینے اسٹیشن جانا ہے۔“

سوچنی کس شہسیت

ماڈل راہیل
میک اپ سلیک بائی عینی
فوٹو گرافی ایم۔ کاشف

دیکھو، سارا دن ادھر سے ادھر کاموں میں گزر جاتا ہے۔
مرنے کی فرصت بھی نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے
صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

”اپنا گھر چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ اپنے پیاروں کو
چھوڑ کر غیروں سے ناتا جوڑنا ہوتا ہے اور یہ بھی خبر
نہیں ہوتی کہ کیسا برتاؤ ہو گا۔ ہم لڑکیوں کی بڑی
مجبوریاں، بڑی پریشانیاں ہوتی ہیں۔ تم مرد تو ہمیشہ
فائدے میں رہتے ہو، اسی لیے تو ہمیں عورت کے
دکھوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔ بات بات پر شک لگاتے
ہو۔ ہم کچھ بھی کر لیں، تمہیں قدر نہیں ہوتی۔“ آپنی
نے اچھا خاصا لٹاڑا

کیا! میں نے کس پر ظلم کیا ہے، کس کے جذبات کی
قدر نہیں کی، یہ سب آپ مجھے کیوں سنارہی ہیں۔“
”نہیں کیا تو کرو گے۔ آخر ایک نہ ایک دن شادی
تو تمہاری ہونی ہے۔“ نازیہ آپنی پر بھی کچھ ابو کا اثر
تھا۔ وہ نس بڑا کما کچھ نہیں۔

”اب ثیاب بھائی کی بھی شادی ہو جانی چاہیے۔“
سعدیہ کو اچانک جانے کیا سوچھی۔

”ہاں بالکل ہو جانی چاہیے اور یاد رکھنا رختی! اپنی
شادی پر سارا کام تم سے کرواؤں گا۔“

”لو اگر کام کر رہے ہو تو احسان تھوڑی ہے۔“
”اوہو آپنی! میں نے کب احسان جتایا، میں تو بس یہ

بتا رہا تھا کہ جوڑ جوڑ دکھنے لگا ہے، آہ ذرا سر ہی دبا
دیں۔“

”سیدھے ہو کر بیٹھو، میری کمر میں پہلے ہی بڑا درد
ہے۔“

”ثیاب بھیا! یہاں شادی میں اتنی ساری لڑکیاں
آئیں گی۔ آپ کوئی اپنے لیے پسند کر لیجیے گا۔“ حرا
نے نفٹ مشورہ دیا۔

”جی اور وہ جو میرے والد محترم ہیں۔ وہ تو ضرور ہی
راضی ہو جائیں گے۔ ادھر میں اپنی پسندیدیاں کروں گا،
ادھر وہ رشتہ مانگنے چل پڑیں گے کہ خیال ہی بہت ہے
انہیں میرا۔“

رختی کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے وہ بولے گیا۔

”ہاں، یہ مشورہ تو تم نے ہی دو، اسے ابا جان کو بتا چل
گیا تو میرے اکلوتے بھائی کا حشر کر کے رکھ دیں
گے۔“ نازیہ یہ کہتے ہوئے ہنستی بھی جا رہی تھی۔
ثیاب منہ بنا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

شام کو اسے چچا کے ساتھ روٹھے رشتہ داروں کو
منانے کے لیے جانا تھا مگر چچا جانے کہاں غائب ہو گئے
تھے۔ شکر ہوا کہ ابا بڑی پھوپھو کو لینے جا چکے تھے ورنہ
چچا کے نہ آنے کا غصہ بھی اہل خانہ کو پروا نہ کرتا
بڑا۔ ثیاب نے موقع غنیمت جانا اور اپنے کمرے میں
آکر کچھ دیر آرام کے لیے لیٹ گیا مگر لگتا تھا کہ سب
نے تنہہ کیا ہوا ہے کہ اسے بالکل آرام نہیں کرنے
دیتا۔ سچ منٹ ہی گزرے تھے کہ چچا میاں آن پہنچے اور
حرا اسے بلانے چلی آئی۔ تیار تو وہ تھا ہی۔ اب اٹھ کر
بالوں میں ایک بار پھر ریش کیا اور چلا آیا۔

”جلے چچا جان! میں تو کب سے آپ کا منتظر
تھا۔“

”ہاں بیٹا! وہ ایک دوست کی طرف دیر ہو گئی تھی اور
تم ایسا کرو کہ اپنی بایک نکال لو گاڑی تو بھائی جان لے
گئے ہیں۔“

”جو حکم میرے آقا۔“

”اور کچھ دیر بعد چچا بھتیجا، خالہ امینہ کی طرف جا
رہے تھے۔ یہ خالہ امینہ پچھلے آٹھ ماہ سے ناراض
رشتہ داروں کی فہرست میں شامل ہوئی تھیں۔ اس
سے پہلے وہ اس شہر میں رہتی ہی نہیں تھیں ورنہ شاید
یہ اعزاز پہلے ہی حاصل ہو جاتا۔ ثیاب نے بھی اپنے
بچپن میں ہی انہیں دیکھا ہو تو دیکھا ہو وہ انہیں بالکل
نہیں جانتا تھا۔ سنا تھا شین کی شادی پر ان کے اور ابا
حضور کے درمیان لڑائی ہو گئی تھی۔ اور بس اس شہر
میں آکر ہونے والی یہ پہلی ملاقات ہی آخری ملاقات
ثابت ہوئی۔ خالہ امینہ نے گھر بھی خاصی پیچ دار جگہ
پر لے رکھا تھا۔ گلیاں دو گلیاں۔

مجھے تو لگتا ہے چچا! ہم جہاں سے داخل ہوئے تھے!

”اے ہے اپنے بھائی صاحب سے بھی پوچھ لیا ہوتا۔ کس ایسا نہ ہو، وہ بھری محفل میں تمہیں بھی ذلیل کر کے رکھ دیں۔“ خاتون کی آواز بڑی کراہی اور لہجہ تیز دہرا تھا۔

”جی خالہ! میں ان کو تیرا کران کے مشورے سے ہی آیا ہوں۔“

”اے ہاں بھائی! ساری عمر تو اس کے اشاروں پر جاتے رہے۔ اب اس عمر میں اپنی مرضی سے بھلا کیا کرو گے۔“

”تو پھر خالہ آپ آری ہیں؟“ انہوں نے گڑبڑا کر کہا۔

”میں پوچھتی ہوں، اختر علی نے مجھے بلانے کی اجازت بھلا کس طرح دے دی۔ اس کے نزدیک تو میں چھاپھا کٹنی اور چلتی ہوں۔ میری نمازیں دکھاوے کی ہیں۔ اے بی بی پروین! یاد ہے ناں، کتنے لوگوں کے سامنے اختر علی نے مجھے فساد کی جڑ قرار دیا تھا۔“ انہوں نے قریب بیٹھی خاتون جو شاید بیٹی یا بہو تھی، سے پوچھا۔

”ہاں ہاں اہل! یہ بھی کوئی بھولنے کی بات ہے۔“ پروین بیکہنے لگی کہ گود کا بچہ بچے مرغیوں کے بچوں کے پاس آتا اور وہ بھی شروع ہو گئیں۔

نیاب نے آگے کر ادھر ادھر نظر دوڑائی، کمرے کا پرہہ بڑی احتیاط سے اٹھا اور ایک لڑکی نے شاید تجسس سے مجبور ہو کر آنے والوں کو دیکھنے کے لیے باہر جھانکنے کی کوشش کی مگر نیاب کو متوجہ پا کر ایک دم سے پرہہ چھوڑ دیا۔ جس تیزی سے اس نے ایسا کیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس گھر میں پہلی بار تھوڑی دھچکی محسوس ہوئی۔ ادھر شکایات مسلسل جاری تھیں۔ چچا کا صراحت تھا۔

”گزری باتوں کو بھولی جائیں اور اس شادی خانہ آبادی کے پرست مرتع پر تشریف لا کر رونق دو بالا کریں۔“ وہ کہتی تھیں۔

”کیسے بھول جاؤں، جس تن لاگے وہ تن جانے۔“

گھوم پھر کر دوبارہ سے وہیں پہنچ جائیں گے۔“

”ارے نہیں بیٹے! بس وہ ذرا آگے چل کر ہستی ہی گلی ہے ناں، اسی میں خالہ امینہ کا گھر ہے اب دعا کرو وہ مان جائیں۔“

حسن علی کو ان کی فطرت کا اچھی طرح اندازہ تھا سو سمجھ جاتے تھے۔ آخر ایک دروازے کے قریب انہوں نے رکنے کو کہا۔

”آپ جائیں اندر میں ہیں انتظار کروں گا۔“

”میاں صاحبزادے! آپ کو ہم اس لیے ساتھ لائے ہیں کہ روٹھے ہوؤں کو منانے میں ہماری مدد کریں اب آجائیں جلدی سے شاپاش۔“ اور منہ بناتے ہوئے اسے بھی ساتھ ہونا پڑا۔ دروازہ ایک بچے نے کھولا۔ اجنبی صورتوں کو حیرت سے دیکھا۔ چچا نے امینہ خالہ کے بارے میں پوچھا تو اندر بھاگ گیا۔

”میرا خیال ہے گھر پر ہی ہیں اور یہ بچہ انہیں ہمارا بنانے کے لیے دوڑا ہے۔“

نیاب خاموش کھڑا رہا۔ اصل میں سوچ رہا تھا کہ دیکھیں اب کیسی خاطر تواضع ہوتی ہے۔ اللہ میاں عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔

بچہ دوبارہ نمودار ہوا، انہیں اپنے پیچھے آنے کو کہا اور خود معتبر بن کر آگے آگے چل پڑا۔ آنگن نہ تو بہت بڑا تھا نہ چھوٹا مگر قدم اٹھانا خاصا مشکل ہو رہا تھا کہ مرغی کے کئی درجن ننھے ننھے چوڑے ادھر ادھر ٹٹل رہے تھے ہر قدم پر لگتا کہ اب کوئی بچے آجائے گا۔ گھر کا آنگن پولیٹری فارم کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سامنے ہی برآمدے میں ایک ادھیڑ عمر خاتون اور ایک بزرگ خاتون لکڑی کے تخت پر جلوہ افروز تھیں۔ چچا میاں نے ادب سے سلام کیا۔ نیاب نے بھی تقلید کی اور دیکھا دونوں کی توجہ ان سے زیادہ مرغی کے بچوں پر تھی۔ سوالیہ انداز میں چچا حضور کو دیکھا تو ہٹا چلا کہ وہ تو سر لپا نیاز بنے کھڑے ہیں۔ کارڈ خدمت میں پیش کیا اور یوں گویا ہوئے۔

”خالہ! میری بچی رختی کی شادی ہے۔ آپ اہل خانہ کے ہمراہ تشریف لائیے گا۔“

ہیں۔ دل ہے کدورتیں دور ہوتی ہیں اور خاندان
ٹوٹنے سے بچ جاتے ہیں۔“



شام کے گھر سے نکلے جب روٹھے ہوئے کو مناکر گھر
پہنچے تو رات کے بارہ بجے ہی والے تھے۔ حسب توقع
گھر میں اس وقت بھی ہنگامہ زوروں پر تھا۔ بچے سوچکے
تھے مگر بڑوں کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں اور
آج تو سونے پر سائے والی بات تھی کہ بڑی پھوپھو اور
ان کی بیٹیوں صاحبزادیوں تشریف لا چکی تھیں۔ اسے
سخت بھوک لگی تھی اور ملنے ملانے کا سلسلہ ختم ہونے
میں نہیں آ رہا تھا پھوپھو نے ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب ہی
بٹھالیا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد لگوٹ کا ایک تھرواوا
ہونے لگا۔ آج سے پہلے بڑی پھوپھو کو اس سے اس
قدر محبت کبھی نہیں رہی تھی اور نہ ہی اسے ان سے
کوئی انیت تھی۔ سو یہ مظاہرے طبیعت پر گراں گزر
رہے تھے۔

”شیاب بچے! کیا بات ہے، بڑے کمزور دکھائی دے
رہے ہو۔“ بڑے پھوپھو نے اس کے بالوں کا اسٹائل
خراب کرتے ہوئے پوچھا۔
”بھوک بہت لگی ہے پھوپھو! اگر اجازت ہو تو کھانا
کھاؤں۔“

”ہاں ہاں میں نے کب روکا ہے، جاؤ بیس لے
آؤ۔ بلکہ تم بیٹھو۔ یہ شانہ لے آئی ہے۔ میں بھی
تمہارے ساتھ تھوڑا سا کھاؤں گی۔“
”کیا مطلب؟ آپ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟“

”نہیں بھئی، کھایا تو تھا مگر اب اپنے پیٹے کے ساتھ
دوبارہ کھاؤں گی۔“
”شیاب بھیا! امی تو بس اٹھتے بیٹھتے آپ ہی کو یاد کرتی
ہیں اور انہوں نے ملکان سے آپ کے لیے کرنا خریدا
ہے کڑھائی والا۔“

”اتنے سرد موسم میں کڑھائی والے کرتے کہاں
پہنے جاتے ہیں۔“ قریب بیٹھی ایک عزیزہ بول اٹھیں۔

تمہارا بھائی تو بنا کسی لحاظ کے کہہ جاتا ہے۔ اسے یہ لڑکا
کون ہے؟“ اب جا کے انہیں اتنا نقد آور لڑکا نظر آیا تو
پوچھنے لگیں۔

”یہ اختر بھائی کا بیٹا ہے۔“ اور شیاب نے سوچا اب
شامت آئی، ابو کی زیادتیوں کا بدلہ شاید مجھ سے لیا
جائے گا۔

”اچھا یہ اختر کا بیٹا ہے، کتنا بڑا ہو گیا ہے۔“ لہجے میں
خاصا دکھ تھا۔ وہ بچا کو دیکھ کر رہ گیا۔

”جب تک تمہارا بھائی خود نہیں آئے گا۔ میں
آنے کی نہیں۔“ خالہ نے آج ادائیگی دکھائی۔

اودھریاب کاجی چاہا، چچا کا ہاتھ پکڑے اور زبردستی
یہاں سے لے جائے۔ نہیں آئیں تو نہ سہی۔ پہلے کم
طوفان بہا ہے گھر میں جواب اس قیامت کو آواز دی جا
رہی ہے۔

”وہ شرمندہ ہیں، اتنا چاہ رہے تھے مگر طبیعت کچھ
ٹھیک نہیں۔“

انہیں جھوٹ بولنا پڑا اور نہ ابو جی، شمش بھاش تھے
اور ہمیشہ کی طرح آج کا دن بھی سب کو ڈانٹنے
پھینکارتے بسر ہوا تھا۔ اتنے میں پردہ پھاڑا۔ محترمہ نے
جھانک کر آنے والے مہمانوں کا جائزہ لینے کی ایک
مرتبہ پھر کوشش کی مگر چوڑیوں کی کھنک پہلے ہی اس
چوری کا راز افشا کر چکی تھی۔ شیاب کی آنکھیں اب پھر
مگر ان تھیں سونا کامی ہوئی۔ آخر بڑی مشکلوں سے
خالہ راضی ہوئیں اور سکھ کا سانس لے کر یہ دونوں
اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اب کدھر جانا ہے؟“ گلی میں آکر اس نے
پوچھا۔

”اب پھوپھو کی طرف چلتے ہیں۔ دعا کرو۔ مان
جائیں، ویسے خاصے ٹیڑھے دماغ کے آدمی ہیں۔“
”تو پھر رہنے ہی دیں۔ ایسے ٹیڑھے میڑھے رشتہ
دار شادی میں نہ ہی شامل ہوں تو اچھا ہے۔“

”ایسی بات مت کرو بیٹا! تم ابھی بچے ہو۔ نہیں
جانتے۔ ایسے موقعوں پر عزیز رشتہ داروں کو بلانا فرض
بننا ہے۔ اسی طرح روٹھے ہوئے پھر سے مان جاتے

”اے بھابھی! تم بھی عجیب بات کرتی ہو۔ کیا گرمیاں نہیں آتی۔“ پھوپھو پلٹ کر خاتون کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے پولیس وہ رخ موڑ کر کسی خالہ مہمانی سے باتیں کرنے لگیں۔ اتنے میں شبانہ کھانا لے آئی اور دونوں شروع ہو گئے۔ ویسے اسے احساس ہو رہا تھا اگر پھوپھو اسی رفتار سے کھاتی رہیں تو وہ ضرور بھوکا رہ جائے گا۔

”یہ رشتی کا رشتہ اتنا اچانک کیسے طے ہو گیا؟“ انہوں نے آگے ہو کر رازداری کے انداز میں پوچھا۔
”ابو نے کیا ہے۔“

”اچھا تو آخر بھائی نے کیا ہے۔ لو میں تو کچھ اور ہی سمجھے بیٹھی تھی۔“ بڑی میٹھی سی ہنسی ہنس کر کہا۔
”کیا؟“ وہ ان کی صورت دیکھتے ہوئے بولا۔
”اے کچھ نہیں۔ چھوٹو بیٹا! بس وہ تو میرا اپنا خیال ہی تھا۔ شکر ہے غلط ثابت ہوا۔“

”کچھ بتائیں بھی کیا خیال تھا آپ کا؟“
”اہی کا خیال تھا کہ آپ کی شادی رشتی بھائی سے ہو گی۔“ شبانہ سے چھوٹی رضوانہ نے جھک کر بتایا۔ وہ کیا کہتا۔ سر جھکا کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔
”اے شبانہ! کھڑی کیا دیکھ رہی ہے۔ میرا لال تھا کہ ہوا لگ رہا ہے۔ اس کے لیے بستر ہی بچھاوے۔“
پھوپھو کا یہ کہنا اسے شلو کر گیا کہ واقعی اس وقت ایک نرم بستر کی خواہش ہی ہو رہی تھی۔
”ہر کمرے میں تو عورتیں اور بچے سو رہے ہیں۔ ان کا بستر کمال لگاؤں ای!۔“

”باہر پر آمدے میں ہی لگا دو مگر بلز ایک بستر کہیں سے مہیا کر دو۔ میں سونا چاہتا ہوں۔“

”شیاب! آگئے تم۔ کھانا تو کھا لیا ہے ناں؟“ ای ہاتھوں سے اپنے بالوں کو سنوارنے کی کوشش کرتی، تھکی تھکی سی چلی آئیں۔

”ہاں بھابھی! کھانا تو شبانہ نے دے دیا اور بستر بھی میں نے کہا ہے۔ وہ بچھاوے گی۔ تم جا کر آرام کرو۔“
مکرمائی نے جیسے بڑی مندر کی بات سنی ہی نہیں۔ کسنے لگیں۔ ”کھا چکے ہو تو آجاؤ۔ میں اپنے کمرے میں

ہوں۔“

اور وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”ای! ایبات ہے۔ مجھے آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ ان کا لہجہ اور چہرہ دونوں ہی اسے پریشان کر رہے تھے۔

”میری طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے۔ شاید پھر پلڈ برے شلو ہو گیا ہے مگر تم فکر نہ کرو۔ ہمیں سو رہو، صبح سے کمانوں میں مصروف ہو۔“

وہ لیٹ تو گیا مگر ٹھیک سے سو نہیں سکا کہ امی کی طبیعت واقعی بہت خراب تھی۔ یوں رات سوتے جاتے کی اور دن پھر نگاہ خیز تھا۔ ناشتے کے بعد ابو سے بدایات لینے ان کے کمرے میں گیا واپس آیا تو شبانہ انتظار میں کھڑی تھی۔

”آپ کے کپڑے میں نے پریس کر دیے ہیں، نما کرتا تبدیل کر لیں۔“

”آپ نے؟“ اس نے حیرت سے کل آنے والی اس مہمان کو دیکھا۔

”جی میں نے کوئی اعتراض — ہے آپ کو؟“ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

”اعتراض نہیں حیرت ہے، ویسے بہت بہت شکریہ۔“
شیاب اس وقت واقعی دل سے اس کا شکر گزار تھا۔
”سینے، فریش ہونے کے بعد امی کے پاس آجائے گا۔ انتظار کر رہی ہیں آپ کا۔“

کہنے کو تو — ”ڈس منٹ میں آ رہا ہوں“ کہہ دیا مگر پھر بھول گیا اور چھوٹے پھوپھو کے ساتھ بازار چلا گیا کہ کام بہت تھا۔



واپس آیا تو ایا جان پچا ہر برس رہے تھے۔ امی بھی سر جھکائے قریب بیٹھی تھیں جو الفاظ اس نے سنے، اس کے مطابق پروگرام یہ تھا کہ بارات کا استقبال گھر چوبی ہو گا۔ دیکھیں بیس پکس گی اور بیس سے بیٹی کی رخصتی ہو گی۔ شاید پچا نے ابو کے اس فیصلے سے اعتراف کی کوشش کی تھی اور سزا بگھتی تھی۔

”ٹھیک کہہ رہے ہیں بڑے بھیا اے بھلا ہو ملوں میں بھی شادی بیاہ کا کوئی مزہ آتا ہے۔“ بڑی پھوپھو پوری طرح ابو سے متفق تھیں اور کیوں نہ ہوتیں۔ انہیں کون سا کوئی کام کرنا تھا۔ مصیبت تو ساری ثیاب اور بے چارے بیمار بچے کے سر آئی تھی۔ وہ خون کے گھونٹ پیتا وہاں سے چلا آیا۔

”کیا ہوا؟ یہ منہ کیوں بنا رکھا ہے؟“ نازیہ آپنی بچے کے کپڑے بدل رہی تھیں اسے دیکھا تو پوچھا۔ جواب میں اس نے سب بتا دیا۔

”واقعی کام بہت بڑھ جائے گا۔“

”پہلے تو ابو مان گئے تھے اب دوبارہ گھر پر سب کرنے کو کیوں کہہ رہے ہیں۔“

”میرا تو خیال ہے ثیاب! بڑی پھوپھو نے ہی کہا ہو گا۔ صبح سے ابو کے ساتھ الٹی الٹی باتیں ہو رہی ہیں۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاتی ہیں۔ سچی ان کی وجہ سے امی کو کل سے کئی مرتبہ ڈانٹ پڑ چکی ہے۔“

”اچھا میرے ساتھ تو بڑا پیار ختاری تھیں۔“

”تم نہیں سمجھتے ان ماں بیٹیوں کو۔ اصل میں پہلے ان کا خیال تھا کہ تمہاری شادی رخصتی سے ہوگی اب جب وہ بات نہیں رہی تو بڑا پیار ختاری ہیں اور دوسری طرف ابو کو بھی رام کر رہی ہیں۔“

”ہوں! اب سمجھا تو یہ بات ہے نازیہ باجی! کچھ کریں۔ اگر ابو راضی ہو گئے ان کی کسی بیٹی کے لیے تو میں جیتے جی مارا جاؤں گا۔“

”تم میرے اکلوتے پیارے بھائی ہو بھلا میں ایسا ہونے دوں گی۔ فکر نہ کرو۔ پھوپھو کی یہ خواہش بھی پوری نہیں ہوگی۔ مجھے یاد ہے یہی وہ پھوپھو ہیں جنہوں نے میری امی کی مشکلات میں گھری زندگی کو مزید اذیت ناک بنانے کی سازشیں کی تھیں۔ خود تو اپنے گھر میں آباد تھیں مگر میری ماں کو آباد نہیں دیکھ سکتی تھیں چچا تو عقل مند تھے۔ ان کی باتوں میں آکر چچی کو کچھ نہیں کہتے تھے مگر ہمارے ابو نے گھر جنم بنا دیا تھا۔“

”بس پھر نازیہ باجی! پوری کوشش کریں کہ یہ رشتہ

کبھی نہ ہونے پائے۔“

”میں نے کہا تھا۔ تم فکر ہی مت کرو۔“ نازیہ آپنی نے حرا کو بھی بلالیا اور دونوں چپکے چپکے منصوبہ تیار کرنی رہیں۔ ثیاب کی پوری کوشش تھی کہ اب پھوپھو کے سامنے نہ ہی آئے۔ انہوں نے دیکھتے ہی دلار کے مظاہرے شروع کر دینے تھے اور اب تو اسے سوچ کر ہی ابھن ہو رہی تھی۔

دوسرے کھانا بھی اسے شانہ نے لا کر دیا تھا۔ سخت بھوک لگی تھی مگر کہہ دیا۔ ”ابھی نہیں کھانا کالم سے جا رہا ہوں۔“

اور اسی شام جب ابو نے چائے کی فرمائش کی تو شانہ جھٹ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نازیہ بھی اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئی ادھر پھوپھو کہہ رہی تھیں۔

”بھائی صاحب! میری بیٹی چائے بہت ہی اچھی بناتی ہے۔ پیسے گئے تو پتا چلے گا۔“

ابھی ابو کے دل میں بھانجی کے لیے محبت کا جذبہ نہیں بیدار ہوا تھا سولہ روائی سے فرما دیا گیا۔

”ٹھیک ہے۔“ پھر چھٹی ہمت نہیں ہاری۔

شانہ چائے بنا رہی تھی اور نازیہ مرچ مسالے الٹ پلٹ کرنے میں لگی ہوئی تھی کجوں ہی وہ کب اٹھانے کے لیے مڑی۔ نازیہ نے بڑی پھرتی سے ایک چمچ نمک

قہوے میں ڈال دیا۔ اثر وہی ہوا جیسا اس نے چاہا تھا۔ ابو نے بنا کسی لحاظ کے ڈانٹ پلائی اور نازیہ کو چائے بنانے کا حکم دیا۔ وہ تو تیار تھی۔ جھٹ چائے بنائی اور

والد محترم کی خدمت میں پیش کی۔ ادھر پھونپی پھوپھو کا ارسلان شانہ سے کہہ رہا تھا۔

”کمال ہے آپ کو ابھی تک چائے بنانی بھی نہیں آتی۔“

”طاہرہ! بیٹی کو کچھ سکھاؤ۔ زندگی میں فیشن ہی کالم نہیں آتے۔“ ابو فرما کر چلے گئے۔ ان کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا مگر خاموش بیٹھیں رہیں۔

آج گھر پر لائفنگ ہونا تھی۔ ثیاب نے فون پر بھی

ان لوگوں کو یاد دہانی کروائی تھی۔ اب خیال آیا، کچھ ہی دیر بعد سامان آجائے گا۔ بہتر ہے چھت پر جا کر دیوار کے ساتھ ساتھ رکھا فالتو سامان ہٹا دوں۔

ابھی چھت پر آیا ہی تھا کہ پیچھے ہی ایک بچہ بھی چلا آیا اس پیام کے ساتھ کہ آپ کے ابو بلا رہے ہیں۔ جلدی جلدی سیر دھیان اتر کر نیچے آیا اور خدمت میں حاضر ہوا۔

”ہاں آگئے تم۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اوپر چھت پر آج کل جو سامان رکھا ہوا ہے۔ اسے ذرا پیچھے کر دو۔“

”جی ہوی کر رہا تھا۔“

”اچھا جاؤ پھر کرو۔“ اور وہ اوپر چلا آیا۔ ابھی پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ پھر آوازیں پڑنے لگیں۔ بھاگا ہوا واپس آیا۔

”جی ابو!“ لہجے کو حتی الامکان سعادت مند بنا کر پوچھا۔

”میں یہ کہہ رہا تھا کہ نیچے کچھ اور بھی فالتو سامان پڑا ہے۔ یہ بھی اوپر لے جاؤ۔“

”ارسلان! تمہارے کام بعد میں کر لیتا۔ پہلے بھائی کے ساتھ سامان اوپر رکھو اور۔“ چھوٹی پھوپھو نے میز پر چڑھ کر دیوار پر خوش آمدید کا بورڈ لگاتے بیٹے سے کہا۔

”نہیں، نہیں تم لگے رہو۔ اگر اوھر چل پڑے تو یہ کام کون کرے گا۔“ ایلنے ٹوکا۔

”ویسے بھائی صاحب، کمرے میں خوش آمدید کا بورڈ! آٹریا پھوپھو نے آہستہ سے کہا۔

”نہ گمراہ نہیں لاؤنچ ہے۔“ اطلاع دی گئی اور وہ سر ہلا کر رہ گئیں۔

”یہ قادر بخش کہاں مر گیا ہے۔ اسے کو، لان کی صفائی کرے۔ شیطان صفت بچوں نے ہر طرف گند بچا رکھا ہے۔“

”اے ہے اتنا ہی صفائی کا خط ہے تو نہ بلاتے ہم لوگوں کو۔“ بچوں کی ایک ٹالین کی مانی برداشت نہ کر سکیں اور بول اٹھیں مگر آواز اتنی تھی کہ اختر علی تنک نہ پہنچ سکی۔

”شیاب جی! مجھے چوڑیاں پہنانے لے چلیں۔“

”شام کو شبانہ اک اداسے کہہ رہی تھی۔“

”کیوں مجھے اور کوئی کام نہیں ہے کیا؟“ سنتے ہی غصہ چڑھ گیا۔

”سب کے کام کر رہے ہیں، ایک میرا کریں گے تو کیا ہو جائے گا۔“ وہ ٹھنکی۔

”پاگل ہو جاؤں گا۔“ وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

”آئی! دیکھیں، یہ نہیں مان رہے۔“ وہ شکایت لگانے لگی۔

”کون نہیں مان رہا بھی؟“ بڑے ماموں صاحب بھی قریب ہی بیٹھے شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ صبح ان سے اچھی خاصی ڈانٹ پڑی تھی، اس لیے کچھ بتاتے ہوئے رک سی گئی مگر پھر ماں کے اشارے پر کہہ دیا۔ وہ بھی اچھے موڈ میں تھے۔

”بلاؤ شیاب کو۔ میں دیکھا ہوں۔ کیسے نہیں لے کر جاتا وہ تمہیں بازار۔“

کچھ دیر بعد وہ خدمت میں حاضر تھا۔

”شبانہ بیٹی کو بازار لے جاؤ۔ اسے کچھ ضروری شاپنگ کرنی ہے۔“

”ابو جان! ابھی وہ لوگ لائیٹنگ کے لیے آجائیں گے۔“

”تو تم کیا سمجھتے ہو، یہ کام تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ ارے میاں! میں موجود ہوں گھر پر، سب کچھ خود کروالوں گا۔ تم جاؤ۔“

گھر اسانس لے کر وہ باہر چلا آیا۔ شبانہ ہنستی مسکراتی ساتھ ساتھ تھی۔ اکیلی شبانہ کو لے جانا کچھ مناسب نہیں لگا۔ کہہ دیا۔ ”ساتھ کسی اور بہن کو بھی لے لو۔“

”ضرورت تو مجھے ہے، انہیں خواہ مخواہ لول۔“ اس نے شائے اچکا کر۔

”اکیلے جانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔“ آخر کہہ ہی دیا۔

”ہاں، مجھے احساس ہے مگر وہ ساتھ ہوں گی نا تو خواہ مخواہ شاپنگ کریں گی کیوں دیر ہو جائے گی۔ تاہم پہلے ہی نہیں ہے آپ کے پاس۔“

”فکر نہ کرو اور سنو۔ آج احمد کا فون آیا تھا کہہ رہے تھے۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی ورنہ پہلے ہی آجا۔ اب کل ہی آ رہا ہوں۔“ نازیہ نے اپنے شوہر کے بارے میں بتایا۔

”چلو اچھا ہے۔ کچھ تو ہاتھ بٹائیں گے میرا۔“ ثیاب خوش ہو گیا۔

لڑکیوں نے ڈھولک سنبھال لی تھی اور گھر گیتوں اور قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ بڑی پوڑھیاں بڑی دلچسپی سے شادی بیاہ کے گیت سن رہی تھیں۔ ثیاب کسی کام سے گزرا تو ایک خاتون اسے دیکھتے ہی بولیں۔

”چلو اچھا ہے۔ فمیدہ کو بہو تلاش کرنے باہر نہیں جانا۔ خاندان میں ہی لڑکی مل گئی۔“

”کون سی لڑکی؟“ دوسری نے پوچھا۔

”مے طاہرہ کی بیٹی شبنم اور کون۔“

جی تو چاہا ابھی جا کر ان خاتون کو بلکہ تمام لوگوں کو بتا دے کہ وہ شبنم سے شادی صرف اسی صورت کر سکتا ہے کہ داغ پھر جائے چونکہ اب تک ایسا ساخہ نہیں ہوا۔ اس لیے یہ خیال عبث ہے مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو رہا اور ماں کے کمرے میں چلا آیا۔

”امی! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیوں یہ لوگ شبنم کو زبردستی میرے سر سوار کرنا چاہتے ہیں۔“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں بیٹے! جو تمہارے ابو کی مرضی ہوگی ویسی ہوگا۔“

”آپ دیکھ لیجئے گا اگر ایسا کرنے کی کوشش کی گئی تو میں یہ گھر ہی چھوڑ دوں گا۔“

”ثیاب بھیا! آنٹی کی طبیعت تو پہلے ہی خراب ہے۔ آپ کیوں ان سے ایسی باتیں کر رہے ہیں جو کچھ کہنا ہے جا کر بتایا جان سے کہیں۔“ فمیدہ کے قریب بیٹھی حرا نے کہا۔

”کہہ دوں گا ان سے بھی۔“

”ارے ایسا غضب مت کرنا۔ غصے میں وہ کچھ نہیں دیکھتے۔“ فمیدہ گھبرا گئیں۔

وہ ہونٹ پیچھے باہر چلا آیا اور ملاقات جی سنوڈر شبنم سے ہوئی۔

ہاں واقعی یہ توجہ ہی کہا تھا اس نے سوہ سرہا کر ساتھ ہو لیا۔ شبنم نے صرف چوڑیاں ہی نہیں اور بھی بہت الا بلا اکٹھا کیا۔ اس کے بعد سچ کباب اور ککے کھانے کی فرمائش ہوئی۔

”یہاں پر کوئی خاص نہیں بنتے۔“ اس نے بہانہ بتایا کہ پہلے ہی بہت دور ہو گئی تھی۔

”چلیں پھر چائیز کھاتے ہیں۔“

”وہ مجھے پسند نہیں۔“ اس وقت یہی کہنا مناسب تھا۔

”پھر چائے ہی پلا دیں ویسے بھی خاصی ٹھنڈ ہو رہی ہے۔“

”گھر چل کر بیٹیں گے۔ ویسے بھی میں نے سنا ہے تم چائے بہت اچھی بناتی ہو۔“ اس نے حج والا واقعہ یاد دلایا اور وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”تمہارا داغ تو ٹھیک ہے ناں ثیاب؟“ شبنم کے ساتھ کچھ ہی دیر پہلے گھر پہنچا تھا کہ نازیہ نے پکڑ لیا۔

”کیوں کیا ہوا ہے آپنی؟“

”یہ تم شبنم کو کس خوشی میں ساتھ لے گئے تھے پتا ہے اب کیا باتیں بن رہی ہیں۔“

”گھر؟“ وہ پریشان ہو کر بولا۔

”ہر کسی کی زبان پر یہی ذکر ہے اور پھوپھو ایک کو بتا رہی ہیں ثیاب لے گیا تھا شبنم کو یہ چوڑیاں اسی نے دلوالی ہیں۔“

”مر گئے! ثیاب سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔“

”اور کرواؤ اسے شاپنگ۔“ نازیہ سخت غصے تھی۔

”آپنی! میں کب لے جا رہا تھا۔ وہ تو ابو نے زبردستی بھیجا تھا۔“

”یہ ابو بھی پتا نہیں کیا چاہتے ہیں تم کم از کم مجھے ہی ساتھ لے لیتے۔ خیر اب سر پکڑے کیوں بیٹھے ہو۔ میں پوری کوشش کروں گی کہ یہ رشتہ کسی طرح نہ ہو جائے۔“

”کیا ہماری حیثیت اور کیا کوششیں؟ ابو کے دل میں اگر یہ بات آنٹی تو کر کے رہیں گے۔“ وہ سخت مایوس تھا۔

”کیسی لگ رہی ہوں؟“ وہ اک اداسے مسکرائی۔
 ”زہر لگ رہی ہو۔“ وہ تیزی سے کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ اس تعریف پر حیران رہ گئی۔

بچن میں کچھ شور سا ہوا تھا۔ وہ چچا جان کے کمرے میں جانے کے بجائے ادھر چلا آیا اور جو کچھ سامنے تھا وہ بیروں تلے سے زمین نکالنے کو کافی تھا۔ کرائے پر منگوائے گئے برتنوں کے ٹکڑے ادھر ادھر فرش پر بکھرے تھے۔ اور بچے کھیلنے کودنے بلکہ کھانے پینے میں مصروف تھے۔

”یہ کیا کیا ہے؟“ کمال پہلے ہو کر پوچھا۔
 ”میں نے نہیں گڈوئے کیا ہے۔“
 ”کون ہے گڈو؟“ سخت لہجے میں پوچھا۔
 ”میں نے نہیں انکل! یہ بلونے کیا ہے۔ اب جھوٹ بول رہا ہے۔“

”جھوٹ جھوٹ۔“ بلونے ہنسی نے پونے۔ گڈو نے ہر کوئی شور مچا رہا تھا۔

”چلو دھج ہو جاؤ یہاں سے۔“ اس نے سامنے والے کو ہاتھ رسید کیا۔ وہ پوری آواز سے روتا اور اپنی امی کو پکار رہا کہ وہ بلی بھی پیچھے ہی تھے۔
 ”اب کیا ہو گا ابو نے حشر نشر کر دیتا ہے اتنے سارے برتن۔“ وہ حسرت سے ان ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا۔

”ٹیاب بھائی! میں ابھی کچھ دیر پہلے بڑے ماموں کے کہنے پر بازار سے رنگ برنگی جھنڈیاں لایا تھا۔ ادھر کرسی پر رکھ کر کسی کام سے گیا اور بعد میں پتا نہیں کس نے ان پر پانی پھینک دیا ہے اب کیا کروں؟“
 ارسلان گھبراہٹا ہوا تھا۔

”نچوڑ کر لگو۔“ اس نے جھلا کر کہا۔
 ”کیا نچوڑ کر لگالوں؟“ ارسلان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”ہاں، لگتی ہیں تو لگو۔ میرا سر نہ کھاؤ۔ پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔“

”ہائے یہ برتن سارے ٹٹ (ٹوٹ) گئے ٹیاب۔
 میاں! کچھ چاہیے تھا تو مجھ سے کہہ دیتے یہ کیا کر

دیا۔“
 ماسی برکتے چلی آئی اور آتے ہی الزام اس پر دھر دیا۔

”تمہیں اللہ کا واسطہ ماسی! آہستہ بولو اور یہ میں نے نہیں بلکہ بچوں نے توڑے ہیں۔“

”لو اب بچوں پر الزام لگادیا۔“ وہ برہم ہوئی۔

”مجھے کیا ضرورت ہے الزام لگانے کی اور ذرا سوچو، ان برتنوں کو توڑ کر مجھے کیا کرنا تھا۔“

”اچھا پھر نہیں توڑے ہوں گے۔“ انداز کچھ ایسا

تھا جیسے کہہ رہی ہو۔ نہیں مانتے تو نہ سہی۔ ویسے اصل بات کا تو مجھے پتا ہی ہے۔

”اے اب میں مہمانوں کو چائے کس میں دوں گی۔

اتنے سارے کپ تو نوٹ گئے ہیں۔“ وہ باہر نکلنے لگا۔ تو ماسی بول اٹھی۔

”ان سے کہنا۔ ہاتھوں کی اوک بنا میں پھر اس میں

چائے ڈال دیتا۔“ تھوڑی دیر ہا کر مشورہ دیا اور ارسلان کے پاس چلا آیا کہ وہ بھی تو مشکل میں گرفتار تھا۔

لڑکے والوں کو آج مہندی لے کر آتا تھا۔ لڑکیاں

اور مہمان آنے والے سب لڑکے ہار سنگھار میں

مصروف تھے۔ ٹیاب کے ساتھ صرف چھوٹی چھو پھو کا

ارسلان ہی کاموں میں لگا ہوا تھا۔ نازیہ آپنی کے شوہر

احمد صاحب آج شام پہنچ گئے تھے اور ٹیاب جو ان کی

آمد کا سن کر خوش ہوا تھا اب بالوس تھا کہ مصروف کا

چند روز پہلے ایک سیمینٹ ہوا تھا جس کے نتیجے میں بازو

پر چوٹ آئی تھی فون پر اس لیے نہیں بتایا تھا کہ نازیہ

پریشان ہوگی۔

”ٹیاب بھائی! آپ کا فون ہے۔ ناصر بھائی لندن

سے بات کر رہے ہیں۔“ کسی رشتہ دار لڑکی نے اطلاع

دی۔

”جا کر کہہ دو۔ مصروف ہوں اور اگر اب اس نے

مجھے فون کرنے کی کوشش کی تو میں خود کو شوٹ کر لوں

گا۔“

”جا کر سن لیں، شاید ضروری بات کرنا چاہتے

ہوں۔“ شبانہ ابھی کسی کزن سے بل بنا کر باہر

”ہاں کل ہم جاویں گے، آپ بھی چلیں گے ناں

ہمارے ساتھ؟“

”کل آئے گی تو دیکھیں گے۔“

”کیا بات ہے، اتنے بدلے بدلے سے کیوں لگ

رہے ہیں۔ کسی سے لڑائی ہوئی ہے کیا؟“

”نہیں حرا بہنا! لڑنا کس سے ہے۔ بس سر میں درد

ہے۔ تم جاؤ۔ سب میں بیٹھو۔ آخر دلہن کی اکلونی بہن

ہو سب ڈھونڈ رہے ہوں گے۔“

”نہیں، میں پہلے آپ کے لیے چائے لے کر آتی

ہوں۔“

”تم رہنے دو حرا! میں ماسی برکتے سے بنوا لیتا

ہوں۔“

”اوہ ماسی برکتے، ارے وہ تو اچھل اچھل کر نچ رہی

ہیں اور گیت گارہی ہیں۔“

”واقعی۔“ ثیاب کو یقین نہیں آیا۔

”ہاں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ ذرا آکر دیکھیں تو

اتنی رونق لگی ہوئی ہے۔“

تب پھر اسے اٹھتا ہی پڑا۔ دونوں پارٹیوں میں

دوروں کا مقابلہ تھا۔ لڑکے لڑکیاں سب اپنی طرف

سے پورا زور لگا رہے تھے۔

”ثیاب بھیا! یہ ٹیوب نہیں جل رہی ذرا چیک

کریں۔“ ماموں کے بیٹے نے اوھر توجہ دلائی اس نے

جھٹ قریب رکھی میز اٹھائی اور اس پر چڑھ گیا مگر دادا ابا

کے زمانے کی کمزور گھن کھائی میز وزن بڑاشت نہیں

کر سکی۔ اور نتیجتاً یہ دھڑام سے نیچے آ پڑے۔

قریب کھڑے تمام کمزور نے قہقہے لگائے، اپنی چوٹ بھلا

کر جلدی سے اٹھنا پڑا اور جب میز پر نظر پڑی تو مزید

تارے ناچ گئے، یہ تو دادا مرحوم کی میز تھی جو اب انے

بطور نشانی سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ اف اگر ان تک

یہ اطلاع پہنچ گئی کہ یہ حرکت مجھ ناچیز سے سرزد ہوئی

ہے تو خیر نہیں۔ اس نے جلدی جلدی حصے، خرے

اکٹھے کیے اور چھت پر رکھ آیا۔ سیڑھیاں چڑھتے

اترے احساس ہوا کہ ٹانگ پر اچھی خاصی چوٹ لگی

ہے۔ مگر اب اس وقت کوئی علاج بھی تو ممکن نہیں

نکلی تھی جس کی بات سن کر بول اٹھی۔

”تمہیں شوق ہو رہا ہے تو تم سن لو۔“ وہ بدستور

کریاں سیٹ کرتے ہوئے بولا۔

اور اس رات اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ اپنی

شادی مکمل سادگی سے کرے گا، یہ فضول قسم کی

رسمیں بالکل نہیں ہوں گی۔ ابو چاہے جتنا مرضی کہیں

مگر بالکل نہیں سنوں گا تو بے کوئی تک ہے۔ گلا پھاڑ پھاڑ

کر بکواس کی ہے اور اسے شادی بیاہ کے گیتوں کا نام دیا

ہے نہ کوئی سر نہ سنگیت بس جس کے جوبی میں آنا

ہے، گانا چلا جاتا ہے۔ ہر لڑکی کی زرق برق لباس پہنے

میک اپ تھوپے خود کو حسینہ عالم سمجھ رہی ہے۔

مضائقے گئے تو کرے آ رہے ہیں اور کھائی کم جا رہی ہے،

ضائع زیادہ ہو رہی ہے اور یہ لائفنگ اور جھنڈیاں

سبحان اللہ کیا سچوٹ ہے بچے تو بچے بڑے بھی رنگ

برنگے کاغذ لگے دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ کچھ برتن

اس روز بچوں نے توڑے تھے۔ کچھ آج ٹوٹے ہیں۔

ویڈیو کمرے کے سامنے لوگ خواہ مخواہ آتے ہیں اور

تب تک دلہن پر سے روپے نہیں وار تے جب تک

ایسے دو تصویریں نہ بن جائیں۔



”ثیاب بھائی! آپ اوھر کیوں چلے آئے ہیں۔ اتنا

مزا آرہا ہے۔“

”کیا مزا آرہا ہے؟“ حرا کی بات پر منہ بنا کر پوچھا۔

”کمال ہے، آپ تو خود اتنے زندہ دل ہیں۔ ایسے

موقعوں پر اپنی رونق لگاتے ہیں۔ اب جب اپنے گھر

میں شادی ہے تو یوں الگ تھلک آ بیٹھے ہیں۔“

”ہاں۔ بس دلیل ہی نہیں چاہ رہا۔“ اور اس نے

جھوٹ نہیں بولا تھا تھکن تو جو تھی سو تھی مگر اس کا دل

بھی بچھا بچھا سا تھا۔

”ہاں۔ واقعی رخصتی باجی کی جدائی کا خیال مجھے بھی

اواس کر دیتا ہے۔“ حرا بھی وہیں اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”کل تم لوگ مندی لے کر جاؤ گے؟“ اس نے

پوچھا۔

تھا۔

”بچے تو کل بھی خراب کر دیں گے۔ چلو خیر“
تمہاری مرضی۔“
اور ثیاب شکر کے گلے پر بڑھ کر پھر اپنے کام کی طرف
متوجہ ہوا۔



برات صرف دو گھنٹے لیٹ آئی۔ خیال تو یہی تھا کہ
پانچ گھنٹے لیٹ ہوگی تو سمجھو صبح وقت پر پہنچ گئی۔ مگر
اسی جلدی آنے پر لڑکیوں میں جھگڑا مچ گئی اکثریت
ابھی تیار ہی کہاں ہوئی تھی۔ حرا مسعدیہ کپڑے تو بدل
چکی تھیں مگر دیگر لوازمات ابھی باقی تھے۔ نازیہ آپنی کے
صرف بال بٹانے رہ گئے تھے۔

”جلدی کرو، جا کر خواتین کو بار پر سناؤ۔ بس وہ اندر
داخل ہونے ہی والی ہیں۔“ ارسلان نے جلدی جلدی
تیار ہونے کی کوشش میں ہانپتی لڑکیوں کو اطلاع دی۔
”ہائے اللہ! اس حلیمے میں میں تو ہرگز نہیں جاؤں
گی۔“

”ٹھیک ہے، تمہیں ماموں ہی آکر نکالیں گے۔“ وہ
غصے سے کہہ کر واپس مڑ گیا۔

”ایمی اور پھوپھو کہاں ہیں؟“ ثیاب انہیں ڈھونڈ رہا
تھا کہ بارات کا استقبال کرنے کو گھر کا کوئی فرد مل ہی
نہیں رہا تھا۔ آخر بڑی پھوپھو مشکل سے دستیاب
ہوئیں۔ بکھرے بال میچنگ کا دوپٹہ ڈھونڈتی ہوئی۔ وہ
اس کی کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھیں۔
”پھوپھو! کیا سوچیں گی براتی خواتین۔“

”اے انتہائی خیال ہے ان کی سوچوں کا تو تم خود ہی
مل لو ان سے، اور ہار بھی پٹناؤ۔ یہ شبانہ کبخت
جانے کہاں مر گئی۔ کہا بھی تھا دوپٹہ سوٹ کے ساتھ
رکھنا۔ بوجھلا، اب میں اس فقیروں والے حلیمے میں
ان عورتوں سے کیسے مل سکتی ہوں! اے ثیاب بیٹے!
مجھے اپنی امی کا نگہا ہی لاؤ۔ ذرا بال ہی سنوار لوں۔“
مڑ کر وہ کھاتو ثیاب غائب تھا۔

”یہ شبانہ اب نظر تو آئے مجھے، نجانے لپ اسٹک
کہاں رکھ دی ہے۔ مجھے سجتے سنورتے نہیں دیکھ

ماسی برکتے کا گیت سننے اور ناچ دیکھنے کی خواہش
ادھوری ہی رہ گئی۔ سوچا امی مل جائیں تو ان سے کوئی
علاج دریافت کرے شاید ان کے پاس کوئی دوا بھی رکھی
ہو، مگر اصل مسئلہ تو امی کو تلاش کرنے کا تھا اور اسے
رش میں نہ تو امی کہیں دکھائی دیتی تھیں مذہبی حرا اور
نازیہ آپنی۔ اگلا روز شاید پچھلے تمام دنوں سے زیادہ
ہنگامہ خیر تھا۔

لڑکیوں کو آج مہندی لے کر لڑکے والوں کی طرف
جانا تھا۔ ساتھ میں کچھ مہمان لڑکے بھی جا رہے تھے مگر
ثیاب، ارسلان اور نازیہ کے شوہر احمد کو گھر پر ہی رہنا تھا
کہ کل بارات آئی تھی اور اس سلسلے میں بہت سے
انتظامات آج ہی کرنے تھے۔ اس کی ٹانگ میں کچھ
تکلیف تھی۔ احمد بھائی ویسے ہی زخمی تھے اور ارسلان
ماموں کی ڈانٹ سن سن کر ہراساں ہو رہا تھا۔ سو کاموں
کی رفتار خاصی ست تھی، آج تو بالاجاں بھی گھبرائے
ہوئے تھے اور سوچ رہے تھے۔ یہ انتظامات گھر پر
کرنے کا شوشانہ ہی چھوڑتے تو اچھا تھا۔ کبھی انہیں
دیگیوں کی تعداد کھنکھنے لگتی۔ کبھی ٹینٹ کے اندر جا کر
جھانکنے اور اعلان کرتے کہ یہاں پر سب مہمان نہیں
سما سکتے، جگہ کم ہو جائے گی۔

چچا جان کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ انہیں
آرام کی ضرورت تھی مگر ابو جان نے انہیں بھی ساتھ
ساتھ لگا رکھا تھا۔

”ثیاب!“ ابو جان نے پکارا، وہ گام ادھورا چھوڑ کر
ادھر لپکا۔

”آرا کئی گھنٹے کب بنے گا، صاحبزادے؟“ انداز
بڑا جتنے نوالا تھا۔

”وہ تو کل بنائیں گے ابو جان!“ ڈرتے ڈرتے
اطلاع دی۔

”کل اتنا تاہم کہاں ہو گا؟“ انہیں بات پسند نہیں
آئی۔

”جی جی صبح بنالیں گے۔ آج بنایا تو بچے خراب کر
دیں گے۔“

”کوئی ضرورت نہیں ایسے فضول مذاق کرنے کی۔“

”اور کیا۔ ہمیں کیا پتا تھا ہم ایسے گھر سے لڑکی لے رہے ہیں جہاں مہمانوں کا احترام تک نہیں کیا جاتا۔“

دولہا کی بہن بھی بول اٹھی۔

”اور جینز بھی بس نام کا دیا ہے۔“ امی صاحبہ نے پھر زبان کھولی۔

آخر علی کسی کام سے ادھر آئے تھے یہ سب سنا تو رک گئے۔

”امی میرے لیے سونے کے ٹاپس بھی نہیں دیے انہوں نے۔“ بہن بولی۔

”جب ہی رہو۔ انہوں نے دیا ہی کیا ہے۔“

”چلیں اٹھیں آپ سب اور تشریف لے جائیں۔“ آخر صاحب غصے سے سرخ چہرے دولہا کی

لمبے کے سر پر پہنچ گئے۔ امی اور چھوٹی پھوپھو جو ان لوگوں کی باتیں سن کر پریشان ہو گئی تھیں۔ اب ان کے اس حکم پر بالکل ہی ڈھم گئیں۔

”یہ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ، کچھ تو خیال کریں۔“

باراتی ہیں یہ لوگ۔ امی کی آواز لڑکھڑاہی تھی۔

”تمہیں چاہئیں ہمیں ایسے باراتی۔ چلیں نکلیں آپ لوگ۔ اپنا رستہ ناپیں۔“

کسی نے چچا کو بھی اطلاع کر دی۔ وہ دوڑے دوڑے آئے۔

”بھیا! یہ کیا کر رہے ہیں آپ! خدا کے لیے ذرا سوچیے۔ میری بیٹی کی زندگی خراب ہو جائے گی۔“

”چپ کرو نم۔“ انہوں نے چھوٹے بھائی کو ڈانٹ دیا۔

بارات میں آنے والے لوگ ایسی کسی صورت حال کے لیے تیار ہی کہیں تھے۔ دولہا اٹھ کر اپنے والد کے پاس جا کھڑا ہوا جو اس لڑائی کی اطلاع سن کر ادھر آئے تھے۔

”دیکھیں بھائی صاحب! آپ ہماری بے عزتی کر رہے ہیں۔“ دولہا کے باپ نے کہا۔

”اچھا تو تمہاری کوئی عزت بھی ہے۔ میں کہتا ہوں لڑکی والوں سے مانگ مانگ کر بیوی اور بیٹی کو زیور

سکتیں یہ لڑکیاں۔“

ٹیاب امی کو بلانے ان کے کمرے تک پہنچا۔ دیکھا تو کراہی تھا۔ آہ نرم و گداز خالی بستر کھڑکی پر گر اٹھا

پردہ، ماحول بھی نیلگوں ہو رہا تھا۔ صاف ستھرا ٹکلیہ ایک دم سے ٹھکن عود کر آئی۔ صبح کی نماز کے بعد ہی ابو نے

اپنی نگرانی میں کام لینا شروع کیا تھا۔ کپڑے تک نہیں بدلے تھے اس نے اور شیونے کا موقع بھی نہیں ملا

تھا۔ آنکھیں مارے نیند کے بوجھل ہونے لگیں۔ سوچا سارا کام تو تقریباً ہو ہی چکا ہے جو رہ گیا ہے۔

ارسلان اور احمد بھائی دیکھ لیں گے مجھے اب سو جانا چاہیے۔

دبے قدموں چوروں کی طرح بستر کی طرف بڑھا کہ خطروں کا بھی کوئی اسے آواز سن دیتا ادھر آنکھ

گاہ بڑے آرام سے بستر پر لیٹا۔ اف کس قدر ٹھکن ہے، آج کتنے دنوں بعد تو ایک مکمل بستر ملا ہے ورنہ

اس سے پہلے جو ہاتھ لگاؤ، بچھا کر سونا پڑتا تھا اور نیند بھی بہت تھوڑے وقت کی مگر آج جی بھر کے سونا چاہتا تھا

اور بستر پر لیٹتے ہی اسے نیند نے آن گھیرا۔



دولہا میاں یا تو واقعی شرمیلے تھے یا پھر بوز کر رہے تھے ہر حال جو بھی تھا ان کے لیے اچھا نہیں تھا۔ لڑکے

لڑکیاں ان پر ہر طرف سے حملے کر رہے تھے۔ بارات کے ساتھ آنے والوں نے اپنے دولہا کو بچانے کی

کوشش تو کی مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔ حرا نے گلاب جاسن دولہا کی طرف بڑھائی۔

ہاتھ سے پکڑنے لگے تو کہا۔

”اونہوں! یوں نہیں منہ کھولیں۔“ اور جب منہ کھلا تو ہاتھ پیچھے کر لیا پھر دوبارہ آگے کیا اور اب کے

انہوں نے جلدی سے آگے ہو کر کھانا چاہا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ منہ میں جانے کے بجائے چہرے پر لگ

گئی۔ پیچھے سے کسی نے گتے کی ٹوپی پہنا دی جس پر دوکان بنائے گئے تھے۔ نیچے لکھا تھا۔ دولہا کے گدھے

جیسے کان یہ سب دیکھ کر دولہا کی امی کا موڑ آف ہو گیا۔ کہہ دیا۔

پہننے والے کی کوئی عزت ہوتی ہے بھلا۔“
”بھک منگے فقیر۔“ کسی پر جوش لڑکے نے نعو
لگایا۔

”انہیں روپیہ دے دو سب شاید ان کے
زیورین جائیں۔“ کوئی اور بولا۔

پھر ہر کوئی لعن طعن کرنے لگا۔ خاموش تھے تو
رخشی کے لبا جو جانتے تھے کہ یہ سب نعرے لگانے
والے لڑکے والوں کو برا بھلا کہنے والے ابھی ابھی اپنے
اپنے گھروں کو روانہ ہوں گے اور پھر خود بھی ایسی ہی
کا دعویٰ شادیاں رچائیں گے۔ ان کی بیٹی کی ڈولی
اٹھانے اب کوئی نہیں آئے گا بے قصور ہونے کے
باوجود سارے قصور اس کے نام لکھے جائیں گے۔

ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ ہم برائی کو برائی قرار
دینے میں پیش پیش ہوتے ہیں مگر جب اپنا وقت آتا
ہے تو یہ کہہ کر دامن بچا لیتے ہیں کہ سب کر رہے ہیں
ہم کیوں نہ کریں۔ یہ جواب باراتیوں کے لئے لے
رہے ہیں۔ ان میں ایک بھی ایسا ہے جو یہ کہے کہ میں
اپنی شادی پر کچھ بھی طلب نہیں کروں گا۔

”خدارا! اسکا ہنگامے کو ختم کرائیے اور مثالیں ان
لوگوں کو۔“ امی روتے ہوئے اباجان سے مخاطب
تھیں۔

”ہرگز نہیں۔ میں ایسے کم ذات لوگوں میں پھول
سی بچی نہیں دے سکتا۔“
”بھائی صاحب! کچھ تو سوچیں لڑکی کا معاملہ ہے۔“

چھوٹی پھوپھو بھی بول اٹھیں مگر انہوں نے سی کی
ایک نہیں سنی۔ بارات واپس چلی گئی۔ پچا بے دم ہو کر
کرسی پر بیٹھ گئے۔

”تم فکر کیوں کرتے ہو۔ حسن! ہماری بچی کے لیے
لڑکوں کی کوئی کمی نہیں، ایک تو میرا بیٹا ہے۔ نیاب گھر کا
بچہ ہے۔ جتنی شریف، لائق فائق۔ ادب آداب سے
آشنا، ذمہ دار۔ اگر تم یہ رشتہ قبول کر لو تو مجھے خوشی ہو
گی۔“

سب نے حیرت سے ابو کی طرف دیکھا۔ پچا جان
مارے مسرت کے ابو کے گلے لگ گئے اور ابھی چل
بارات جانے کے بعد خاموشی اور اداسی چھا چکی تھی۔
ایک دم سے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ارسلان بڑے ماموں
کا خیال کیے بغیر بھنگواڑ لے لگا، عزیزی نئی اور خوش کن
خبر اٹھانے میں گھری رخشی کو سنانے کے لیے دوڑی۔
امی ناز بے سے کہہ رہی تھیں۔

”فورا“ بازار جاؤ اور میری رخشی کے لیے زیور اور
جوڑے خرید لاؤ۔ خدا امیری اور میرے بیٹے کی خواہش
یوں پوری کرے گا۔ میں عاجز بندی سوچ بھی نہیں
سکتی تھی۔“

”نیاب بھائی نے اپنی شادی پر پر خوب کام کیا
ہے۔“

اس کی بھاگ دوڑ یاد کر کے سعدیہ ہنس رہی تھی۔
جرات نے یہ خبر ملول بیٹھی رخشی کو سنائی۔ پہلے تو اسے
یقین ہی نہیں آیا۔ اسے کتنی ہی قسمیں کھائی پڑیں اور

شائع ہوئے ہیں

دار و خواتین و انجمن کی طرف سے پیش کیے گئے خوب صورت ناول

- ☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 250 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
- ☆ محبت بیاں نہیں لبتی جدوں قیمت: 250 روپے

32216361 فون: اردو بازار، کراچی۔ 37

جب یقین آیا تو بہن سے لپٹ گئی۔ اور بے تحاشا آنسو نکل پڑے۔

”گلتا ہے بہت دعائیں مانگی گئی ہیں۔ جب ہی تو آخری وقت پر وہ بارات واپس چلی گئی۔“ ارسلان بھی چلا آیا وہ جھینپ کر بہن سے الگ ہو گئی۔
ارسلان ثیاب کو تلاش کرتا ہوا ادھر آیا تھا ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ آخر ممانی کے کمرے میں اسے سویا ہوا ثیاب مل ہی گیا۔

”اٹھو بھائی! دروازہ کھولو۔ خوش نصیبی دستک دے رہی ہے۔“ اس نے اس کے سر پر پیچ کر پورے زور سے کہا۔

”کیا بکواس ہے یار! سونے دو۔“ وہ کوٹ بدل کر لیٹ گیا۔

”بکواس نہیں تمہاری شادی ہے، جلدی سے اٹھ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ ماموں غصے آکر کینسل کریں۔“
”ارسلان! کیوں میرے ساتھ دشمنی کر رہے ہو۔ سونے دو۔“

نیند میں اس نے کچھ نہیں سنا، وہ بھی سمجھ گیا ایسے نہیں اٹھے گا۔ کسی بزرگ کو بھیجنا پڑے گا۔ کچھ دیر بعد جب ارسلان کے والد اسے باہر لے کر آئے تو بھی اس

پر نیند بری طرح سوار تھی۔
”صاحبزادے! حلیہ درست کر لو، تمہاری شادی ہے رخصتی کے ساتھ۔“

مارے حیرت کے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ الفاظ پر غور کیا تو یہی سوچ ابھری یا تو میں عالم خواب میں ہوں یا پھر ابلانے پی رہی ہے۔ سو دوبارہ وضاحت چاہی۔ سعدیہ نے جلدی جلدی تفصیل گوش گزار کر دی۔

”کیا یہ سچ ہے؟“ اس نے ایک بار پھر ابو سے تصدیق چاہی۔

”میرا تمہارا مذاق تو کبھی بھی نہیں رہا صاحبزادے!“
اس کی بے یقینی ان کے موڈ کا ناس مار گئی اور ادھر اسے بھی یقین آ گیا کہ واقعی وہ اور ابو دونوں ہی ہوش و

حواس میں ہیں، پھر کیا تھا چند منٹوں میں نہاد ہوشیار ہوا بالکل فریش مہمانوں کے روبرو تھا۔ رخصتی سے تو ابھی سامنا نہیں ہوا تھا۔ محبت کے جو طوفان اس کے لیے اٹھ رہے تھے۔ انہیں دل میں چھپا رکھا تھا اہل بیتہ جو ہمار ابو جان پر آ رہا تھا۔ اس پر قابو پانا بھی آسان نہیں تھا آج ابو بہت پیارے، بڑے اچھے لگ رہے تھے۔ جی چاہتا تھا اٹھ کر ان کے گلے لگ جائے بلکہ انہیں اٹھا کر دو تین چکر بھی دے ڈالے مگر خطرہ ان کے موڈ سے تھا جس کا اندازہ ان کا چہرہ دیکھ کر بالکل نہیں ہو رہا تھا۔
سعدیہ کی زبانی اس نے رخصتی کو مبارک باد بھجوائی تھی، اب وہ اس کے کان کے قریب جھکی کہہ رہی تھی۔

”رخصتی بابی اس مبارک باد کو سن کر طمانیت سے مسکرائی تھیں اور اب بھی مسکراتی جا رہی ہیں اور ہاں وہ ناصر بھائی کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے ثیاب سے کہنا رخصتی کو بہنوں کی طرح رخصت کرے۔ میں نے کہہ دیا، یہ ناممکن ہے۔ پوچھا کیوں جواب دیا۔ اپنی نیت خراب تھی سو بارات واپس چلی گئی اب دو لہا بنے بیٹھے ہیں اور دل میں ہزاروں لٹو پھوٹ رہے ہیں۔
چہرے پر مسکان ہے اور زمانہ پریشان ہے۔“
”آئیے مولوی صاحب! نکاح پڑھائیے“ ابو ادھر چلے آ رہے تھے۔

سعدیہ جلدی سے کھسک گئی، وہ بھی سنبھل کر بیٹھ گیا اور دل نے ابھی سے کہہ دیا۔
”مجھے یہ ساتھ قبول تھا۔ قبول ہے قبول رہے گا۔“

خاموش محبت یوں معتبر ہو گئی کب سوچا تھا۔ دونوں کے دل ایک ہی انداز میں دھڑک رہے تھے ایک ہی بات کہہ رہے تھے۔





”اف! کیا بتاؤں تمہیں گھر کی شفٹنگ کتنا مشکل کام ہے اور وہ بھی جب سب کچھ آپ کو خود ہی کرنا ہو۔ دو عدد بچوں کے ساتھ۔“

ضحیٰ نے کارڈ لیس کو دوسرے کان پر منتقل کرتے ہوئے کندھے اور سر کے درمیان دبایا اور ہاتھوں میں موٹی موٹی کتابوں کا ڈھیر اٹھا کر الماری کی طرف بڑھی۔ ”ہاں اب تو شکر ہے تقریباً“ کام مکمل ہے۔ بس کتابوں کی الماری کا کام کر رہی ہوں، تمہیں تو پتا ہے میری کتابوں کی تعداد کا اور اب تو بچوں کی بھی کتابیں آنے لگی ہیں گھر میں تو سمجھو یک نہ شدتیں شد۔“ سارے بال اکٹھے کر کے اونچی سی پونی بنائے ضحیٰ کبھی کتابیں اٹھاتی رکھتی اور کبھی فون کو ایک سے دوسرے کان پر منتقل کرتی ہوئی بار بار لمبے سے لاؤنج کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کاچکر لگا رہی

نیر سلطانہ کاشف



مصرفیات میں ہی اتنا وقت گزر جاتا ہے۔ اب زندگی میں وہ سکون کہاں۔ اچھا چلو۔ اب مجھے اجازت دو۔ بہت سارا کام باقی ہے ابھی۔“

وہ جو اس انداز سے بیٹھی تھی جیسے کہ اب فرصت سے بات کرنے کے موڈ میں ہو، ایک دم سنسنیزاری ہوئی تھی۔ کارڈ لیس بند کر کے اس نے میز پر رکھا اور ایک ٹرالس کی کیفیت میں اٹھ کر الماری کی طرف بڑھی، اور اس کے بعد کتنی ہی دیر تک وہیں قالین پر بیٹھی اپنی پرانی تحریروں کی فائل دیکھتی رہی۔

اطلاعی تھکنی کی تیز آواز پر اس نے ہڑبوا کر فائل سے سر اٹھایا۔ ”اف اتنا وقت گزر گیا۔“ اس نے

تھی۔ ”ارے تم سے باتیں کرتے کرتے اچھا خاصا کام تو ہو ہی گیا۔“

اس نے جائزہ لیتی ہوئی نظروں سے الماری کو دیکھا اور وہیں رکھی آرام کرسی پر ٹیک لگا کر تسلی سے بیٹھ گئی۔

”کہاں جناب اب تو لکھنا لکھانا ایک خواب ہی بن گیا۔“ اس کے خوب صورت چہرے پر ایک دم سے تھکن عیاں ہوئی تھی۔

”نہیں نہیں پابندی کیوں ہونی ہے عامر تو کہتے رہتے ہیں مجھ سے لکھنے کو بار بار، لیکن گھر اور بچوں کی

حیرت سے گھڑی کی طرف دیکھا اور دروازے کی جانب بڑھی۔

”کیا حال ہیں بھی ہماری بیگم صاحبہ کے۔“ سلام کا جواب دیتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں حال دریافت کرنا عامر کی عادت تھی۔ آفس کی ساری تھکن وہ گھر کی دہلیز سے باہر ہی چھوڑ کے آنے کی کوشش کیا کرتا تھا جس میں اکثر کامیاب بھی رہتا تھا۔

”حال تو بہت اچھے ہیں لیکن گھر کے، میرا حلیہ اور حالت دونوں ہی توجہ طلب ہیں، ہے نا؟“

وہ جانتی تھی کہ عامر گھرواپسی پر اس کا ہنستا مسکراتا اور تھوڑا سا سچا ہونا چہرہ دیکھنا پسند کرتا تھا۔

”اے کوئی بات نہیں جناب! حلیہ درست کرنے کے لیے مالدولت آپ کو دس منٹ دیتے ہیں اور حالت درست کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ بس اب آپ باورچی خانے کا رخ نہ کریں بہم چلیں گے آپ کی امی کی طرف، آپ کی تھکن بھی اتر جائے گی اور ہم بچوں کو بھی لیتے آئیں گے۔“

عامر مسکراتے ہوئے لاؤنج کی طرف بڑھا تو اس نے بھی کمرے کا رخ کیا۔



”اور ضعیف گھر کی ترتیب ہو گئی مکمل ان دنوں میری بھی طبیعت کچھ ٹھیک نہ رہی ورنہ کچھ تو مدد کروادیتی تمہاری۔“

کھانے سے فراغت کے بعد چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں پکڑاتی ہوئی بھا بھی پاس ہی بیٹھ گئیں۔

”جی بھابھی! شکر ہے ہو گیا سب کام اور یہ آپ نے خوب کی۔ ایک ہفتے سے پورا پورا دلن جو بچوں کو آپ نے سنبھالا ہوا ہے اس سے بڑھ کر کوئی مدد ہو سکتی ہے بھلا؟۔ ویسے چائے بے حد مزیدار بنائی ہے آپ نے۔“

اس نے تشکر کا اظہار کرتے ہوئے بات بدل دی تھی۔

”پچھو! آپ کیا رسالوں میں کہانیاں لکھتی

تھیں؟“ اریشہ جو کافی دیر سے کسی رسالے میں سر دیے ہوئے تھی ایک دم سے سوال کر بیٹھی۔

”ہوں؟ ہاں لکھا کرتی تھی، آج تمہیں کس طرح یہ خیال آیا؟“ اس نے اریشہ کی طرف رخ موڑا۔

”اے بھئی۔ آج کسی کتاب سے تمہاری لکھی ہوئی کسی کہانی کا مسودہ مل گیا تھا۔“ اریشہ کی جگہ بھابھی نے جواب دیا تو وہ بس مسکرا کر رہ گئی۔



فجر کی نماز سے فارغ ہو کر اس نے چائے کا پانی چولے پر رکھا، عامر کے مسجد سے واپس آنے تک چائے تیار رکھنا اس کا روز کا معمول تھا۔ چائے دم پر رکھ کر اس نے پیالیوں میں چینی ڈالی اور باورچی خانے سے لمحہ کیلری میں چلی آئی۔

ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوائے موڈ پر خاطر خواہ اثر ڈالا اور وہ عامر کے آنے تک وہیں کھڑی اوپر نیچے دائیں بائیں فلیشس کا جائزہ لیتی رہی۔

”بیگم! یہ فائل کل سے بیس پڑی ہے بے چاری۔“

چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے عامر نے اس کی توجہ قالین پر پڑی فائل کی طرف مبذول کروائی۔

”اوہ ہاں! اکل تو ایک دم سے نکل گئے تھے اور رات آکر اس طرف آتا ہی نہیں ہوا۔“ اس نے پیشانی کو ایک دم سے چھوتے ہوئے کہا اور فائل اٹھا کر الماری میں رکھ دی۔

”بھئی! ایک بات تو بتاؤ!“ عامر نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ ”میں نے تمہیں کبھی لکھنے سے منع نہیں کیا۔ تم خود لکھنا چاہتی ہی نہیں ہو، لیکن پھر بھی جب ایسا کوئی ذکر ہو تا ہے ایک اداسی تمہارے چہرے کا احاطہ کیوں کر لیتی ہے؟“

”پتا نہیں عامر! کیا ہوا ہے مجھے، پہلے تو مجھے لگتا تھا کہ اتنی ذمہ داریوں کے باعث میں تمہیں لکھ پاؤں گی لیکن اب مجھے لگتا ہے جیسے میں لکھ ہی نہیں سکتی اندر

آمین! سامنے والی اسماء بھابی نے زور و شور سے آمین کہا تو اس نے بھی ہلکی آواز میں آمین کہہ کر ساتھ دیا۔
”اب دیکھو اگلی قسط میں کیا ہوتا ہے۔“
برتنوں کی طرف پلٹی تھی چونکہ کُر رک گئی، اگلی قسط؟

”ہاں مجھے تو بڑی شدت سے انتظار ہے، میں تو رسالہ آتے ہی سب سے پہلے یہی ناول پڑھوں گی۔“
براہروی گیلری سے پر عزم کچے میں ارادہ ظاہر کیا گیا۔
”چھاپتا ہے کیا؟ اس بار میں نے الماری ٹھیک کی تال! تو وہی قانتہ رابعہ والا فارمولا اپنایا جو تم نے بتایا تھا!“ سامنے والی اسماء بھابی کے پاس شاید فرصت ہی فرصت تھی اس وقت۔

”چھاپا؟ زبردست، کتنا اچھا رہتا ہے نا! مجھے تو بہت فائدہ ہوا اس ایک سال والے فارمولے سے فیصلہ کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوا، بس سوچ لیا تھا کہ وہ سارے کپڑے جن کو ایک سال سے ہاتھ بھی نہیں لگایا بنا پس و پیش نکال دیتے ہیں۔“ براہروی گیلری سے آواز آئی۔

یقین مانو بڑا کامیاب طریقہ ہے۔ میں نے اپنی ہن کو بھی بتایا۔ اس بار وہ بھی یہی کمرے کی۔ ان شاء اللہ!“ اسماء بھابی نے جوش و خروش سے اعلان کیا۔
”ان شاء اللہ بھئی اس کا ثواب تو مجھے بھی ملے گا“ آخر میں نے بتایا تھا آپ کو اور آپ نے اپنی ہن کو“ برابر والی گیلری سے اٹھاتی ہوئی آواز آئی۔

”مٹی نے جلدی جلدی برتن دھو کر ہاتھ خشک کیے اور لاؤنج میں آکر کافے اور فلم کی تلاش مین سرگرداں ہو گئی اس کے اندر ”تحریک“ پیدا ہو چکی تھی۔

سے کوئی تحریک ہی نہیں پیدا ہوتی۔“ سخی نے بے چارگی سے عامر کی طرف دیکھا تھا۔
عامر کے ساتھ ہی بچے اسکول کے لیے روانہ ہو چکے تھے، دروازہ بند کر کے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے اس نے باورچی خانے کا رخ کیا۔

”شیمین! تمہیں پتا ہے کیا ہوا علیزے کے ساتھ؟“ برتن سمیٹ کر دھونے کے لیے رکھتی ہوئی مٹی کے ہاتھ اس آواز پر لمحہ بھر کو رکے۔
”ہاں جج میں اسماء بھابی! بہت افسوس ہوا۔ انتقال دکھ رہا ہے میرا تو؟“

”مٹی کو اندازہ ہوا کہ یہ آوازیں اس کے برابر اور سامنے والی گیلری میں کھڑی خواتین کی ہیں۔
”اللہ کتنی سی عمر میں طلاق ہو گئی! چھوٹے چھوٹے بچے تو رل جائیں گے نا اس کے۔“ مٹی کا ہل ہل گیا اور اس نے آوازوں پر توجہ دینے کے لیے تل ہلکا کر دیا۔

”اصل میں تو سب کیا دھرا اس کی ہاں کا ہے اس نے ہی بہت الٹی سیدھی پیٹیاں بڑھائی تھیں علیزے کو، لیکن ابھی کوئی اتنی بھی تو نہیں تھی اسے خود بھی عقل سے کام لینا تھا ناں!“

ایک گیلری سے آئے ہمدردی کے بیان کو دوسری گیلری سے فوری طور پر مسترد کر دیا گیا تھا، مٹی کے جتس میں اچھا خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ برتنوں کو ایک طرف کر کے اس نے ہاتھ دھوئے اور گیلری کے قریب آگئی، ذرا سی دعا سلام ہو چکی ہوئی تو کھل کے ہی پوچھ لیتی آس نے اپنے آپ سے کہا اور پھر سے سماعتوں کو باہر کی طرف مرتکز کر دیا۔

”ہاں ویسے بات تو آپ کی بھی ٹھیک ہے اسماء بھابی! آج کل لڑکیوں کو اپنے گھر بچانے کی فکر ہی کم ہو گئی ہے شاید، اوپر سے ماؤں کے رویے اور شبہ دیتے ہیں۔ بس اللہ ہی بچائے، سب کو محفوظ رکھے۔“
براہروی گیلری سے صدق دل سے دعا کی آواز آئی:





دعا کی والدہ کا اچانک انتقال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ماں اور سوتیلے بھائی حماد کے ساتھ رہتی ہے۔ دعا کے دو ماموں ریاض احمد جن کی بیوی رابعہ احمد ہیں اور الیاس احمد جن کی بیوی مریم ہے۔ رابعہ احمد کے کتنے پر ریاض احمد دعا کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں کہ سوتیلے بھائی کے ساتھ رہنے کا اب جواز نہیں ہے۔

ریاض احمد کے دو بیٹے عمیر اور عمر ہیں اور ایک بیٹی نوال ہے۔ عمیر بہت سلجھا ہوا نوجوان ہے جس نے باپ کے ساتھ مل کر ان کا کاروبار بھی سنبھال رکھا ہے۔ جبکہ عمر ایک بگڑا ہوا ضدی اور خود سر نوجوان ہے۔

الیاس احمد اپنے بڑے بھائی ریاض احمد کے برابر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ آنے جانے کے لیے درمیان میں دروازہ ہے۔ ان کی بیوی مریم ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ بیوی کی جائیداد تھکانے کی کوشش میں ہیں۔ مریم کا ایک بھائی ایکسڈنٹ میں معذور ہو جاتا ہے اور اس کی بیوی مرحاتی ہے وہ ذہنی طور پر بھی ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اس کا علاج شادی تجویز کرتے ہیں۔

انعم اور احسن ایک خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن اولاد کی کمی ان کی زندگی میں ہے۔ انعم کے شک کرنے پر احسن اپنا ٹیسٹ کرواتا ہے۔ انعم بہت پریشان ہے احسن اسے تسلی دیتا ہے۔ لیکن اس کے بار بار پریشان ہونے پر ناراض ہو کر اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ اس کی رپورٹ پازیو آتی ہیں وہ بالکل نارمل ہوتا ہے۔ انعم کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ کمی اس میں ہوتی ہے۔

الیاس احمد بنیادی طور پر لالچی آدمی ہے۔ اسے رشتوں کا بھی پاس نہیں۔ وہ اپنی بیوی سے بھی اکھڑا اکھڑا رہتا ہے اور

مکمل ٹول





اپنے بھتیجے عمیر کو بھی باپ بھائی کے خلاف بھڑکا رہا ہے۔
عمیر اور دعا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ راجہ احمد یہ پسند نہیں کرتیں۔ عمیر اور نوال دونوں بہن بھائی دعا کو اپنی ماں کے غم سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ریاض احمد کو بہن اور بھانجی سے بہت محبت ہے۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ عمر کو دعا ایک آنکھ نہیں بھاتی وہ اسے ہر وقت ذلیل کرتا رہتا ہے۔

دعا کو دیکھ کر الیاس احمد کا لالچی ذہن مختلف منصوبے بنانے لگتا ہے۔
الیاس احمد، عمر کے کہنے پر اس کے والد سے اس کے علیحدہ بزنس کی سفارش کرتا ہے، جسے ریاض احمد سختی سے رد کر دیتے ہیں۔ عمران سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔

تبریز ملک اپنے معذور بھائی کی شادی اور مریم کو ان کا حصہ دے کر پیشہ کے لیے امریکہ میں رہائش پذیر ہونا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر الیاس احمد ایک شاطرانہ منصوبہ بناتا ہے۔ اور عمر کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ عمر کا وہیہ دعا کے ساتھ انتہائی دوستانہ ہو جاتا ہے۔ راجہ احمد بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں، کیونکہ انہیں مریم نے مشورہ دیا ہوتا ہے کہ عمر اور دعا کی شادی ہوگئی تو باپ، بیٹے کے درمیان فاصلے کم ہو جائیں گے۔
ریاض احمد، عمر اور دعا کی باہم پسندیدگی کو جانتے ہیں۔ اور ان کی شادی کا عندیہ دیتے ہیں، مگر راجہ، دعا کا عمر سے شادی سے گریز اور بار بار عمر اور دعا کے اچھے تعلقات کو جتاتی رہتی ہیں۔ دعا کے رویے سے عمر کھٹک جاتا ہے۔

تیسری قسط

”آؤ اندر چلیں، میرے دشمنوں نے حملہ کر دیا۔
ہے۔“ عمر کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اس نے قدم موڑ دیے۔ دعا کے قدم منوں بھاری اپنی جگہ جم کر رہ گئے۔
”چلو ہاں، رک کیوں گئیں؟“ اس نے مڑ کر زور سے منجمد دعا کو پکارا۔
وہ یہاں رک کر کیا کرتی۔ عمیر اور ریاض احمد کی گاڑی پورچ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اسے ان کا سامنا کرنا تھا۔ وہ ان سے چھپ کے خود کو مزید گناہ گار ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی۔
”ایک پروڈیوسر مجھے بہت اچھا پروڈیوزل دے رہا ہے۔“ اس نے چلتے ہوئے ایک اور وار کیا۔
ریاض احمد کا نظام تنفس تیز ہو چکا تھا۔ اندر جاتے ان کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ اس لڑکی سے انہیں سنگی بیٹی سے بڑھ کر محبت تھی۔ اس کی تربیت میں انہوں نے بہت سی اچھائیاں شامل کی تھیں۔ اسے اتنا فہم دیا تھا کہ وہ اچھے اور برے میں تمیز کر سکے۔

عمیر باپ کی طرح نظریں چرا کے اندر نہیں چلیا تھا۔
”دعا! میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔“ عمر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پلایا۔ یہ حرکت اسے تاؤ دلانے کے لیے کی گئی تھی۔ عمیر نے زخمی نگاہوں سے اسے ہاتھ پکڑتے دیکھا اور اس کا لہجہ، ”وہ اتنی اپنائیت سے بات کر رہا تھا۔ جیسے وہ انزل سے ایک دوسرے کے شناسا ہوں، اس آواز میں شیرینی صرف دعا کے لیے کھلی تھی۔ تو کیا دعا اس کے لیے بہت خاص ہو گئی تھی۔“
”ہم بعد میں بات کریں گے۔“ صدے سے اس کا دل چور تھا۔ اس کے جسم میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ تھوڑا سا زور لگا کے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔
عمر نے کندھے اچکائے اور اندر چلا گیا۔
”ایسی کون سی باتیں ہیں جو تم دونوں اکیلے میں ڈسکس کرو گے، کسی تیسرے کے سامنے تم نے اسے ٹال دیا۔“ اس کا فشار خون بلند ہو گیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ سب کچھ دعا سمیت ہنس ہنس کر دے۔

”تم غلط سمجھ رہے ہو، ایسا کچھ۔۔۔“ وہ عمیر کی اس غلط فہمی پر دھواڑیں مار مار کے رونا چاہتی تھی۔ اس لمحے کی پڑائی سے وہ کتنا چھپی تھی۔

”سناپ اٹ دے! میں مزید ایک حرف بھی جھوٹ نہیں سنوں گا، یہ سب تم چھپا رہی تھیں ناں۔“ وہ ایک ایک لفظ چبا کے بولا۔ اسے کبھی غصہ نہیں آیا تھا۔ وہ ہمیشہ بہت شائستہ اور مہذب رہتا۔

”ایسا کچھ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔“ اسے صفائی کن معتبر اور صادق الفاظ میں دی جائے کہ جو اسے مطمئن اور دعا کی طرف سے اس کا دل صاف کر دے۔ ”میں کچھ نہیں سمجھ رہا، بلکہ تمہارے پاس سمجھنے آیا تھا۔“ عمیر کو اس کی کئی دنوں کی بے رخی یاد آئی۔ ”نہیں عمیر! میری عمر کے ساتھ۔۔۔“

وہ لمحہ بھر کو انک کے رکی گیا اسے یہ لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ کیا وہ واقعی ذہنی طور پر اس کی دوست بن گئی تھی۔

”بس۔۔۔“ عمیر کے دل پر زور کا گھونسا پڑا۔ کتنا اذیت ناک ”دوستی“ کا لفظ تھا۔

”میں تمہارے پرہیزگاروں میں ہرگز اثر نہیں کروں گا“ میں نے اپنی آنکھوں سے جو دیکھا ہے، اس کے بعد سب جھوٹ اور بے معنی ہے۔“

اس نے انگلی اٹھا کے اپنا فیصلہ سنایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا نکل گیا۔ دعا خالی ہاتھ جھکتی رہ گئی۔



”چاچو۔۔۔ چاچو“ اگر آپ وہاں پر ہوتے تو خوشی سے دھال ڈالنے لگتے پاپا۔۔۔ اور عمیر کی شکلیں دیکھنے والی تھیں۔ ”عمر بہت ایکسیائیڈ تھا۔“

اس نے فوراً ”الیاس احمد کو مطلع کر کے“ اپنی خوشی میں شامل کیا اسے عمیر کی شکل پر ترس سے زیادہ ہنسی آ رہی تھی۔

”گڈ ویری گڈ۔“ الیاس احمد نے تہقہ لگایا۔ ان کے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔ کاش یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے۔

”آپ کی امید سے بڑھ کر اسکو کیا ہے میں نے۔“ عمر بڑھ چڑھ کر اپنی کارکردگی بیان کر رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی قلعہ فتح کر لیا ہو۔

”بہت احتیاط سے قدم اٹھاؤ عمر! یہ باپ بیٹا تمہاری سوچ سے زیادہ ہوشیار ہیں، جتنی آسانی سے دعا کو ہمارے ہتھ نہیں پڑھنے دیں گے۔“ الیاس احمد نے اسے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بلور کر دیا۔

”ڈنٹ دردی چاچو جان! جب تک کھیل ان کی سمجھ میں آئے گا، ہم لوگ انہیں چمکے دے چکے ہوں گے۔“

عمر کو خود پر بہت اعتماد تھا۔ ماسٹر اینڈ الیاس احمد تھا۔ لیکن گروار تو وہ ادا کر رہا تھا۔ اسے یہ سب کرنے میں مزہ آ رہا تھا۔ کیونکہ عمیر اسے اپنا پیدائشی دشمن اور باپ سوتلا لگتا تھا۔ اسے لگا کہ اس کی زندگی میں جتنی خرابی اور تلخیوں ہیں، وہ سب ان باپ بیٹے کی مہرہوں منت ہیں۔ اب وہ انہیں سلگا کے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کر رہا تھا۔

”حجاب تم ایسا کرنا کس۔۔۔“ وہ انہیں آگے کی پلاننگ تفصیل سے بتانے لگا۔



ریاض احمد چیخ کیے بغیر اسٹڈی روم میں چلے گئے۔ عمیر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ رابعہ احمد وجہ سے آگاہ تھیں۔ وہ عمر اور دعا کو لان میں واک کرتے دیکھ چکی تھیں۔ انہوں نے ملازمہ کو رے دے کر بھیجا، وہ ان باپ بیٹے کی تفتیشی کارروائی کا جھبہ نہیں بننا چاہتی تھیں۔ ڈنر کی اطلاع ملنے پر ریاض احمد اسٹڈی روم سے نکلے، ان کا رخ دعا کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ بستر میں دبی پڑی تھی۔ وہ دفعہ کی دستک ان سنی کر دی، وہ کسی سے بات کرنے کی روادار نہیں تھی اور نہ ہی خود میں اتنی ہمت پاتی تھی کہ شرمندہ چہرے لیے میز تک آجاتی۔

”دعا۔۔۔ دروازہ کھولو۔۔۔“

انہوں نے تیسری دستک کے ساتھ زوردار آواز بھی دی۔ دعا اچھل کے بستر سے نکلے۔ اسے ان کے آنے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔

”ماموں! جان آپ!۔۔۔ دروازے پر انہیں پاکر وہ حیرت میں گھر گئی۔

”تم زور نہیں کرو گی؟“ خاصی سنجیدگی سے استفسار کیا گیا۔ انہوں نے اس کی سرخ ڈورے والی آنکھوں میں جھانک کے بہت سے راز پڑھ لیے۔

”نہیں، دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے نظریں چرائیں۔ ان کی آنکھوں اور لہجے میں چند گھنٹے قبل والی تلخی کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ مزید تاسف میں گھر گئی۔ انہیں اب بھی اس کی پرواہ تھی۔

”کیا کرتی رہتی ہو دن بھر؟“ وہ اس کی سائیڈ سے ہو کر کمرے میں داخل ہو گئے۔

”کچھ نہیں، بس کچن میں ممانی جان کی ہیلپ کرواتا رہتی ہوں۔“ مختصراً بتاتے اس کے ہاتھ ٹھنڈے پڑ گئے۔

وہ خود سے کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔ کاش وہ خود سے پوچھنا شروع کرتے تو وہ ہرگز جھوٹ نہ بولتی۔ اس طرح الزام بھی اس پر نہ آتا، شاید وہ اس کے لہجے پر یقین کر لیتے۔

راجہ احمد اقبال و خیراں داخل ہوئیں۔ دعا کے دل میں ہنکتے سارے شاید اور کاش پر اس پڑ گئی۔

”آپ بھی یہاں ہیں، میں بھی دعا کو لینے آئی ہوں۔“ اس نے شام کو چائے بھی نہیں پی کیا ہوا بیٹا، طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔؟“

ان کے لہجے میں از حد پریشانی سمٹ آئی۔ وہ ریاض احمد کو اس طرف آنا دیکھ کے چند لمحوں کا وقفہ پا کے پیچھے آئی تھیں۔ اب یکسر انجان بن رہی تھیں۔ ان کا تنہا دعا کے پاس ٹھہرنا، وہ بھی اس صورت میں جب کھیل بہت آسانی سے کھیل جا رہا تھا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

”سہی تھنک۔ تمہیں کوئی کورس وغیرہ کر لینا چاہیے۔“ انہوں نے راجہ احمد کی بات اور موجودگی کا نوٹس لیے بغیر اپنا سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔

”کیسا کورس؟“ اس نے باری باری دونوں کو دیکھا۔ ممانی جان کے ماتھے پر اچھے خاصے بل پڑ چکے تھے۔

”کوئی بھی، جس میں تمہیں انٹرنیٹ ہو۔ پیکنگ کا، پارلر کا، ڈیزائنر یا ہینڈی کرافٹ کا، چوائس تمہاری ہوگی۔“ انہوں نے انتخاب اس پر چھوڑ دیا۔

انہوں نے ساری شام خوب سوچنے بچھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا۔ سگنی بیٹی بھی ہوئی تو بیٹی کرتے، چیچ چلا کے عزت نفس کو دو کوڑی کا کرنے کے بجائے وجہ کو جڑ سے اکھاڑتے۔

ابھی وہ اتنے بوڑھے اور کمزور نہیں ہوئے تھے کہ اس سازش کے اصل مجرموں کی پہچان نہ کپاتے لیکن انہیں یہی بہتر لگتا تھا۔

”کیا ضرورت ہے بھلا کورس وغیرہ کرنے کی؟ ابھی۔۔۔“ راجہ احمد بیچ میں کود پڑیں۔

”تمہیں کیوں اعتراض ہے؟“ انہوں نے راجہ کو ٹوک دیا۔ ان کے لہجے میں حتیٰ نہ تھی نہ ہی درشتی، ماتھا بے شکن تھا۔ لیکن پھر بھی کچھ تو ایسا تھا جس نے راجہ احمد کی زبان لڑکھڑادی۔

”مم۔۔۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ ایک بار دعا سے پوچھ لیں کہ وہ کیا چاہتی ہے۔“ پھر بھی وہ ہوشیاری سے تڑپ کا پتہ پھینک گئیں۔

”مجھے کسی سے نہیں پوچھنا اور اگر آپ بھی میرے معاملات میں خاموشی اختیار کرھیں گی تو مجھے اچھا لگے گا، ٹیبل پر آجاؤ دعا۔“

وہ کہہ کر ہر نکل گئے۔ راجہ احمد نفی میں سر جھٹکتی ان کے پیچھے ہو گئیں۔ دعا نے کمرہ خالی ہونے پر شکر کا سانس لیا۔ اسے ماموں جان کے فیصلے پر خوشی تھی۔

☆☆☆

نوال اور دعا لاؤنج میں قالین پر بیٹھی کارٹون دیکھ

رہی تھیں۔ آج چھٹی تھی، سب گھر پر تھے۔ عمیر سڑھیاں اتر کر باہر جانے لگا تو نال نے پکار لیا۔
 ”عمیر بھائی۔ عمیر بھائی۔“ اس نے ایک ہی سانس میں دوبارہ آواز دی۔ دعا ایک نگاہ ڈال کے پھر سے اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی۔
 ”کمان جا رہے ہیں بھائی! مجھے تو جیسے آپ بھول ہی گئے ہیں۔“ نال نے منہ بسور۔
 ”میں بھلا اپنی گریبا کو بھول سکتا ہوں، بس تھوڑا بڑی ہوں، اس لیے نا تم نہیں نکال پاتا۔“ عمیر نے اس کے سر پر چیت لگا کے گلہ دور کرنا چاہا۔
 ”آپ کہاں جا رہے ہیں آپ؟“ نال نے بازو زور سے کھینچا۔

”اپنے دوست کی طرف۔“ عمیر مسکرا دیا۔
 ”مجھے بھی شام کو باہر لے جائیں، مجھے شاپنگ کرنی ہے، ڈنر اور اس کے بعد لانگ ڈرائیو۔“ نال نے فرمائش کی۔ عمیر سوچنے لگا۔ وہ دعا کو ساتھ لیے بغیر کہیں نہیں جاتی تھی اور عمیر کا دل اس طرف سے اتنا رہا تھا کہ وہ اسے دیکھتا تک گوارا نہیں کر رہا تھا۔
 رابعہ احمد بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوئیں۔
 ”سارلڈن میرا بچہ فائلوں میں سر دیے رکھتا ہے، ایک دن چھٹی کا ملتا ہے۔ وہ بھی تمہارے سیر پائے کے لیے وقف کر دے۔ جاؤ عمیر! تم اپنے فریڈز سے ملو، وہ آئے بیٹھے ہیں۔“ کل سے عمیر کا اثر چہرہ اور کئی روز سے دعا کو نہ مخاطب کرنا، سب ان کے علم میں تھا۔ وہ ان دونوں کو قریب آنے کا موقع فراہم نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

دعا کی آنکھیں غم اور چہرہ ستا رہا، انہیں ڈر تھا کہ وہ کوئی ہمدردی کے اپنے اندر کا غبار نہ نکال دے۔ دعا نے چونک کے رابعہ احمد کی اس پھرتی کو پرکھا۔ وہ ایم اے اکنامکس گولڈ میڈلسٹ تھی۔ رشتوں کی اتنی جانچ پڑتال تو رکھتی تھی۔

”کیا میرا انجوائے کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے، ہمیں مل کے گھر سے باہر گئے ہوئے۔“ نال ہنسد تھی، اس نے منہ بسورنا شروع

کر دیا۔

”عمیر بیٹا تم جاؤ، میں شام کو شاپنگ پہ لے جاؤں گی۔“ رابعہ احمد کو جی بھر کے بیٹی پر غصہ آ رہا تھا۔
 عمیر نے بھی ہل کا درشت رویہ، ”انکار محسوس کیا، وہ خود بچوں کی تفریح کی حالی تھیں۔ تاکہ ذہن تروتازہ رہے۔“

”ڈونٹ وری ماما جان! میں انہیں شام میں لے جاؤں گا، لیکن نو شاپنگ صرف ڈنر، تم شاپنگ اور کسی دن کے لیے رکھ لو۔“ عمیر دعا کی موجودگی میں زیادہ وقت نہیں گزار سکتا تھا۔

”ہر۔۔۔“ نال نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ رابعہ احمد کے چہرے پر جھنجھلاہٹ اور غصے کے طے جلے تاثرات چھا گئے۔ وہ منہ میں بڑبڑاتی ہوئی مڑ گئیں۔
 عمیر کو ہل پر افسوس تھا۔



وہ اپنے کمرے میں آ کے لیٹ گئی۔ اس کا باہر جانے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔ وہ عمیر سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی تھی، نال کو ٹالنا جان جو کھوں کا کام تھا، اس کا انکار عمیر کے دل میں مزید بدگمانی پیدا کرنے کا موجب بنتا۔

”دعا! تم تیار نہیں ہو رہیں۔ نال نے شاور بھی لے لیا ہے۔“ رابعہ احمد اس کا جائزہ لینے آئیں۔

”جی۔۔۔ وہ۔۔۔ میں، ابھی عمیر تو واپس نہیں آئے۔“ پہلے کی طرح وہ ان سے اپنے احساسات شیئر نہیں کر سکتی تھی، اسے ان پر اعتبار نہیں رہا تھا۔

”آریو فائن دعا؟“ انہوں نے ٹوہ لی۔ اس کے چہرے پر چھائی بیزارى واضح تھی، یہی وہ دیکھنے کی متنی تھیں۔

”تج۔۔۔ نی۔۔۔“ وہ روہانی ہو گئی۔ اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔ دعا نے چہرہ چھپانے کے لیے وارڈروب کھول لی۔

”مگر نہیں دل چاہ رہا تو نہ جاؤ۔ میں خود عمیر کو منع کر دوں گی۔“

رابعہ احمد نے بڑی ہوشیاری سے وار کرنا چاہا۔
عمیر کی بھیجی ہوئی صورت اور دعا کی یڑمروگی ان کے
درمیان فاصلوں کی گواہ تھی۔ وہ اپنی اولاد کو تو نہیں مگر
اسے تو روک سکتی تھیں۔

دعا نے وارڈروب سے منہ نکال کے بڑے دکھ سے
ممائی کو دیکھا، ہمیشہ سے ان کی عزت کرتی آئی تھی۔ وہ
اتنی سمجھ دار تھیں۔ کہ وہ انہیں سمجھا بھی نہیں سکتی
تھی۔ عمر کے ساتھ وہ خود اسے تیار کر کے بھیجتیں۔
ان کے رویے کا وہ غلام قابل مذمت تھا۔

”نہیں ممائی جان! اتنے عرصے بعد نوال اور عمیر
نے پروگرام بنایا ہے، میں انہیں رفوز (انکار) نہیں
کر سکتی۔“ اس نے صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔ اس
کا لہجہ ایسا ٹھوس اور مضبوط تھا کہ مزید جرح کی گنجائش
نہیں تھی۔

”ویسے ممائی جان یہ والا فراق کیسا لگے گا۔“
وہ عمیر کا دلوا لیا ہوا نیوی بلیو کلر کا فراق خود سے
لگائے پوچھ رہی تھی۔

”آریو ریڈی دعا۔“ نوال چلاتی ہوئی اسی طرف۔
آ رہی تھی۔ رابعہ احمد ماتھے پر بل ڈالے باہر نکل
گئیں۔ انہیں دعا کا انکار بہت برا لگا تھا۔ دعا کے جلنے
دل پر چھوڑ پڑی۔



وہ لان میں شام کی چائے پی رہے تھے جب تہیز
ملک کی مریدیز نے ہارن دیا۔ وہ شازو نادر ہی ان کی
طرف آتے تھے۔ مریم اور الیاس احمد چائے کے کپ
رکھ کے استقبال کے لیے اٹھ گئے۔

”سلام علیکم بھائی صاحب۔“ مریم ان کے سینے
سے جا گئی۔

”وعلیکم اسلام، کیسی ہے میری گزریا؟“ انہوں نے
اس کے سر پر ہوسہ دیا۔

”آپ کے لیے بہت اوا اس تھی۔“ مریم نے ان
سے الگ ہو کر پیار بھرا شکوہ کیا۔ الیاس احمد نے مصافحہ
کے لیے ہاتھ برہایا۔

”بچوں میں اتنی مصروف رہتی ہے ورنہ میں تو کتنا
ہوں کہ مینے میں ایک آدھ بار چکر لگایا کرے۔“ چور
کی داڑھی میں تنکا کے مصداق، الیاس نے فٹ سے
جھوٹ گھڑا۔ مریم نے دانت کچکچا کے انہیں گھورا۔
”آئیں بیٹھیں بھائی صاحب۔“ مریم پیچھے ہٹی۔ وہ
ان کے ساتھ لان چیر رہی بیٹھ گئے۔

”الیاس احمد میں تمہاری طرف آیا تھا، کافی روز
پہلے تم نے کسی لڑکی کا ذکر کیا تھا۔ کب اس کے پیرئس
سے ملواؤ گے۔“ وہ اسی لیے آئے تھے کہ ایک بار خود
اس سے پوچھ کے تسلی کر لیں۔ الیاس احمد نے گلا
کھنکارا۔

”جی بھائی صاحب! صرف دو چار روز
میں۔“ جواب ابھی بھی واضح نہیں تھا۔
”اتنی تاخیر کی وجہ جان سکتا ہوں۔“ انہیں اپنے
بہنوئی پر بھروسہ نہیں تھا لیکن بہن کی وجہ سے لحاظ کرنا
پڑتا۔

”جی وہ۔ ایک چھوٹلی اس کی والدہ کی دفتہ ہو گئی
ہے۔“ انہوں نے دوسری بار بڑا موزوں جھوٹ بولا۔
”ڈاکٹرز نے آپریشن کا کہہ دیا ہے، میرا ایک
سروٹ بھی اپنی بیٹی دینے پر راضی ہے، پاسپورٹ وغیرہ
میں بھی تائم لگے گا، اگر دو چار دن میں بات بن جائے تو
ٹھیک ورنہ میں سروٹ کی بیٹی سے نکاح پر دھوا دوں
گا۔“ انہیں اپنی فیملی کے پاس شفقت ہونا تھا اسی لیے
ارادہ بتا دیا۔

”نہیں۔“ نہیں بھائی صاحب، صرف چند دن
میں ان لوگوں کو زبان دے چکا ہوں، پلیز ایسا مت
کریں۔“ الیاس احمد کو اپنی پڑ گئی، وہ اتنے پاپٹر کس لیے
بیل رہے تھے۔

”اوکے، لیکن میں زیادہ۔“ ویٹ نہیں کروں گا۔“
انہوں نے صاف کہہ دیا، وہ مزید اس معاملے کو لٹکانا
نہیں چاہتے تھے۔

”جی میں جلد ان شاء اللہ آپ کو خوش خبری سناؤں
گا۔“ انہوں نے بڑے وثوق سے کہا۔

”بیگم صاحبہ! چائے لگا دی ہے۔“ ملازمہ نے آکر

اطلاع دی۔
”آئیں بھائی صاحب! اندر چلتے ہیں۔“ مریم کھڑی ہوئی۔

”بڑی کو نیک سروس ہے بھی تمہاری لیکن میں نے پچھلے کیا تھا۔“ انہوں نے مریم کو چھیڑا۔
”ہرگز نہیں بھائی صاحب! چائے تو آپ کو ہمارے ساتھ پینا پڑے گی۔“ الیاس احمد نے بڑے اصرار کے ساتھ روکا۔

”آئیں، میں بچوں نے بھی ٹوشن پڑھ لی ہوگی، آپ کو دیکھیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔“ مریم ان کی آمد پر بہت خوش تھی۔ وہ بھی اس کا دل رکھنے کو اندر چل دیئے۔



پورے بیس منٹ کے انتظار کے بعد وہ دونوں پورچ میں آئی تھیں۔ عمیر نے پہلی بار دعا کو گہرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس پایا تو کئی لمحے ساکت گزر گئے۔ دعا کی آنکھیں جھک گئیں، خوشی یا جیسا سے نہیں بلکہ شرمندگی سے۔ اگر اور کوئی بل ہوتا تو وہ تعریفوں کے بل باندھ دیتا۔ دعا کی پلکیں کپکپا رہی تھیں۔
”بھائی! ہم کیسے لگ رہے ہیں؟“ نوال کی ماڈل کی طرح کمر پہ ہاتھ رکھ کے گھوم گئی۔ نوال نے زبردستی کاہل کی لکیر اس کی گھور سیاہ جیسی آنکھوں میں بھی ڈال دی تھی۔ عمیر کا کل شام سے کشافوں بھرا دل ان آنکھوں میں کہیں کھو گیا۔ اس کے دل میں ٹھنڈک سی جگہ بناتی گئی۔

”بہت اچھی! بالکل الگ سی۔“

اس کا دل کئی ہوئی پتنگ کی طرح ڈول رہا تھا۔
نوال عمیر کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی مسلسل کان کھا رہی تھی۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے بیک ویو مرر دعا پر سیٹ کیا۔ وہ سر جھکائے انگلیاں موڑ رہی تھی۔ اس نے نوال کو ٹوکا دے کے دعا کی طرف متوجہ کر دیا۔ عمیر جیسے پریشانی بندے کا ایمان ڈگمگا گیا۔ اس کا دھیان سیاہ آنکھوں میں جل بجھ رہا

تھا۔ نوال نے مزید کہہ دیا اور پھر پانٹنے لگی۔
”عمیر بھائی! دعا تو ڈراما کروم ہو کے، اب سیٹ زیادہ ہو گئی ہے۔ بٹ آئی تو تھنک وہ کینفیوژن گسی اور وجہ سے ہے یہ کافی روز سے خاموش اور سہمی ہوئی سی لگ رہی ہے۔“ نوال نے اتنی مصروفیت کے باوجود بھی کتنا گہرا ٹوٹ لیا تھا۔ عمیر سے مزید رہا نہ گیا۔
”تمہیں ایسا کیوں لگا؟“

”میں جب بھی گھر آتی ہوں یہ محترمہ بے حس، انپرجونی بیٹھی ہوتی ہیں، ایسے جیسے سارے جہاں سے روٹھی ہوں۔“ دعا کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اسے ان کے اندازوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”نوال! تمہاری فریڈ اریفکے کے پیرش کا بیج اب ہو گیا۔“ عمیر نے نوال کا دھیان دوسری طرف کیا۔
اس نے جو اس کے منہ سے اگھواتا تھا۔ وہ اس تک پہنچ گیا تھا۔



وہ واش روم سے منہ ہاتھ دھو کے نکلی تو عمر کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اسے جب سے مل سے خبر ملی تھی کہ وہ عمیر کے ساتھ ڈنر کرنے نئی ہے اس کا پارہ سوانیزے پر پہنچا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ جانے پر تو چہرے کی سلوٹیں ہی نہ نکلتی تھیں۔
”کہاں گئی! تم؟“ اکھڑا اور بازو عبہجے میں تقیش کا آتما زہا ہوا۔ دعا نے پوری آنکھیں کھول کے سوال اور سوال کرنے والے کو دیکھا۔

بہت سارے دن اور وقت، وہ ان ماں بیٹے کو سمجھنے میں ضائع کر چکی تھی۔ اسے حق کے لیے زبان بندی کر کے، نظریں جھکا کر، ہر حکم کی تعمیل کر کے، اسے کوئی نیک نامی کا تمغہ نہیں مل جاتا تھا۔ حق بات کے لیے وہ ذرا بھی رعایت برتتے کو تیار نہیں تھی۔

”کیوں سنتم کیوں اور کس حیثیت سے باز پرس کرنے آئے ہو؟“ اس نے بھی لہجہ تنکھا کر لیا۔
ابھی اس کے دل پر عمیر کی ناراضی کا زخم تازہ تھا۔ عمر کے چوہہ طبق روشن ہو گئے۔ اس باشت بھر

کی لڑکی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی جرات کر لی تھی۔

”ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والی گھٹیا، تھرڈ کلاس، کمپنی، ڈیل لڑکی۔“ یہ تمام گالیاں وہ دل میں ہی دے سکتا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اپنی زبان اور غصے پر جبر کیا۔

”نہیں۔۔۔ وہ میں۔۔۔ آٹم سوری میں تو یوں ہی۔“ بے اختیار زبان سے معافی پھسل گئی۔ اس کے گھٹیا ذہن کو چھتیاؤں نے گھبراہٹ میں خیر، معافی ایک کروڑ روپے کی تھی، مانگنے میں کوئی خاص حرج نہیں تھا۔ یہی سوچ کے خود کو تسلی دی گئی۔

”اس اوکے، تمہیں کوئی کام تھا۔“ اس کے ذہن میں ہر طرف عمیر کی ناراضی کا غلبہ۔ تھا۔ اسے عمر زہر لگ رہا تھا۔ وہ ان سے سینے کا راز وہ باندھ چکی تھی وہ بے تصور ہوتے ہوئے بھی ذلت کی دلدل میں کیوں گر گئی۔

”ہاں، نہیں میں یوں ہی، کیا میں تمہارے روم میں نہیں آ سکتا۔“ عمر کا جی چاہ رہا تھا کہ چھتر مار مار کے اس کے گال سرخ کر دے یا پھر زمین پر تو ضرور اٹھا کر شیخ

دے۔
”آ سکتے ہو لیکن فی الحال مجھے چنچ کرنا ہے۔ پھر کسی وقت تشریف لاتا۔“

غیر واضح طور پر اسے جانے کا کہہ دیا گیا۔
اس نے ان ماں بیٹی کی نیت کا فتور پکڑ لیا تھا۔ اب وہ ان پر اندھا اعتماد کر کے، اپنا نقصان نہیں کر سکتی تھی۔

عمیر کے جڑے اور مٹھیاں بھینچ گئیں۔ وہ کھولتے دماغ کے ساتھ اس کے کمرے سے نکلا۔ دعا اسٹینڈ سے تولیہ اتار کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کے چہرہ صاف کرنے لگی۔



ریاض احمد چیمبر کی پشت تھاے میز کو گھور رہے تھے۔ عمیر نے رست و اچ پر وقت دیکھا۔ پورے چھ

منٹ ہو گئے تھے اسے اس کرسی پر بیٹھے خاموش پر سوچ باپ کو تکتے۔ ان کا مراقبہ ٹوٹ ہی نہیں رہا تھا۔
”کیا بہت بڑا نقصان ہو گیا ہے۔“ عمیر یہ ہی سمجھا۔

”ہاں، بہت بڑا۔“ انہوں نے سرفنی میں ہلایا۔
”کس۔۔۔ کیا ہوا پاپا جان؟ اپوری تھنک ازاو کے۔“ عمیر کا دل ڈوب گیا، وہ بیٹھے سے کھڑا ہو گیا۔
”میں نے حمید چودھری کو ٹیم مینیشن لیٹر بھیج دیا ہے۔“ انہوں نے بتاتے ہوئے لمبا سانس خارج کیا۔
حمید چودھری ان کی اسلام آباد والی برانچ کے منیجر تھے۔ چوبیس سال پرانے انتہائی تجربہ کار اور ایماندار کارکن تھے۔

”مگر کیوں پایا جان؟“ عمیر کو واقعی زور کا جھکاؤ تھا وہ پھر سے کرسی پر گر گیا۔
”میں نے عمر کو اسلام آباد بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔“ یہ بتانا بھی ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

”اس طرح آجناک سے“ ایٹی سولڈر ریزن۔“ یہ پہلا اتنا بڑا فیصلہ، جو انہوں نے اسے اعتماد میں لیے بغیر خود ہی کر لیا تھا۔

”مگر یہ سب نہ کروں تو کیا کروں، جو ہو رہا ہے وہ ہونے دوں، ان سب کو فری ہینڈ دے دوں۔“ انہوں نے اپنی نشست سنبھال لی۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ عمیر کا ذہن شاک میں تھا۔ عقل اتنی حاضر نہیں تھی کہ وہ ذو معنی الفاظ کو پکڑ لیتا۔

”تم گھر میں نہیں ہوتے؟ کیا تمہاری آنکھوں پر بھی پردے پڑ گئے ہیں، تم کوئی تبدیلی نوٹ نہیں کر پا رہے۔“ وہ ایک ہی سانس میں پے درپے سوال کرتے اس پر برس پڑے۔ عمیر نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

”میرے کا نقصان ہو جانا چاہیے، عزت کا نہیں۔“ وہ پردے آتا ہوا اور مثبت قدم اٹھا لیتا ان کی دور اندیش تھی، انہیں اپنے گھر، عزت، رشتوں اور عاقبت کو بچانا تھا۔ وہ اپنے خاندان کے منصف اعلیٰ تھے انہیں یہی

نہ سہرتا تھا۔

وہ بریف کیس اور لیپ ٹاپ صوفے پر رکھ کے، فارم لیے سیدھا دعا کے کمرے میں گیا۔ رابعہ احمد کلب فرمائی کر رہی تھیں۔ انہوں نے مڑ کر عمید کو اس کمرے کی طرف بڑھتے دیکھا تو کڑائی کے نیچے دھیمی آنکھ تیز کر دی۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ جائے نماز لیٹ رہی تھی۔

”یہ پیلا جان نے فارم بھجوائے ہیں ۴ نہیں رفل کر لیتا۔“ اس نے فارم ڈسک ٹیبل پر دھر دیا۔
”کس چیز کا فارم؟“ اس کے ذہن میں نہ آ سکا۔
”کسی کورس میں ایڈمیشن کے فارم ہیں، نقل کر کے بھجوا دیتا۔“ یعنی وہ خود اس کے کمرے میں نہیں آیا تھا بلکہ بھجوا دیا گیا تھا۔ اس نے صرف کام کی بات کی تھی۔
حل احوال اور نہ ہی۔۔۔؟

”جی۔۔۔“ اس نے فارم اٹھا کے پڑھا۔

”عمید! کیا ہوا؟ کوئی خاص بات ہے۔“ رابعہ احمد بھاگی آئی تھیں۔

”جی کورس کے ایڈمیشن فارم دینے آیا تھا۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ دعا کے ہاتھ بے جان پڑ گئے اس نے فارم واپس ٹیبل پر دھر دیے۔

”کیا ہوا؟“ انہوں نے فوراً اس کی سستی کو نوٹ کیا۔
”کچھ نہیں۔“ اسے عمید کی اجنبیت نے دکھی کر دیا تھا۔

”مگر نہیں موڈ بن رہا تو نہ لو ایڈمیشن میں خود ہی تمہاری ماموں کو سمجھا لوں گی۔“ دعا کا دماغ بھک سے اڑ گیا وہ اسے کسی تین چار سال کی بچی کی مانند ٹریٹ کر رہی تھیں جو انگلی پکڑ کے ان کے پیچھے چلتی جائے۔

”میں نے آپ سے کوئی فیور نہیں مانگی، ماموں نے جو کیا ہے، بہتر کیا ہے۔“ دعا کا انداز دو ٹوک ہو گیا۔ وہ اتنی آسانی سے انہیں خود سے کھیلنے کی اجازت نہیں

دے سکتی تھی اسے خود ہی اپنے لیے لڑنا تھا۔

”میں عمید کے لیے چائے بنا لوں۔“ اب ان کا مڑنا ہی بننا تھا۔ دعا نے زور سے سر کو جھٹکا اور دروازہ کھول کے بال بین ڈھونڈنے لگی۔

چودھویں کا چاند پورے آسمان کو روشن کیے ہوئے تھا۔ اس نے تمام بیرونی فینسی لائٹس بجھا دی تھیں۔ پورے چاند کی روشنی میں وسیع لائن کی بھیگی گھاس پر بڑے شبنم کے قطروں کو نکلے پیروں کے نیچے دبانا یوں لگتا تھا جیسے آسمان پر ستاروں کے اوپر چل رہے ہوں، ایک انوکھی سی خوشی دل میں جنم لیتی۔

”گلیا، ہم ساری زندگی یوں ہی تنہا ایک دوسرے کے سہارے گزار دیں گے۔“ یہ سوال پرانا اور اسے ازیر ہو گیا تھا۔ وہ ہر دفعہ کئی تسلی بخش جواب دیتا، لیکن وہ مطمئن نہ ہوتا۔

”میں اور تم، پھر تھوڑے عرصہ تک، ماں اور پیلا بھی آجائیں گے اور پہلے کی طرح مل جل کر رہیں گے۔“ احسن کا دل بھی جکڑا گیا۔ یہ سوال اس کے اندر پنچے گاڑ دیتا۔

”پہلے کی طرح۔۔۔“

”میں بہت ہنساکرتی تھی، زور سے تم مجھے ڈانٹا کرتے تھے، بدحو، بے وقوف کہہ کر غصہ نکالتے۔“ وہ ماضی میں کھوسی گئی۔ احسن کے ہونٹوں پر ہنسی ٹھہر گئی۔

”سارے گھر میں میرے چننے چلانے سے رونق رہتی، اب تو مجھے اپنی ہی آواز اچھی لگتی ہے۔ ذرا اونچا بول دوں تو دل سہم جاتا ہے اور زور سے ہنسنے تو بہت عرصہ بیت گیا ہے۔“ وہ خود ترسی کا شکار رو دینے کو تھی۔ احسن کتنے ماہ کی سرتوڑ کوشش کے باوجود بھی اس کے اندر کاروگ ختم نہیں کر سکا تھا۔

”پلیز انو جان! تم نے کیوں اس صدمے کو خود سے چننا رکھا ہے۔ جو ہمارے مقدر میں لکھا تھا وہ ہو چکا، تم اس پر صبر کیوں نہیں کر لیتیں۔ جو کچھ ہے اس پر خوش

رہتا سیکھ لو۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”کیا ہے ہمارے پاس جس پر خوش ہوا جاسکے“ یہ ناشکری نہیں زندگی سے بے زاری تھی۔

”میں میرے پیرش ہماری محبتیں کھیلٹ بھی فیملی دیش اٹ۔“ اس نے سب کو دیا۔

”تو نیور، نو کھیلٹ اینڈ نو بھی فیملی نہ کی ہے احسن، تم اس کی کو کیوں اہکھٹ نہیں کر لیتے“

نہیں ہوں میں مکمل، ادھوری عورت ہوں، تم مجھے جھوٹی تسلیاں مت دیا کرو۔“ وہ ایک دم سے ہانپو ہو گئی۔ احسن خاموش اسے دیکھتا رہا۔ وہ ایسی ہی ہو گئی تھی، پل بھر میں پھر جاتی۔ اس کے اندر کا گھٹاؤ بھرا

نہیں جاسکتا تھا، نہ دعا سے اور نہ ہی دوا سے۔



ریاض احمد گھر آکے اسٹڈی روم میں مقید ہو گئے، یہ ان کی عادت تھی۔ جب انہیں پریشانی یا کسی پر غصہ

ہوتا تو وہ اسٹڈی میں جا بیٹھتے، راجہ احمد چائے کی ٹرے لے آتی تھیں، کیونکہ آج ان کے دل میں کوئی چور

نہیں تھا۔ ”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے ریاض احمد۔“ وہ ٹرے

میز پر رکھ کے چائے پلانے لگیں۔ ”تمہیں بہت بہت مبارک ہو راجہ بیگم۔“ یہ ان کا خاص طرزِ خطاب تھا جو غصے کے وقت استعمال کیا

جاتا تھا۔ ”کیسی مبارک بلو؟“ وہ حیران تھیں۔

”میں نے تمہارے لائق ہونمار لاڈلے بیٹے کو اسلام آباد والی برانچ کا چارج دے دیا ہے۔“ یہ خبر وہ

کس دل سے دے رہے تھے وہی جانتے تھے۔ ”اومے کیا۔ کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں۔ ان بلو

اہل۔“ ان کے ذہن سے شوہر کا چند لمحے قبل والا غصہ نکل گیا۔ وہ خوش تھیں بے حد خوش۔ یہی ان کی

بھی خواہش تھی، لیکن وہ یہ سفارش کر نہیں سکتی تھیں۔ اب یہ مجبور خودی۔ ہو گیا تھا۔

”آپ سے مذاق کیا کروں گا؟ میں نے یہ کڑوا گھونٹ بھر لیا ہے۔“ ریاض احمد ان کی طرف دیکھنے

سے بھی گریز کر رہے تھے۔ یہ ان کی سخت ناراضی کا انداز تھا۔

”کیا آپ دل سے خوش نہیں ہیں؟“ راجہ احمد کے مسکراتے ہونٹ سکڑ گئے۔ بھلا یہ سوال پوچھنے والا تھا؟

ان کے تاثرات سب واضح کر رہے تھے۔ ”پتا نہیں دل سے کسے خوش ہوا جاتا ہے، میرے

دل کو مارو گئی، رہ گیا خوشی کا سوال، تو ہاں میں خوش نہیں ہوں۔“ انہوں نے جذبات کو چھپانے میں

ہیرا پھیری نہیں کی تھی۔ ”کیوں؟“ راجہ احمد بالکل انجان تھیں۔

”تم نے اپنی ذمہ داریوں سے آنکھیں چرا لیں تو مجبوراً مجھے یہ سب کرنا پڑا۔“ انہوں نے جتلیا۔

”پلیز ریاض، صاف صاف بات کریں، آئی کانٹ انڈر اشیڈ۔“ وہ واقعی نا سمجھ بن گئیں۔

”تم اتنی لاپرواہ تو نہیں کہ گھر میں کون، کیا کر رہا ہے، اس سے بے خبر ہو۔“ لمحے کی جی سیدھی ان کے

دل میں جا اتری۔ دونوں کا غبار تھا جو اندر پل رہا تھا۔ راجہ احمد نے تھوک نگلا، وہ ان کا اشارہ سمجھ گئی

تھیں لیکن اس میں اتنا غصہ اور ناراض ہونے والی بات تو نہیں تھی۔ راجہ احمد کی یہی کوشش تھی کہ ان

دونوں کا تعلق شوہر کی نظروں میں آجائے۔ جو آگیا تھا اور پھر دعا کا رشتے سے انکار والا جھوٹ، شاید ان کی

سوچ کا ٹریک بھی پیوی والا ہو گیا تھا۔ اسی لیے عمر کا مستقبل سنوارنے کا فیصلہ ہو گیا۔

”ڈونٹ وری ایواؤٹ اپنی تھنک، چائے پیئیں۔“ وہ اس سے زیادہ لکلی نہیں دے سکتی تھیں۔

انہیں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔ دو تین وار ہی خامے کاری نکلے تھے ان کا دل خوش تھا۔ انہیں کسی کی پروا نہیں تھی۔ انہیں اپنی پر غور تھا۔



اس کے کمرے کے باہر کھڑے عمید کا دل اٹھا

گمراہوں میں ڈوب کے ابھر رہا تھا۔ اس نے کبھی اتنا برا خواب بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ اپنی محنت سے اسٹینڈ کی ہوئی کمپنی یوں اس کے سپرد کر دے گا۔ وہ اپنے بپ کارائٹ پینڈ تھا۔ ان کی طبیعت اچانک سے بگڑ جاتی، ورنہ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنے بزنس کو فارن کنٹریز تک وسعت دے۔ اسلام آباد والی براج کا چارج سنبھالے۔ اب بدلتے حالات کا تقاضا یہی تھا۔ اس نے بے جان اور ٹھنڈے ہوتے ہاتھوں سے دستک دی۔

”تیس کم ان۔“ اندر سے فوراً بلاوا آگیا۔ اس نے ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھلتا گیا۔ عمر تین تئیسوں پر سر رکھے موٹوں سمیت بیڑ لپٹا، موبائل پر نیٹ سرچنگ کر رہا تھا۔ عمیر کو اپنے کمرے کی چوکت پر دیکھ کے حیرت میں گھر گیا۔

”بے نصیب، آج ہماری آرام گاہ کو بہت بڑی ہستی نے تشریف آوری کا شرف بخشا ہے۔“ اس کے ذہن میں آیا کہ وہ دعا کے لیے کوئی دھمکی یا تنبیہ کرنے آیا ہو گا۔ اس لیے استقبال بڑی تھیل اردو سے کیا گیا۔

”تم یہیں ٹھہرے رہو، ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنا، میں بیس پچیس منٹ میں تمہارے لیے پھولوں کے ہار اور فرش راہ کرنے کے لیے گلاب کی پیتیاں لے کر آتا ہوں۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے کتا قریب سے گزرنے لگا۔

”تنتے ترڈ میں مت پڑو، یہ موقع تم اپنے لیے سنبھال کے رکھو۔ فی الحال میں اپنی مرضی سے نہیں آیا، بھیجا گیا ہوں۔“ عمیر نے زمین پر نظریں گاڑ دیں۔

”پریذیڈنٹ آف ہاؤس نے بھیجا ہو گا۔“ طنز کیا گیا۔

”ان پیپر زہ سائن کرونا۔“ اس نے پیر اس کی طرف بڑھائے۔ عمر نے چند لمحے سوچ کے کاغذات پکڑ لیے اور پڑھنے لگا۔

”تمہیں پرسوں اسلام آباد جانا ہے۔ حمید چوہدری دس دن تمہیں ٹریننگ دیں گے اس کے بعد انہیں فائر

کر دیا جائے گا۔“ اس نے باقی کی تفصیل بھی پہنچادی۔ ”اس مہینے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔“ اس نے بڑے محل کا مظاہرہ کیا، یہ سب ایک خیرات کی مانند لگا تھا، لیکن اسے خاموشی میں بہتری لگی تھی۔ اسلام آباد جانا ہے یا نہیں الیاس احمد سے مشورے کے بعد فاسل کیا جاتا تھا۔

”نقشب۔“ اس نے یک لفظی جواب دیا اور پھر مڑ گیا۔

”نقشب یہ کیا، اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔“ اس کی اردو کمزور پڑ گئی اس کے اندر کا تجسس بڑھا۔ ”پچیس منٹ لگیں گے، جاؤ اور کسی اردو کے پروفیسر سے اس کا مطلب پوچھو۔“ وہ کہہ کر جانے کے لیے مڑ گیا۔

”تمہیں بتاتے ہوئے شرم آرہی ہے۔“ اس نے عمر کی اٹھی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ”شرم نہیں، ڈر ہے۔ مطلب سن کے، تم میرا گریبان نہ پکڑو اور مجھے اپنی سیلف ریسپیکٹ مت عزیز ہے۔“ عمیر نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانک کے چپا چپا کے جواب دیا۔ ”کیٹ لاسٹ فرام ہیئر۔“ عمر کے نتھنے پھول گئے۔

وہ طنز یہ نفی میں سر جھٹکنا واپس مڑ گیا۔



الیاس احمد نے لان میں آکر ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ مریم بچوں کو دودھ پلا رہی تھی، ملازم تک وہاں نہیں تھے۔ یوں بھی مریم ان کی جا بوسی نہیں کرتی تھی۔ وہ موبائل نکال کے ممبر ڈائل کرنے لگے۔

”میں بھی آپ کو بی کل کرنے والا تھا چاچو جان۔“ عمر نے چھوٹتی کہا۔

”پوری تھنگ نازاؤ کے۔“ انہوں نے پوچھا۔ ”تو چاچو ایلانے مجھے پرسوں اسلام آباد بھیجنے کا کہہ دیا ہے۔“ اس نے فنافٹ بتایا۔

”تم نے کیا کہا؟“ الیاس احمد کو بھی حیرت نے

اسے ہر پیزن شاپنگ پہ لے جاتے، انہیں اس پر بھی اعتراض نہیں تھا۔

وہ اس کی ماں صفیہ بیگم کی بھی بہت عزت کرتی تھیں، انہیں ننہ کے ساتھ ساس کا بھی درجہ دیتیں، کبھی ان سے اونچی آواز میں بات تک نہ کی، ان کی ہر رائے ان کے لیے مقدم ہوتی۔

پھر اب ایسا کیا ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم سے مکمل طور پر بدل گئی تھیں۔ وہ جو عمر کے سائے سے بھی اسے دور رکھتی تھیں۔ اب خود اس کے سپرد کرنے لگیں، بلکہ وہ اسے عمر کے ساتھ بہتر رویہ اور تعلقات رکھنے پر یکپھر دیتیں۔

اور عمر کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے لیے گھنیا اور بدترین الفاظ استعمال کرتا، منحوس، چڑیل، غرضیکہ جو اس کے منہ میں آتا وہ بولتا چلا جاتا۔

اب وہی عمر اتنی نرمی اور تحمل سے بات کرتا کہ دعا کو کئی بار دھوکا ہوا۔ اس کے ذہن میں مختلف دوسوے آتے۔ اس کا دل بالکل نہیں چاہتا تھا کہ وہ عمر کی کوئی بات مانے اس سے میل جول برہائے یا باہر گھوٹے پھرے، لیکن وہ اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ راجہ احمد کے سامنے ڈٹ جائی یا عمر کے منہ پر صاف انکار باری۔ (اور اپنے گھر چلی جاتی۔)

اگر وہ اتنی جرأت کرتی ہوتا تو اس سے کیا بچتی۔ سارا دن گھر میں وہ راجہ، ممائی اور عمر ہی ہوتے تھے۔ وہ ممائی کو جواب دے کے، خود پر بد نیزی کا ٹیکہ نہیں لگوا سکتی تھی اور عمر اس کا جینا حرام کر دیتا، اسے مجبوراً ان ماں، بیٹے کی ہر بات کو بلا جوں و چراں ماننا اور عمل کرنا تھا۔

عمر سے وہ کچھ بھی شیر نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس کے لیے بہت پوزیشنو تھا۔ وہ ماں سے بحث کرتا اور عمر کا گریبان پکڑنے تک نوبت آجاتی، دعا سے اس کی لالعلقی ہی تھی۔ وہ اس سے ناراض تھا اس کی ناراضی دعا کے اعصاب پر بہت بھاری تھی۔ وہ کبھی اس سے ناراض نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے منانے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھی اسے عمر کو ساری سچائی جانی پڑتی، جو وہ

گھیرا۔ ”کچھ نہیں، میں نے سوچا انکار یا اقرار کرنے سے پہلے آپ سے پوچھ لوں۔“ اس نے اپنی تابعداری جتائی۔

”گھڑ، تو ایسا ہے کہ تم اسلام آباد جانے کی پکننگ کرو۔“ لیا س احمد نے غے بھر میں حساب لگایا۔ ”ہمارے مشن کا کیا ہوگا، اگر میں اسلام آباد چلا۔“

”کل رات تم اس مشن کو وائمنڈ اپ کر دو گے، کب اور کیا کرتا ہے، یہ میں تمہیں ارلی مارننگ بتا دوں گا، ابھی فی الحال تم اپنے باپ کے پاس جاؤ اور اس کا شکریہ ادا کرو، ایک اور احتیاط وہ یہ کہ۔“ وہ اسے آگے کا پلان بتانے لگے۔ عمر سنتا اور ذہن نشین کرتا جا رہا تھا۔



وہ گھٹنے کھڑے کیے بازو ان کے گرد لپیٹے، ان پر سر رکھے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ تیند اس کی آنکھوں سے کئی روز ہوئے اڑ چکی تھی۔

راجہ ممائی اس سے بہت محبت اور شفقت سے پیش آتیں۔ وہ جب بھی ان کے گھر آتی، وہ اس کا بے حد خیال رکھتیں۔ عمر نے کبھی اسے اچھا نہ جانا تھا۔ وہ اپنے باپ کا غصہ دعا پر نکالتا، بلکہ ہر وقت ریتا ہی انا اور غور میں تھا۔ اسے اپنے علاوہ باقی سب حقیر لگتے۔ وہ جب بھی دعا کی انسلٹ کرتا راجہ احمد اس کی ڈھال بن جاتیں۔ اس کا ٹوٹا دل جوڑے رکھنے کو اپنے لاڈلے کو کھری کھری سناتیں، اسے خود سے لگا کے پکارتی رہتیں اور عمر کو برا بھلا کہتیں۔ وہ ہمیشہ اس کا ٹوٹا حوصلہ برھاتی آتی تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ وہ عمر سے کئی بار بے عزت ہونے کے باوجود باقی سب کے خلوص سے متاثر چھٹیوں اور ویک اینڈ پر چلی آتی۔

انہوں نے کبھی اس کی عہد اور نوال سے بدستی پر پابندی نہیں لگائی تھی۔ وہ ماموں جان کی لاڈلی تھی۔ وہ

نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا کوئی سائبان نہیں تھا۔

اس کے پاس اس گھر کے علاوہ اور کوئی محفوظ چھت نہیں تھی۔ حماد اس کا سوتیلا بھائی، جس نے یہاں آجانے کے بعد ایک فون کال بھی نہیں کی تھی۔ وہ اس پر کیسے مان لیتی۔ وہ خود کی حفاظت کرتی، اس گھر کے مینوں کو اپنے خلاف نہیں کر سکتی تھی۔



جس روز سے اس نے دعا اور عمر کو گاڑی میں دیکھا تھا، تب ہی سے اس کا ذہنی سکون غارت ہو گیا تھا۔ وہ عمر سے اس حد تک ڈرتی تھی کہ اس کی موجودگی میں کبھی لاؤنچ اور بچن تک نہیں آتی تھی۔ اب وہ دونوں سیر سائے کرتے پھرتے تھے۔ ان کے بیچ انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ تو وہ ان سے شیر کر لیتی، وہ اپنا ہر دکہ سکھ ایک دوسرے سے شیر کرتے آئے تھے۔ وہ عمر سے سب چھپاتی اور اسے انور کر رہی تھی۔ رابعہ احمد کے جھوٹ نے اسے مزید الجھا دیا تھا، پھر ریاض احمد کا اسے اسلام آباد بھیجے کا اسٹیپ لینا، یعنی وہ بھی کچھ نہ کچھ جانتے تھے، کچھ ایسا جو وہ عمر سے بھی شیر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بھی انہیں کرید کے مزید ذہنی اذیت میں مبتلا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے دعا کے بدلے پڑیے پر سخت دکھ تھا۔ اسے گھر بلو سیاست نہیں آتی تھی کہ وہ دعا کو اعتماد میں لیتا۔ ماں سے کیسے بچا کر ان ماں نے بھی جھوٹ بول کے اس کا ہاں توڑ دیا تھا۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ سے عمر کی فہور کرتی آتی تھیں۔

دعا کا رونا، مغموم سی صورت، خاموشی یہ سب ظاہر کرتے تھے کہ وہ کسی ٹیشن میں ہے۔ وہ جتنا سوچتا، اتنا ہی الجھتا جاتا۔

”یا خدا سب ٹھیک کر دے۔“ اس نے منہ پر ہاتھ پھیرتے دعا مانگی۔



وہ ماں کی گود میں سر رکھے لیٹا لاڈ کر رہا تھا۔ رابعہ احمد

نری سے اسے اونچ بیچ سمجھا رہی تھیں۔

”تمہارے پیانے، تم بہت برا ٹرسٹ کیا ہے۔ پلیز عمر! اب تم پورا اترنا، ان کا اعتماد بالکل نہ توڑنا، اتنی محنت اور لگن سے کام کرنا کہ انہیں تم پر فخر ہونے لگے، ان کی تمام شکایات دور ہو جائیں۔“ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

”اس سب کے بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟“ اس نے کسلی کھلی۔

”بہت سارا ثواب، تمہارے والد تم سے راضی ہوں گے تو رب العزت تمہیں ضرور اجر دے گا۔“ رابعہ احمد کی عقل نے عیسٰی تک کام کیا تھا۔

”لیکن مجھے اجر آب سے چاہیے۔“ اسے آج کی تاریخ نہیں اس کھیل کو ختم کرنا تھا۔

”کیا اجر؟“ رابعہ احمد کا چلتا ہاتھ رک گیا۔

”دعا۔“ مجھ بدلے میں دعا چاہیے۔“ اس نے ماں کا ہاتھ تھام کے آنکھوں سے لگالیا۔ رابعہ احمد مسکرا دیں۔

”اتنا کم ریٹرن، بانی داوے میں نے پہلے سے دعا تمہارے ہی لیے سوچ رکھی ہے۔“ انہوں نے بیٹے کے سامنے دل کا بھید کھول دیا تاکہ وہ دل لگا کے محنت کرے۔ عمر کو بھی یہی شک پڑتا تھا جو بچ نکلا۔

”اوہ! ارسلی مام، آئی لو یو مام سوچ، پھر آپ اس کی بہت سی حفاظت کیجیے گا۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنی بھولی ماں کے ہاتھ جو ملے، لمبے میں از حد فکر سمولی۔

”بہت بد تمیز ہو گئے ہو تم۔“

رابعہ احمد نے اس کے سر پر چیت لگائی اور ہاتھ چوم لیا۔ وہ بہت عرصہ بعد دل سے خوش ہوئی تھیں، ان کا روم روم جھوم اٹھا تھا۔



اس نے حفظ ماہنامہ کے طور پر، خود کو بیڈ روم تک محدود کر لیا تھا۔ رابعہ احمد اسے باہر بلواتیں تو وہ ان کی پہلپ کروا دیتی، ورنہ کسی نہ کسی کونے میں گھسی

دیکھیں گے اور۔۔۔ اور جو تم کو وہ۔۔۔ بٹ تم ایسے نہیں
مانو گی، میں ماما کو بلاتا ہوں۔“ وہ اسے نظروں کے حصار
میں جکڑے ہوئے تھے۔

”آخری باب۔۔۔ خدا کرے یہ واقعی آخری پار ہو۔“
اس نے صدق دل سے دعا کی تھی جو فوراً سن لی گئی۔
وہ ناچار بیڈ سے اٹھنے لگی۔ عمر اپنی جیت پر مسکرا
دیا۔



وہ ریو الونگ چیئر گھمانا کمری سوچ میں غرق تھا۔
جہاں عمر کو اسلام آیا دہلی براؤنچ ملنے پر افسوس تھا،
وہاں یہ خوشی تھی کہ اس کا سایہ بھی دعا سے دور ہو گیا
تھا۔

”میں آج دعا کو منالوں گا“ اس سے ڈھیر ساری
باتیں، ہنسی مذاق ہو گا، وہ پھر سے کھل مل جائے تو یقیناً
سب کچھ مجھ سے شیر کر لے گی۔ عمر ہم دونوں کو
دور نہیں کر سکتا۔ میں اسے اپنی دعا چھیننے نہیں دوں گا،
میں بے وقوف ہوں، جو اس سے ناراض ہوں، جب
میں حقیقت سے آگاہ نہیں تو کیوں اپنے دل میں وہم کو
جگہ دوں۔ مجھے اپنی محبت اور دعا پر اعتماد ہے، اس نے
کچھ بھی غلط نہیں کیا ہو گا۔“

وہ خود کو سرزنش کرتا، ”مبائل نکال کے گیلری میں
سے اس کی تصاویر نکال کے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے
پر روشنی سی چمکنے لگی۔

”کتنے روز ہو گئے ہیں، مجھے اسے جی بھر کے دیکھے،
اس کی آواز سن۔“ ”مبائل آف کر کے گاڑی کی چابی
دراز سے نکال کے وہ اٹھ گیا۔



”دعا۔۔۔ دعا۔۔۔“ راجہ احمد نے خالی کمرہ پا کر اسے
آواز سن دیں۔ وہ واش روم سے ٹائل سے بال خشک
کرتی نکلی۔

”تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں، عمر تمہارا بچہ
وہٹ کر رہا ہے۔“ وہ اسے واش روم سے نکلتا دیکھ کے
ناراض ہو گئیں۔ عمر کب سے انتظار میں کھڑا تھا،

وہ لیٹی کتاب پڑھ رہی تھی۔ جب دروازے پر
دستک ہوئی۔ وہ فٹ سے اٹھ بیٹھی، ”آنہ دہلی شخصیت
دوہی ہو سکتی تھیں۔ راجہ احمد یا عہد۔ اس نے دہنٹا
ٹھیک سے کندھوں پر پھیلا لیا۔

”ہیس۔۔۔“ اس کی آواز میں غناہت تھی۔ عمر
باچھیں چیرتا حاضر تھا۔ اس کے موڈ پر اس پڑ گئی۔
”فری ہو۔۔۔“ اس نے صحنوں اچکا میں۔

”میں ہر وقت فری ہی ہوں ہوں۔“ اس نے اپنی کم
بانگی پر طنز کیا۔
”تو چلو اٹھو، میرا مووی دیکھنے کا موڈ بن رہا ہے۔“
بڑے ہی ملاؤ سے فرمائش کی گئی۔

”لیکن میرا دل نہیں چاہ رہا۔ کئی مین مجھے موویز
میں کوئی انٹرٹ نہیں۔“ اس نے انکار کرنے کی
ہمت پکڑی۔
”تمہارے دل کی ایسی کی تھیں۔“ اس نے ذہن
میں للکارا۔

”یو ڈونٹ نو، میں کل اسلام کلبو جا رہا ہوں، اب
وہیں رہوں گا۔“ اس نے شکل پر اداسی طاری کر لی۔
”یہ تو اچھی خبر ہے۔“ دعا کا دل بلیٹل اچھلا۔ اتنے
دنوں بعد ملنے والی پہلی خوشی تھی۔
”تم مجھے مس کر دو۔“ وہ بڑی آس سے پوچھ رہا
تھا۔

”یادیں اچھی ہوں یا بری، ان پر پہرہ نہیں بٹھایا
جاسکتا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے باور کروا دیا۔ وہ ابھی
انتابے وقوف نہیں ہوا تھا، اس کا جی چاہا کہ ٹیبل اس
کے اوپر الٹوے۔

”تو پھر تم میرے ساتھ مووی پر چل رہی ہونا، میں
چاہتا ہوں جب میں وہاں پر تھا بیٹھا ہوں تو میرے پاس
بہت سی خوب صورت یادیں ہوں، جو میری تہائی دور
کرنے اور مسکراتے کا سبب بنیں۔“ وہ ڈھٹائی سے
کہہ رہا تھا۔

”ہم گھر پر مووی دیکھ لیتے ہیں۔“
”نہیں دعا! بس آخری بار سچ کریں گے، مووی

لیتا جاؤں۔“ اس نے سوچا ہوا بہانا کھڑا۔

”بس تھوڑی دیر ہے۔ میں روٹیاں ڈال دوں، آہی گئے ہو تو میرے ساتھ کچھ کھائیں۔“ رابعہ احمد نے آخری جملہ بڑا سوج کے ادا کیا۔ وہ اس کی دعا سے ناراضی سے آگاہ تھیں۔ اسے مزید آگاہی دینا ضروری تھا۔

”کیا کیوں دعا اور عمریں۔ نوال بھی تھوڑی دیر تک کانچے سے آجائے گی۔“ اسے اچنبھا ہوا۔

”دعا اور عمر تو مودی دیکھنے گئے ہیں اور نوال کانچے سے آگے بھی کھاتی ہے، کبھی نہیں۔“ انہوں نے بڑی مصروفیت دکھائی۔ عمر کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ وہ کتنے ارمانوں اور خوشی سے اسے ایک نظر دیکھنے دوڑا چلا آیا تھا۔ اس کا سارا جوش ملیامیت ہو گیا۔

”دعا عمر کے ساتھ مودی دیکھنے گئی ہے۔“ اس نے دکھ سے دہرایا۔

”ہاں عمر کل اسلام آباد جا رہا ہے، پھر نہ جلنے کتنے روز بعد لوٹنے، وہ دونوں اس آخری دن کو سیلپیوٹ کرنا چاہ رہے تھے۔“ انہوں نے بڑے جامع اور تکلیف دہ الفاظ میں جھوٹ بولا۔ انہیں اس بات کی بالکل پروا نہیں تھی کہ جب وہ ایسے من گھڑت شوشے چھوڑتی ہیں تو ریاض احمد یا عمر کے دل پر کیا بیتی ہے۔

”آپ دعا کو عمر کے ساتھ کیوں جانے دیتی ہیں؟“ وہ ماں کے سامنے سوال لیے کھڑا ہو گیا۔

”کیوں کا کیا مطلب؟ وہ عمر کے ساتھ کہیں آجا نہیں سکتی۔“ وہ ترکی بہ ترکی بولیں۔

”تو عمر اس پر اتنا مہمان کیوں ہو گیا ہے۔“ یہی اس کے دل کی چیخ تھی جو نوک زبان پر آگئی۔

”تمہیں اس کے اچھا ہو جانے پر کوئی اعتراض ہے۔“ رابعہ احمد کو یہ تعینش بہت بری لگی تھی۔ عمروضا کے لیے سر نہیں ہو گیا تھا۔ وہ اسے اپنے طور پر اسے عمر کی امانت تسلیم کر چکی تھیں۔ ان ماں بیٹے کا عہد ہو گیا تھا۔ اب عمر کباب میں ہڈی بن رہا تھا۔

”مجھے اس دوستی پہ اعتراض ہے۔“ اس نے کینٹی

اسے غصہ بھی آسکتا تھا۔

”میں فریش ہو رہی تھی، عمر تھوڑا ویٹ اور کر لے گا۔“ وہ جان بوجھ کر شور لینے لگی تھی، تاکہ وقت ضائع کر کے اسے چڑا سکے اور شاید وہ غصے میں اول فیل بلکا جائے یا روگرام کینسل کر دے۔

”اچھا جلدی سے ہال ڈرائی کرو، ہری اپ، میں تمہارا ڈریس چوز کرتی ہوں۔“ انہیں کچھ زیادہ ہی جلدی تھی۔

”میں کرلوں گی ممائی جان۔“ اسے ان کی پھرتی سے کوفت ہوئی۔ وہ ان سنی کر کے وارڈروب کھول چکی تھیں۔

”یہ والا ڈریس پہنو۔“ انہوں نے عمر کا دلویا ہوا سرخ رنگ کا فراک نکالا۔ دعا کو ممائی جان کی یہ حرکت اور دماغت بہت بری لگی تھی۔

”میں اس کے ساتھ ڈنٹ پر نہیں جا رہی۔“ اس نے سنجیدگی سے کتنے برش اٹھایا۔ رابعہ احمد کو اس کا لہجہ عجیب تھا، لیکن صرف نظر کرتی تھیں۔

”ڈنٹ پر نہیں، لیکن انجوائے کرنے تو جا رہی ہوتا“ کھلے دل سے سیلپیوٹ کر دے اس ڈریس میں کیا برائی ہے۔ میرے بیٹے نے تمہیں اتنے چاؤ سے دلویا ہے، پھر اسے پہنتا ہے تو آج کیوں نہیں دس منٹ میں ریڈی ہو کے آجاؤ، آئی ہو پ کہ مجھے دوبارہ آنے کی زحمت نہیں دوگی۔“ وہ بھی دوبارہ اسی کے لمحے میں کتنی باہر نکل گئیں۔ انہیں دعا پر پتہ چھ گئی تھی دعا نے بھی نخوت سے سر جھکا۔

وہ بہت خوش و مگن مرکزی دروازہ کھول کے داخل ہوا۔ رابعہ احمد چن میں بیچ تیار کر رہی تھیں۔

”السلام علیکم لما جان! وہ سیدھا ان کے پاس آیا۔

”وعلیکم السلام۔“ رابعہ احمد اس کی آواز پر مڑیں۔

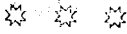
”تم اس وقت۔“ وہ تھوڑا حیران ہوئیں، کیونکہ وہ

کبھی اس نام نہیں آیا تھا۔

”جی یہاں قریب سے گزر رہا تھا تو سوچا لپٹا جان کا لپٹ

کے حصے میں محبت بھری تسلی آتی۔ وہ بے جان چیزوں کو اپنا اور ضد کا مسئلہ بنا کے ماں کو دکھ میں مبتلا نہیں کرتا تھا۔ وہ ان کی خوشی کی خاطر عمر کو اپنے کپڑے، کھلونے، بیک، شوز غرضیکہ ہر وہ چیز بخوشی دینے پر راضی ہو جاتا جو اس کی بھی ضرورت کی ہوئی، لیکن دعائے دعا کو کی چیز نہیں تھی۔ وہ اس کی محبت تھی۔

اس بار ماں کے آنسو، دلیلیں اسے دعا سے دست بردار نہیں کر سکتے تھے۔ اسے اپنے حق کے لیے لڑنا اور ڈٹ جانا تھا۔ اس سب کے لیے دعا کا اس کے ساتھ برابر کھڑا ہونا، اعتماد کرنا ضروری تھا، عمر کے کل اسلام آباد جانے کے بعد اس نے دعا سے بات کرنے کا ارادہ باندھا۔



کی پھر تکی رگ کو انگلی سے دبایا۔
”میں نے تو بھی تمہاری اور دعا کی دوستی پہ اعتراض نہیں کیا۔“ وہ جرح پر اتر آئیں۔

”مجھ میں اور عمر میں بہت فرق ہے۔“ اسے یہ اپنی ماں نہیں لگ رہی تھیں۔ جو صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط قرار دیتی تھیں۔

”گنہگار فرق ہے؟“ وہ چوہا بند کر کے اس کے سامنے تن گئیں۔

”کردار کا۔“ وہ ماں کی دیدہ دلیری پر حیران تھا۔
”اپنی اصلاح کر لو، کردار کا نہیں اخلاق کا۔“ انہیں عمر کے حق کے لیے لڑنا تھا۔ اس کے رستے کی تمام دیواریں گرانی تھیں۔

”آپ اس معاملے میں اس کی حمایت کریں گی،“
پٹھ ٹھوٹکس گی، اس اعلان کو رد والے کی۔ ”اس نے ماں کی چوری پکڑ لی۔ راجہ احمد اتنے درست تجزیے پر گھبرا گئیں۔ لیکن عمر پر ظاہر نہ ہونے لگا۔

”میں نے انہیں دوستی کا مشورہ نہیں دیا، وہ دونوں خود ہی ایک دوسرے کے قریب آ گئے، جیسے دعا تمہارے قریب ہے، مجھے اس پر بھی اعتراض نہیں، وہ خاصی مہم جو اور سینیس ایبل لڑکی ہے۔ میں اس پہ کوئی پابندی نہیں لگا سکتی، انڈی پنشنٹ ہے، جو چاہے کر سکتی ہے۔“ انہوں نے فوراً گرت کی طرح رنگ بدلا۔ آسانی سے پکڑائی میں آنے والی نہیں تھیں۔

”ماما جان! آپ۔“

”نصف از انیف عمر! میں دن بھر فارغ نہیں ہوتی کہ عمر اور دعا کی ایکٹوٹیز دیکھتی پھوں اور تم بھی اس دوستی پر کڑھنا چھوڑو، میں نقی پیک کر رہی ہوں، لیتے جانا۔“ انہوں نے بات ہی سمیٹ دی۔ اب ان سے مزید کچھ کہنے یا سننے کی محتاج نہیں تھی۔



اسے ماں کے روتے نے بہت دکھ دیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے اس کی ہر چیز اٹھا کے عمر کو دے دیتی۔ اس

دعا گھر سے لے کر ریٹورنٹ میں بیٹھنے تک خاموش رہی تھی۔ اگر عمر بلا لیتا تو ہوں، ماں میں جواب دے کے پھر سے چپ کا روزہ رکھ لیتی۔ عمر نے کھانا آرڈر کر دیا۔

”کتنا اچھا ہونا اگر تم اس ریڈ فرائڈ کے ساتھ مل سکتی اور کاجل بھی لگا لیتیں۔“ اس نے دعا کو نظروں کے حصار میں جکڑے، بڑی حسرت سے فرمائش کی۔ دعا کے دلغ کے سارے فیوز بھک سے اڑ گئے۔ اتنی جرأت تو عمیر نے نہیں کی تھی۔ بلکہ وہ خواتین کا، پلک پلک پر ج سنور کے آناخت ناپسند کرتا تھا۔ وہ جبرے پیچھے خاموش رہی۔

”ویسے سرخ رنگ میں ساوگی میں بھی غضب ڈھا رہی ہو۔ اس رنگ نے تمہاری خوب صورتی میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے۔“ عمر نے تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ وہ پچھلے تاثرات لیے میز کی سطح کو گھورتی رہی۔

”اے فوٹس گرل! اتنے کمپلیمنٹس دیے ہیں، کم از کم تھینکس ہی بول دو۔“ عمر نے پھر سے دانتوں کی نمائش کی۔

عمید آفس سے آکے سیدھا بیڑھیاں چڑھ گیا۔ اس نے ماں کو پکارا نہ ہی سلام کر کے چائے کی فرمائش کی۔ رابعہ احمد نے مڑ کر دیکھا، ریاض احمد بھی کمرے میں چلے گئے تھے۔ ان کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ عمید ان کا برا بیٹا تھا۔ نہایت فرمایاں بردار، سمجھ دار، ان کی ذرا سی تکلیف پر سو بار پوچھنے والا، وہ ان سے ناراض ہو گیا تھا۔ اس بار بغیر کسی وجہ کے، عمر کی فیور کر کے، وہ اسے خود سے دور کر چکی تھیں۔ عمر اور دعا دو گھنٹے بعد ہی لچ کر کے لوٹ آئے تھے۔ عمر کو ضروری کام سے جانا پڑ گیا۔ دعا نے دوبارہ باہر جھانک کے نہیں دیکھا۔ وہ رات کے کھانے کی تیاری کرتی رہیں۔ جب ٹیبل لگی۔ دعا باہر آئی نہ ہی عمید کمرے سے نکلا۔ نوال جلد ہی کھانا کھا کے سو گئی تھی۔ اس کا کل ضروری ٹیسٹ تھا۔ اسے صبح جلدی اٹھ کے دہرائنا تھا۔ رابعہ احمد نے چند لمبے بمشکل کھائے۔ ریاض احمد کو دودھ دے کے وہ بیڑھیاں چڑھ گئیں۔ ان کے دل کو کسی طور چین نہیں تھا۔

”عمید۔۔۔ عمید۔۔۔“ کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی۔ وہ اوندمے منہ لیٹا تھا، ماں کی پکار پہ اٹھ بیٹھا، انہوں نے لائٹ آن کی۔

”جی ماں جان۔“ وہ مؤدب تھا۔

”کیا ہوا میری جان؟“ اس کی حالت پر ان کے ضمیر نے انہیں سرزنش کی۔

”ٹھیک ہوں میں، آپ کو کوئی کام تھا۔“ اس نے ادب ملحوظ رکھا تھا۔

”تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟“ وہ ہمیشی پڑ گئیں۔

”جب بھوک ہوگی، بچن سے لے لوں گا۔“ اس نے انہیں اپنی ذمہ داری سے فارغ کر دیا۔

”تم مجھ سے ناراض ہو عمید۔“ وہ نزدیک جا

بیٹھیں۔

”کیوں بھلا؟“ اس نے نظریں جھپکائے رکھیں۔

”میں عمر کی فیور نہیں کر رہی تھی۔“ انہوں نے

”آئی تھنک کہ میں کوئی اتنی توپ چیز نہیں ہوں، جس طرح سے تم پکلیمنٹ پاس کر رہے ہو۔ شاید تمہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے اور غلط فہمی کے لیے سواری کیا جاتا ہے۔“ دعا کے رسپانس نے اس کے دماغ کی طنائیں زور سے کھینچیں۔

”اگر میری جگہ عمید ہوتا تو۔۔۔“ اس نے پہلی بار خود اس کا ذکر چھیڑا۔

”تم خود کو اس سے کچھ مت کرنا۔ وہ کبھی بھی تمہاری جگہ نہیں ہوتا۔“

وہ اس کی تعریف میں بلا ٹکان بول سکتی تھی اور اس کے خلاف ایک حرف بھی سننا اس کی شان کے خلاف تھا۔

”یو مین۔۔۔ ہی از بچ بیٹر۔“ اس نے بھنوس اچکائیں۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ دعا نے اس کی حالت سے حفا اٹھایا۔

”میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔ ہر ایک کی اپنی پرسنالٹی ہوتی ہے۔“ دعا معصومیت سے بولی۔

”کیا تم عمید میں انٹرسٹڈ ہو۔“ وہ یک دم سیدھا ہو گیا۔ اس نے اراداً نہیں پوچھا تھا، زبان پھسل گئی۔ دعا کئی لمحے کے لیے غور کرتی رہ گئی۔ وہ اسے اچھا لگتا تھا۔ اس کی عادتیں گروار اخلاق سب اچھا تھا۔

”شاید نہیں، لیکچو نیل، میں نے ہمیشہ اسے ایک دوست کی طرح لیا ہے۔ اس ریلیشن سے کبھی ہٹ کر نہیں چلے ہم۔“ وہ عمر کی بات کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔ اسے مطمئن کرنا ضروری تھا۔

”تو پھر تم نے جواب دینے میں تاہم کیوں لیا؟“ عمر نے اس سے وضاحت چاہی۔

”اس لیے کہ میں ٹھیک سے جانچ پرکھ کے، تمہیں قہ جتاؤں۔“ اسے عمر کا اس طرح سے کریدنا اور ذاتیات میں دخل اندازی کرنا برا لگتا تھا۔

دیگر کھانا لگا رہا تھا۔ جب اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔

”ایکسکیوزی۔“ وہ اسکرین دیکھ کے معذرت کرتا اٹھ گیا۔

اعتراف جرم کر لیا۔

”میں نے آپ کو کوئی الزام نہیں دیا۔“ اس نے انہیں بری الذمہ کر دیا۔ بلکہ اسے ماں کے ساتھ بحث پر بھی افسوس تھا۔ انہیں بیٹے کی فرماں برداری کچھ کے لگنے لگی۔

”عمیر! میرا مطلب یہ تھا کہ۔۔۔ کہ شاید وہ دونوں۔۔۔ ایک دوسرے میں۔۔۔“

راجہ احمد نے آپس میں ہاتھ ملے ان کے حلقے سے آواز نکل رہی تھی۔ انہوں نے اپنے چلاتے ضمیر کو ڈپٹ دیا۔ وہ پھر اس کا ذہن الجھانے جارہی تھیں کہ اگر وہ دعا کے لیے نیک جذبات رکھتا ہے تو ان پر نظر ثانی کر لے۔

”ایک دوسرے میں۔۔۔“ عمیر نے سراٹھایا۔
”ایک دوسرے میں انٹرسٹڈ ہوں۔“ انہوں نے تھوک نکل کے باقی کا جھوٹ بھی بول دیا۔ عمیر کا دماغ جھنجھکا کے رہ گیا۔ آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اسے ماں کے الفاظ پر یقین کرنا دشوار لگا۔

”آپ کہہ رہی ہیں تو سچ ہی ہوگا۔“ وہ کہہ کر پھرتی سے اٹھا اور تنگی پاؤں کمرے سے نکلتا چلا گیا۔
”عمیر۔۔۔ عمیر رکو تو کہاں جا رہے ہو؟“ وہ آوازیں دیتی اس تک پہنچنے کی کوشش میں تقریباً بھاگ رہی تھیں۔ اس کے قدم بہت تیز تھے۔ وہ دروازے کے پاس جا کر راجہ احمد ہانپتی ہوئی اس تک آئیں۔

”عمیر! کہاں جا رہے ہو؟“ ان کا سانس اکھڑا تھا۔
”پلیز نا جان، آپ اندر مت آئیے گا، مجھے پیلا سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔“ اس نے اندر جا کے زور سے دروازہ بند کر لیا۔

وہ سڑک کنارے بایک روکے فون سن رہا تھا۔
”جی چاچو جان، ساری تیاری اور پلاننگ مکمل

ہے۔“ اس نے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔
”تم نے ڈانٹا کنز یاد کر لیے ہیں۔“ الیاس احمد کے پاس کلائیہ مکس کے لیے بہت سی فکریں تھیں۔
”رٹ لیے ہیں۔ ڈونٹ سواری۔“ وہ مسکرایا۔

”عمر! اس غضب کی ایکٹنگ کرنا کہ سب کی نظریں دھوکا کھا جائیں، تم پر حقیقت کا گمان ہو۔“ انہوں نے کوئی دسویں بار یہ سنبھہ کی۔

”آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ چاچو۔“ وہ براعتو تھا۔
”تم اپنے ذہن میں بار بار ایک کروڑ کی گردان کرو، آج کی رات کا ڈراما تمہیں ایک کروڑ دے جائے گا۔ ایک کروڑ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ عمر، بہت بڑی۔“ الیاس احمد نے اسے اپنے سینے میں آسان طریقہ بتایا۔

”اوکے، رکھتا ہوں۔“ عمر نے مسکرا کے موبائل آف کر دیا۔

ریاض احمد دروازہ پئی رہے تھے انہیں عمیر کا اندر آکے دروازہ لاک کرنا بہت عجیب لگا۔ اس کا چہرہ تاتا ہوا اور آنکھیں شدت ضبط سے سرخ پڑ گئی تھیں۔ باپ نے فوراً بھانپ لیا۔

”کیا ہوا عمیر؟“ انہوں نے گلاس واپس رکھ دیا۔
”میں آپ سے کچھ مانگنے آیا ہوں پاپا جان۔“ وہ ان کے قدموں میں سر جھکائے بیٹھ گیا۔

”تمہارے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے، مانگ کر دیکھو۔“ ان کا دل جوان بیٹے کی حالت پر پھل رہا تھا۔
”آپ کی جان ہی مانگنے آیا ہوں۔“ اس نے نرمی سے کہا۔

”کھل کے بتاؤ عمیر۔“ وہ انہیں بہت الجھا ہوا لگ رہا تھا۔

”آپ دعا کو میرے نام کریں۔“ اس نے اپنے دل پہ لگا تیر کھینچ نکالا جو سیدھا ریاض احمد کے دل پر جالگا۔
”تم نے زندگی میں پہلی بار مجھ سے کچھ مانگا ہے،

ورنہ ہمیشہ تم میرے ہر کئے اور دلیے پر صابر و شاکر رہو
ہو۔“ نہیں اسے سببتا تھے بہت صدمہ ہو رہا تھا۔
کاش وہ اس سے ہٹ کے کوئی دنیاوی چیز مانگ لیتا
وہ کوئی بھی قیمت چکا کے اس کے قدموں میں لا
دھرتے یہ خواہش پوری کرنا ان کے اختیار میں نہیں
تھا۔

”آئی ایم ریٹلی سوری بیٹا! میں دعا کے ساتھ زبردستی
نہیں کر سکتا، یہ سچ ہے، مجھے اس کی آہوں سے ڈر
لگتا ہے۔“ ریاض احمد نے سچ بتا دیا۔ ان میں جھوٹ
بولنے کی ہمت نہیں تھی اور اسے کوئی آس دلا کے
آئندہ زندگی کا سکون عذرت نہیں کرنا چاہتے تھے۔

”بٹ والی پاپا جان! آپ ایک دفعہ اس سے پوچھ
تولیں۔ وہ کبھی بھی۔“

”میں اس سے پوچھ چکا ہوں۔“ وہ بیٹھے نظریں
نہیں ملایا رہے تھے۔

”کیا گماں نے؟“ عمیر کا دل بہت شدت سے
دھڑکا۔ اس سوال نے اس کے اندر خوف کے پنجے گاڑ
دیے۔

”اس نے بے حس نے ریخوڑ کر دیا۔“ انہیں بہت
تکلیف دہ مراحل سے گزرتے اسے بتانا پڑا۔ عمیر کو
باپ کے الفاظ اور اپنے کل بے یقین لگے۔

”اس نے میرے پردہ پونڈل کو ریخوڑ کر دیا۔“ اس نے
باپ کے الفاظ کو پھر سے دہرائے تصدیق چاہی۔ ریاض
احمد کی آواز نے ساتھ نہ دیا۔ انہوں نے لمبکت میں کئی
بار سر ہلایا۔

”میں۔ نہیں۔“ اس کے لب بے آواز بے
وہ ان کے پاس سے اٹھ گیا۔ مزید کچھ نہیں کہا تھا۔
اس کا جسم بالکل بے جان اور آنکھیں پانی سے بھر
گئیں، دل گہری دلدل میں جا گرا۔ اس کا من، اعتدال
بھرم سب ایک جھٹکے میں چکنا چور ہو گیا۔ وہ باپ کے
سامنے اپنی مردانگی کا بھرم قائم رکھتا ہوا گیا۔

”سنو عمیر۔“ وہ آنکھوں میں ٹھہرے نمکین پانی
کو چھپانے کے لیے سینے تک سر گرائے مڑا۔
”جی پاپا جان۔“ آواز کی نمی باپ سے چھپی نہ رہ

سکی۔ وہ جوان بیٹے کی اس حالت پہ اندر سے کٹ
گئے۔

”تم دعا کے کوئی باز پرس نہ کرنا میں نے اسی لیے تم
سے چھپا رکھا تھا۔“

”تو چھپائے رکھتے نا بتایا کیوں؟“ وہ روہا سنا ہو گیا۔
”ہیاس لیے دیا کہ تم خود کو مزید آگے بڑھنے سے
روکو۔“ وہ قدم گھسیٹتا چل دیا۔ وہ کتنا آگے بڑھ چکا
تھا۔ اس کا اسے صبح سے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔

وہ چکن سمیٹ کے فریج میں سالن رکھ رہی تھیں۔
جب عمر چلا آیا۔ وہ دوسرے گیا اب لوٹا تھا۔

”کیا کر رہی ہیں ملما؟“ وہ سیدھا ان کے پاس آیا۔
”کچھ نہیں، تم کمال تھے۔“ وہ پلٹیں۔

”ایک ضروری کام سے چلا گیا تھا۔“ اب دوسرا آئیں،
میرے ساتھ چلیں۔“ اس نے نمل کا ہاتھ تھام لیا۔

”مگر ہر جانا ہے؟“ وہ اس کے ساتھ چلنے لگیں۔
”پاپا جان کے پاس۔“ یہ معمول کی خبر نہیں تھی۔

راجہ احمد رک گئیں۔

”ان کے پاس کیوں؟“ انہیں پوچھنا پڑا۔

”انہوں نے میرے لیے اتنا بڑا دل کیا ہے، اب
تھیں کس تو بنتا ہے نا۔“ اس نے ماں کے گلے میں
بانہیں ڈالیں۔

”میں صدقے جاؤں، میرا بیٹا کتنا سمجھ دار ہو گیا
ہے۔“ وہ نمل ہو گئیں۔ انہیں اس کے اندر یہ ساری
تبدیلی دعا کے زندگی میں آنے کی وجہ سے لگتی تھی۔

ریاض احمد گود میں ہاتھ رکھے بے حس و حرکت
بیٹھے تھے۔ عمر گھبرایا نہیں تھا۔ بے اسے ایک کروڑ کی
گردان یاد آئی۔

”اسلام علیکم پاپا جان!“ نہایت ادب سے سلام
پیش کیا گیا۔ ریاض احمد نے چونک کے اسے دیکھا،
انہیں اپنی بیٹائی پر یقین نہ آیا، دراز سے نظر کاچشمہ
نکل کے لگایا۔

”و علیکم السلام۔“ بلا آخر انہیں یقین کرنا پڑا کہ

عمرہ نفس نفیس موجود تھا۔
 ”میں آپ کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا تھا۔ آپ کا
 بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا اور مجھ پر
 ٹرسٹ کیا۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کے
 اعتماد کو مجھ سے بچاؤں، میں آپ سے صلاح مشورہ
 لیتا رہوں گا، آپ کی مدد کے بغیر میں اتنا بڑا بزنس رن
 نہیں کر سکتا، آپ میرے۔“

”میں نے حمید چوہدری کو فائر کر دیا ہے۔“ عمر کے
 دھیمے مزاج نے انہیں چونکایا ضرور تھا، لیکن وہ اتنی
 جلدی جیسے میں آنے والے نہیں تھے۔

”نہیں۔۔۔ نہیں پاپا جان! آپ انہیں فائر مت
 کریں، میں تو بزنس کی الف، ب سے بھی ناواقف
 ہوں، ان ایکسپیٹس ہوں، میں بھلا آپ کی محنت
 کیوں ضائع کروں، آپ جو بھی سیٹ دس گئے، میں وہی
 لوں گا۔“ عمر کو یہ سب کہنے میں ذرا مشکل پیش نہیں
 آئی تھی، کیونکہ اس نے عمر کو کاپی کیا تھا۔ وہ باپ سے
 ایسے ہی نرم لہجے میں پیش آتا۔

”اسے اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کریں،
 ریاض احمد! میں کبھی بھی نہ کہہ سکتا تھا جو ان کی ضد اور
 لالچا پلین ہے، میرا بیٹا سدھر جائے گا۔“ رابعہ احمد کے
 لہجے میں بیٹے کے لیے فخر بول رہا تھا۔

”اللہ تمہیں ہدایت دے اور اپنی حفظ و امان میں
 رکھے۔“ باپ نے صدق دل سے دعا دی۔

”چلیں، آپ پھر آرام کریں، مجھے ابھی تھوڑی سی
 پیکنگ کرنی ہے۔“ عمر فارغ ہو گیا۔ وہ نہ باپ کے
 قریب ہوا، نہ ان سے پیار لیا اور نہ ہی انہیں چھوا۔
 رابعہ احمد نے محسوس کیا ہوا نہیں، لیکن ریاض احمد کا
 دل ٹھٹھک سا گیا۔



وہ کب سے کھڑکی میں کھڑی لان میں قطار در قطار
 لگے درختوں کو گھور رہی تھی۔ اس کے کمرے کی لائٹ
 آف تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کوئی لان کی ساری لائٹس
 بھی آف کر دے، تاکہ تاحد نگاہ اندھیرا چھا جائے، وہ

اس گھب اندھیرے میں آنکھیں جھپک جھپک کے
 تادیدہ نقطے تلاش کرے۔ حالانکہ اسے کس چیز کی
 تلاش تھی۔ یہ وہ خود بھی ٹھیک سے نہیں جانتی تھی۔
 ”تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو عمر؟ میں نے
 تمہارا کیا گناہ لڑا ہے۔ کیوں سب کی نظروں میں مجھے رسوا
 کر رہے ہو، میں ملوثی تنہا ہوں، کسی سے کچھ کہہ بھی
 نہیں سکتی۔ میرا بے ہی کون، جس سے میں اپنی سچائی
 شیئر کروں، میری امی بھی نہیں ہیں ورنہ میں ان کی گود
 میں چھپ جاتی۔“ ماں کی یاد پر اس کے منہ سے سسکی
 نکلی۔ وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھے بے آواز رونے لگی۔

”ایک شخص نے، صرف ایک شخص نے، مجھ سے
 میرے سارے رشتے، محبتیں چھین لیں۔ میں کیا
 کروں، کس سے کہوں، میرے خدا میری رہنمائی
 فرما۔“ وہ زور، زور سے روتے فریاد کر رہی تھی۔ اس کا
 کوئی سہارا، مددگار نہیں تھا۔ وہ سوائے آنسو بہانے
 کے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

بیڈ پر بڑے اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ اس
 نے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کیے اور کھڑکی سے
 ہٹ کے بیڈ کی طرف آگئی۔ اسکرین پر عمر کا ٹنگ چمک
 رہا تھا۔ اس کا جی چاہا موبائل زور سے نشن پر دے
 مارے۔ اس نے بے بسی سے گیلی آنکھیں زور سے میچ
 کے کڑ لیں اور نیچے گر گئی۔ عمر دروازے کے باہر ہی
 کھڑا تھا۔ اس نے ہنڈل اٹھایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔

دروازے کی چڑچڑاہٹ پر دعا نے مڑ کر دیکھا، اسے
 باہر کی ہلکی سی روشنی میں عمر کا بھیا نک چہرہ نظر آیا۔ وہ
 کسی چیل کی طرح اس پر جھپٹی۔

”تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اس کا لہجہ
 زہر خند، آنکھیں متورم اور نفرت سے بھری تھیں۔

”باہر آؤ، میری بات سنو۔“ عمر کو اس کے خطرناک
 تاثرات نے سہا دیا تھا۔

”چلے جاؤ یہاں سے، صبح بات کرنا۔“ وہ کہہ کر
 دروازہ بند کرنے لگی، وہ پھرتی سے میچ میں آگیا۔

”تم آن بیا، میں تمہیں فریڈ سمجھ کر، ایک مشورہ

کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز میری بات سن لو۔ اگر تم نہ مانیں تو میں شور مچا کے سب کو جگا دوں گا۔“ اس نے انگلی اٹھا کے دھمکی دی۔

”میرے صبر کا امتحان مت لو۔“ دعا و زور دھکیلتی روہانی ہو گئی۔ عمر نے اسے بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

”جن بھوت نہیں ہوں جو تمہیں کھا جاؤں گا۔ میں نے تمہیں کچھ دکھانا ہے۔ چلو میرے ساتھ۔“ اس نے اسے ابو سے چلنے کا اشارہ کیا۔

”مجھے نہیں جانا کیس بھی پلیز عمر! زبردستی مت کرو۔“ وہ بے بسی کی انتہا پر تھی۔

”تقی بے چاری سی شکل مت بناؤ یا ربلا وجہ سین کری ایٹ کر رہی ہو چند منٹوں کی تو بات ہے۔ میری بات سن لو ورنہ تم جانتی ہو میں کتنا ضدی ہوں اگر خود سے نہیں چلو گی تو اٹھا کے لے جاؤں گا۔“

عمر نے ہٹ دھرمی سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ روتی ہوئی اس کے پیچھے گھسنے لگی۔ کسی بے جان لاش کی مانند۔ سارا گھر سو رہا تھا۔ لیکن ایک آنکھ ایسی تھی جو اسے سب کی گواہ بن گئی تھی۔



الیاس احمد کرٹ کے بل لیے تھے۔ سائنٹسٹ برنگا موبائل آنکھوں کے سامنے رکھا تھا۔ مہیج ٹون ٹی واٹریشن ہوئی، انہوں نے موبائل اٹھا کے ”ان بکس کھولا“ اوکے کا مہیج تھا۔ موبائل آف کر کے تیکے کے نیچے دیا اور کد تبدلی۔

مریم بائیں طرف بڑی بے خبر سو رہی تھی۔ الیاس احمد نے چہرے کو خاصا کرب ناک بنایا، ہاتھ زور سے مریم کے بازو پر مار کے، نقاہت زدہ آواز میں دہائی دینی شروع کر دی۔

”مریم۔ مریم۔ اٹھو مریم۔ مجھے۔ مجھے۔“ ان کے منہ سے الفاظ نہیں نکل پا رہے تھے۔ مریم آنکھیں ملتی ٹھنڈا کے اٹھ بیٹھی۔

”جی۔ جی کیا ہوا کیوں شور کر رہے ہیں؟“ وہ بے

رابطہ بننے لگی۔

”مجھے پانی دو، میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔“ الیاس احمد نے بلا وجہ زور لگا کے بانپ بانپ کے چہرہ سرخ کر لیا۔ وہ ہاتھ زور زور سے جھٹک رہے تھے۔

مریم کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے سائڈ نیبل پر پڑے جگ میں سے پانی کا گلاس بھر اور شوہر کی طرف سرخ کیا۔

”مجھے بیٹھنے کے لیے سارا دو۔“ انہوں نے مزید کمزوری دکھائی۔ مریم نے ان پر جھک کے بازو ان کی کمر کے گرد ڈالا۔ زور لگا کے انتہیں تھوڑا اوپر کیا، پانی کا گلاس ایک ہاتھ سے منہ کو لگایا۔ دو گھونٹ بھر کے انہوں نے گلاس پرے کر دیا اور دھڑام سے تکیے پر گر گئے۔

”کیا ہو رہا ہے الیاس! آپ کو اچھے بھلے تو سوئے تھے آپ۔“ مریم نے ان کی کمر کے پیچھے دو تکیے جوڑے۔

”شاید میرا بلڈ پریشر مائی ہو گیا ہے، جسم سے جان نکلی جا رہی ہے،“ عمر کو بلاؤ، مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔“ الیاس احمد نے لمبے لمبے سانس لیتے بات مکمل کی۔

”آ۔۔۔ اچھا۔ کدھر ہے آپ کا موبائل۔“ مریم نے اثبات میں سر ہلا کے، موبائل کی تلاش میں تکیے اور چادر اور دھڑا کے تلاش شروع کر دی۔

”یہ لو موبائل۔“ الیاس احمد نے اپنے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کے موبائل نکال کے بیوی کو پکڑ لیا۔

مریم نے عمر کو کال کی، تیل جا رہی تھی، لیکن وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ وہ چور نظروں سے مریم کی پریشان صورت دیکھتے ہوئے ہر تین چار سیکنڈ بعد ہائے جی دہائی بھی لگا دیتے۔ جو مریم کی جان نکالنے کے لیے کافی تھی۔

”عمر کال ریسیو نہیں کر رہا۔“ اس کی رنگت اڑی تھی۔ ”آئی تھنک ڈرائیور کے ساتھ اسپتال چلتے ہیں رستے میں عمو دیا، عمر کو انفارم کروں گی۔“ اس نے غلت میں مشورہ دیا۔

اچھلوں کو دوں یا پھر روؤں۔“ عمر نے خود پر بے بسی طاری کر لی۔

”روؤں کیوں؟“ دعا کو کچھ تو پوچھنا تھا۔

”اس لیے کہ میں پایا کو بھی ہاں کر چکا ہوں، صبح اسلام آباد جاتا ہے۔ اب میں اپنا دیرینہ خواب اور خواہش دیکھوں یا ان کی خوشی۔“ اس نے لاچاری سے ہاتھوں میں انگلیاں پھنسانیں۔

”جو تمہیں اپنے لیے ہسٹ لگے، وہ کرو۔“ دعا نے جان چھڑائی۔ ”باتی بات ہم کل صبح یا فون پر بھی ڈسکس کر سکتے ہیں۔ ابھی میں چلتی ہوں۔“ دعا کی پھنسی پھنسی آواز لگی۔

”واٹ۔۔۔ آریو میڈ“ میں تم سے اپنی زندگی کی اتنی بڑی خوشی شیئر کر رہا ہوں، اور تم جان پھڑا کے جارہی ہو۔“ عمر صدمے کی زوہیں آگیا۔

”صرف پانچ منٹ مزید یا! آج میں نے ڈائلاگز کی ریسرلنگ کی ہے۔ وہ سن کے چلی جاتا۔ یار میں بہت ایکسائٹڈ ہوں۔“ وہ مرث کی آستینیں چڑھانے لگا۔ جیسے کوئی جانور رن کر کے جا رہا ہو۔

”بہتہ جاؤ ہاں۔“ اس نے بڑے دنگ لہجے میں بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شش و پنج میں جھلا بیڈ کے کنارے ذرا سا ٹک گئی۔ اس کا دل خوف سے بھر گیا تھا۔

”تم سمجھتی کیوں نہیں ہو، میں تم سے اور تم مجھ سے بے حد پیار کرتی ہو۔“ عمر اس کی آنکھوں میں دیکھ کے شروع ہو گیا۔

”ہم جو کر رہے ہیں، اگر وہ کسی کی نگاہ میں آگیا تو ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ میں تم سے محبت ضرور کرتا ہوں، لیکن جو کچھ خودی مجھے ہو رہا ہے وہ بالکل نہیں چاہتا۔“ عمر کے الفاظ دعا کو گھبراہٹ میں جھٹلا کر رہے تھے۔ اس کی عقل میں ڈائلاگز کا سر جویر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن وہ اس کے بگڑنے کے خیال سے چکی بیٹھی رہی۔ یوں بھی وہ خود ہی سوال کرنے اور جواب دینے کا عادی تھا۔ اس نے دل میں چند آیات کا ورد شروع کر دیا۔

”بالکل نہیں، چاہے میں تکلیف سے مر جاؤں، لیکن اپنے بھائی اور بھینچوں کے بغیر اسپتال نہیں جاؤں گا۔ تم۔۔۔ تم میرے بھائی جان کو کالی کر دو، عمر کو میرے ڈاکٹر کی رہائش گاہ کا بھی پتا ہے، بھائی جان سے کہو کہ اسے فوراً ”جگا کر میرے پاس بھیجیں۔“ بولتے ہوئے ان کا سانس پھول گیا۔ مریم نے ان کی کمر سے ہلاتے تیزی سے بھائی جان کا نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو بھائی جان، الیاس کی طبیعت خراب ہے۔ پلیر عمر کو لے کر جلدی آجائیں۔“ مریم نے تیسری نیل پر کل ریسیو کرتے ہی پیغام دیا۔

”تمیں عمر کو لے کر آ رہا ہوں۔“ ریاض احمد نے مزید کچھ سننے بغیر کل ڈسکنکٹ کر دی۔

”وہ عمر کو لے کر آرہے ہیں۔“ مریم کے ان الفاظ نے الیاس احمد کے دل میں ٹھنڈ ڈال دی۔ انہوں نے مزید ایکٹنگ کرتے سردائیں بائیں ہلایا۔



”کیا دکھانا تھا تم نے مجھے، کیوں زبردستی لے آئے ہو۔“ دعا نے اپنے اندر کی گھبراہٹ پر قابو پا کے ”اپنے اعصاب کو کنٹرول میں رکھا۔

”یار، مجھے تم سے ایک مشورہ کرنا ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے دروازے کو ہاتھ مارا جو بند ہو گیا۔

”ییس۔ یہ تم نے دروازہ کیوں بند کر دیا۔“ وہ کپکپاتی دروازے کی طرف بڑھی۔

”میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا، ریاض احمد کی لاڈلی، چیتی بھانجی۔ میری نیت خراب نہیں ہے کیونکہ تم دنیا کی آخری لڑکی نہیں ہو۔ دروازہ اس لیے بند کیا ہے کہ کوئی ہمارے بولنے کی آواز سن کے اس طرف نہ آجائے۔“ اس نے بڑی مضبوط جیتائی۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ایکٹنگ میرا خواب ہے اور ایک پروڈیو سر مجھے اپنے سیریل میں کاسٹ کرنے کا سوچ رہا ہے۔ آج اس پروڈیو سر نے مجھے آفس بلوا کے، لیڈنگ رول کی آفر کر دی ہے۔ میری بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں، خوش ہوں

ریاض احمد افتخار و خیراں پیروں میں چل اڑنے لگے۔ رابعہ احمد ان کے موبائل کی بیل اور باتوں کی آواز سن کے جاگ گئی تھیں، جلدی سے اٹھ بیٹھیں۔
”کیا ہوا ریاض صاحب؟ سب خیریت تو ہے۔“
”نہیں، مریم کی کال تھی، الیاس کی طبیعت بگڑ گئی ہے، وہ عمر کو بلا رہا ہے۔“

ریاض احمد بولتے ہوئے باہر نکل گئے۔ رابعہ احمد نے بھی پھرتی سے جوتے پہن کے پیچھے دوڑ لگا دی۔
”خدا خیر کرے۔“ وہ ان سے کئی قدم آگے عمر کے کمرے تک پہنچ گئے۔ اندر سے عمر کی آتی آواز سنے ان کا دستک کے لیے اٹھایا ہاتھ روک دیا۔ وہ بھلا اس وقت کس سے اتنی اونچی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔
”عورت کی عزت نازک آئینے کی طرح ہوتی ہے اور عورت بھی تم جیسی جو دکھنے میں پاک اور معصوم ہو۔“ عمر نے اتنا کہہ کر رخ موڑ لیا۔

وہ بالکل صحیح ڈانٹا لگ بول رہا تھا۔ بولنے کے دوران وہ دعا کے چہرے کے آثار چڑھا کر ہر گہری نظر رکھے جوتے تھا۔ ذرا سی بھول چوک کی محفائش نہیں تھی۔ وقت کم، کام زیادہ۔ عمر کی کوشش تھی کہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو کے سب بولے۔

”ہم کیسے اپنے بیویوں کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ وہ ہم پہ اندھا اعتبار کرتے ہیں۔ میں لاکھ براہی، لیکن اپنے ہی گھر میں نقب نہیں لگا سکتا، اس عورت ذات نے ہی مراد کو جنت سے نکلوا دیا تھا، اس پر زمین تنگ کی اور آج ایک پارچہ۔“ وہ سانس لینے کو رکھ دے تاثر چپ بیٹھی تھی۔ یہ سب اس کی عقل سے بالاتر تھا۔

”تم شکل سے اتنی معصوم اور سیدھی ہو کہ کوئی بھی مجھ پر اعتبار نہیں کرے گا، چاہے ہم رنگے ہاتھوں ہی کیوں نہ پکڑے جائیں۔“ یہ ڈانٹا لگ ادا کرتے اس نے دعا کے بجائے سامنے والی دیوار کو گھورا۔

ریاض احمد سانس روک کے کھڑے تھے۔ رابعہ احمد بھی شوہر کی طرح خاموش بار بار انہیں نکلتیں۔

”مریم! ایسا کرو، مجھے اٹھنے میں سہارا دو اور بھائی جان کے ہاں لے چلو۔“ الیاس احمد نے نقاہت سے اٹھنے کی کوشش کرتے اس کا بازو پکڑ لیا۔
”نہیں، آپ لیٹے رہیں، میں خود ان کی طرف جاتی ہوں۔ دیکھتی ہوں وہ لوگ اتنی دیر کیوں کر رہے ہیں۔“ اس نے شوہر کو واپس لٹانا چاہا۔
”نہیں۔۔۔ نہیں۔“ میرا بلڈ پریشر ضرور رہائی ہوا ہے، لیکن میں اتنا بھی کمزور نہیں پڑا کہ چل نہ سکوں۔“ وہ اس کے دھیارہ روکنے یا جرح کرنے سے پہلے چل پڑے۔ مریم ان کے غصے سے آگاہ تھی۔ اس لیے ناچار روک نہ پائی۔

”بس عمر۔ بس۔ میری تو بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“

یہ دعا کی آواز تھی یا موت کے فرشتے کی پکار۔ ریاض احمد نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے دیوار کا سہارا لیا۔ پیچھے کھڑی رابعہ احمد کے کانوں میں لمبی نہیں جیسی حالت تھی۔ انہوں نے یہ سب تو نہیں چاہا تھا۔ انہوں نے ریاض احمد کو قتل کیا۔

”جو بھی کہہ رہا ہوں اسے تھوڑی دیر بعد تم اچھی طرح سے غور نہ کرنے کے باوجود بھی انڈر اسٹینڈ کر لوگی، سب سمجھ میں آتا جائے گا۔“ وہ طنز پر ہنس رہا تھا۔ دروازے کے اس پار کون کون کھڑا ہے۔

”پلیز، پلیز آئندہ میرے فیڈ روم میں ہرگز نہ مت آنا۔ اور جو کچھ ہمارے بیچ ہو چکا اسے بھی ایک غلطی سمجھ کر بھلا دو۔“ عمر بہت روائی سے جذباتی ڈانٹا لگ بولتا جا رہا تھا۔ دعا ایک دم سے کھڑی ہو گئی۔ وہ ششدر سی رہ گئی۔ اسے کسی انمولی کا احساس ہوا۔ اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا، عمر نے فوراً ہاتھ رکھ دیا۔

”میں جلد واپس لوٹوں گا“ تم میرا انتظار کرنا اور میں
برامس کرتا ہوں کہ اس غلطی کا خمیازہ بھگتنے کو تمہیں
اکیلا نہیں چھوڑوں گا میں خود اپنے باپ سے تمہارا
ہاتھ مانگوں گا۔“

ریاض احمد سے مزید برداشت نہ ہوا۔ وہ اپنی ساری
توانائیاں جمع کر کے، دروازہ کھول کے اندر داخل
ہو گئے۔

”عمو!“ وہ شیر کی مانند دھاڑے۔ رابعہ احمد تھر تھر
کناں رہی تھیں۔ الیاس احمد سیڑھیاں چڑھ رہے
تھے جب انہوں نے بھائی کے چلانے کی آواز سنی وہ
ایک ہی جست میں ساری سیڑھیاں پھلانگ گئے۔
اس ڈرامے کا انٹروا تاخیر سے پہنچا تھا۔ مریم حواس
باختہ سی رہ گئی۔ ریاض احمد میں نہ جانے کون سی طاقت
آگئی تھی۔ انہوں نے عمر کا گریبان دیوچ لیا۔ عمر اور
نوال بھی شور شرابا سن کر باہر کودوڑے۔ سارا گھر عمر
کے کمرے میں جمع تھا۔

”بھائی جان! بیبا جان! یہ کیا ہو رہا ہے؟“ الیاس احمد
اور عمر ایک ساتھ ان کی طرف بوڑھے عمر کو باپ سے
چھڑانا چاہا۔ دعا کا پتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔

”کیا ہو رہا تھا عمر یہاں آدھی رات کو مجھے سچ سچ
بتا دو ورنہ میں گلادباؤں گا، تمہیں شوٹ کر دوں گا میں
تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا، کب سے یہ سلسلہ چل
رہا ہے۔ کمزور اور بیمار ریاض احمد میں نہ جانے کون
سی قوت آگئی تھی کہ وہ قابو میں نہیں آ رہے تھے۔

”جو آپ نے سنا وہ لفظ بہ لفظ سچ تھا“ اب میں مزید
کھل کے کیا بتاؤں، آپ خود سب سن چکے ہیں۔“ عمر
نے باپ کی آنکھوں میں دیکھ کے مضبوطی سے جھوٹ
بولا۔ اس کی آنکھ میں خوف تھا، نہ ڈر۔ ریاض احمد کے
ہاتھ اس کے گریبان پر ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے ایک
جھٹکے سے اپنے بازو بھی آزاد کروائے۔

”آخر یہاں ہو کیا رہا ہے، کوئی مجھے بھی تو بتائے۔“
بے خبر مریم، چیخ کر بولی نوال نے زرد پڑی ماں کا ہاتھ
تھام لیا۔

”کچھ بھی نہیں آنٹی جان! رات کے اس پہر دعا کی

میرے کمرے سے برآمدگی ہوئی ہے، میری دعا کے
کمرے سے نہیں۔“ اس نے ہاتھ سے دیوار کے
ساتھ سہمی ہوئی چھٹکی کی طرح چپکی دعا کی طرف اشارہ
کیا۔ نوال، عمر، مریم اور الیاس احمد نے اس طرف
دیکھا۔ سب کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ کوئی اس
دھینگا مشتی میں اسے دیکھ نہ پایا تھا۔

”کیا مطلب؟ سیدھے سے بتاؤ۔“ عمر چلاتے
ہوئے، پھولے نتھنے کیے عمر کی طرف برہا۔

”پلیز عمر، کنٹرول یور سیلف، اتنے ہانہو مت
ہو۔“ الیاس احمد نے پھرتی سے بیچ میں کود کے عمر کو اس
تک پہنچنے سے روکا۔

”عمر! کھل کے سچ بتاؤ۔“ اس نے آنکھ سے اسے
بولنے کا اشارہ دیا۔

”مجھ پر کون یقین کرے گا؟ میں سب کی نظروں میں
ایک برا انسان ہوں، بیبا جان سب سن چکے ہیں۔ میں
دعا کو کل جانے سے پہلے سمجھا رہا تھا۔ میں سارا قصور
اکیلی اس کا نہیں نکالتوں گا، ہم دونوں سے غلطی ہوئی
ہے اور میں اس غلطی کا خمیازہ بھگتنے کے لیے دعا کو
اپناؤں گا، شادی کروں گا۔“

”جسٹ شٹ اپ۔“ عمر جھٹکے سے اپنا آپ
چھڑا کے، چلاتا ہوا اس پر جھپٹ پڑا۔ اس نے زور کا
چھڑ عمر کے گل پر سید کیا۔

”بکواس کرنا ہے، الزام لگاتا ہے، دعا پر۔“ نہیں ہے
وہ ایسی۔ ”عمر اسے جھنجھوڑنا ہوا چیخ رہا تھا۔ الیاس احمد
بیچ بچاؤ کرواتے پھنس گئے تھے عمر کو ڈرامے کے
مطابق چپ چاپ مار کھانی تھی۔ مگر اس کے کہے پر
تصدیق کی مہربنت ہو سکے۔

”تمہیں تمہیں جان سے مار دوں گا، تمہارا گند اوجھو
مٹا دوں گا۔ بہت برداشت کر لیا تمہیں۔“ اس نے
کے اور لاتوں کی بارش کر دی تھی۔

”عمر! چھوڑو عمر کو، وہ بالکل سچ کہہ رہا ہے، میں نے
اور تمہارے پیانے سب خود سنا ہے۔“

رابعہ احمد عمر کو دیوچ کے اس سے الگ کرنے
لگیں۔ ان سے لاڈلے اور جوان بیٹے کی درگت بنا

برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ عمیر نے پلک جھپکائے بغیر مائل اور پھر دعا کو دکھا، جس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا تھا۔ اسے بالکل یقین نہیں تھا۔ اس کا دل خون خون ہو رہا تھا۔

”نہیں۔۔۔ دعا۔ دعا! تم بولو۔۔۔ تم بتاؤ دعا۔“

”بس عمیر! کوئی کچھ نہیں بولے گا۔“ اس سے قبل کہ عمیر دعا کے قریب پہنچ کر اسے ہاتھ سے پکڑ کر میدان میں ٹھیک لیتا، الیاس احمد زور سے دھاڑے۔ عمیر وہیں رک گیا۔

”بھائی جان! آپ اپنے حالات دیکھیں، ٹکلیں یہاں سے دوہی بیٹے ہیں اور وہ بھی ایک لڑکی کی خاطر ایک دوسرے کا گریبان پکڑے ہیں، پلیز آپ سب یہاں سے چلے جائیں، کوئی کچھ نہیں کہے گا، میرے بھائی کی حالت پر رحم کھاؤ۔“

الیاس احمد نے بڑے گلو گیر لہجے میں فریاد کی۔ اب سب کا دھیان ریاض احمد کی طرف مڑ گیا۔ جن کی رنگت زرد، جسم چمکولے کھا رہا تھا اور آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ رابعہ احمد نے روتے ہوئے گرتے ہوئے شہر کو تھما۔

”ماموں جان۔۔۔“ دعا کے سرود خود میں اس ڈھب سے ہوئے شخص کو دیکھ کر حرارت پیدا ہوئی۔

”بس۔۔۔ ایک لفظ مت بولنا۔“ الیاس احمد نے اس کے منہ پر نواز کا ہاتھ رکھ کے چباچبا کے کہا۔ وہ واپس گر گئی۔

رابعہ احمد، عمیر اور الیاس احمد نے ریاض احمد کو سہارا دے کے اٹھایا اور باہر لے گئے۔ وہ تنہا اس سیاہ رات کی تاریکی کو اپنے نصیب میں جذب کرنے کو رہ گئی۔



ریاض احمد کے دل کی دھڑکن تیز اور بلڈ ریشر مائل ہو گیا تھا۔ انہیں اسپتال لے جایا گیا۔ سب اگلے روز تک ان کے ساتھ وہیں رہے۔ رابعہ احمد کا دل روکے برا حال تھا۔ عمیر کی خاموشی، مست جامد اور گہری تھی۔

مریم وقفے وقفے سے حیرت اور نفرت کا اظہار کرتی۔ الیاس احمد بظاہر اتنے رنجیدہ اور پریشان تھے کہ پل بھر کو بڑے بھائی کا ساتھ نہ چھوڑا۔ انہیں ساتھ لے کے ہی گھر آئے۔

”عمیر اور نوال! آپ لوگ ذرا باہر جاؤ، ہمیں ضروری بات کرنی ہے۔“ جیسے ہی ریاض احمد کو بستر پر لٹایا گیا۔ الیاس احمد نے ان کو باہر جانے کا آرڈر دے دیا۔

وہ دونوں ذہنی اور جسمانی طور پر بہت تھک چکے تھے، بغیر چوں و چرا ان کے وہاں سے نکل گئے۔ الیاس احمد بیڈ کے قریب کرسی پہنچ کے بیٹھ گئے۔

”بھائی جان! مجھے آپ سے ایک ضروری اجازت لینی ہے، پھر اس موضوع کو چھیڑنا مناسب تو نہیں لگتا، لیکن موقع کی نزاکت کا تقاضا ہے۔“ انہوں نے تمہید باندھی۔

”ہم کمو کیا کتنا چاہتے ہو؟“ رابعہ احمد نے شوہر کے ہاتھ سہلاتے ہوئے دیور کا حوصلہ بڑھایا۔

”دیکھیے بھائی جان! آپ کے دونوں جوان بیٹے آپ کا پانا ہیں، ان سے ہماری نسل آگے بڑھے گی، آپ لوگوں کے بڑھاپے کا آسرا ہیں وہ دونوں۔“

”میرا بیٹا صرف عمیر ہے۔ مجھے عمر سے نفرت ہو گئی ہے، میں اس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں۔“ ان کے لہجے میں بھی نفرت سی تھی۔

”دھین بھائی جان دھین، گوشت کو ناخنوں سے جدا نہیں کیا جاسکتا، آپ کی اسی جذباتیت کی وجہ سے، میں نے فیصلہ کیا کہ دعا کو اپنے گھر لے جاؤں، جب تک معاملہ ٹھنڈا نہیں پڑ جاتا، اس کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ دونوں بھائیوں کے بیچ مدد مڑی ہو گئی۔ کسی ایک کو بھی چوت لگ گئی تو نقصان کس کا ہو گا؟“

انہوں نے بولتے ہوئے بھنوس اچکا کے بھابھی جان سے بھی رائے چاہی۔ وہ تو لڑائی جھگڑے کا سن کر ہی سہم گئیں۔

”ہم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو الیاس! اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤ، ان کی طبیعت بہتر ہو جائے تو باقی

کے معاملات دیکھ لیں گے۔ ”راجہ احمد نے فوراً ”حالی بھلی۔ مریم کے ماتھے پر ہل پڑ گئے، لیکن خاموشی میں ہی عافیت تھی۔ ریاض احمد نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

”چلیں بھابی جان! ہم بھی پھر نکلتے ہیں، میں آفس ہو آؤں، آپ بھائی صاحب کو ریسٹ کرنے دیں، میں شام کو دوبارہ چکر لگاؤں۔ گلہ چلو مریم! اسے لے کے آؤ۔“ الیاس احمد کا مقصد پورا ہو گیا۔ انہوں نے مریم کو اسے لانے کا کہہ دیا۔



مریم ماتھے پر ہل ڈالے اس کے کمرے کا دروازہ کھول کے اندر داخل ہوئی۔ کمرے میں رات کی مانند گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے لائٹ آن کی۔ بیڈ کے قریب زمین پر دھری ہوئے کمرے کی ہوائی دھا کو حقارت سے دیکھا اور قریب جا کے پاؤں کی ٹھوکر ماری۔

”مٹھو بے جیا۔“ یہ پہلی گالی تھی جو اس نے اپنے لیے سنی۔ اس کا جسم زور کی ٹھوکر کھانے بھی بے حس و حرکت رہا۔

”تم ایسے نہیں سونگی۔“ مریم نے جھک کر اسے بازو سے دبوچ کے گھسیٹا، وہ اٹھ گئی۔ اس کے بال بکھرے، آنکھیں رونے سے سوچی اور متورم، رنجت پیلی پڑ چکی تھیں۔

لاؤنج کے صوفوں پر عمیر اور نوال کب سے خاموش بیٹھے تھے۔ مریم اسے ہاتھ سے پکڑے تقریباً گھسیٹتی اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔ نوال اور عمیر نے بڑی تکلیف اور کرب سے اس منظر کو دیکھا۔ دونوں کی زبان تالو سے چپک گئی تھی۔ اس کا وہ بیانیہ من پر رل رہا تھا۔ جو ہمیشہ اس کے شانوں پر ڈاڑھتا تھا۔ وہ جو سراٹھا کے چلا کرتی تھی اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ جو ایک شان سے اس گھر میں دندناتی پھرتی تھی آج ایک گناہ گار مجرم کی طرح گھسٹتی ہوئی نکلی تھی۔



وہ دن چڑھے تک سویا تھا۔ باقی کا دن اس نے خوش

گوار موڈ میں فرینڈز کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتے، اسموگنگ اور لائٹ ڈرائیو، اپنی فوٹ کریم کافی پیتے شام ہٹاتی۔ اسے ملازموں سے پتا چلا تھا کہ ریاض احمد کی طبیعت ناساز ہے۔ وہ اسپتال پر زور دیتے۔ اسے باپ یا ان کی بیماری کی قطعاً ”فکر نہیں تھی۔ وہ خوش تھا۔ اپنی جیت پر، اس شام کو خوب صورت ہٹانا چاہتا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب الیاس احمد کی کال آئی۔

”ہیلو چاچو، ہاؤ آریو؟“ وہ بڑی مستی میں بولا۔

”جاہل گھر دے، الو کے پیچھے، صبح سے کہاں دفع ہو تم؟“ وہ چھوٹے ہی اس پر برس پڑے۔

”کیا ہوا چاچو جان! ابوری تھنک از فائن، میں ذرا فرینڈز کے ساتھ نکلا تھا۔“ عمر نے گھبرا کے وضاحت دی۔

”شرم کرو عمر! کیا ہر بات، ہر موقع کی نزاکت میں ہی تمہیں سمجھاؤں، تم میں خود کیل اتنی عقل نہیں ہے۔ یہ وقت فرینڈز کے ساتھ انجوائے کرنے کا نہیں، بلکہ ریاض احمد کی خدمت کرنے کا ہے۔ تاکہ انہیں یقین آجائے کہ تم دونوں گناہ گار ہو۔“ الیاس احمد کا بارہ چڑھنے لگا۔

”لیکن چاچو جان، کیا تو شاید میری شکل دیکھنا بھی پسند نہ کریں بہت برا دھچکا لگا ہے انہیں۔“

”لسن ٹومی عمر! ابھی جیت کا جشن منانے کا وقت نہیں آیا، دعا ایک ڈرپوک اور بزدل لڑکی ہے جو اپنے کردار کی صفائی میں ایک لفظ بھی نہ بول سکی، لیکن اب ہمارا اگلا اور آخری موریا ریاض احمد ہے۔ جو کہ نہایت ہی ذہین اور زیرک بندہ ہے۔ اس اسٹیج تک اگر تمہاری ذرا سی بھی غلطی، ساری محنت پرانی پھیر سکتی ہے۔ سو برائے مہربانی اپنی ساری فضول آئیڈیولیز چھوڑ کے، ان کے پاس جاؤ، معافی مانگو اور اپنے گناہ کے اعتراف میں ایک جذباتی اور جامع تقریر کرو۔ جان لو عمر! جب تک بھائی جان کو دعا پر تنکا بھر یقین رہے گا، وہ ہمیں اس برہاتھ نہیں ڈالنے دیں گے۔“ الیاس احمد نے عمر کی عقل پر ماتم کیا۔ جو اپنی عقل کا استعمال بہت کم کرتا تھا۔

”یعنی میں یلپا کا یقین کھل کر دوں، انہیں دعا سے اس قدر بدظن کر دوں کہ انہیں اس کے کردار پر نظر ثانی کرنے کا موقع دیے بغیر ہم لوگ اپنی چال چل جائیں۔“ عمر کی سمجھ میں ساری بات آگئی تھی۔
”تلف کو برس، اب آئی نا تمہاری عقل پنہری پر، اب وقت ضائع کیے بغیر جلدی سے گھر جاؤ مجھ بھی جان بھی تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی، اللہ حافظ۔“ الیاس احمد نے ہدایت دے کے فون بند کر دیا۔



راجہ احمد نے شوہر کا پی چمک کیا جو نارمل تھا۔ انہیں میڈیسن کھلا کے، وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر گروس رکھ کے بیٹھ گئیں۔

”آج ماشاء اللہ آپ بہت بہتر ہیں، بس آپ میڈیسن کی غفلت مت کیجئے گا۔“ راجہ احمد ان سے مسکرا کے ہلکے پھلکے لہجے میں ان کا دھیان بٹانے لگیں۔

”راجہ بیگم! اب شاید میری طبیعت کبھی بھی نہ سنبھل سکے، جتنا بڑا دکھ مجھے میری اولاد نے دیا ہے اس کا مداوا کوئی چیز کوئی خوشی نہیں کر سکتی۔“ وہ پھر سے دل برداشتہ ہونے لگے۔

”آپ اس حادثے کو اس قدر دل پر مت لیں ریاض، انجی اور بھی بہت سے مفلس رہتے آپ کے منہ پر ہیں۔“ راجہ احمد نے کھو کھلا ساداسا دیا۔

”میرا رشتوں پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے، مجھے دعار کتنا مان اور اعتبار تھا، لیکن اس نے کیا کیا، سوچو تو میرا دل ہی بچھ گیا ہے۔“ راجہ احمد کے پاس الفاظ نہیں تھے، ان کا دکھ بہت بڑا تھا۔ دلاسا بہت چھوٹا اور کم تر احساس تھا، وہ کسے بے قصور کہتیں، کسے بری الذمہ قرار دیتیں۔

”جو بھی ہو ریاض احمد! مجھے بھی بہت صدمہ ہے، دعا کو میں نے نوال کی طرح ہی سمجھا اور یہ خدا مجھے کبھی۔“ وہ دعا کے کردار اور پاکیزگی کی کوئی دینے لگی تھیں۔ جو عمر کے حق میں بہتر نہیں تھی۔

”راجہ! کیا تمہیں لگتا ہے کہ جو بھی ہوا، اس میں سراسر قصور دعا کا ہے۔ اس نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ وہ نفس کی خواہش پر برائی کی طرف مائل ہوئی؟“ وہ عورت تھیں۔ پھر وہ سارا دن گھر میں اس کے نزدیک رہتی تھیں۔ اس کے لیے پوچھ رہے تھے۔

”آپ اس معاملے کو کسی فیصلہ کن وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔“ انہوں نے کافی ذمہ داری جو اب دیا۔ جس سے ان کی تشفی بھی ہو جائے اور کسی کی طرف داری کی بوجھ بھی نہ آئے تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ راجہ ان کا ہاتھ تھپک کر بیٹھ پر آہستہ سے رکھتی اٹھ گئیں۔ دروازے پر چہرے پر بے حد پشیمانی سجائے عمر کھاتا تھا۔

”یہ جان کیسے ہیں؟ میں ان سے ملنے آیا ہوں، ان کی فکر میں مجھے کسی پل چھین نہیں۔“ وہ ماں کو دیکھتے ہی شروع ہو گیا۔ وہ اپنے پیچھے احتیاط سے دروازہ بند کرتی باہر آ گئیں۔

”یہاں سے اپنی فکر سمیت دفعان ہو جاؤ۔“ وہ سختی سے کہتی چہرہ موڑ گئیں۔

”پلیز نا، جو گناہ ہم سے سرزد ہو گیا ہے۔ اب اس کے لیے ہمیں کتنا ذلیل و خوار کیا جائے گا۔ پلیز مجھے معاف کر دیں، اگر میں نے اس کے درغلانے میں آکر کوئی بھول چوک کر لی ہے تو میں اس سے شادی کر لوں گا۔“ عمر نے شرمندگی سے ہاتھ جوڑ دیے۔

”شٹ اپ، جسٹ شٹ اپ، تمہیں غیرت نہیں آتی، اتنا بڑا گناہ کر کے دھٹائی سے اس کا اعتراف کرتے ہوئے، یہاں کوئی فلمی سین نہیں چل رہا عمر احمد ہو سکتا ہے، باقی سب کو تمہارے اس ڈرامے پر یقین آ گیا ہو، لیکن میں۔ میں۔ میں تمہاری ماں ہوں تمہاری رگ رگ سے واقف، تمہیں بچانے کے لیے دنیا والوں کے سامنے تمہارے کرتوتوں یا پھر اپنی تربیت کی لان رکھنے کے لیے روہ ڈال سکتی ہوں، لیکن مجھے تم پر اعتبار قطعی نہیں، دعا کو میں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ اس کے ہاتھ سے اچانک انڈہ بھی کر کر ٹوٹ جائے تو وہ بو کھلا جاتی ہے۔ اس کے منہ سے اپنی

خبر، ایک ماموں کا منہ کالا کر دیا، اب دو سراخیر خواہ بن رہا ہے غیرت مرگنی ہے سب کی۔“ آخری جملہ منہ میں بڑبڑاتی وہ اٹھ گئی۔ الیاس احمد نے ٹی وی کا ریموٹ رکھ دیا۔



وہ اپنے ساتھ ہونے والے اندوہناک واقعے پہ ابھی تک بے یقین تھی، صرف چند منٹوں نے اس کی زندگی کو گھپ اندھیروں میں دھکیل دیا۔ اس کی پاک وامنی کو واغدار کر دیا۔ وہ بے یقین تھی۔ کیا واقعی حقیقت میں سب ہو چکا ہے؟ اس سے ماں جیسی شفقت سے پیش آنے والی رابعہ ممالی اور ماموں جن میں اسے شروع سے اپنا باپ دکھتا تھا۔ اسے یاد تھا جب وہ چھ برس کی عمر میں ماں کی انگلی تھام کے ریاض ماموں کے گھر آئی تھی۔

انہوں نے کیسے بسن اور اس کے دکھ کو سمیٹ لیا تھا۔ نوال اور عمر شام کو لوٹتے۔ ریاض احمد سے ”پاپا جان“ پکارتے لپٹ جاتے رات کو ان سے چاکلیٹ اور آئس کریم کی فرمائش ہوتی، ایک روز اس نے ماں کا ہاتھ تھام کے آنکھوں میں آنسو لیے معصومیت سے پوچھا۔

”امی جان! کیا میرے ابو جان، کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ وہ مجھے چیزیں نہیں لاکریں گے، میں کس کی گود میں چڑھوں۔“ وہ رونے لگی۔ ریاض احمد اور صفیہ بیگم اس معصوم بچی کی سوچ پر ششدر رہ گئے۔ ”گندی بات دعا! میں ہوں ناں تمہارا ابو جان اور میں آفس سے آکے نوال کے بجائے تمہیں گود میں اٹھایا کروں گا۔ کیونکہ تم میری بڑی بیٹی ہو۔“ ریاض احمد نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔ گال پر بوسہ دیا اور گدگدی کی، ”انہوں نے ایک بچی سے کیا وعدہ ہمیشہ نبھایا۔

رابعہ احمد نے بڑی خوشی اور خندہ پیشانی سے اپنی اولاد کے بیچ اس شراکت داری کو عمر بھر برواشت کیا، نوال اپنی شاپنگ رابعہ احمد کے ساتھ جا کر کرتی۔

صفائی کے لیے لفظ نہیں نکلتے۔ اس کی خاموشی اس کی بے گناہی کا ثبوت ہے۔ تم اس کی بزدلی کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ، اینڈ گیٹ آؤٹ فرام ہیئر۔“

رابعہ احمد کی آنکھیں غصہ کرنے اور چبا کر بولنے سے لہو رنگ ہو گئیں۔ عمر نے پہلی بار ماں کا یہ روپ دیکھا تھا۔ ایسے جیسے انہوں نے کڑوے سچ کے بجائے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا ہو۔ لہجہ ماں کے رتبے کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہل نہ پایا۔ وہ اسے ہاتھ سے پرے دھکیل کے آگے ایک طرف سے ہو کر نکل گئیں۔



”کیا ضرورت تھی الیاس! اس گناہ کی پوٹلی کو گھر تک لانے کی۔ عمر کا گند آپ اپنے گھر اٹھا کے لے آئے۔ اتنا برا قدم اٹھانے سے پہلے مجھ سے صلاح تو کر لی ہوتی۔“ مریم نے بمشکل شوہر کے کھانا کھانے تک ضبط کیا لاؤنچ میں آتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ دعا کو کمرے میں بند کر کے بعد میں خیر خبر نہیں لی تھی۔

”پچھا۔ تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ میں الیاس احمد کوئی بھی کام کرنے سے پہلے مریم ملک سے صلاح و مشورہ کرنا اپنا فرض سمجھوں، کیونکہ وہ مجھ پہ حکمران ہے اور مجھ سے بہتر سوچ رکھنے والی ہے۔ انہوں نے پوری آنکھیں کھول کے مریم پر گاڑ دیں۔ مریم سے قحط مزاجی سے بات کی جاتی تو وہ مزید سر چڑھتی، وہ اسے ذرا سی بھی ڈھیل دینے کو تیار نہیں تھے۔

”آپ مجھے غلط مت لیں۔ یہ سب بھائی جان اور بھابھی کے بے جالاؤ پار کا نتیجہ ہے۔ یہ لڑکی دیکھنے میں جتنی معصوم اور سیدھی لگتی ہے اتنی ہی مہسنی اور کھنی نکلی۔ تو یہ ہے، ایسی عورت کے سائے سے بھی بچنا چاہیے۔ میں تو۔۔۔“

”پچھا۔ اس سے زیادہ بڑھ بڑھ کے بولنے کی ضرورت نہیں۔ کہاں ہے وہ اس کی خبر بھی لی ہے کہ نہیں۔“ ”پڑی ہے کمرے میں، لے لیں جا کے اس کی خبر

ریاض احمد سردیوں، گرمیوں، عید، شبِ برأت کے کپڑے اسے ساتھ لے جا کر دلاتے اس کے پاس نوال سے زیادہ تو نہیں لیکن کم بھی کپڑے، جوتے، پرس، پیگ وغیرہ نہیں تھے اس کے پاس اپنی ذاتی وارڈ روب بھی۔

اس نے میٹرک میں پہلی پوزیشن لی تو ماموں ایک گھنٹے بعد لیب ٹاپ لے کر حاضر تھے۔ ایف ایس سی میں A+ گریڈ لیا تو بلیک بیری کا تحفہ ملا۔ لی اے میں دوسری پوزیشن لی تو گاڑی، بعد ڈرائیور اسے یونیورسٹی لے جانے کے لیے موجود تھی۔ ریاض احمد کی محبتوں کے یہ سارے انداز صرف اسی کے لیے مخصوص تھے۔ عمید یونیورسٹی لیول تک بائیک استعمال کرتا رہا۔

نوال اور عمید نے کبھی دعا سے حسد نہ کیا۔ سوائے عمر کے، اسے دعا سے اللہ واسطے کا پیر تھا۔ وہ اسے ایک آنکھ نہ بھاتی اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنی اس رقیب کا رمار کے بھر کس نکال دے۔ اس کی ہر چیز کو آگ لگا دے۔ اس کے یہ خطرناک عزائم صرف سوچ تک محدود تھے۔ وہ اکثر اٹھ کے سامنے بھڑاس نکال لیتا۔ وہ اسے پیار سے سمجھتا تھا لیکن جب کبھی دعا گھر میں اکیلی اس کے قابو آجاتی، وہ جی بھر کے اس کی بے عزتی کرتا۔

دعا باقی سب رشتوں کی محبت کی ڈور سے بندھی کھینچی چلی آتی ورنہ کالج لیول میں آنے کے بعد اس کا قطعاً اس گھر میں آنے اور عمر کے ہاتھوں اپنی درگت بنوانے کو دل نہ چاہتا۔ اس نے اپنی زندگی کا ہر مرحلہ ماموں کے صلاح و مشورے سے طے کیا۔ کیا لڑی رات نے سب ختم کر دیا۔ اس کا مال کے بعد محبت و احترام کا رشتہ بھی اس سے چھن گیا۔ عمر کو اس سے نفرت تھی۔ پیر تھا اپنی زندگی بھر اس کا بدلہ وہ اس طرح اسے رسوا کر کے لے گا اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اسے اتنے دنوں میں ایک بار بھی اس کے لیے پھرے، آنکھوں اور لفظوں میں جھوٹ یا کھوٹ نظر نہیں آیا۔

وہ گھٹیا اور پختہ ذہنیت تھا۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ کم نہ سکی۔ اس کا حلق گھٹ گیا، آنتا گھٹیا، شرم ناک الزام، وہ اپنی صفائی میں کیا بولے۔ اس کا جی چاہا کہ کاش زمین بھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس قدر بے عزتی، اس کی برسوں کی اعتماد کی بنیاد پر کھری عمارت اس شخص کی مکاری نے لمحہ بھر میں زین بوس کر دی۔ وہ رورہی تھی، زار و زار، سب اپنے بیگانے ہو گئے تھے۔ مریم مملی نے اسے کتنے زور سے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا، کمرے کا دروازہ کھول کے دھکے مار کے اندر پھینکا، کسی نے پلیٹ کر خبر نہ لی۔ وہ اپنی بزدلی اور کم ہمتی پر ماتم کر رہی تھی۔ اسے کیا بولنا چاہیے تھا؟ کیسے اپنا دفاع کرتی؟ جب اس نے پہلی بار عمر کی آنکھ میں ہوس دیکھی تھی۔ اس نے دعا کو دوستی کی پیش کش کی یا جب راجہ احمد نے اسے زبردستی اس کے ساتھ رخصت کیا یا تب اڑ جاتی جب وہ اسے ڈرا دھمکا کر اپنے کمرے میں لے جا رہا تھا۔ وہ کم از کم نوال کو ہی اپنا ہمزائے لیتی، وہ ایک دم سے جھوٹی اور تھانہ پڑتی۔ کوئی تو اس کی پاکدامنی اور گواہی کے لیے بولتا۔ سب کی آنکھوں میں ٹھہری بے اعتباری اور نفرت نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔



اس کی آنکھیں رونے سے سوچ چکی تھیں۔ اس کے ہاتھ کمزوری سے کپکپاتے اور سر اس قدر بھاری تھا جیسے منوں جو تھلے دبا ہو۔ کمرے کا دروازہ ہلکی سی چرچر اہٹ سے کھلا۔ بیرونی جلتی تیز روشنیوں نے اندرونی حصے کی تاریکیوں کو نگل لیا۔ قدموں کی ابھرتی چاپ اس کے قریب آئی۔

اس نے گھٹنوں میں دبا مراٹھا کے آنے والے کو دیکھا اور پھر معمول کے مطابق اپنے دوپٹے کی تلاش میں گلے میں ہاتھ پھیرا دوپٹا گلے میں نہیں تھا اس نے شرم کے مارے قائلین پر ہاتھ پھیرتے ادھر ادھر دوپٹا ٹھولا لیکن وہ کہیں ہوتا تو ملتا جب مریم اسے بازو سے پکڑ کر کھینچ رہی تھی، پیروں میں اٹکتا، زمین پر رلتا گیا تھا۔ اس نے اپنے سینے کے آگے دونوں بازو لگا لیے

کے باہر نکل آئے۔

☆☆☆

ریاض احمد کو ڈاکٹر نے پندرہ روز کا بیڈ ریسٹ بتایا تھا۔ وہ پانچ روز بعد ہی آفس جانے کی ضد کرنے لگے۔ رابعہ احمد نے بمشکل انہیں روکا۔ اس بار صدمہ صرف عمر کا نہیں ان کی لاڈلی بیٹی کا بھی تھا۔ وہ آفس سے ملحقہ ریسٹ روم میں لیٹے متضاد سوچوں میں گھرے رہتے۔ عمیر بغیر باشتائے آفس اور نوال کلج چلی جاتی۔ رابعہ احمد کا دھیان گھر داری کی طرف بالکل نہیں تھا۔ وہ اس حادثے پر اندر ہی اندر کڑھتی رہتیں۔ انہیں اس سبب میں اپنا بھی قصور لگتا، کیونکہ وہ ہی ان دونوں کو قریب لانے کی پلاننگ کر رہی تھیں۔ ان دونوں کو تنہائی اور گھومنے پھرنے کے مواقع فراہم کیے اور اس سبب کا اتنا بھیاں تک نتیجہ نکلا۔

ریاض احمد کی زبان جیسے نالو سے چپک گئی تھی۔ وہ ان سے بیٹھی ادھر ادھر کی بات کرتی رہتیں۔ وہ بہت زیادہ ہوتا ہوا ہوں یا ہاں میں سر ہلا دیتے تو نہ دیوار یا کھڑکی سے باہر نظر آتے درختوں کو گھورے جاتے۔

عمیر آفس میں سارا دن غیر حاضری سے کام لیتا۔ اس کا بی چاہتا کہ وہ یہاں سے اتنی دور چلا جائے جہاں کوئی اپنا نہ ہو۔ اس کے دل کا ایک کونہ دعا کو قصور وار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے یک جانب ہو کر سوچا تو دعا کی زندگی کا ریکارڈ اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ وہ اس کی ہیٹ فرینڈ تھی، لیکن بالغ ہونے کے بعد اس اپنے اور عمیر کے درمیان ایک حد مقرر کر لی۔ پھر صفیہ پھوپھی بھی بہت سخت اور وضع دار خاتون تھیں۔ انہوں نے دعا پر بہت سی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں، کیونکہ گھر میں سوتیلا بھائی اور باپ بھی موجود تھے۔

دعا نے کبھی مذاق میں بھی عمیر کے ہاتھ پر ہاتھ نہیں مارا تھا، بہت فرائی بردار اور نیک لڑکی تھی۔ اب عمر کے کمرے میں سے اس کی برآمدگی اور وہ گفتگو جو ریاض اور رابعہ احمد نے من و عن سن تھی، کسی بے

اس کی آنکھوں میں خوف واضح تھا۔ ”یہ تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے بیٹا! اس چپ کر جاؤ، اب اور مت روؤ، جو ہوتا تھا وہ ہو چکا، تم خود کو سنبھالو۔“ الیاس احمد نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ لمحہ بھر کو اس ظالم شخص کا دل کانپ گیا۔ لکٹی بری حالت میں وہ معصوم اور پائیزہ لڑکی ان کے سامنے تھی۔ معاملہ کروڑوں کا تھا سو ہمدردی کو پاؤں رکھ کے کچل دیا۔ دعا پھر سے خشک آنکھیں لیے سسکیں پھرنے لگی۔

”ٹھو شہاباش! ادھر بیڈ پہ آجاؤ۔ کیوں خود کو مزید اذیت دے رہی ہو۔“ انہوں نے بازو سے پکڑ کر دعا کو اٹھایا اور بیڈ تک لے گئے اور قائلین پر رکھی کھانے کی ٹرے اٹھا کے اس کے سامنے رکھ دی۔

”چلو شہاباش کھانا کھاؤ، کب سے بھوکی ہو، کوئی ایسے بھی خود کے ساتھ ظلم کرتا ہے۔“ الیاس احمد نے خود نوالہ بیٹا کے اس کے منہ کی طرف بڑھایا جو دعا نے تھوڑے پس و پیش کے بعد ان کے لحاظ میں منہ میں ڈال لیا۔

”شہاباش! اب شروع ہو جاؤ اور سارا کھانا ختم کرو۔“ اس واقعے کے بعد یہ واحد رشتہ تھا جو اس سے اتنے محبت بھرے لمحے میں بات کر رہا تھا۔ دعا ماموں کے احترام میں چھوٹے چھوٹے قہقہے لپکتے لگی۔ وہ اسے کھاتے دیکھتے رہے۔ وہ بغیر ڈوپٹے کے خفت زدہ سی تھی۔ چند قہقہے لے کر اس نے ٹرے پر بے کھسکاوی۔ انہوں نے دعا کی کھانے میں عدم دلچسپی نوٹ کی۔

”چھایہ لو، اب پانی کے ساتھ ٹیبلٹ بھی کھاؤ،“ نیند آجائے تو خود کو بہتر محسوس کرو گی۔“ الیاس احمد نے جب سے گولی نکال کے اس کی طرف بڑھائی اس نے ٹیبلٹ ان کی شفاف تھیلی سے اٹھا کے پانی کے ساتھ نگل لی۔

”اب تم لیٹ جاؤ گڈ گرل! میں ملازمہ کو چائے کا مک دے کے جگواتا ہوں۔ اب کچھ برامت سوچنا“ سب بہتر ہو جائے گا، میں صبح پھر ملنے آؤں گا۔“ الیاس احمد نے اسے لٹا کے چادر ڈالی اس کا سر تھپکا اور اٹھ

یقین کی گنجائش نہیں تھی۔ عمیر کا دل ڈانوا ڈول تھا۔ اسے لگتا کہ سچ بہت سی باتوں کے نیچے چھپا ہوا نکل آئے گا۔ وہ دعا کے پاس جائے، تمہید کیا پائے، اتنے شرمناک موضوع پر بات کیسے کرے؟ کیا دعا تعاون کرے گی، جو سچ وہ چھپا رہی ہے۔ وہ عمیر پر اعتبار کر کے اگل دے گی۔

”اگر اس کا عمر کے ساتھ تعلق۔۔۔“ عمیر نے لمبا سانس خارج کر کے آنکھیں موندیں اور سر کرسی کی پشت سے نکالو اس کا دل غمزدہ ہو رہا تھا۔



مریم، رابعہ احمد کو جھٹلانی کا بی نہیں، ساس کا بھی درجہ دیتی تھی، اس نے بیشہ ان کا بہت احترام کیا تھا۔ وہ اپنا ہر گھڑلو مسئلہ ان سے شیئر کرتی، جو اب اس کا مریم کو بھی بہت دکھ تھا۔ اسے دعا پر اتنا غصہ تھا کہ وہ اسے اپنے گھر رکھنے کو بھی راضی نہیں تھی۔ الیاس احمد کے آگے وہ بے بس ہو جاتی۔

”بیگم صاحبہ! دعا بی بی نے صبح کا ناشتا بھی نہیں کیا اور اب دوسرا کھانا بھی واپس بھجوا دیا ہے۔“ ملازمہ ٹرے لیے گھڑی تھی۔ مریم بچوں کے یونیفارم، شوز اور بیگ وغیرہ سمیٹ رہی تھی۔ اس کے سامنے پر بل پڑ گئے۔

”میں نے بچوں کا یونیفارم چھینج کر دیا ہے، تم انہیں سینڈویچ بنانے کے دو، میں اسے دیکھتی ہوں۔“ وہ ہدایات دے کے مڑی۔

دعا گھٹنوں میں سر نہواڑے بیٹھی تھی۔ مریم نے زور سے دروازہ کھلیا۔

”بھوک ہڑتال کر کے، تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔“

مریم اس کے سر پر آکے چلائی۔ دعا نے چہرہ اوپر کیا تو ایک لمحے کو مریم کا دل لرزا۔ زرد سوجن زدہ چہرہ، آنکھیں لال سرخ اور پونے پھولے ہوئے، کھمرے پل، اس نے کبھی کسی عورت کو اس طرح ماتم کنل نہیں دیکھا تھا۔ دعا سے اسے بھی انیت رہی تھی۔ صغیہ بیگم کی وفات سے پہلے وہ بہت ہنس کھ اور زندہ

دل لڑکی ہوا کرتی تھی۔ مریم اسے اکثر اپنے کالج اور یونیورسٹیز کے قصے سناتی، اپنے لڑکھنڈ کی شرارتیں، دعا، نوال اور مریم اکثر بیٹھ کے مودی دیکھتیں اور وہ اپنے کپڑوں کی شاپنگ کے لیے اسے بھی ساتھ لے جاتیں۔

”مجھے کچھ بھی ثابت نہیں کرنا مملانی جان، میری ماں زندہ ہوئی تو میرے ساتھ یہ سلوک نہ کیا جاتا۔“ دعا کی آواز گلو گلو ہو گئی۔

”بی بی گندی زبان سے اس شریف اور پاک باز عورت کا نام لے کر اس کے کردار کی توہین مت کرو۔ تم کیا سمجھتی ہو، صغیہ کے ذکر سے ہمیں ایمویشنل بلیک میل کر کے تم پھر سے دھوکا دے لو گی تو یہ تمہاری بھول ہے دعا، تمہاری شرافت اور معصومیت کا چولا اتڑ چکا ہے۔ کردار کی گندگی سب پر عیاں ہو گئی ہے۔ اب کسی نے تم پر اعتبار نہیں کرنا۔“ مریم نے جی بھر کے تذلیل کی۔ اس نے سب کا بھروسہ توڑا تھا، وہ اسے رعایت کیوں دیتی، وہ مخلص لوگوں کو پسند کرتی تھی اور خود بھی مخلص رہتی۔

”آپ لوگوں نے یک طرفہ میرے کردار کا فیصلہ کر لیا، مجھے صفائی کا موقع دیے بغیر۔“ یہی زخم اسے رلا رہا تھا۔

”یعنی تم ابھی بھی اتنی دیدہ دلیری سے، ہماری آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی کو جھٹلا رہی ہو۔ تو کیا آدھی رات کو، عمر کے ساتھ بند کمرے میں محفل میلاد اٹھنڈ کر رہی تھیں۔ وہ تمہاری ہوس اور ذہنی پلیدی، تمہیں وہاں تک پہنچانے کے لیے لگی تھی۔“ مریم نے اس کی ذات پر کچھ اچھلنے کی حد کر دی۔ دعا نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

”خدا سے ڈریں مملانی جان، اب مجھ پر بے بنیاد الزام تراشی مت کریں۔“ وہ چیخ پڑی۔

”جو اس مت کر دو ذلیل لڑکی! خود کو چھپانے کے لیے کوئی اور طریقہ ڈھونڈو۔ یوں چہرہ ڈھانپنے سے تمہارے وجود سے اٹھتے تعفن کی بو کم نہیں ہوگی، ہم خود بھی تمہاری شکل دیکھنا اوارا نہیں کرتے، کہتی ہوں

الیاس سے، کسی کے ساتھ منہ کالا کر کے، چلتا کروں۔“ مریم بکیتی جھکتی اپنے اندر کی بھڑاس نکال کر چلی گئی۔ وہ پھر سے گھٹ گھٹ کے رونے لگی۔



الیاس احمد صبح و شام بھائی کی عیادت کے لیے آتے۔ ان کا دل بھلائے، رات کی میڈیسنز اور زبردستی دودھ کا گلاس پلاتے۔ بھابھی جان کے ساتھ اظہار فکر مند ہی ہوتی۔ ریاض احمد کے چہرے پر روز بروز بدھمتی پیلاہٹ اور رابعہ احمد کے چہرے پر کھنڈی پریشانی انہیں اپنے مشن کے مزید قریب کر رہی تھی۔ ”میں ان کی بہت کیئر کر رہی ہوں، لیکن پھر بھی ان کی خاموشی اور کمزوری بدھمتی جا رہی ہے۔ الیاس! وہ جو تمہارا ہارٹ اسپیشلسٹ فرینڈ ہے، تم پلیز اس سے ٹائم لے دو، میں ان کا کمپلٹلی چیک اپ کروانا چاہتی ہوں۔“ وہ ان کے ساتھ کوریڈور پار کر رہی تھیں۔

”ڈونٹ وری بھابھی جان! میں نہ صرف ٹائم لے دوں گا بلکہ خود آپ کے ساتھ جاؤں گا۔“ انہوں نے مزید پیش کش کی۔

”تمہارا بہت بہت شکریہ، تم ریاض کو واپس زندگی کی طرف لانے میں میرا بہت ساتھ دے رہے ہو، لیکن۔۔۔“ انہوں نے مایوس کن سا وقفہ دیا۔ الیاس احمد کے دل میں ٹھنڈی آڑ گئی۔

”لیکن یہی نال بھابھی جان کہ جب تک ان کے کچے میں پلٹا ناسور جڑ سے نہ اکھڑا، وہ تب تک نہیں سنبھلیں گے۔ آپ جانتی ہیں ناں، اپنے شوہر کی حسادیت کو۔“ وہ انہیں گھما پھرا کے اپنے مطلب کے موضوع تک لے آئے۔ اب آگے کی ساری محنت ان کو کرنا تھی۔ عمر کا کام ختم ہو گیا، لیکن کھیل ابھی جاری تھا۔ اب انہوں نے تیرہ چھوڑنے تھے۔



”مجھے تو دعا کا ذکر چھیڑتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔“ رابعہ احمد نے نفی میں سر ہلایا۔

”بھابھی جان، میرا مشورہ مانیں تو دعا کا نکاح پڑھوا دیں۔“ انہوں نے فٹ سے پہلا وار کیا۔

”عمر سے۔۔۔“ رابعہ نے سہم کے دل پر ہاتھ رکھا۔

”ہرگز نہیں، عمر نہ عمید، آپ کیوں اپنے بیٹوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنانے پر تکی ہوئی ہیں۔ کیا آپ کو عمر کے ساتھ عمید کی خوشی عزیز نہیں۔ جتنی ذلت

یہ لڑکی دے چکی ہے۔ اس کے بعد یہ ہمارے شریف خاندان کی بہو بننے کے قابل نہیں رہی۔ کیا آپ اسے وہ پہلے والا پیار، عزت، محبت جیسی شفقت دے پائیں گی۔ اس نے آپ کے خاندان کو توڑا، آپ کے مجازی خدا کو موت کے منہ میں دھکیل دیا، بھائی جان اپنے بچوں کے حصے کی محبت اس پر لٹاتے رہے۔ اس کے منہ میں لقمے ڈال ڈال کے آتا بڑا کیا اور ان ساری محبتوں کا صلہ کیا ملا۔ بدنامی، رسوائی، ذلت۔۔۔ تھ ہے اس لڑکی پر۔۔۔“

الیاس احمد پورے جوش سے تقریر جھاڑتے ان کی برین واشنگ کر رہے تھے۔ رابعہ احمد کے چہرے کے انار چڑھاؤ اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ سوچ اور یقین کے مراحل طے کر رہی ہیں۔ ورنہ وہ ضرور انہیں ٹوک دیتیں۔

”میری عقل ہی ماؤف ہو گئی ہے۔ خدا جانے کیسے حالات سدھریں گے۔“ انہوں نے ماتھے کو انگلیوں سے مسلا۔

”میری نظر میں ایک رشتہ ہے، اگر کہیں تو بات بڑھاؤں۔“ ان کا انداز محتاط تھا تاکہ انہیں کوئی شبہ نہ پڑے۔

”یا، اتنی جلدی۔ کیا واقعی تم اس کی شادی کروا دو گے۔“ رابعہ احمد اس انہونی خبر پر ٹوٹے پھوٹے لفظ بولنے لگیں۔ وہ خود بھی ذہنی طور پر دعا کو ہونے کے لیے تیار نہیں تھیں اور رہی سہی کسر الیاس احمد کی تقریر نے پوری کر دی تھی۔

”لیکن الیاس! یہ بہت بڑا قدم ہے۔ ریاض احمد کی

خاموشی کسی مصلحت کے تحت ہے۔ وہ دعا کا ذکر نہیں کرتے اس لیے مجھے ٹھیک سے اندازہ نہیں کہ وہ اس کے لیے کیا سوچ رہے ہیں۔“ وہ تھوڑا متزلزل ہوئیں۔

راجہ احمد ہی تو اصل مہو تھا جسے الیاس نے قابو کرنا تھا۔ کچھ ایسا کرنا تھا کہ راجہ احمد اسی کی طرح سوچیں اور رونے لگیں۔

”یہ ہمت آپ کو کچھ ملنی ہے“ آپ سال ہیں اپنی اولاد

کی بہتری کا سوچیں اس لڑکی کو مکھن سے پال کی طرح نکال باہر کریں یہ نہ ہو کہ بھائی جان اس کی محبت اور پیہمی میں اندھے ہو کے عمر کا گناہ عمو کے سر تھوپ دیں عمو باپ کا بے دام غلام بے زبان بے چارہ۔ ان کی ہر رضا میں راضی۔“ الیاس احمد نے خوف ناک نقشہ کھینچا۔

”نہیں۔ نہیں الیاس میں اپنے شریف اور فرماں بردار بیٹے کی زندگی برباد نہیں کر دوں گی۔ یہ لڑکی اسے ڈیزرو نہیں کرتی۔“ وہ فوراً بدک گئیں۔ اس تصور سے ان کی رنگت اڑ گئی۔

”بھائی جان سے کوئی بعید نہیں آپ خود آگے بڑھیں اور فائنٹ کریں۔“ الیاس احمد نے ہمت بندھائی۔

”میں نے کبھی ان سے اونچی آواز میں بات نہیں کی باب اولاد کی خاطر ان کے سامنے ٹوٹ جاؤں وہ بھی اس عمر میں۔“

وہ بے قاعدہ رونے لگیں۔ حالانکہ چند دن پہلے تسکون شہر پرست اپنے عجازی خدا کو نہ صرف دھوکا دے رہی تھیں بلکہ ایک معصوم لڑکی کو گمراہ بھی کر رہی تھیں۔ جھوٹ بولنے کی حد تک تھیں۔

”بھابھی جان! رونے سے کچھ نہیں ہونے والا۔“ انہیں کوفت ہوئی۔

”اگر آپ نے ہمت نہ پکڑی اپنی اولاد کے حق میں کھڑی نہ ہو میں تو آپ کی آنے والی نسلوں کے حصے میں بھی بدنامی اور ذلت ہی آئے گی۔ کیا کبھی عمر اور

مشہور حراج نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

قیمت	آداب
450/-	آوارہ گرد کی ڈائری
450/-	دعا گول ہے
450/-	انکس بھلوتے کے نقاب میں
275/-	پلے ہو جتن کو پیلے
225/-	گہری گہری پھر اسافر
225/-	عبارت گدہ
225/-	مرد حراج
225/-	مرد حراج
300/-	مرد حراج
225/-	مرد حراج
225/-	مرد حراج
200/-	ایک گراہن پوائنٹ انشاد
120/-	اوپری انکس انشاد
400/-	مرد حراج
400/-	مرد حراج

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

نے انہیں کس لڑکی کا آسرا دے رکھا ہے اور کب ملوائیں گے اس کے گھر والوں سے۔ ”مریم ان کے برابر چلتی مسلسل بول رہی تھی۔

”تم چاہو تو اسی ہفتے شادی کروا دیتا ہوں۔“ اب مریم کو بھی اس کھیل میں شامل کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اس کی ہاں اور کوشش کے بغیر تمام کام ناممکن تھا۔

”کیا مطلب میں چاہوں تو؟“ وہ نہ سمجھ سکی۔ ”بیٹھ جاؤ“ میں مطلب بھی سمجھا دیتا ہوں۔“ انہوں نے اپنے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہارے بہت لاڈلے بھائی آصف نے محبت کی شادی کی اور شادی کے محض دو ماہ بعد جب کہ انہیں ہنی مون سے لوٹے دس روز ہی ہوئے تھے ان کا ایک سینڈنٹ ہو گیا جس میں تمہاری بھابھی کی بیوہ اور بھائی کی بیوہ کی بیوی کو نقصان پہنچا۔“ وہ پرانی باتیں کیوں دہرا رہے تھے۔ مریم نے بولنے کے بعد لب وا کیے تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کے اسے بولنے سے روک دیا۔

”میں بھی اس کی آنکھوں میں سچے خوابوں نے تعبیر بھی نہیں پائی تھی کہ اس کا گھر اجڑ گیا۔ اس کی محبوب بیوی کی جدائی نے اسے ذہنی معذور کر دیا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ جلد از جلد اس کی شادی کر دی جائے ایک ایسی لڑکی سے جو اس کی اینڈینٹ ہو، اس کا بے حد خیال بھی رکھے۔ اس کی ذہنی معذوری کو سمجھے اور اس سے بہت زیادہ محبت بھی کرے تاکہ وہ نارمل زندگی کی طرف مڑے۔ تمہارے بھائی صاحب کو کافی عرصہ سے ایسی لڑکی کی تلاش تھی جو آخر کار میں نے ڈھونڈ لی ہے۔“ الیاس احمد نے اس تفصیلی گفتگو کو ڈرامائی وقفہ دے کے ادھر اور اچھوڑا۔

”کون ہے وہ لڑکی؟“ مریم کو یہی پوچھنا چاہیے تھا۔ ”اس معصوم، ہمدرد، خیال رکھنے والی لڑکی کا نام دعا ہے۔“ الیاس احمد نے مریم کی سماعت میں ہم بلاست کیا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

عمیر ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھیں گے؟ ایک دوسرے کی نظروں کا سامنا کیا میں گے کیونکہ آپ ایک بیٹے کا جھوٹا دوسرے کی پلیدی میں ڈال رہی ہیں اور نوال اس کی بیسٹ فرینڈ سے بھابھی کہہ لے گی؟ اور کیا آپ اسے دل سے بیٹی تسلیم کریں گی؟ اگر ان سب سوالوں کا جواب نہیں میں ہے تو پھر آپ لے ڈھک جانا چاہیے۔“ الیاس نے زور کا مکا ہوا میں اچھلا۔ رابعہ احمد صدمے کی زد میں نفی میں سر ملاتی جا رہی تھیں۔ ”بھائی جان کا محبت اور مٹھاس سے برین واش کریں۔ دعا کا قصور نکالیں اور نہ ہی عمر کا نام لیں جو ہو چکا اسے اپنے ذہنوں پر مسلط کرنے کے بجائے آگے کا سوچیں۔“ الیاس احمد کا موبائل بجنے لگا تو انہیں اپنا پر زور سلسلہ کلام منقطع کرنا پڑا۔

”میں چلتا ہوں۔ میری ضروری کال ہے، آپ سوچیں پھر فونکس کریں گے۔“ الیاس احمد موبائل کان سے لگا کے آگے بڑھ گئے اور ان کے لیے بہت سے دروا کر گئے۔

مریم پورچ میں غصے سے بھری دائیں سے بائیں چکر کٹ رہی تھی۔ اس نے کوفت سے تیسری بار موبائل پر نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے کمپیوٹر آپریٹر کی اطلاع تھی کہ مطلوبہ نمبری الحال بند ہے۔ مریم نے موبائل زور سے دوسرے ہاتھ پر مارا۔ تب ہی الیاس احمد چھوٹا گیٹ کھول کے لان کے رستے داخل ہوئے چکر کاتی مریم کی نگاہ ان پر پڑی تو وہ رک گئی۔

”کہاں تھے آپ اور موبائل کیوں آف کر دیا تھا؟“ وہ غصے کو کسی حد تک ضبط کر کے شروع ہو گئی۔

”تمہیں پتا تو ہے میں اس وقت بھائی جان کے پاس جاتا ہوں۔“ الیاس احمد اپنی خوشی میں اس کے غصے پر توجہ نہ دے پائے نور نے ابھی مزاج درست کر دیتے۔ ”بھائی صاحب کی دو دفعہ کال آچکی ہے، آخر آپ



قزۃ العین مسکند



کم ہونے میں نہ آ رہا تھا۔

”کیا؟“ پھر خیر سے فریدہ نے منیہ کو دیکھا تھا۔

”لو بھلا تم جاؤ گی نہیں تو رشتہ کیسے طے ہو گا؟“

فریدہ نے استغاب سے کہا۔

ثریا بیگم نے محض منیہ کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا

اور پھر حجب سی ہو گئیں۔ ایسا بھی نہ تھا کہ انہیں اپنی بیٹی کی ڈھٹائی ہوئی عمر کی فکر نہ تھی اور منیہ کوئی ان کی سونپلی بیٹی تھی۔ بلکہ وہ ان کے اپنے جگر کا گلہ تھی۔

مگر حجب ہر آنے والے رشتے سے تو اتار سے انکار ہوتا رہا تو وہ بھی اب خاصی بددل ہو چکی تھیں۔ ان کے اعصاب اب جواب دیتے جارہے تھے غصہ کہیں نہ کہیں تو اترتا ہی تھا۔ ندی کے اس بے تے دھارے کو

”منیہ شام کو تیار رہنا لوگے والے تجھے دیکھنے آ رہے ہیں۔“ ثریا بیگم نے منیہ کو شام کو رشتے کی غرض سے آنے والے مہمانوں کی نوید دی تو منیہ کا چہرہ —

اڑ گیا۔

اس کے چہرے پر تذبذب کے سائے دیکھ کر ثریا بیگم لحظہ بھر کو ٹھٹھکی گئیں۔

”اب کیا ہوا ہے تجھے؟“ ثریا بیگم کی آواز میں دبا دیا سا طیش تھا۔

”میں سوچ رہی ہوں کہ اب کی بار فریدہ کو بھیج دیں مہمانوں کے سامنے۔“

منیہ نے ہمت کر کے کہہ تو دیا مگر ثریا بیگم کا غصے سے برا حال ہو گیا۔

”منحوس ماری! کیا ساری زندگی ماں کے سینے پر مونگ دلتی رہے گی رشتہ ہو تیرا اور جان چھوٹے میری۔“ ثریا بیگم نے اسے کوسنا شروع کیا تو پھر وہ لگاتار بولتی ہی چلی گئیں۔

”یہ تیری شکل پر بارہا بچتے دیکھ کر لوگ رشتہ سے ہی انکار کر جاتے ہیں۔ نحوست ماری، مجھے تو کبھی یقین ہی نہیں آتا کہ تو بھی میری ہی اولاد ہے۔“

منیہ کے رگد پے میں ملال سرایت کر گیا تھا۔ ماں کے الفاظ کسی تازیانے سے کم نہ تھے۔ زمانے کی نگاہوں کا مسخروہ ہی کیا کم تھا کہ اپنی ماں نے بھی اسے ہی مجرم قرار دے ڈالا تھا۔

”ہائے ری قسمت! کہاں تو میری خوب صورتی کی دھوم پورے محلے میں تھی اور کہاں تیری یہ بسوری صورت۔“ ثریا بیگم کو اپنے ماضی کی یاد آتے ہی ملال نے گھیر لیا تھا۔

”کیا ہوا ماں۔“ فریدہ جو ابھی کچن سے برتنوں کا ڈھیر دھو کر فاسد ہوئی تھی شور سن کر کمرے میں آ گئی۔ دوپٹے کے پلو سے وہ اپنے ہاتھ خشک کرتے ہوئے ماں کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ رہی تھی، وہیں منیہ کا پر ملال چہرہ بھی سامنے تھا۔

”ہونا کیا ہے،“ نواب زاوی رشتے والوں کے سامنے جانے سے انکاری ہے۔“ ثریا بیگم کا اشتعال کسی طور

کیس تو کنار المٹا ہی تھا۔ منیہ کی بات پر انہیں شدید غم
وغصے نے اپنی پلیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ تو اس لگائے
بیٹھی تھیں کہ آج یہ رشتہ طے ہو جائے گا۔

بڑی مشکل سے منت سماجت کر کے انہوں نے
رشتے والی کو راضی کیا تھا کہ کوئی معقول سارشتہ ڈھونڈ
کر لاؤ۔

اب تو رشتے والی بھی مستحضرانہ انداز میں آنکھیں
مٹکاتے ہوئے کھی کھی کرنے لگی تھی۔

”لائی تو ہوں رشتے اب وہ لوگ پسند ہی نہ کریں تو
میرا کیا دوش؟“

ضبط کا کھونٹ لی کر ثریا بیگم رشتے والی سے اصرار
کرتیں کہ منیہ کے لیے دوبارہ کوئی معقول رشتہ
بتائے۔ منیہ بی اے کر چکی تھی۔ گھر گریہ کی ہر کام
میں طاق تھی۔ کمری سانولی رنگت، دبے دبے سے
نقوش اس پر اس کی شخصیت کا ڈانواں ڈول ہوتا ہوا
اعتماد اس کو مضحکہ خیز بنا دیا کرتا تھا۔

سر جھکا کر بیٹھی وہ عجیب سی لگتی تھی اور رشتے والی
خواتین کن اکھیوں سے اسے دیکھ کر آنکھوں ہی
آنکھوں میں اشارے کرنے لگتیں۔

اور خود منیہ کا اس وقت دل چاہتا تھا کہ وہ بھاگ
جائے کہیں دور اور پھر بھی لیٹ کر واپس نہ آئے۔
اسے یہ ایک امتحان۔ لگتا تھا۔ جنانسور نا اور پھر

نئے سرے سے اس کا وہ چلا کر لوگوں کی مستحضرانہ
نگاہوں کا سامنا کرنا۔ وہ زخمی دل اور زخمی روح لیے ہر
مرتبہ تماشا بننے کے لیے مہمان خانے میں چل دیتی
تھی۔ اور پھر ہر مرتبہ کی طرح وہی سب کچھ دہرایا جاتا
تھا۔ پھر کچے زخموں کو تار تار کر کے لہو رنگ کیا جاتا
تھا۔ پھر ان زخموں پر ہنسی ٹھٹھا کا ترکا لگایا جاتا تھا۔

اب منیہ کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ اس کے
اعصاب مثل ہو چکے تھے۔ اب کسی نئے دکھ کی تاب
لانے کی سکت خود میں نہ پاتی تھی۔

”آپ فکر مت کریں امی۔ میں اسے سمجھا دوں
گی۔ آپ جائیں کیوں اپنا بی بیالی کر رہی ہیں۔“

فریدہ نے معاملہ فہمی اور سمجھ داری کا ثبوت دیتے
ہوئے ماں کو ان کے کمرے میں لے جا کر ٹھنڈا پانی پلایا
اور تسلی اور تشفی دی۔

چاندی کا سا روپ تھا فریدہ کا۔ سرخی بائل سفید
رنگت اور حسن ماں کا چرایا ہوا تھا۔ دلکش نقوش بڑی
سیاہ گھنیری پلکوں کا بھوری آنکھوں پر سایہ لیے
متناسب سر یا مکمل خوب صورتی کا پیکر تھی۔

اور منیہ تو فریدہ کے سامنے آکر اور بھی عام سی لگا
کرتی تھی۔

بھی بھئی منیہ سوچتی۔

”ایسا کیوں ہوتا ہے ایک ہی ماں کی آنکھوں سے جنم
لینے والی دو بہنوں میں اتنا فرق؟ کیا ہوتا اگر دینے والا
محض اسے تھوڑی سی سفید رنگت ہی دے ڈالتا۔
سفید رنگت میں تو بھدے نقوش بھی چھپ جایا
کرتے ہیں۔“

وہ اکثر حسرت بھری نگاہ سے فریدہ کے مرم میں
ہاتھوں کو دیکھتی تو دھیا ابلے چاندی جیسے ہاتھ۔ پھر
اپنے سیاہ ہاتھوں کو دیکھتی۔

آنکھیں بانپوں سے بھر جاتی تھیں۔ اور گلے میں
درد کا ریلا سالانے لگتا تھا۔

فریدہ، منیہ کی اس سوچ سے یکسر بے نیاز رہتی
تھی۔ اسے تو اپنی خوب صورتی کا کوئی خاص احساس
بھی نہ تھا۔ وہ تجوی جانتی تھی کہ ہر نظر اس کے چہرے

پر ٹھہری جاتی ہے۔ اس کے دلکش چہرے کا طواف
کرتے لگتی ہے۔ مگر وہ فطرتاً ہی ایسی تھی۔ مست
ملنگ سی۔

اسے تکبر سے خوف آتا تھا۔ اگرچہ وہ خدا کی مکمل
صناعی کا اعلا نمونہ تھی۔ مگر اسے اس بات کا مطلق
غور نہ تھا۔

اس کے برعکس وہ ہمدرد دل اور نغمسار طبیعت کی
مالک لڑکی تھی۔ اسے اپنی ماں کی فکر اور اپنی بہن کی
حالت کا بخوبی احساس تھا۔ بالآخر فریدہ نے منیہ کو مٹا کر
ہی دم لیا تھا۔ کئی طرح کی تسلیاں دلا سے اور پھر اماں کی

رشتے کی غرض سے کسی اور گھر جانے کے لیے برتوں رہی تھیں۔ جانے والوں کا راستہ روکا تو تھیں جاسکتا۔ وہ بھی لب بستہ نہ گئی تھیں۔



رات کی ٹھنھرتی ہوئی خشکی اب صبح کی لودیتی ہوئی سورج کی پیش کو گھیر لائی تھی۔ ساری رات منیرہ تکیے پر سر رکھے روتی بلکتی تڑپتی رہی۔ خود کو مورد الزام ٹھہراتی رہی۔ وہ اپنی ماں کی خوشیوں میں رکاوٹ تھی۔ اپنی ماں کے لازوال دکھوں کی وجہ تھی۔

صبح معمول کے مطابق اس نے بابا کو دکاں پر جانے سے پہلے ناشتہ تیار کر کے دیا تھا۔ آج فریدہ کا آخری پیپر تھا۔ اس کو ناشتہ کروا کر کالج کے لیے روانہ کیا۔ پھر گھر میں گہری خاموشی چھائی گئی تھی۔ وہ اور ماں ہی تھے گھر میں ماں اپنے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ کل شام سے وہ کمرے سے باہر نہیں آئی تھیں۔

فریدہ نے بتایا تھا کہ ماں کی طبیعت سخت خراب ہے۔ وہ بخوبی وجہ جانتی تھی۔ تب ہی سامنے جانے سے بھی کترا رہی تھی۔ مگر اب ناشتہ تو کروانا ہی تھا ماں کو۔ اس نے ٹرے میں ناشتہ لگایا اور ماں کے کمرے میں ٹرے لیے چلی آئی۔

ماں سر پر کپڑا باندھے لیٹی تھیں۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

”ماں ناشتہ کر لیں۔“ اس نے ٹرے نیبل پر رکھی اور ماں کے سر پہلے بیٹھ گئی۔

ماں نے گہری نگاہ منیرہ کے اواس اور پرطلال چہرے پر ڈالی۔ ان کا کلیجہ جیسے کٹ کر رہ گیا تھا۔

یہ بیٹوں والی مائیں کیوں نہیں سوچتی ہیں کہ بیٹیوں کی ماؤں کے دل بھی ہوا کرتے ہیں۔ جب کسی کو اس کے قد کاٹھ، رنگت، چال ڈھال اور نقوش کی بنا پر ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ تو اس کی ماں کے دل پر کتنے کچوکے لگتے ہیں۔ لڑکیاں شیشے کی مانند نازک ہوتی ہیں۔ ان کے دل پر لگنے والی ٹھیں کالج کے فکروں کی مانند انہیں ریزہ ریزہ کر ڈالتی ہے۔

فکر کا احساس منیرہ کے دل میں اجاگر کر دیا۔ اسے راضی کر لیا تھا۔

منیرہ نے فیوزی رنگ کا سوٹ پہنا تھا۔ جو اس کی کالی رنگت کو اور بھی اجاگر کر رہا تھا۔ وہ بے دلی سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی۔

ایک معمر خاتون اور ایک قدرے فربہ مائل نوجوان لڑکی تھیں۔ دونوں نے منیرہ کو گہری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ منیرہ کے ہاتھوں میں ٹرے لرزے لگی تھی۔ اسے لگا کہ وہ لڑکھڑاکر گر جائے گی۔

اس کے ہاتھوں کی لرزش ان خواتین سے بھی پوشیدہ نہ رہی۔ گہری خاموشی فضا میں تنہا سی گئی تھی۔ منیرہ نے کپکپاتے ہاتھوں سے ٹرے کو رکھی اور گھبراہٹی ہوئی نظروں سے ان کی جانب دیکھا تھا۔ معمر خاتون نے ساتھ آنے والی لڑکی کی نگاہوں میں جھانکا، ناگواری کے گہرے سائے دونوں کی نگاہوں میں ہویدہ ہوئے تھے۔ منیرہ کا سر جھک سا گیا تھا۔

مابو کی دہیز کمرے اس کے سر کا زاویہ منہ پہ چھکا ڈالا تھا۔ دونوں خواتین دلی دلی مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرنے لگی تھیں۔

”تو یہ ہے آپ کی بیٹی؟“ لڑکی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ تو ثریا بیگم جیسے ٹرائس سے جا لیں۔

وہ تب سے منیرہ پر ہی نظریں لگائے بیٹھی تھیں۔ انہیں تو اپنی اس بیٹی میں کوئی کمی، کوئی عیب، کوئی

کھوٹ دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ ان کے جسم کا حصہ تھی۔ وہ اسے کیونکر برا کہہ سکتی تھیں۔

”ویسے لگتا نہیں کہ یہ آپ کی اپنی بیٹی ہے۔“ معمر خاتون نے جیسے خطا اٹھایا ہو۔

”جی۔“ ثریا بیگم کے منہ سے بے ساختہ ہی نکلا تھا۔ اچھا، بس اب ہم چلتے ہیں۔ ہمیں جلدی ہے، ابھی ہمیں رشتے کی غرض سے — اور جگہوں پر بھی جانا ہے۔

صاف ظاہر تھا وہ انکار کر کے اپنا دامن جھاڑ کر

کیا کبھی کسی لڑکی کو اس کی قابلیت کم ہونے لگھری
واری نہ آنے اور دین سے دوری کی وجہ سے بھی
ٹھکرایا جاتا ہے؟

جب کہ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تو
فرمان پاک ہے۔

”اس لڑکی سے شادی کرو جو دین دار ہو۔“
لیکن یہ سب تو محض ثریا بیگم کی ذاتی سوچ تھی۔
دوسروں کو ان کی سوچ سے کیا لیتا رہتا۔

”اماں کیا سوچ رہی ہیں۔ انھیں ہنشتہ کر لیں۔ میں
جانتی ہوں آپ نے رات میں بھی کھانا نہیں کھایا
تھا۔“

منیو نے گلوگیر لہجے میں عداوت سے کہا۔
”تو نے کر لیا ہنشتہ؟“ اماں نے اس سے پوچھا تو وہ
نظریں چرا گئی۔

پھر اماں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ پہلا لقمہ بنا کر منیو کے
منہ میں ڈالا تو منیو ہلک ہلک کر رو دی۔ گرم سیال آنسو
خود بخود آہوں اور سسکیوں کا سیلاب لے آئے تھے۔
”اماں! لوگ اتنے بے حس کیوں ہوتے ہیں۔“ وہ
ٹوٹ رہی تھی ماں کے سامنے۔

”بیٹا میں ہرگز مایوس نہیں ہوں۔ میرا رب ہے
نا، تو فکر کا بے کی۔“ وہ ماں تھیں۔ نئے عزم اور
حوصلے کے ساتھ اٹھ بیٹھیں۔ جبکہ منیو نے تو سوچ لیا
تھا اب اس کی شادی کبھی نہیں ہو سکے گی۔ اور وہ ہمیشہ
ماں کے لیے یونہی روگ بنی رہے گی۔



جب ہم سوچتے ہیں ماں کہ ایسا ہو جائے گا تب ہی
ویسا نہیں ہوتا اور وہی ہوتا ہے جو قادر مطلق کی رضا
ہوا کرتی ہے۔

چند دن بعد پھر گھر بھر میں رشتے کی ہوا چلی تھی۔
منیو کو معلوم تھا کہ رشتے کے لینے ہی ہوئی ہے۔
اس نے بے حد فکر مندی سے اپنا پسندیدہ سرخ رنگ
نکالا تھا۔ سیدھی مانگ نکال کر سلیتے سے دوپٹہ سر پر
اوڑھ لیا۔ بے حد اعتماد سے چلتی وہ ڈرائنگ روم میں

آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ہمیشہ کی طرح آج پھر کیا
ڈراما رچایا جائے گا۔

جب انسان کو کسی شے کے کھونے کا ذر ختم ہو جاتا
ہے۔ تو پھر اس کے تمام وسوسے اور اندیشے زائل ہو
جاتے ہیں۔ ایسا ہی آج منیو کے ساتھ تھا۔ وہ سوچ
چکی تھی کہ اس کی زندگی میں لفظ حلائی جیسا باب ہی نہ
تھا۔ منیو نے اعتماد سے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا اور
سلام کیا۔

نوجوان خاتون نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا۔
ثریا بیگم چونک سی گئیں۔ آج تو منیو کے رنگ
ڈھنک ہی نرالے تھے۔ اعتماد کی سرخی چہرے پر چھائی
ہوئی تھی۔

آج تو وہ وہ منیو لگ ہی نہیں رہی تھی جو ذری
سہی گھبراہٹی ہوئی تھی۔ آج وہ سر اٹھا کر آنکھوں میں
آنکھیں ڈالے زمانے کا سامنا کر رہی تھی۔
ذہر حقیقت جب ہم کسی خوف کو پس پشت ڈال کر
اس پر قابو پا لیتے ہیں تو پھر کھوجانے کا شکست کا خوف
جاتا رہتا ہے۔ آج بے حسی کی چادر خود منیو نے اوڑھ
لی تھی۔

”کیا کرتی ہیں آپ؟“ نوجوان خاتون نے سوال
دیا۔

”جی میں بی اے کر چکی ہوں گر بیجویشن کے بعد گھر
میں ہوئی ہوں۔“

یوں لگتا تھا کہ سارے معاملات طے کرنے کی مجاز
ہی نوجوان عورت تھی۔ کیونکہ معر خاتون بالکل چپ
تھیں۔ طائرانہ نظروں سے اطراف کا جائزہ لینے میں محو
تھیں۔

اور کیا مشاغل ہیں آپ کے؟“ ثریا بیگم نے منیو
سے قبل ہی جواب دے ڈالا تھا۔

”مشاء اللہ گھر گھر ہستی میں ماہر ہے میری بیٹی۔ بے
حد سکھ رہے۔ ہر کام سلیتے سے کرتی ہے۔ ذائقہ دار
ہاتھ ہیں میری بیٹی کے۔“
”آف یہ مامیں بھی ماں نجانے کس آس کی ڈور

تھامے زندگی کے کرناک پل بھی کاٹ جاتی ہیں ہنستے مسکراتے۔“

منیرہ نے لمحہ بھر کے لیے ماں کے چہرے پر بکھرے امید کے رنگوں کو دیکھ کر سوچا اور ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی تھی۔

”ماشاء اللہ۔“ معمر خاتون پہلی مرتبہ ہمکلام ہوئی تھیں۔

”میرا نام لینی ہے مجھ سے بڑی زہرہ ہیں اور پھر عادل اور عاقل ہمارا سب سے چھوٹا بھائی ہے۔“

نوجوان خاتون نے تعارف کر دیا تو منیرہ سوچ کر رہ گئی۔ اس تعارف کا مقصد؟؟؟

”ہماری آرزو ہے کہ ہمارے دونوں بھائیوں کی شادی اب ایک ساتھ ہی ملے کر کے اس فرض سے بھی سکدوش ہو جایا جائے۔“ لینی نے مسکرا کر کہا۔

لو تو دونوں بھائیوں کی اکٹھے شادی کرنے کا جواز بنا کر انکار کا طریقہ اپنایا ہے! منیرہ نے بے دلی سے سوچا۔

”کیا آپ کی کوئی اور بھی بیٹی ہے۔“ لینی کے اس اچانک سوال پر ثریا بیگم ہری طرح چونکی تھیں۔

”جی، میں بھی چھوٹی بیٹی، بھی ہے مگر ہم پہلے اپنی بڑی بیٹی کے فرض سے ہی سکدوش ہونا چاہتے ہیں۔“

ثریا بیگم نے بے حد سہاوے سے بات بتائی تھی۔ ثریا بیگم کے چہرے پر گہرے کرب اور افسوس کی ملی جلی کیفیت رخنہ تھی۔ کچھ دیر پہلے چہرے پر بکھرے امید کے رنگ کبیں کھو چکے تھے۔

”آئی پلیز بلا میں تو سنی اس کو۔“ لینی نے بے حد اصرار سے کہا۔ تو ثریا بیگم ہلہولہ کر گئیں۔

”ای! میں فریدہ کو بلا کر لاتی ہوں۔“ اچانک ہی منیرہ بے حد حوصلے اور سکون سے اٹھی، اور ڈرائنگ روم پار کر گئی تھی۔

فریدہ کچن میں برتن سمیٹ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اپنے عقب میں منیرہ کو دیکھ کر اس نے سوال کیا تھا۔

”امی اندر بلا رہی ہیں۔“ منیرہ نے بے حد سکون سے کہا۔

سے کہا۔ فریدہ عام سے حلیے میں بھی بے حد دلکش اور حسین لگ رہی تھی۔ چند لمحوں اس کے گالوں کو چھو کر عجب سی نظارہ دکھلا رہی تھیں۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟“ فریدہ نے استعجاب سے پوچھا تھا۔

”وہی جو تم نے سنا اب خیرے مت کرو جلدی چلو۔ میں ساتھ لے کر ہی جاؤں گی۔“

منیرہ نے قطعیت سے کہا تھا اور فریدہ جو حیرت تھی۔ مگر موقع ایسا تھا کہ انکار بھی نہ کر سکی۔ خاموشی سے بہن کے پیچھے چل دی۔

”یہ آگئی میری بھولی بیٹی۔“

اچانک ثریا بیگم کی آواز میں تقاضا صادر آیا تھا۔ کتنے یقین اور مان سے انہوں نے فریدہ کو متعارف کروایا تھا۔ منیرہ محسوس کیے بغیر نہ سکی تھی۔

”ماشاء اللہ بہت پیاری ہے۔“ معمر خاتون نے عینک ناک پر جلاتے ہوئے بے حد دلچسپی سے فریدہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”اوہر آؤ بیٹی اوہر بیٹھو میرے پاس۔“ انہوں نے فریدہ کو اپنے پلوں میں جگہ دی تو وہ غمگین سہیلی ان کے قریب جھککے ہوئے بیٹھ گئی۔

وہ اس نئی افتاد پر حواس باختہ سی تھی۔ اوہ اس کا یا ملٹ پر حیران بھی تھی۔ اسے اچانک کیوں بلایا گیا؟ کیا انہوں نے منیرہ کو رد کر دیا ہے؟

فریدہ نے بے حد دلگرفتگی سے سوچا تھا۔ اسے بہن سے بے حد محبت تھی۔

”میں اپنے چھوٹے بیٹے عاقل کے لیے فریدہ بے حد پسند آئی ہے۔ آپ یہ رشتہ ہماری طرف سے پکا سمجھیے۔“ اچانک معمر خاتون نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

منیرہ مسکرا دی تھی۔ کسی بھی قسم کا رینج اور ملال اسے محسوس نہ ہوا تھا۔ فریدہ اس کی بہن تھی۔

”اور میرے بڑے بھائی عادل کے لیے منیرہ بالکل ٹھیک رہے گی۔ کیوں امی؟“ لینی نے معمر خاتون سے پوچھا تھا۔ تو معمر خاتون مسکرا دی تھیں۔

”بالکل! یہ دونوں آج سے میری بیٹیاں ہیں، میرے گھر کی رونق ہوں گی۔“ مہر خاتون نے مسکرا کر کہا۔ جہاں ثریا بیگم خوشی سے گنگ رہ گئیں۔ وہیں منیرہ کا منہ بھی حیرت و استعجاب سے کھلا رہ گیا تھا۔ اسے اپنی قوت سماعت پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ کیا وہ بھی قابل قبول بھری تھی؟

پھر باقی کے مراحل بے حد تیزی سے حل ہوتے چلے گئے تھے۔ عادل اور عاقل کو ثریا بیگم اور سجاد صاحب دیکھ کر پسند کر آئے تھے۔ بے حد تعریف کر رہے تھے۔ بے حد سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔ خوب کھاتے پیتے، اخلاق ڈالے۔ سجاد صاحب تعریف کرتے نہ جھکتے تھے۔

”مگر؟“ ثریا بیگم جیسے کچھ کہنا چاہ رہی تھیں، مگر سجاد صاحب نے انہیں گھور کر دیکھا تھا۔ اور وہ سر جھکا کر خاموش رہ گئی تھیں۔

گھر میں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ عادل اور عاقل کے گھر والے بے حد خوش حال لوگ تھے۔ اس لیے ہر شے ہی اعلا اور نفیس تھی۔ منیرہ اور فریدہ دونوں کا لنگا بے حد ذہنی اور کاہلار تھا۔ اماں نے عادل اور عاقل کی تصویریں منیرہ اور فریدہ کو دکھا دی تھیں۔ عادل بے حد وجیہ اور خوب صورت تھے۔ گوری رنگت پر پرکشش نقوش لیے عادل، وجیہ سے تصویر میں مسکرا رہے تھے۔ منیرہ کو تو اپنی خوش بختی پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

وہ سمجھتی تھی کہ ماں کی دعاؤں کو تعبیر مل گئی تھی۔ اب ہر سہ ہواؤں میں اڑتی پھرتی تھی۔ خوشیوں کے کھٹولے میں ہلکورے لیتی ہوئی، ہواؤں کے دوش پر اڑتی ہوئی خوابوں کو حقیقت بننے دیکھ کر بے تحاشا سرشار تھی۔

بارات کے روز منیرہ اور فریدہ دونوں بے حد اچھی لگ رہی تھیں۔ اگرچہ منیرہ کو اپنی گہری سانولی رنگت کا قلق رہا تھا۔ مگر خوشی نے آج کوئی ایسا انوکھا رنگ اس کے چہرے کو بخشتا تھا کہ وہ بے حد مطمئن اور اچھی

لگ رہی تھی۔ اگرچہ فریدہ کی آب و تاب ہی نرالی تھی۔ دلہن بنی فریدہ کی چھب ہی نرالی تھی مگر اب وہ خوش تھی۔ ان سب باتوں سے قطع نظر اس کی سوچ کی پرواز عادل تک جانی ہی نہ تھی۔

رخصتی کا ٹھن مگر صبر آنا وقت آن پہنچا تھا۔ جب دوہرا اور دلہن روز رو جلتے ہیں اور پھر تمام عمر قدم سے قدم ملا کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ منیرہ کو اس پل اچانک بے حد دھچکا لگا تھا۔

یہ کیا؟؟؟ اس نے دلہنا پے کی لالچ مٹا کر قدرے تحیر سے ساتھ چلتے عادل کو دیکھا تھا۔

میروں سیر والی میں بے حد وجیہ صورت عادل کا وجود بیساکھی کے سارے چلتے ہوئے بے حد بھدا لگ رہا تھا۔ ایک ٹانگ سے معذور عادل نے اس کی نظروں میں اٹھتے ہوئے سوالوں کو دیکھ لیا تھا۔ تب ہی اپنی نظریں پھری تھیں۔ اور پھر منیرہ نے پلٹ کر فریدہ کو دیکھا تھا۔ جس کے ہمراہ مکمل اور خوب مردانہ وجاہت کا مالک عاقل اپنے قدموں پر چل رہا تھا۔ اور فریدہ بے حد پرسکون سی تھی۔

منیرہ کے دل میں جھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔ تو کیا تا عمر اسے اپنی سانولی رنگت اور بڑے ہوئے نقوش کی سزا بھگتنی تھی۔ ان کی پاداش میں ایک ایسے شخص کی ہمراہی میں جو مکمل ہی نہ تھا۔ گرم سیال آنسو اس کے گال کو نم کر گیا تھا۔ تب ہی وہ قابل قبول ٹھہری تھی۔ ورنہ آج بھی شاید وہ ہمیشہ کی طرح ماں کی دہلیز کی چوکھٹ پر کسی رشتے کی آس لگاے بیٹھی ہوتی، منیرہ نے بے حد دکھ سے سوچا۔

وہ اپنی قسمت پر شاکر ہو گئی تھی۔ راضی بہ رضای اس کی قسمت کا لکھا تھا۔ جسے اس نے دل سے قبول کر لیا تھا۔ آخر عادل اس کا مجازی خدا تھا۔ کچھ اپنے عیبوں کی پردہ پوشی اور کچھ عادل کے عیب کی پردہ پوشی اس رشتے کی بنیاد بن گئی تھی۔ صبری واحد حل تھا۔ منیرہ نے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔





سب میں شامل ہو مگر سب سے جدا لگتی ہو
 صرف ہم سے نہیں، خود سے بھی جدا لگتی ہو
 آنکھ اٹھتی ہے نہ جھکتی ہے کسی کی خاطر
 سانس چڑھتی ہے نہ رکتی ہے کسی کی خاطر
 جو کسی درد پہ نہ ٹھہرے وہ ہوا لگتی ہو
 زلف لہرائے تو آنچل میں چھپا لیتی ہو
 ہونٹ پھٹنے تو دانتوں میں دبا لیتی ہو
 جو کبھی کھل کے نہ برے وہ گمنا لگتی ہو
 جاگی جاگی نظر آتی ہو نہ سوئی سوئی
 تم جو ہو اپنے خیالات میں کھوئی کھوئی
 کسی مایوس مصور کی دُعا لگتی ہو
 ساحر لدھیانوی
 بے زباں ہم کلام ہوتے ہیں
 خامشی میں پیام ہوتے ہیں
 راز داں مل کے لوٹ لیتے ہیں
 اجنبیوں کے نام ہوتے ہیں
 زیست میں زہر گھولنے والے
 کس قدر خوش کلام ہوتے ہیں
 مسکرا کر نگاہ ڈوب گئی
 اس طرح بھی سلام ہوتے ہیں
 کس قدر خود نظر میں دیوانے
 اجنبی بن کے عام ہوتے ہیں
 شکیب جلالی

روشنی پہلے صبا کے لیے
 بھول روشن کرو خدا کے لیے
 اپنے اندر کرے یقین پیدا
 وہ جو ہم کو پرکھنے آیا ہے
 عشق کی انتہا کے معلوم
 جان کافی ہے ابتدا کے لیے
 کس میں ہمت ہے روکے اس کو
 نیا سورج چمکنے آیا ہے
 ہم کو جن لیے سزا کے لیے
 اس کو دل سے سلام کرتے ہیں
 وہ جو گر کر سنبھلنے آیا ہے
 پار سائی ہے بزودی کا نام
 حوصلہ چاہیے خطا کے لیے
 وقت کے ساتھ دو دیووں کا، هجوم
 ملنے آیا ہے، چلنے آیا ہے
 ہر کسی پر قاتل کیوں آتا
 دل متحاصر ایک دلربا کے لیے
 چاند، سورج، ستارے، پھول، کنول
 خوش ہیں کوئی تو ملنے آیا ہے
 قاتلِ شغائی
 یا سین کنول

حسین سنے

ایک مریض نے ماہر نفسیات سے کہا۔ ”سب سے بڑی مصیبت میرے رگلیں خواب ہیں، میں خواب میں ہمیشہ ایک سی منظر دیکھتا ہوں کہ لڑکیاں اسکول میں ادھر سے ادھر دوڑتی پھرتی ہیں، کچھ کھیل میں مصروف ہو جاتی ہیں اور کچھ ورزش کرنے میں، پھر اچانک اسکول کی گھنٹی بج جاتی ہے اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔“

ماہر نفسیات نے غور سے مریض کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”چھاتو تم چاہتے ہو کہ میں اپنے علاج سے تمہیں یہ خواب دیکھنے سے روک دوں؟“

”ہرگز نہیں۔“ مریض نے سٹٹا کر کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ آپ اسکول کی گھنٹی بجوانا بند کر دیں۔“

آزادی ملتے ہی۔۔۔!

رات کے تین بجے ایک صاحب ایک مکان کے سامنے فٹ پاتھ پر ٹہل رہے تھے۔ پولیس والے انہیں مٹھکوں سمجھ کر گشت کے دوران رک گئے۔ ایک پولیس آفیسر نے پوچھا ”آپ اس وقت کیوں ٹہل رہے ہیں؟“

صاحب مکان کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ ”میں اسی مکان میں رہتا ہوں، میری بیوی میکے گئی ہوئی ہے، آج رات میں دو بجے گھر پہنچا تو پتا چلا کہ گھر کی چابی مجھ سے کہیں کھو گئی ہے۔ اب میں انتظار کر رہا ہوں کہ بیٹوں میں سے کوئی گھر آئے تو اس کے ساتھ میں بھی اندر جاؤں۔“

جواب

استاد نے پوچھا۔ ”اگر تمہارا دوست اور تمہاری گرل فرینڈ سمندر میں ڈوب رہے ہوں تو تم کس کو بچاؤ گے؟“

”ڈوب جانے دو دونوں کینوں کو،“ آخر وہ ایک ساتھ وہاں کر گیا رہے تھے؟ شاکر نے جواب دیا۔

سوا سیر

ریسٹورانٹ میں بیٹھی ہوئی ایک خاتون نے ویٹر کو بلا کر اے سی بند کرنے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ویٹر کو اے سی چلانے کو کہا۔ جب کافی دیر تک اس قسم کی فرمائشیں جاری رہیں تو قریب کی میز پر بیٹھے ہوئے شخص نے ویٹر کو بلا کر کہا۔ ”یہ عورت ہمیں پار پار بلا کر اور احمکتا دے کہ پانچل بتا رہی ہے اس کی باتوں پر دھیان مت دو۔“

ویٹر نے تشکر نہ انداز میں کہا۔ ”ارے صاحب! آپ فکر نہ کریں سپاگل تو میں اسے بتا رہا ہوں، ہمارے پاس اے سی ہی نہیں ہے۔“

گر بہ کشتن

ایک نوجوان کی چند دفتوں بعد شادی ہونے والی تھی۔ اس کے قریبی دوست اسے مشورے دے رہے تھے کہ پہلے ہی دن بیوی پر رعب ڈالنا، اگر پہلے ہی دن بیوی سے ڈر گئے تو تمام عمر زن مہریدی میں گزرنے کی۔ ایک دوست نے ایک ترکیب بتائی کہ گھرے میں ایک عدویلی چھوڑ دینا۔ نئی ٹوبلی دھن بنی سے خوف زدہ ہو جائے گی۔ ایسے میں تم ہی کو مار کر دھن پر رعب بھانا،

”میں اس عرصے میں اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ میری بیوی غائب بھی ہو سکتی ہے۔“

ان صاحب نے جواب دیا۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

عقل مند

نایاب نے راحیل سے پوچھا۔

”سورج زیادہ مفید ہے یا چاند؟“

راحیل نے کہا۔

”سورج ہمیشہ دن کے وقت روشن ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ دن کے وقت روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی اور چاند اندھیری راتوں کو روشن کرتا ہے لہذا چاند ظاہر ہے سورج کی نسبت زیادہ فائدہ مند ہے۔“

مسرت الطاف۔ کراچی

ہزل

کرپشن کرنے والے کم نہ ہوں گے
کل اس کرسی پہ لیکن ہم نہ ہوں گے
تیری شوگر ملیں بڑھتی رہیں گی
میرے بھی کارخانے کم نہ ہوں گے
خدارا اس کو بھی اک باری دے دو
وگرنہ اس کے دھرنے کم نہ ہوں گے
تیری دیکیں خدا رکھے سلامت
حکومت ہے تو ججے کم نہ ہوں گے
کسی دن میں بھکاری ہو رہوں گا
مگر بیکم کے خرچے کم نہ ہوں گے

نسیم شریف

خواب غفلت

سوا ہوا انسان پانی کی چند لونڈوں سے بھی جاگ جاتا ہے لیکن سوئی ہوئی قوم کو جگانے کے لیے لوڈ شیڈنگ کرنی پڑتی ہے۔

(سنہرا قول، فرام واپڈا)

بس سمجھو کہ پھر حیات تمہاری ہوگی۔
شادی والی رات نوجوان نے ایسا ہی کیا کہ کسی طرح ایک بلی بیڈ روم تک پہنچادی۔ جب وہ خود اندر جانے لگا تو پتا چلا کہ دروازہ بند ہے اور اندر سے دھما دھم کی آوازیں آرہی ہیں۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو دلہن صاحبہ ایک ہاتھ میں ڈنڈا سنبھالے اور دوسرے ہاتھ

میں بلی کو دم سے اٹھائے فرماتے لگیں۔
”ارے آپ دیکھیں، اس کم بخت نے مجھے بہت تنگ کیا ہے میں نے سوچا آپ کے آنے سے پہلے اس کا کام تمام کروں۔“

فرق

عاشق نے اپنی محبوبہ کی بد عمدی اور بے وفائی کی دہائی دیتے ہوئے سچ کر کہا۔

”کیا فرق ہے اس میں اور مجھ میں جو تم مجھے نظر انداز کر کے اس سے پیار کی پیٹنگیں بڑھا رہی ہو۔“

محبوبہ نے اس سے بھی تیز آواز میں جواب دیا۔
”اس کے پاس بنگلہ ہے جبکہ تم جھونپڑے میں رہتے ہو۔ اس کے پاس نئے ماڈل کی کار ہے اور تم پیدل خاک چھانتے پھرتے ہو۔ اس کا کروٹوں کا لوہار اور نوکر چاکر ہیں جبکہ تم بے روزگار ہو اور سب سے بڑی خولی یہ ہے کہ تم صرف چپیس برس کے نا تجربہ کار شخص ہو جبکہ وہ ساٹھ برس کا تجربہ کار آدمی ہے۔“

”نا قابل یقین“

ایک صاحب تھانے میں داخل ہوئے اور بولے۔

”سر! میری بیوی غائب ہو گئی ہے۔“

”کب؟“ تھانیدار نے پوچھا۔

”تین مہینے ہو گئے ہیں۔“ ان صاحب نے کہا۔

تھانے دار حیران رہ گیا۔ ”آپ کی بیوی تین مہینے پہلے غائب ہوئی تھی اور آپ اب رپورٹ درج کروا رہے ہیں، اس عرصے میں آپ کیا کرتے رہے ہیں؟“

مکتبہ رحمتیہ کراچی

نسبت زہرا
وہ تیسرا ساتھ گھڑی جبر کا
کیوں ستاتا ہے عادتوں کی طرح
گردیا شاہ
دشمن ہیں نہ رستے کے خاور
عشق لگتا ہے اختیار دی ہے

عیدین زمین
یہ کیوں رک گئے کادواں چلتے چلتے
چلو دیکھتے ہیں نشان چلتے چلتے
زمین کی کوئی بات من کو لگی کہا
جو یوں رک گیا آسمان چلتے چلتے

نذا، قضا
سفر تو شاید کٹ گیا
میں کہ چیوں میں بٹ گیا

نمرہ، اقرا
پیری اودا کی آرزو میں بس ہی فرق تھا
مجھے بس وہ، اسے سارا زمانہ چاہیے تھا
افضل کرامت

بہت کم لوگ واقف ہیں سخن آمار لوگوں سے
کہ جو محسوس ہوتا ہے وہی لکھا نہیں جاتا
موسم، ایمان
ہم اپنے مزاج میں کسی بھی در کے نہ ہو سکے
کسی سے ہم ملے نہیں، کسی سے دل ملا نہیں
سیدہ لوباجا

زمانہ والوں سے چھپ سکونے کے دن نہیں ہیں
اسے یہ کہنا ادا اس ہونے کے دن نہیں ہیں
میں جان سکتی ہوں وصل میں اہل جہد کیا ہے
مگر حقیقت شناس ہونے کے دن نہیں ہیں

اقصی ناصر
ہم ان سے بچ کر جینے تو لگے لیکن
بھر دل کے دھڑکنے کی صدا نہیں آتی
ہما فاروق

میرے شہر میں کوئی شہر یاد آتا ہے
حکم ملا ہے بچے کو محترم کر لوں
ناوید یاسر

یعنی ترتیب کرم کا بھی سلیقہ تھا اسے
اس نے جگر بھی اٹھایا مجھے پاگل کر کے
عظی شفیق

کتے دود نکل گئے رشتے نہاتے نہاتے
خود کو کھو دیا ہم نے اپنوں کو پاتے پاتے
لوگ کہتے ہیں ہم امسکر لے بہت ہیں
اود ہم تنہا گئے دود چھپاتے چھپاتے

ترہنی اشفاق
اک نظر تو نے جو دیکھا تو صدی بیت مچی
عہد کو بس اتنا حساب ماہ و سال آتا ہے
ہلالہ

یہ اود بات بہادرین گریز پا نکلیا
گوئی کہ ہم نے صدقہ بہت اٹا ہے
خدا کیلے کہ تری عمر میں کئے جائیں
وہ دن جو ہم نے میرے بچہ میں گزارا ہے

نوال افضل حمس
شرح فراق، مدح لب مشک کو کریں
عزبت کہے ہیں کس سے تیری گفتگو کریں
یاد آشتنا نہیں کوئی، نگاہیں کس پیام سے
کس دل کے ہلکے نام پر غالی بنو کریں

کراچی



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت
ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جس شخص کی دو پٹیاں چولن ہو جائیں اوروہ ان
سے اس وقت تک اچھا سلوک کرتا رہے جب تک
وہ اس کے ساتھ رہیں یا جب تک وہ ان کے ساتھ
رہے، وہ اسے جنت میں ضرور داخل کریں گی“
(ابن ماجہ)

- قوائد و مسائل:-
- 1۔ ”جب تک وہ اس کے ساتھ رہیں“ کا مطلب
یہ ہے کہ ان کا نکاح ہو جائے تک ان سے اچھا
سلوک کرے۔ ان کی اچھی تربیت کرے، ان کی
جائز ضروریات پوری کرے۔
 - 2۔ ”جب تک وہ ان کے ساتھ رہے“ کا مطلب
یہ ہے کہ اگر ان کا نکاح کرنے سے پہلے فوت ہو
جائے اور اپنی وفات تک ان سے اچھا سلوک
کرتا رہے تو جنت میں داخل ہو جائے گا۔

حکایت رومی،

حضرت شعیب علیہ السلام کے زمانے میں
ایک آدمی اکثر یہ کہتا رہتا تھا۔
”مجھ سے بے شمار گناہ اور جرم سرزد ہوتے رہتے
ہیں۔ اللہ کے کرم سے مجھے کچھ نہیں ہوتا“
حضرت شعیب علیہ السلام نے جب اس کی یہ
باتیں سنیں تو فرمایا۔
”اے بے وقوف! تو مرامِ مستقیم سے ہٹ گیا ہے۔
تیری مثال اُس سیاہ دیگ کی سی ہے جس پر اسی کا رنگ
چھٹا رہتا ہے۔ تیرے قلب پر رنگ کی اتنی تھیں چٹھ
کتنی ہیں کہ مجھے خدا کے بھید دکھائی نہیں دیتے۔ جو بد شعیب

گناہ میں آکر وہ ہوا خدا پر سے اس پر اصرار کرے تو اس کی
عقل پر ناک پڑ جاتی ہے۔ اسے بھی توبہ کی توفیق نہیں
ہوتی۔ یہاں تک کہ اسے گناہ کے کاموں میں لذت ملنے
لگتی ہے۔ وہ شخص گمراہ اعدیے دین ہو جاتا ہے۔ اس
میں حیا اور مذمت کا احساس ہی باقی نہیں رہتا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی یہ باتیں سن کر اس
شخص نے کہا۔
”آپ علیہ السلام نے مجھ کو فرمایا۔ لیکن یہ تو بتائیے
کہ اگر اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کا مواخذہ کرتا ہے تو اس
کی علامت کیا ہے؟“

پھر گناہوں کی علامت سے ارشاد ہوا۔ میں مثلاً العیوب
ہوں، البتہ اس کی گرفت کی ایک واضح علامت یہ ہے
یہ نماز روزے کی پابندی کرتا ہے، زکوٰۃ بھی ادا کرتا
ہے، لمبی لمبی دعائیں بھی مانگتا ہے اور نیک عمل بھی
دکھا دے گئے لیکن اس کی روح کو ان
عبادتوں سے ذرہ برابر بھی لذت نہیں ملتی۔ اس کو کسی
جاہد میں بھی روحانی سکون حاصل نہیں ہوتا۔ اس
کی مثال ایسی ہے جیسے درخت میں اخروٹ تو لگتی
لگے ہوں، مگر ان میں مغز نہ ہو۔

جب اس شخص کو اپنے باطن کا پتا چلا اور اپنی
روحانی بیماری معلوم ہوئی تو وہ بہت حیران و پریشان
ہوا۔
درس حیات:- انسان اس خوش فہمی میں نہ رہے
کہ اس کی بد فعلی اور غلط کاری پر اس کی گرفت نہیں
ہوتی۔ گرفت کا انداز مختلف قسم کا ہوتا ہے۔
(مولانا جلال الدین رومی)

ذنیب وار،

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے سوال کیا۔

امیر المومنین اذنیادار کی آپ کیا تعریف فرمائیں گے؟

آپ نے جواب دیا۔
”ذنیادار بھونکنے والے کتوں کی طرح ہوتا ہے جو ایک دوسرے پر فزائے رہتے ہیں۔ یہ سب دنیادار کی طرح ہوتے ہیں۔ ان میں طاقت و دیگر دوزلوں کو کھاتے ہیں اور بڑے چھوٹوں کو شرب کر جاتے ہیں۔“

دعا کا اثر

حضرت عثمان بن عفان فرماتے ہیں کہ حضرت ابو مسلم خولانی جب بھی گھر میں داخل ہوتے تو سلام کہتے اور گھر کے اندر پہنچ کر اللہ اکبر کہتے اور ان کی بیوی بھی اللہ اکبر کہتی تھی اس کے بعد وہ بیٹھے اپنے جوتے اور جامدہ اتارتے اور پھر ان کی بیوی کھانا لاتی اور وہ کھاتے۔

ایک بار جب حضرت ابو مسلم خولانی اپنے گھر پہنچے سلام کیا تو کوئی جواب نہ ملا۔

گھر میں داخل ہو کر اللہ اکبر کہا، بیوی نے اس کا جواب نہ دیا۔

یہی صبح گھر میں چراغ تک نہیں جلا یا تھا۔ بس وہ ایک جگہ بیٹھی زمین کرید رہی تھی۔

حضرت ابو مسلم خولانی نے بوجھل آج تجھے کیا ہوا؟ تو وہ بول پڑی۔

”میرے شوکر کیا کیا کرتے ہیں اور کہاں کہاں پہنچ گئے ہیں۔ وہ حکومت سے اتنا حامل و دولت مند

انہی جائیداد اور جاگیر لے چکے ہیں جن کے پاس کچھ بھی نہیں تھا وہ بھی شاہانہ زندگی گزار رہے ہیں۔

اور آپ تو بڑے مشہور بزرگ ہیں۔ آپ تو زیادہ لے سکتے ہیں۔ آپ بھی امیر المومنین حضرت معاویہ

کے پاس ہلتے تو میں بھی وہ ہیبت کچھ دیتے۔“

حضرت ابو مسلم خولانی کچھ گے کہ یہ نیکر بیوی ہے۔ سلام مزاج ہے، خود نہیں بول رہی بلکہ کسی

لے آج اس کو روک دیا ہے اور اس کے کان بھر دیے ہیں اور پھر دعا مانگی۔

و یا الہی! جس نے بھی میری بیوی کو روک دیا ہے اسے تو اندھا کر دے۔“

حضرت ابو مسلم خولانی کے گھر ایک عورت آتی تھی جس نے ان کی بیوی کو حضرت امیر معاویہ کی سخاوت کے قصے اور حضرت ابو مسلم کی شان بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔

”میں بھی بہت کچھ حاصل کر سکتی ہو، بس تجاے خلاف سے مطالبہ کر دو کہ وہ بھی حضرت معاویہ نے اپنے لیے کچھ لیں۔“

یہ عورت رات کو اپنے گھر میں کام کر رہی تھی کہ ایک آنکھ میں کچھ معمولی سی تکلیف ہوئی۔ اس نے انھیں مسلیں اور پھر کمر والوں سے کہنے لگی۔ ”چراغ کیوں نہ لگا دیا؟ اسے روشن کرو، میرے گھر والے حیران ہو گئے اور کہنے لگے۔

”چراغ تو بدستور جل رہا ہے۔“

پھر اسے یقین آ گیا کہ اس کی آنکھوں کی روشنی بجلی کی ہے اور وہ مکمل اندھی ہو چکی ہے۔ اگلے دن اسے پتہ چل گیا کہ حضرت ابو مسلم خولانی نے ہی

اندھا ہونے کی بدعا دی تھی۔

پھر تو وہ عورت اکبر حضرت ابو مسلم خولانی کے پاؤں پر چڑھی۔ بڑی روٹی، سیتانی، منت سماجت کرنے لگی اور معافیاں مانگنے لگی۔

اس پر حضرت ابو مسلم خولانی نے اسے معاف کر دیا اور اس کے لیے دعا بھی فرمادی۔ وہ پھر اپنی آنکھوں سے دھیمی واپس اپنے گھر لوٹ آئی۔

منہری باتیں

۱۔ منافق وہ ہے جو اسلام سے محبت کرے اور مسلمانوں سے نفرت۔

۲۔ قائم ذات سے محبت کریں، آپ بھی قائم ہو جائیں گے۔

۳۔ اللہ سے پیار کرنے والو، اللہ کے بندوں سے بھی پیار کرو۔

۴۔ مسلمان، مسلمان کے خلاف جہاد نہیں، ضلالت ہے۔

۵۔ جو کہتا ہے اللہ کہتا ہے اور اللہ جو بھی کرتا ہے، صحیح کرتا ہے۔

(دراصف علی داحف)

نسرین۔ سیکھو پورہ لاہور

بندہ پروردی

ہر اس کا نواب بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔
بادشاہ اس پر مکمل اعتماد کرتا تھا۔ اس نواب کے

خاصی تعداد میں غلام تھے جن کو وہ بیٹوں کی طرح آرام
اور نرب و زینت سے رکھتا تھا۔ ان شاندار نرب و
زینت سے آراستہ غلاموں کی ٹولیاں یا زار میں گشت
کر رہے تھے۔

ایک غریب، مفلس، قلاش شخص جو بیوہ کا اور بنگا
تھا، ان کو دیکھ کر لوگوں سے پوچھنے لگا۔
”یہ رئیس زادے کون ہیں؟“

جواب دینے والے نے کہا: ”یہ ہمارے اس علاقے
کے نواب کے جاگزیں ہیں۔
وہ یہی کہ خیران رہ گیا اور آسمان کی طرف منہ کر
کے کہنے لگا۔

”اے اللہ! اپنے اس بندے کو دیکھ کہ سردی کے
مارے اس کے دانت بچ رہے ہیں اور بھوک اس
بڑا حال ہو گیا ہے۔ اور اس علاقے کے نواب بندہ
کو دیکھ کر اس کے غلام کہنے مڑے تازے، بے فکر اور
فارخ البالی سے ادھر ادھر اترتے پھر رہے ہیں۔“

تقدیر بالی سے نواب رئیس کے عروج کا ستارہ
زوال پذیر ہو گیا۔ بادشاہ نے بعض وجوہات کی بنا پر
اس کو قید کروادیا۔ اس کے اموال و املاک کو ضبط کر
لیا۔ اور اس کے وفادار ساتھیوں کو شکنجوں میں پھنسا کر
نواب رئیس کے دھنوں کے متعلق پوچھنے لگا۔ اتنی
تکلیف کے باوجود رئیس کے کسی غلام نے بھی کوئی بات
نہ بتائی۔ یہ سب کچھ اس منہ چھٹ بے فوالے سامنے ہو
رہا تھا۔

بادشاہ نے کہا: ”میں تمہاری زبان اور ہاتھ کٹوا
دوں گا۔“

تمام غلام خاموش رہے۔ اس پر بادشاہ کے
غضب کی آگ اور جھڑک اٹھی اور مسلسل کئی دن
تک ان پر بے جا سختیاں کروا تا رہا لیکن کیا حال
کسی کی زبان نے اپنے مالک کے متعلق کوئی شکوہ
شکایت یا بھید ظاہر کیا ہو۔

یہ مدد ناک منظر دیکھ کر وہ بے فدا شخص بے ہوش

ہو گیا۔ عالم بے ہوشی میں اس نے یہ آواز سنی۔
”اللہ تعالیٰ کو بندہ پروردی کا سبق دینے والے ان
غلاموں کی وفاداری دیکھ اور بندہ دینے کا سبق بھی ان

غلاموں سے سیکھ۔“

فدس حیات: انسان اللہ تعالیٰ کی جنت
سے کبھی بھی واقف نہیں ہو سکتا، لہذا انسان کو اللہ تعالیٰ
کی بارگاہ میں کبھی گستاخی کے الفاظ ادا نہیں کرنے
چاہئیں۔

نعمت انعام

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے زمانے میں ایک
شخص تھا جس کا نام تھا۔ بشر مانی۔ یہ شراب نوشی کا
مادی تھا۔ شراب کی حالت میں ایک دن راستے میں
ایک کاغذ ملا جس پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھی تھی۔
اگرچہ بشر مانی نے اس کی حالت میں تھا مگر اس نے
بڑی عسدت سے اس کاغذ کو اٹھا کر جلدی سے صاف
کیا۔ عطر لگایا، بوسہ دیا۔ اور جا کر گھر میں اپنے
طاق پر ادب سے رکھ دیا۔

اسے صلات کو خواب میں اللہ تبارک و تعالیٰ
کی طرف سے ندادی تھی۔

”اے بشر! تم حالت مدہوشی میں تھے۔ شراب
پیمے ہوئے تھے لیکن تم نے میرا نام ادب سے نشین
سے اٹھا یا عطر لگایا، اور اس کا بوسہ لیا۔ اس وقت
وقت بھی تم مجھ سے غافل نہ تھے۔ تم نے بیاد رکھا۔
اس کے صدمے ہم تم کو آج سے اپنا ولی بناتے ہیں۔
اور تمہاری روح کو جلا کر کرتے ہیں۔“

اس کے بعد بشر مانی نے شراب نوشی اور گناہوں
کی زندگی سے توبہ کر لی اور حق تعالیٰ سے نوازا
درجہ ولایت بر فائز ہو سکے۔



آپ کے خط اور ان کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں
آپ کی عافیت، صحت اور سلامتی کے لیے دعائیں
رب کریم آپ کو ہمیں اور ہمارے پیارے وطن کو
دشمنوں کی سازشوں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

پہلا خط اسلام آباد سے افشین نعیم کا ہے، لکھتی ہیں

نام مثل بہت پسند آیا، میک اپ اور فوٹو گرانی دونوں
ہترین۔ ”جب مجھے سے ناتا“ میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ اس
دفعہ دونوں ہی میں کچھ زیادہ متاثر کن بات نہ تھی۔
ایمانوں میں مصباح علی کا ”میرا راج دلار“ بہترین تحریر
تھی۔ ”میرا راج دلار“ کے نام سے ایک تحریر پہلے بھی
آپ کے پرچے کی زینت بن چکی ہے۔ مصنفہ کا نام مجھے یاد
نہیں ہے۔ کردار یعنی کہ راج دلار کے نام اس کہانی میں
ایاز تھا۔ مزاج بھی دونوں کہانیوں کا ایک جیسا ہے۔ وہ پہلی
کہانی دنوں ہمیں یاد رہی بہت محفوظ ہوئے تھے پڑھ کر۔

یہ راج دلار بھی بہت پسند آیا۔ بہت اچھی تحریر۔ ایسی کم
سے کم ایک کہانی پر ماہ اس پرچے میں ہونی چاہیے جو دونوں
ہنسائی رہے۔ ”تیرگی میں روشنی“ صدف آصف کا افسانہ
پسند آیا۔ مناز نعیم کا افسانہ ”عیدی میں لے کر“ اچھی
کوشش تھی گو کہ مزاج کے معیار پر پورا نہ اتر سکی۔ مکمل
ناول میں سارہ عرفان کا ”شہر محبت کی خیر“ موضوع تو پرانا تھا
ہی۔ ڈائلاگ بھی حد درجہ گھسے ہوئے اختتام حسب
توقع تھا جو شروع کے تین صفحات پڑھ کر ہی اندازہ ہو گیا
تھا۔

سلوی سیف اللہ کا ”سنہری دھوپ“ بہت اچھی قسط
ری۔ کہیں کوئی جھول نہیں تھا۔ ناول میں تاثرات بیان
کرنے کا جو انداز ہے وہ اس کی جان ہے۔ بہت بہترین
انداز میں ہر کردار کے تاثرات بیان ہو رہے ہیں۔ بہت
ایتھے۔ ام طیفور کا ”پاپلن کی رت“ کیا کہنے؟ اس
تحریر نے تو ایسا اپنے تحریر میں جکڑا کہ ارد گرد سے بیگانہ ہو کر
پڑھتے رہے۔ ہوش تو تباہ آیا جب ”باقی آئندہ“ لکھا
دیکھا۔ نہ پوچھے صدمے کے مارے کیا حالت ہوئی۔ خدا را
اگلی قسط کے آخر میں باقی آئندہ نہ لکھے گا۔ ناولٹ میں
مقدس مشعل کا ”تاتائین تھا“ پسند آیا مگر اس تحریر میں
ایک سی کردار کا متضاد رویہ کچھ ہضم نہیں ہوا۔ حشر خانو کا
”یہ عید کتنی سعید“ گو موضوع یہاں بھی پرانا تھا۔ پر انداز

خط بھجوانے کے لیے ہوتا

ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔

Email: shuaa@khawateendigest.com

مختلف بھی تھا اور اچھا بھی اس لیے اچھا لگا۔ بندھن میں
زاہد احمد اور مسز زاہد بہت پسند آئے۔ ”خط آپ کے“ تو
میں ضرور پڑھتی ہوں۔ بہت ترس آتا ہے آپ پر جب ہر
دوسرے خط میں پڑھتی ہوں۔ آپ کی امیرا خط ضرور چھاپیے گا
اور خط میں قابل ذکر بات کیا ہوتی ہے بھلا؟

بخ۔ پیاری افشین! آپ کا نامہ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ہم
پر ترس! بہت ہنسی آئی پڑھ کر۔ آپ کے مذکورہ دونوں
افسانے ان شاء اللہ لگ جائیں گے۔ یہ عید کے حوالے
سے تھا۔ اس لیے جلد لگ گیا۔ جناب! آپ کا حکم سر
آنکھوں پر۔ آئندہ ”باقی آئندہ“ کی جگہ لکھیں گے ”باقی
واقعات اگلے شمارے میں ملاحظہ کیجئے“ بس خوش۔ خیر یہ تو
ازراہ تفنن لکھ دیا، اس ماہ ام طیفور کی دوسری اور آخری
قسط شامل ہے۔ پہلے جو آپ نے میرا راج دلار پڑھی
تھی۔ وہ بھی مصباح علی کی ہی تحریر تھی۔ انہوں نے ان ہی
کرداروں پر دوسری کہانی لکھی تھی۔ اُسے آپ سیریز کہہ
سکتی ہیں جیسے ”نثر بخاری“ ”ہم سے زمانہ“ میں جوادی اور

ایک بات نوٹ کر لیں۔ آپ نے دوسرے سلسلوں کے لیے انتخاب ایک ہی کانڈر خط کے ساتھ ہی لکھ دیا ہے۔ آئندہ علیحدہ علیحدہ کانڈر لکھیں۔ البتہ لفاظ ایک ہی استعمال کر سکتی ہیں۔

شبلی کے کرداروں پہ لکھتی ہیں۔

اقصی طیب الرحمن گاؤں مونڈن ضلع ہری پور ہزارہ سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

مسکان پروین منگریو نے لاڈکانہ سے لکھا ہے

آئی میں نے پہلا خط لکھا وہ بھی آپ نے نہیں دیا۔ چلو خیر ایک بات ہے میں آپ سے ناراض نہیں ہو سکتی کیوں کہ آپ میری پیاری آپتی ہیں۔ میں اپنی ڈرائنگ کے بارے میں پوچھوں گی کہ جو میں نے خط میں بھیجی تھی اور اب جو بھیج رہی ہوں اس کے بارے میں اور جو کمائی ہے اس کے بارے میں اس خط میں ضرور بتائیے گا۔

ج۔ پیاری مسکان! چند ایک کو چھوڑ کر آپ کے تمام اسکی چیز بہت اچھے ہیں، مگر آپ سمیت ان تمام ہمنوں سے جو ہمیں اسکی چیز سمجھتی ہیں ہم گزارش ہے کہ زحمت نہ کیا کریں کیوں کہ ہم نے مستقل بنیادوں پر ایک آرٹسٹ کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ کمائی کے لیے معذرت چاہتے ہیں۔ فی الحال مطالعہ پر توجہ دیں۔

منعم ملک نے سندھ منگر سے لکھا ہے

اس بار بھی ابھی شعل ملای نہیں، میں پہلے ہی خط لکھ رہی ہوں کہ کتنے سے رو نہ جائے۔ شعل ہمیشہ اچھا ہی ہوتا ہے۔ پرانی رائٹرز کے ساتھ نئی لکھاریوں کو بھی جگہ ملی ہوتی ہے یہ اچھا ہے مگر کچھ رائٹرز کو پڑھے تو عرصہ ہو چلا۔ میری درخواست ہے کہ پلیز بانی سب کے ساتھ عمارہ خان، میمنہ صدف کے ناول بھی شامل کریں۔ اگر قسط وار ہوں پھر تو کیا ہی بات ہے۔ یہ توئی وی پر مصروف نہیں ہوں گی نال۔ ہمیں شدت سے انتظار ہے ان کے ناولز کا۔ پلیز ان سے ضرور لکھوائیں۔

فرزانہ کھل بہت زبردست لکھ رہی ہیں۔ اتنا خوب صورت کہ بس ایک ہی نشست میں ختم کرنے کو جی چاہتا ہے، مگر رشتے سمجھانے کے معاملے میں مجھے تھوڑی شکایت ہے ان سے۔ کردار بہت ہوتے ہیں اور یہ سمجھا نہیں جاسکتا، یہ چار الجھن کا شکار کرتی ہے۔ ”کماں کا ذکر سفر“ نے ایسا دماغ گھمایا کہ ابھی تک چکر آ رہے ہیں۔ ان کا پہلا ناول ہے جو میں نے چھوڑ دیا ہے ورنہ ان کی تحریروں کا انتظار رہنے لگا ہے۔ بانی سب پر پھر بھی تبصرہ کروں گی اور

ٹائٹل ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ دونوں ماڈلز بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ پر موبائل کچھ پسند نہیں آیا۔ پیارے نبی کی پیاری باتوں سے فیض یاب ہو کر سیدھے پہنچے ”خواب شیشے کا“ تک بہت خوب صورت موضوع، بہت خوب صورت فقرے، جملے، بہت خوب صورت منظر نگاری ہر چیز لا جواب۔ ”شہزاد“ شروع میں در شہوار پہ بہت غصہ آتا تھا، ”اب بہت ترس آتا ہے۔“ ”سنہری دھوپ“ اچھا ناول ہے، لیکن ”جام آرزو“ جیسا ہی لگتا ہے، لیکن پھر بھی اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ سارہ عرفان کا ناول بھی بہت زبردست تھا، پڑھ کر اچھا لگا اور جو سب سے اچھا تھا جس ناول نے شروع میں بہت ہنسایا اور دور درمیان میں مگرایا اور آخر میں جا کر پھر ”ہو رہا کو ترا“ تیرا گوانڈی بن کر آیا ہوں“ نے پھر ہنسایا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ ”عید خوشیوں کی نوید“ سب سے زیادہ شازیہ الطاف کا پڑھ کر اچھا لگا بانی بھی بس ٹھیک ہی تھا اور جو سب سے زیادہ شوق سے پڑھتی ہوں وہ ہے ”جب تجھ سے ٹاٹا جوڑا ہے“ ن۔ ص۔ نے جو بتایا ہے کہ جہاں ان کی

شادی ہوئی، یہ زیادتی تو والدین نے کی ہے۔ لطیفہ پسند نہیں آئے اس کے لیے معذرت۔ آپتی جب میں نے شعل پڑھنا شروع کیا تھا تو میں 9th میں تھی اور آج میں پندرہویں کا امتحان دوں گی۔ یہ صرف اور صرف آپ کی دعاؤں کی وجہ سے ہے۔ پلیز آپتی آپ اگلے ڈائجسٹ میں میرے چھوٹے بھائی کو ضرور کوئی نصیحت کرنا کہ وہ مجھ سے خط پوسٹ کروانے کے کم پیسے لیا کرے۔

ج۔ پیاری اقصی! الطائف پسند نہیں آئے تو معذرت کی کیا بات۔ آئندہ اچھے الطائف منتخب کریں گے تاکہ آپ کو پسند آئیں۔ پرچہ پسند آیا۔ بہت شکریہ۔ ہمیں بھی آپ کے یہ گل بوٹے پسند آئے۔

اور چھوٹے بھائی! تم بھائی ہو، ذرا کیے نہیں ہو جو خدمات کا معاوضہ لیتے ہو۔ ہمارے والد کہتے تھے کہ بھائی پانچ سال کا ہو اور بس پینتیس سال کی ہو۔ تب بھی بھائی بڑا ہوتا ہے۔ کچھ آیا سمجھ میں۔

نام ذہن میں نہیں آرہے۔ ایک میں اور ایک میرا بھائی ان تین رسالوں سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ بیشہ لوگ ہماری زبان سے ”ہمارے رسالے“ کہتا ہوا سنتے ہیں۔ میں نے تیرہ ماہ پہلے افسانے بیچے تھے۔ بھائی نے اتنی چاہ سے لکھوا کے بیچے تھے اور اب ہر ماہ اسی آس پر جاتے ہیں کہ شاید؟ حیران مت ہوں ہمارے لیے یہ پچھوئی سی بات بہت معنی رکھتی ہے۔ ہر دفعہ وہ اتنے مایوس نظر آتے ہیں کہ میں کئی بار پکارا ارادہ کرتی ہوں۔ کچھ بھی ہو جائے شعاع میں اب کچھ نہیں لکھوں گی۔ انہیں اس میٹرک میں بڑھتی لڑکی کی کیا ضرورت؟ آخر ایسے نظر انداز کر کے آپ لوگ کیوں اذیت دے رہے ہیں؟ سچ بتاؤں اگر یقین کر لیں تو کتنی ناولن ایسے ہیں جو لکھے جانے کے لیے چلتے ہیں اور میں ان کو شعاع و خواہش کے دامن میں سلانے کے لیے تھک تھک دیتی ہوں۔ آخر کامیابیوں کا سفر نامہ کامیوں کے جوتے پہن کر کرنا پڑتا ہے شاید۔ مگر کوئی منزل بھی تو ہو؟

ج۔ پیاری منعم! آپ کی ناراضی بجائے اور شکوہ سر آنکھوں پر مگر بھی ہمارے دفتر آئیں تو ہم بھی آپ کو کہانیوں کے انبار تلے دبے ملیں گے۔ پیاری لڑکی! تمہیں اذیت نہیں دے رہے، مگر تم ہماری مصروفیت کا اندازہ نہیں کر سکتیں ”بے مول“ پاری آنے پر لگ جائے گا۔ اب اٹھو اور جن لفظوں کو سلا رہا ہے۔ جھجھوڑ کر چگاؤ اور ہمیں لکھ بھیجو۔

پرچے کی پسندیدگی کے لیے ہماری طرف سے اپنے بھائی کو شکریہ کہہ دیتا۔ کامیابی اور ناکامی تو بعد کی بات ہے مگر انسان کو ناامید نہیں ہونا چاہیے۔

نوال رفیق نے جہلم سے لکھا ہے

”اپنا ڈائجسٹ سب رسالوں کا بادشاہ“ کچھ غلط تو نہیں کہنا تاں۔ میں شروع سے ہی سب سے پہلے افسانے بڑھتی ہوں۔ پھر وقت نکال نکال کر بانی ڈائجسٹ تو جناب آٹ

میں سب سے اوپر چڑھی تھیں مصباح علی۔ ان کی تحریر نے میرا وقت اچھا کر دیا۔ آپنی مجھے ذاتی طور پر گھریلو زندگی میں لکھے گئے ناول بہت پسند ہیں پھر اس میں سارے رشتے بھی ہوں اوپر سے ہماری جیسی نمل کلاس کہانی اپنی اپنی گتی ہے۔

ج۔ پیاری نوال! ہم کو شش کریں گے کہ آپ کی پسند کو سامنے رکھتے ہوئے کہانیوں کا انتخاب کریں۔ مصنفین تک بھی آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ شعاع آپ کو سب رسالوں کا بادشاہ لگتا ہے یہ جان کر خوشی ہوئی۔ یہ اللہ کا کم اور اس کی مہربانی ہے۔

گفت غفار نے کراچی سے لکھا ہے

”پہلی شعاع“ آپ کی پُر خلوص دعا پر دل کی گہرائیوں سے آمین کہا۔ حمد و نعت کی تعریف ہم ناچیز کیا بیان کر سکتے ہیں۔ نور کی کرنیں مدح کو منور کرنے والی مہکتی تحریریں بہت سی بھلی لکھیں۔

”سارے نبی کی پیاری باتیں“ مجھ ناچیز کی اوقات ہی کیا میرے قلم کی جرات ہی کہاں جو پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ کہہ سکیں۔

”بندھن“ زاہد احمد اور آمنہ زاہد سے ملاقات اچھی لگی۔

”تجھ سے ناتا جوڑا“ بڑھا دونوں دفعہ آنکھیں دھندلا گئیں۔ ماضی کی چند باتیں یاد آگئیں۔ ”باتوں سے خوشبو آئے“ سیدہ نسبت زہرا (کی تحریر رسول اللہ اور حضرت امام باقر کی تحریریں۔ آخرت کی پہچان۔ باپ کی خوشنودی۔ باغ جبران کے چند پھول صبر و شکر۔ ساری تحریریں اچھی ہیں۔ ”کھانا کس کی پہن“ فائزہ بجٹی۔ گریشا شاہ فوزیہ۔ مگر عذرا ناصر۔ تھیں ناصر، نجم شام۔ ان کے اشعار اور قطعات اچھے لگے۔

عفت سحر طاہر کو صدمہ

ہماری ہرول عزیز مصنفہ عفت سحر طاہر کی ساس مختصر علالت کے بعد اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئی ہیں۔

اللہ وانا الیہ راجعون

اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

عفت سحر طاہر اس بنا پر ناول ”خواب شیشے کا“ کی قسط بھی نہیں لکھ پائیں۔ آستانہ ماہ ان شاء اللہ آپ قسط پڑھ سکیں گی۔

ج۔ پیاری نکتہ ایک طویل مدت بعد آپ نے یاد کیا، بہت خوش ہوئی، ہمیں یاد ہے کافی عرصہ پہلے آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اتنا عرصہ آپ نے رابطہ نہیں کیا۔ شعلہ کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہوں۔

چوک اعظم سے ناظمہ زیدی نے محفل کو مدوق بخش ہے

شمارہ لیٹ ملا۔ ٹائٹل خوب صورت تھا۔ پیاری باتوں سے مستفید ہوئے اور پھر خوشیوں کی نوید پر پہنچے۔ سروے میں سوالات مختلف تھے اچھا لگا یہ آئیڈیا۔ عندیہ زہرا کا جواب بیسٹ تھا۔ ہندوئن میں دونوں تصویروں میں تضاد تھا۔ کیا یہ ایک ہی جوڑے کی تھیں؟ ”ہاں“ بس ٹھیک تھا۔ دیکھی سلسلہ بننا جا رہا ہے۔ کچھ خوش گوار یادیں بھی ہونی چاہئیں۔

”شہر زاد“ آگے بڑھا۔ ”میرا راج دلار“ مزاحیہ تھا مگر بے مقصد۔ صدف آصف کا افسانہ اچھا لگا سبق آموز تحریر۔ ”تائیفین“ بہت اچھا ناول تھا بیسٹ۔ ممتاز عظیم کا ”عیدی“ اچھا تھا۔ ”شہر محبت“ میں ایشل کی شرازتیں اچھی لگیں۔ ”عمید سعید“ بس ٹھیک ہی تھا روایتی سارینڈ۔ ہیرو شادی کر کے بھی ہیرو۔ ”سنہری دھوپ“ نے نئی کوشل ہے۔ دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ ”افشین عظیم“ ”نیانام“ مگر اچھا اضافہ۔ گلد۔ ”پاپا ملن کی رت“ آغاز اچھا نہیں لگا تھا، مگر قیام پاکستان کے حالات اچھے لگے۔ ”خواب شیشے کا“ آگے بڑھا اور ساتھ ہی ہمارا تجسس بھی۔ شاعری اچھی تھی۔ شرمینہ اکرم کا شعر بیسٹ تھا اشعار میں۔ ”مسکراہٹیں“ سب پرانی، مزہ نہیں آیا۔ ”خوشبو“ بہت اعلیٰ جاک اللہ۔ ”تاریخ“ بہت اچھا زبردست اور شکر یہ بھی کہ میری فرمائش پر آپ نے مسلمان بادشاہوں کے حالات زندگی دیے۔ آخر میں حسب سابق کچھ سوالات۔ ناول یا افسانہ ایروپا ریجیکٹ کرنے کا معیار کیا ہے؟ کیا یہ کسی فرد واحد کی سازش میرا مطلب ہے کاوش ہوتی ہے یا گروپ کی؟ جو کہانیاں آپ ریجیکٹ کر دیتے ہیں وہ کہاں جاتی ہیں؟ پلیز ان سوالات کے جواب ضرور دیجیے گا مجھے بہت بے چینی ہے۔

مجھے دسمبر اور جنوری کا خواتین چاہیے، کیا کسی بہن کے پاس ہے؟ پلیز مجھے بھجوا دیں۔ اور ہاں ایک بات اور۔۔۔ اب میں اپنی کہانیوں اور افسانوں کے بارے میں نہیں

بوچھوں گی۔ صبر شکر کر لیا ہے، ہو سکتا ہے کبھی میرے پوتے، پوتیاں یا نواسے نواسیاں شعلہ یا خواتین پڑھیں تو کہیں ”اے ہاں یہ تو ہماری دادی ہیں۔ ماما نے بتایا تو تھا

کچھ لکھتی لکھاتی تھیں۔ بے چاری اپنی زندگی میں اپنا نام دیکھ لیتیں تو کتنا خوش ہوتیں ”چچ“ افسوس۔“

ج۔ پیاری ناظمہ! آپ کے سوالوں کا جواب تفصیل کا متقاضی ہے کبھی کراچی آئیں تو بلا مشافہ دیں گے۔ کہانی کا انتخاب فرد واحد کی کاوش نہیں ہوتی آپ نے مستقبل کا جو نقشہ کھینچا ہے اسے پڑھ کر کچھ غالب یاد آئے۔

دل کے ہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ آپ خوش گوار یادیں لکھ سببیں، ہم منتظر ہیں۔ کراچی والوں کے بارے میں صحیح سنا ہے۔ آئندہ خیال رکھیے گا اگر ہم بارش ہو گئے تو۔۔۔

رائی حمید کوہاٹ سے لکھتی ہیں

جولائی کا شعلہ ہاتھ میں لیتے ہی پہلی نظر خوب صورت اور پیاری ماڈل پر پڑھی تو موڈ فریش ہو گیا، میں نے پڑھا کہ ہمارے پیارے شعلہ کو اس دنیا میں آئے 32 سال ہو گئے ہیں۔ اس لحاظ سے تو شعلہ مجھ سے صرف 4 سال بڑا ہے، میری طرف سے آپ سب شعلہ کے ادارے سے وابستہ تمام چھوٹے بڑے عزت کے قابل لوگوں کو نہیں میرے اپنوں کو بہت بہت بہت سالگرہ مبارک ہو۔ میں اس خط کے ساتھ ایک خوب صورت سا کارڈ خود اپنے ہاتھوں سے بنا کر بھیج رہی ہوں، حمد و نعت سے آغاز کیا اور مختلف احادیث جس میں محبت کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ مجھے بہت اچھی لگی اور محبت کے بارے میں بہت کچھ جاننے کو ملا۔ مجھے تو اپنے اللہ، رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر اپنے والدین بہن، بھائی سے اور پھر اپنے ملک پاکستان سے ہمارے مظلوم کشمیری بہن، بھائیوں سے دل کی گہرائیوں سے محبت ہے۔ ”ہندوئن“ میں زاہد احمد کا پڑھ کر۔ خوشی ہوئی اور ”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ کہ جو ہماری دونوں قارئین خالائیں ہی کون گی کہ بارے میں پڑھ کر مجھے تو پہلے ہی مردوات سے نفرت تھی اور بھی ہو گئی ہے۔ ”شہر زاد“ کو پڑھ کر تو میرا شک یقین میں بدل گیا کہ یہ بوہڑ زادوں سے ہم زاد صاحب فون پر باتیں کرتے ہیں، یہ ہو نہ ہو ہمارے ہادی صاحب ہی ہیں۔ یہ کیسی محبت ہے جو کہ انسان کو بے عزت ہی کر کے رکھ دے، جس محبت میں

صدف مہرنے محمدیہ کالونی سے لکھا ہے

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔ پندرہ سال سے شعل پڑھ رہی ہوں۔ پہلی بار جون میں ایک خط اور ناول بے سائبان لکھ کر بھیجا تھا۔ ہماری محبت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتی ہیں کہ پچاس روپے میں پورا سوٹ سلائی کر کے مینے کا تین چار سوگاتے ہیں اور ان سے ڈائجسٹ خرید لیتے ہیں۔ شعل اور خواتین پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہمارے نصیب میں بھی کچھ خوشیاں لکھ دی گئی ہوں۔ ہاں مگر کچھ دیر کے لیے کیونکہ پھر اس کے بعد زندگی کی تلخیاں ہم پر حاوی ہو جاتی ہیں اور ہم پھرتے اس بے رحم اور ظالم دنیا میں واپس آ جاتے ہیں۔ ”خواب شیشے کا بہت ہی خوب صورت ناول ہے۔“ سنہری دھوپ“ بھی بہت اچھا ناول ہے۔ رقصم ایک بہت ہی خوب صورت تحریر تھی، لیکن ڈورس کو جلدی ہدایت مل گئی۔

ج۔ پیاری صدف! آپ لوگوں کی یہ محبت اور قدر دانی ہی ہمارا اثاثہ ہے۔ اللہ پاک آپ کی مشکلات کو دور کرے اور آسائیاں عطا فرمائے اور یہ تو بیاں کہ پچاس روپے میں پورا سوٹ؟ یہ تو سراسر زیادتی ہے آپ کے ساتھ اجرت میں اضافہ کریں۔

فوزیہ شمرٹ ہانیہ عمران، آمنہ رئیس گجرات سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

جولائی کا شمار بہت منتوں کے بعد مجھے ملا۔ ٹائٹل دیکھ کر خوب دل کھتا ہوا۔ ماڈل شاید نئی تھی، مگر فوزی ڈریس شاید پچھلی عید کا ہی تھا۔ دوسری ماڈل کے ہاتھ میں موبائل تھا۔ بلیک اسکرین پر اگر عید مبارک لکھ دیا جاتا تو موبائل ہاتھ میں پکڑنے کا کچھ مقصد بھی سمجھ بھی آ جاتا۔ یہ خدا ہماری نگاہ میں آپ سمیت ساری کائنات معصوم اور خوب صورت ہے۔ آپ کے دل میں میرے بارے میں اسنے بیڈ کممنٹس اللہ والیوں رحم کرے میں تے بڑی درویش

عزت نہ ہو وہ محبت جائے بھاڑ میں، مصباح جی کا افسانہ اچھا تھا۔ مہناز جی کا افسانہ ”عمیدی“ میں لے کر اچھے موضوع پر تھا۔ مقدس مشعل جی کے ناولٹ کو پڑھ کر بہت

اچھا لگا، آج کل کے دور میں یہ محبتیں آپ کو کم ہی ملیں گی جو کہ اتنی سادہ اور حوصلے اور صبر پر مشتمل ہیں۔ سحرش بانو جی کا ناولٹ بہ عید کتنی سعد ہے اچھے اور دلچسپ موضوع پر تھا مگر گھر کے رشتے اب کہیں کہیں ہی نظر آتے ہیں۔ گمانی تو اچھی لگ رہی ہے۔ سارہ عرفان صاحبہ کا مکمل ناول شہر محبت کی خیر بردا اچھا اور دلچسپ لگا اور مزہ آیا۔ افشین صاحبہ کا افسانہ میری عید پاکے سنگ میں بڑے اچھے طریقے سے بتایا کہ ہمیں ہر حال میں اپنے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ ام طیفور صاحبہ کا مکمل ناول پڑھ کر تو موڈ ہی فریش ہو گیا بہت زبردست اور دلچسپ ہے ویل ڈن! عفت صاحبہ کا خواب شیشے کا عفت جی نے ناول بڑا زبردست شروع کیا ہوا ہے آج کل کے دور میں تو انسان صرف دنیا ہی کا سوچتا ہے آخرت کا کچھ خیال نہیں کی حال مہما صاحبہ کہ گھر کے بڑوں کا ہے۔ اس ماہ کی مسکرائیں پڑھ کر مزائی آگیا باتوں سے خوشبو آئے پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔

ج۔ پیاری رہی! کارڈ واقعی بہت خوب صورت ہے۔ ڈیزائننگ کا کورس کر لیں کامیاب رہیں گی۔ مروت سے نفرت والی بات ٹھیک نہیں ہے۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، جس طرح سب عورتیں اچھی نہیں ہوتیں اسی طرح سب مرد بھی برے نہیں ہوتے، ویسے بھی اس سلسلہ میں اب تک جو باتیں قارئین نے لکھی ہیں اس میں مردوں سے زیادہ خواتین قصور وار نظر آتی ہیں۔ ساس، بھندیں، بھتیجیاں، دیورائیاں عورتیں ہی ہوتی ہیں۔

میرے خلوص دعاؤں اور کارڈ کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

سانچہ ارتحال

موت زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ امت الصبور کے بہنوئی عبد الواجد خان مختصر علالت کے بعد اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

اللہ وانا الیہ راجعون

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں عبد الواجد خان کو حنت الفروخ میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

شہناز اختر نے لکھا ہے

تین دن ہو گئے۔ امی کہہ رہی ہیں اب لکھ بھی دو۔ کیا لکھوں؟ کوئی تعریف، کوئی تنقید۔ امی کے اصرار کا سبب مصباح علی صاحبہ ہیں کیونکہ امی کی بڑی فحور تھیں۔ راج دلار ادا دیکھتے ہی انہیں پچھلا یاد آگیا۔ قصائی قصائی لگا رہی تھیں پھر حکم صادر کیا۔ ذرا وہ والا ڈھونڈ تو سہی ڈیوٹی بھابی کی گلی وہ پڑھ کے یہ پڑھا اور ایک پیغام دیا ہے۔ ”عمر ایاز بچے کیا ہوا“ تیرے ماں باپ گزر گئے۔ تیری ماسی زندہ ہے اس کے ہاں آجا۔ میں تیری رخصتی کروا دوں اور اصل میرا بھی ایک چھوٹا بھائی ہے اور امی کو ابھی سے یقین ہو گیا ہم اس کے ساتھ کہیں یہ سلوک نہ کریں۔ دن میں کئی بار نصیحتیں کرتی ہیں مجھے تو ڈر ہے کہ دسویں میں ہی اسے بیاہ دیں۔ عیدی میں لے کر جاؤں گی مگر نازیم نے لکھا

ہا ہا۔ کتنا میری فحشیت کو سامنے رکھ کر لکھا۔ یہ بیان تھا میری بھابی صاحبہ کا۔ انہوں نے صاف کہا تمہارے بھائی کی دسویں ڈھونڈنے کی ذمہ داری اگر امی تمہیں سونپتیں تو تم یقیناً یہی کرتیں بلکہ وہ محترم اپنے اپنے گھر میں بڑھے ہو جاتے۔ سہری دھوپ ٹائل کا اشارت بہت اچھا لگا ہے۔ دعا تو بہت ہی بھولی معصومیت بھری تھی۔ آئی کیا سلوکی چلی وہی ہیں جنہوں نے بہت پہلے بھی ایک ٹائل لکھا تھا۔ مجھ سے نانا جوڑا گھر والوں سے نانا توڑگ رہا ہے۔ کیا شادی کے بعد ایسی فصول زندگی ہوتی ہے۔ یہ میرا بیان ہے جب کہ بھابی فوراً ”بولیں توبہ توبہ بالکل بھی نہیں۔ مزے آتے ہی ہاسنگ ہیں۔ وہ بھی اس سلسلے میں حصہ لیتا چاہتی ہیں جواب کیسے لکھتے ہیں، کچھ طریقہ بتائیں۔“

ج۔ پاری شہناز! جرم کماوت ہے کہ کسی کو شادی اور جنگ کا مشورہ نہیں دینا چاہیے مگر آپ کی والدہ نے اتنے خلوص سے آفری ہے تو ان کا پیغام عمر ایاز تک پہنچا دیا ہے۔ ویسے مصباح کی یہ کہانی پڑھ کر ہمارے ذہن میں زرداری صاحب کا ایک انٹرویو آ رہا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ”خدا اسب کچھ بتائے“ مگر چھوٹا بھائی نہ بتائے۔“

بھابی سے کہیں کہ نانا جوڑا کے سوالات پڑھ کر ان کے جواب لکھ کر جس طرح یہ خط بھیجا ہے، اسی طرح بھیج دیں۔ سلوکی بٹ وہی ہیں جنہوں نے دو بھائیوں کی کہانی لکھی تھی۔ ٹائل کا عنوان تھا۔ دل کے رشتے و شوار بہت تھے۔

بندی ہوں۔ پہلی شعلہ کی باتیں ہمار کی پہلی رت کی طرح لگیں۔ خوش کن خوش امید۔ شعلہ کے اسلامی سلسلے مطلب حمد باری تعالیٰ اور پیرائے نبی کی پیاری باتیں سے ذہن و دل شاد کیے۔ عید کی خوشیوں میں سب کی خوشیاں پھر مسرت لگیں۔ بندھن میں زاہد احمد اور آمنہ زاہد کا بندھن اچھا لگا، مگر دونوں تصویروں میں اتنا تضاد کیوں؟ جب مجھ سے نانا جوڑا یہ تصویر والا آئیڈیا بہت اچھا لگا۔ ویسے ساس اور نند کو کب موقع دے رہی ہیں۔ ”خواب شیخ کا“ سیلی بوجھ پہلی۔ اس معاملے میں ہمیشہ صفر بنا صفر ہی ملاء عفت صاحبہ بھی ہمارے ساتھ ہی کھیل کھیل رہی ہیں۔ میرے خیال میں ہر ٹائل کو بس ایک سال میں پورا ہونا چاہیے۔ کھل ٹائل تینوں کے تینوں اچھے لگے۔ سہری دھوپ میں رابعہ احمد کچھ اچھا نہیں کر رہیں۔ دعا اور حمید کے ساتھ۔ شرمجبت کی تیر۔ سپر ہٹ محرر تھی۔ ”پیارے گلی کی رت“ اس طرح فوراً ایک بار پھر ہمارے دلوں میں چھا گئیں۔ شروع کی محرر اتنی مزاحیہ ہر جملے پہ ہنس ہنس کے برا حال تھا۔ تحرش بانو کی یہ عید کتنی سید ہے عید کے حوالے سے اچھی لگی، ہیر و ہیر و دن دونوں کی ٹوک جھوک بہت مزے کی تھی۔ اتنا یقین تھا ان اتنی مستقل مزاجی۔ افسانے عید کے حوالے سے سب ہی اچھے لگے۔ مصباح علی کا میرا راج دلار انہیں ہنس کے برا حال۔ ”ٹائلوں سے خوشبو آئے“ ہر ماہ ایک نیا قصہ پڑھنے کو ملتا ہے جو کہ اچھا لگتا ہے۔ عید کی شاعری اس بار کچھ خاص نہ تھی۔ موسم کے پکوان۔ ہائے شیر خوار، اس ملائی کچھ نہ پوچھیں یہ عید کیسی گزری، دل کرتا ہے یا تو ہر کھلا دیں یا گراچی کا سمندر پاس ہو تو ڈوب مو۔ میں نے تو کسی کو عید مبارک بھی نہیں کہا اور نہ کسی کی مبارک کا جواب دیا ہے۔ آج کے خط اس بار تو آپ نے خوب شگوفے چھوڑے ہیں۔ قسم سے اتنا پورا اشعار پڑھ کر مزہ نہیں آتا جتنا آپ کی اس چار صفحوں کی محفل میں آیا۔

ج۔ پاری فوزیہ! میٹھی عید پر کھٹا دل۔ واہ کیا بات ہے۔ ماڈل نے بہت برا مانا ہے۔ آپ نے اس کے نئے سوٹ کی توجہ نہ کی۔ موبائل ہاتھ میں پکڑنے کا کافی زمانہ ایک ہی مقصد ہے کہ سب دیکھ لیں ہمارے پاس کتنا مگنا موبائل ہے تو پچھاری ماڈل کا کیا تصور کہ وہ شو بھی نہ مارے ہمارے دل میں آپ کی کتنی محبت ہے مکاش دل چیر کے دکھا سکتے ہمارے گمنام بیڈ نہیں

زارا، مہوش ڈوگر نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے

عید سے متعلق سروسے پڑھ کر مزہ آگیا۔ گزری ہوئی عید کا مزہ دوبالا ہو گیا۔ اسکے بعد زابد احمد کا انٹرویو اچھا تھا۔ دونوں تصاویر کو دیکھ کر تبدیلی کے معنی سمجھ میں آئے۔ ”جب تجھ سے ناٹا جوڑا ہے“ یہ سلسلہ مجھے بہت پسند ہے۔ صائمہ اکرم جب بھی آتی ہیں کچھ اچھا ہی پڑھنے کو ملتا ہے۔ شہزاد بہترین کاوش۔ ”خواب شیشے کا“ جب شروع ہوا تھا تو ابوریح سا گھیلو ناول لگا تھا، مگر اب یہ دلچسپ سے دلچسپ تر ہوتا جا رہا ہے۔ مکمل ناول ”سنہری دھوپ“ عمر اور اس کے چچا کا کردار ایک آنکھ نہ بھایا۔ ”پیا ملن کی رت“ ام طیفور کا ناول دلچسپ انداز میں شروعات بہترین منظر نگاری ہے۔ حد پسند آیا اور کرداروں میں کے ماضی کا حال جان کر ناول میں دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ برکت

اللہ گھر کے مکین اور پنجابی مزہ دے گی۔ سارہ عرفان کا ”شہر محبت کی خیر“ ہلکی پھلکی خیر اچھی لگی۔ ٹاؤٹ دونوں ہی معمول کے مطابق کمائیاں نہیں۔ نیا پن محسوس نہ ہوا۔ افسانوں میں میرا راج دلار اور پیا کے رنگ پسند آئے۔ ”عمیدی میں لے کر جاؤں گی“ ممتاز نعیم کا ناول کافی عام تھا کہ اب سب محسوس بک چارم پرانا ہو گیا۔ ”تیرگی میں روشنی“ صدق آصف کا بہت عام ہی کہانی۔ اس ماہ شارے کی جان سلسلے وار کمائیاں نہیں بلکہ تمام مستقل سلسلے بھی اچھے تھے۔ آئی میری درخواست ہے ہر ماہ کم از کم ایک ہلکی پھلکی زمزماع کہانی ضرور شائع کی جائے۔ زندگی کی حقیقتیں اپنی جگہ یہ تحاریر پڑھ کر کچھ دیر کو ہی ساری تلخیاں بھول جاتے ہیں۔

ج۔ پیاری زار! اکوشش تو ہماری بھی یہی ہوتی ہے کہ ہر ماہ ایک مزاحیہ تحریر ضرور شامل ہو، مگر ہماری مصنفات خاص طور پر نئی لکھنے والیاں دینی، فلسفیانہ اور جنگلک موضوع کا انتخاب کرتی ہیں اس لیے ہم بھی آپ کی طرح

سوچ کر رہ جاتے ہیں۔ ویسے غلصانہ مشورہ ہے کہ آج کل وزرا کے بیانات اور انٹرویوز کے مطالبات پڑھیں، ان شاء اللہ مزاحیہ تحریروں کی کمی کا احساس نہیں رہے گا۔ شعلے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف پہنچائی جا رہی ہے۔

ہاجرہ عمر لاہور سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

بہت سارے کاموں کے دوران شعلے سے رشتہ نہیں ٹوٹا، بہت بھلا لگتا ہے۔ جب میاں ہاتھ میں تھما کر یہ کہیں کہ لو تمہارا پیٹرول آگیا۔ سروس پر چاند دیکھتی دو سہیلیاں عید کا احساس جاگا تو آئین کا ٹائٹل بے حد اچھا لگتا ہے ایک شرم لحاظ والی چیز شکر ہے آپ کے ادارے نے آج تک بخوبی قائم کر رکھی ہے۔ کٹ دیکھی۔ کئی نئی لکھاری موجود تھیں۔ ادارے میں ضرور پڑھتی ہوں اس میں ایسا لگتا ہے جیسے آپ مجھ سے حالات حاضرہ پر مخاطب ہوں۔ پھر حمد و نعت سے سرشار ہو کر خود کو قصوں میں گم کیا۔ ”خواب شیشے کا“ شہزاد“ کچھ متاثر نہیں کر رہا۔ ”پیا ملن کی رت“ آئی۔ ”ام طیفور کا واہ جی واہ ایلی“ نیا نیا چاچی۔ اور پانی رشتوں کا بنگامہ پورافن گامہ لگا۔ جملوں کی تکرار اور طوالت کے باوجود پسند آیا۔ سنہری دھوپ سلوی بٹ کا اچھا لگا۔ یہ عید مکتی سعید ہے۔ حشرش بانو کا واقعی بہت اچھا لگا۔ افسانے اور ادا مصباح علی صاحبہ کیا لکھتی ہیں۔ راج دلار کے کچھ کیوں ہاتھ دھو کر بڑھتی ہیں۔ کچھ سال پہلے اچھا بھلا عمرایاز نے نکاح کر لیا تھا اور ممتاز نعیم کا عیدی میں لے کر جاؤں گی ہا ہا۔ واقعی جو قصہ فیس بک کا لکھا۔ یقین کریں اعتدل بہنا میں بھی عروبہ کی والدہ جیسی ہوں۔ باقی افسانے بھی دل کو بھیلے گئے۔

ج۔ پیاری ہاجرہ! ایڈیٹری کے اصولوں کو رہنے دیں، سیکھ کر کیا کریں گی۔

ہمیں خوشی اس بات کی ہے کہ پرچا آپ باقاعدگی سے

سانچہ ارتحال

شرینہ اکرم کی پیاری والدہ جیلہ بیگم ایک دن کی مختصر علالت کے بعد رضائے الہی سے اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔

ان اللہ وانالہ راجعون

اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی غلطیوں سے درگزر فرمائے۔ (آمین)

آپ سب قارئین سے دعا مغفرت کی التجا ہے۔

پڑھتی ہیں اور آپ کے میاں صاحب آپ سے اس سلسلے میں پورا تعاون کرتے ہیں۔

حرامک نے دہاڑی سے لکھا ہے

گزشتہ چند ماہ سے میں نے ان ڈائجسٹوں کا مطالعہ کرنا معطل کیا ہوا تھا۔ وجہ میرے ایگزائز تھے۔ اب فارغ ہوئی ہوں تو گزشتہ تینوں ماہ کے رسالے پڑھے اور پڑھ کر میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ سلسلے دار ناؤز اور مکمل ناول کے علاوہ کوئی بھی کہانی متاثر نہ کر سکی۔ خاص طور پر ”سمیرا حمید“ کا ناول ”برباہاگ کی مینا“ اور ”میں بنت جیلہ“ بالکل بھی دلچسپ نہیں لگیں۔ برا لگے تو معذرت۔ آپ ہلکی پھلکی اور اچھی اسٹوریز اور مکمل ناول جو دو تین ہوں شائع کیا کریں۔

ج۔ پیاری حرا! آپ کا مسئلہ شعبہ بیوٹی کو دے دیا ہے۔ معذرت کی ضرورت نہیں۔ آپ کی تعریف و تنقید ہی کو پیش نظر رکھ کر پرجا ترتیب دیتے ہیں۔ آپ کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ پرچے میں ہلکی پھلکی کہانیاں بھی شامل ہوتی ہیں لیکن تھوڑا سا ”عم دوراں“ بھی شامل ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ ہماری بہت سی قارئین نے ”میں بنت جیلہ“ کو بہت پسند کیا ہے۔

کراچی سے نسیم کوثر نے شرکت کی ہے لکھا ہے

صائمہ اکرم کی تعریف و توصیف کے لیے تو الفاظ ہی نہیں ہیں۔ صائمہ جب بھی لکھتی ہیں چھا جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور حسین ناول ”شہر محبت کی خیر“ سارہ عرفان نے نہایت عمدہ اور بے حد دلچسپ لکھا ہے اور ایک دلنشین و دلکش ناول یہ عید کتنی سعید ہے، حشر بانو نے تو میلہ لوٹ لیا۔ مقدس مشعل کا ناول بس گوارہ تھا۔ مناز نعیم نے عیدی میں لے کر جاؤں گی مزاحیہ انداز میں لکھا۔

ہنسی مسکراتی تحریر تھی مگر اس کا نام فیس بک ہونا چاہیے تھا ”خواب شیشے کا“ زبردست جارہا ہے۔ سنہری دھوپ بہت اچھا لگ رہا ہے، مگر اسے سازشی ڈراموں جیسا نہیں بننے دیں ورنہ اس کی جاہلیت متاثر ہو جائے گی۔ اس کے

علاوہ باقی تمام سلسلے بھی ٹھیک ٹھاک ہی لگے۔ خالدہ جیلانی سے سخت شکایت ہے۔ نجائے کیوں وہ ہمارے اشعار شامل ہزیم نہیں کرتیں۔

ج۔ پیاری نسیم! خالدہ جیلانی تک آپ کی شکایت پہنچا دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہماری قارئین اشعار یادداشت کے بھروسے پر لکھتی ہیں جس کی بنا پر ان کی صحت مشکوک ہو جاتی ہے۔ زیادہ تر اشعار دو تین ماہ پرانے پرچوں سے ہی نقل کر کے بھجوا دیے جاتے ہیں۔ اس بنا پر شامل نہیں ہو پاتے۔ شعاع آپ کو پسند آیا۔ بہت شکریہ۔

سانہ راؤ نے لودھرا سے لکھا ہے

انٹرویو پسند آیا۔ صائمہ اکرم آپ کی ”شہر زاو“ قسط پڑھ کر بہت مزا آیا۔ عفت آپ کی ”خواب شیشے کا“ بھی ٹھیک تھی۔ اس کے بعد مکمل ناول کو دیکھا۔ ام طیفور آپ اپنے مخصوص انداز تحریر کے باعث سب پر بازی لے گئیں۔ پاملن کی رُت زبردست لگ رہا ہے۔ سارہ عرفان ہماری بھی دعا ہے کہ ”شہر محبت کی خیر ہو“ بابا بابا۔ سلوی جی کا سنہری دھوپ ٹھیک لگا۔ حشر بانو کا ”یہ عید کتنی سعید“ انداز تحریر پسند آیا۔ ”تیرگی میں روشنی“ صدف آصف کا

افسانہ بازی لے گیا۔ انسانی جذبات کی ترجمانی کرتی خوب صورت انداز میں لکھی گئی تحریر۔ ایک بات پوچھنی تھی کہ کیا مناز نعیم اور افشین نعیم بہنیں ہیں۔ بیانی کے سلسلے بھی اچھے رہے۔

ج۔ پیاری سانہ! ہم کبھی بھی کسی بھی قاری بہن کا خط ردی کی نوکری میں نہیں ڈالتے۔ پہلی کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ خط پرچے میں شامل ہو جائے اگر محدود صفحات کی بنا پر شامل نہ ہو سکے تو ہم خط پڑھتے ضرور ہیں۔ اس سلسلے کا بنیادی مقصد آپ کی رائے جاننا ہی ہے۔

شعاع آپ کو پسند آیا یہ جان کر مسرت ہوئی۔ افشین نعیم اور مناز نعیم بہنیں نہیں ہیں۔



اپنے اپنے غرائز، وابستگی اور ادوار غرائز و وابستگی کے تحت شائع ہونے والے پرچوں، مہمانہ شعاع اور مہمانہ کرن میں شائع ہونے والے ہر تحریر کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما ڈرامائی اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طے شدہ استعمال سے پہلے پبلشرس تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ عملی کا حق رکھتا ہے۔

شعل کے ساتھ ساتھ

۱۰

صدف مختار۔ بوسال مصور

نہ ہو مجھے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا جلدی جلدی پرست۔
پھر فوراً اپنے جوتے پہنے بالوں میں پونی باندھی بس
جی تیاری مکمل۔ کہیموں پر فومز وغیرہ کا ہمیں شوق
نہیں۔ اتنے میں ناشتا تیار ہوتا ہے۔ کیا اور پھر خالی
بیگ میں ساری کتابیں ڈال کر ہم اپنی سواری پہ سوار ہو
کر اسکول روانہ۔

1۔ سوال بہت مشکل نہیں لیکن جواب دیتے ہوئے
شرم آ رہی ہے۔ عموماً لڑکیاں کہتی ہیں 15 سال سے
پڑھ رہی ہوں۔ 20 سال سے پڑھ رہی ہوں جبکہ
”ہم“ تو ابھی بچے ہیں۔ اب اس کا مطلب یہ نہیں کہ
ہم دیو بنائے ہاتھ میں فیڈر پکڑے عشوں عشوں
کرتی ٹاک کے ساتھ شعل پڑھتے ہیں۔ ہم نے ابھی
9th کے پیپر دیے ہیں۔ رسالوں کی عادت اپنی
بڑی بہن مریم مختار سے لی۔ وہ منگوائی تھی تو ہم بھی
ورق گردانی کیا کرتے تھے پہلے پہل تو میں فخریہ سب
کو بتاتی تھی کہ آج میں نے 300 لائیں پڑھی ہیں
لیکن سیونٹھ سے ماہانہ پڑھنے شروع کر دیے۔ نہ
صرف شعل بلکہ خواتین۔ اور کرن بھی تقریباً
99-2002 سے لے کر اب تک کے کافی شمارے

اسکول میں ہر پیریڈ انینڈ کرتی ہوں اور مجھے فخر
محسوس ہوتا ہے کہ اللہ نے مجھے مس نصرت صاحبہ
جیسی بہترین کلاس ٹیچر عطا کی ہیں۔ ذہن اور بچوں کو
سمجھنے والی۔ اس کے علاوہ مس منورہ صاحبہ جیسا کوئی
نہیں۔ 6 پیریڈز کے بعد بریک ہوتی ہے جو زیادہ شایا
کے ساتھ گزرتی ہے یا پھر آج کل درحمنہ احمد کے
Tense کے ساتھ پھر 2 پیریڈز ہوتے ہیں اس کے
بعد چھٹی۔

بھی پڑھے ہوئے ہیں۔ میری خالہ سعدیہ اقبال اور
زابدہ خانم بھی بہت باذنق ہیں وہ بھی ہر ماہ منگوائی ہیں۔
اور کافی گھرانوں میں ڈائجسٹ پڑھنے سے روکا جاتا ہے
لیکن میری امی بے حد اچھی ہیں بالکل بھی نہیں
ڈانشتیں۔

2۔ میری صبح کا آغاز جلد ہی ہو جاتا ہے۔ اتنا جلدی
بھی نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی تو یوں ہوتا ہے ہم سو رہے
ہوتے ہیں اور ہماری سواری آجاتی ہے۔ بہر کیف
جھوٹ کی مجھے عادت نہیں ہے بہت کم نماز ادا کر پاتی
ہوں فجر کی۔

تقریباً آدھے گھنٹے میں گھر پہنچ جاتی ہوں۔ کھانا
وغیرہ کھانے کے بعد اگر ہفتہ ہو تو رسالہ پڑھتی ہوں
ورنہ نہیں۔ پھر آرام اس کے بعد چار سے پانچ تین
کتابوں کا کام کرتی ہوں سچا سچ سے چھ دو مشکل کتابوں
کا۔ پھر چھ بجے میرے کزن ہانیہ خالد ایمان فیصل
حفظہ (سرسری) اور کافی بچے لائبہ رباب وغیرہ آتے
ہیں تو ہم کھیلتے ہیں۔ سات بجے نوبت تک تو مکمل
پڑھائی۔ ویسے حقیقی بات ہے میں ایک اچھی
اسٹوڈنٹ ہوں میرا ریکارڈ ہے آج تک سبق کے لیے
نہ تو کھڑی ہوئی ہوں اور نہ ہی ہوں گی اس نئے اسکول
میں۔ رات کو یاد آتا کھانا بھی کھاتی ہوں۔ ٹی وی اچھا
نہیں لگتا لیکن ریلنگ دیکھتی ہوں۔ عشاء کی نماز
کے بعد پھر لکھنے والا کام اور پھر سو جاتی ہوں۔ نیند ویسے
تو بہت جلدی آجاتی ہے لیکن جس دن کوئی غلطی یا برا

سردیوں میں مشکل ترین کام منہ دھونا لگتا ہے جو
ہم کبھی کبھی دھوئے ہیں۔ صرف اور صرف وقت منہ
ہاتھ دھونے پہ لگتا ہے۔ تیار ہونے میں مجھے زیادہ سے
چار پانچ منٹ لگتے ہیں۔ سیتے ذرا یونیفارم استری ہویا

کام کر لوں ہرگز بھی نیند نہیں آتی چنانچہ گریزی کرتی ہوں۔ چیدہ چیدہ حصے بیان کیے ہیں تاکہ آپ لوگ زیادہ پورنہ ہوں۔

3- واقعی کبھی کبھی بہت بہترین تحریریں ہوتی ہیں جو دل و دماغ پر نقش ہو جاتی ہیں جیسا کہ ”ذہنک زہ محبت“ بھی سوچے مجھے تو ایسی کہانیاں پسند ہیں جن کے اینڈ پر کوئی نہ کوئی مرجاتا ہے۔

استغفار! کیا کہا کہ کسی کردار میں مجھے اپنی جھلک دکھائی دی۔ ارے سارے کردار تو بڑے اچھے ہوتے ہیں جبکہ میں نہ تو رنسیٹل ہوں اور نہ ہی اچھی لگی۔ میں تو میٹھی چیز دیکھتی ہوں تو میرا دل چاہتا ہے اڑ کر

جھپٹ لوں۔ ویسے مجھے ”مقید خاک“ کے اختر کا کردار بہت اچھا لگا تھا اور اپنی طرح بھی۔ یعنی ڈھیٹ، زیادہ بولنے والا اور زندہ دل۔

4- ہم تو وہ انا پرست ہیں جو ہمارے بھی کہتے ہیں وہ منزل ہی بد نصیب تھی جو ہمیں پانہ نہ سکی خامیوں کی تو لائن لگتی ہے جبکہ خوبیاں چراغ لے کر دھوڑنے سے ملیں گی۔ ویسے مل جا میں گی تھوڑی بہت۔ خامیاں ناخن کھاتی ہوں۔ فخر قضا کر دیتی ہوں جبکہ میری خالہ اقرا خانم اسپیشلی کہہ چکی ہیں۔ بھانجیوں! فخر کے لیے بھی اٹھا کرو۔ مقابلے بہت کرتی ہوں۔ اسکول میں لڑکیاں کہتی ہیں سڑیل، کھڑوس کیونکہ میں اتنی جلدی کسی سے فری نہیں ہوتی ڈیڑھ سال ہو گیا ہے نئے اسکول میں لیکن مجھے ابھی تک صرف درجنہ احمد اور میمونہ اقبال اچھی لگی ہیں۔ کوئی اچھے سے بات کرے تو بہت اچھے سے کرتی ہوں کوئی بد تمیزی کرے تو بس خیر نہیں ہوتی۔ تاثرات چھپانے ہرگز نہیں آتے۔ میرے منہ سے سب کچھ پتا چل جاتا ہے۔ بانی پھر کبھی سہی۔

خوبیاں : بالکل بھی جھوٹ نہیں بولتی ہوں۔ اپنے حق کے لیے آواز اٹھاتی ہوں۔ مجھے جولوگ اچھے لگتے ہیں ان کے ساتھ بہت مخلص ہوں جیسا کہ میری

ایمی، خالہ اقرا، لڑکیاں، بھائی اسامہ (وہ اصل میں بات یہ ہے کہ دونوں بہن بھائی ہم پیشہ ہیں) رمشا، شیبہ، انیلا، حمنہ اور میمونہ ریاض۔ کپڑوں، جوتوں کا قطعاً شوق نہیں۔ ویسے جن بچوں کے نمبر زیادہ ہوتے ہیں وہ تو بہت اچھے لگتے ہیں۔ یاد آیا! میں چیل (بیوقوف) بھی ہوں۔ دل چاہتا ہے ہر انسان سے کچھ نہ کچھ سیکھوں۔ اب محنتی بھی بن گئی ہوں اگست میں رزلٹ آئے گا تو آپ سب کو نمبر بتاؤں گی ان شاء اللہ۔

5- بارش مجھے اچھی نہیں لگتی۔
6- پسندیدہ لطیفہ :
ٹیچر لڑکوں سے ”وعدہ کرو زندگی میں کبھی شراب اور سگریٹ نہیں پیو گے“

لڑکے ”وعدہ کیا سر! نہیں پیئیں گے“
ٹیچر لڑکیوں کا پیچھا نہیں کرو گے“
لڑکے ”نہیں کریں گے سر! بالکل نہیں کریں گے“
ٹیچر ”وعدہ کرو لڑکیوں کو نہ تو چھیڑو گے اور نہ آوازیں سکو گے“

لڑکے ”وعدہ کیا سر!“
ٹیچر ”آخر میں یہ کہ اپنی زندگی اس وطن پہ قربان کرو گے“
لڑکے ”کردیں گے سر! بالکل کر دیں گے“ ایسی زندگی کا اور کرنا بھی کیا ہے“
پسندیدہ شعر :

غریب شہر تو فاقے سے مرگیا عارف
امیر شہر نے ہیرے سے خود کشی کر لی
نایاب جیلانی کے ”مورے پیا“ سے ایک پسندیدہ ترین لائن۔
”خالی کر دینے والے ہمیشہ خالی رہتے ہیں۔“



خواتین ڈائجسٹ

اگست 2017ء
کے شمارے کی ایک جھلک



- ”حالم“ نمرہ احمد کا ناول،
- ”حسن المآب“ سائرہ رضا کا مکمل ناول،
- ”دشت جنوں“ آمنہ پاض کا مکمل ناول،
- ”حیرۃ انتظار“ سارہ عرفان کا مکمل ناول،
- ”فسانہ مدعگی“ نسیم ناز کا مکمل ناول،
- ”ام ایمان قاضی، میثاء حسن علی اور انیلہ کرن علی
- ”آسید ذاتی، سنیہ عمیر، شازیہ جمال طارق،
- شازیہ لطاف ہاشمی اور سیدہ انتہی کے افسانے،
- ڈراما سیریل سنگ مرمر کی ”دخانی پیش راجا“
- ڈائریکٹر پروڈیوسر اور سنسکر ”نویہ جعفری“ سے باتیں،
- ”کرن کرن روشنی“ احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان
- کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،
- کا ناولٹ،

خواتین ڈائجسٹ کا اگست 2017 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

واصفہ سہیل

کریکٹ

تھا۔ اس لیے کوئی مجھے کھیلنے ہی نہیں دیتا تھا۔
فخر زمان کے بڑے بھائی آصف کہتے ہیں کہ ہم اکثر
کرکٹ کھیلنے پر اس کی پٹائی کر دیا کرتے تھے مگر اس
نے کسی صورت کرکٹ نہیں چھوڑی اور آج اس کی
یہی دھن رنگ لے آئی ہے۔ (واہ دھن ہونو ایسی۔۔)

ضرورت

ارمنا خان نے اپنا ہیرا سائل تبدیل کر لیا ہے۔
ارمنا نے اپنے لمبے اور خوب صورت بال کٹوا کر
چھوٹے کروا لیے ہیں۔ (لوگ اس پر کئی باتیں بنا رہے
ہیں۔ پر کیوں۔۔ بھی؟) ارمنا اس بارے میں کہتی ہیں
گستاخ ”مجھے اپنے چھوٹے بال پسند ہیں۔ انہیں
سنبھالنا آسان ہوتا ہے۔“ (ارمنا! آپ اپنی تو مصروف
نہیں ہیں کہ بال بھی سنبھالنا مشکل ہو؟) لوگ کتنی
باتیں بنائیں، مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ (کرنا بھی
نہیں چاہیے، لیکن عقل کی بات سننے میں کوئی حرج



دھن

مروان کے علاقے کٹلانگ سے تعلق رکھنے والا
دیہاتی بچہ یکایک دنیا کے کرکٹ کے آسمان پر ایک
روشن ستارہ بن کر چمکنے نہیں بلکہ دکنے لگا۔ یہ دیہاتی
بچہ جس نے کلب کرکٹ سے آگے کبھی سوچا بھی نہ
تھا کہ وہ پہنچ پائے گا۔ ”فخر زمان“ ہے۔ جواب فخر
پاکستان ہے۔ چیمپئنز ٹرافی میں اپنے پہلے ایک روزہ
بین الاقوامی کیریئر کا آغاز کرنے والے فخر زمان نے
فائنل میں 106 گیندوں پر 114 رنز بنا کر
پاکستان کو فتح دلا دی اور بھارتی کھلاڑی دھول چاٹتے رہ
گئے۔ (ویسے دھول تو اور بھی بہت سے لوگوں نے چائی
تھی۔)

فخر زمان بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان پر کرکٹ کھیلنے
پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ (ہائیں۔۔ کیا پی سی بی نے
جس۔۔!) وجہ یہ تھی کہ میں سخت گیند سے بہت اچھے رنز
بنانے والا کھلاڑی تھا اور بالرز کی خوب جم کر پٹائی کرتا





بھی نہیں۔) میری زندگی ہے۔ (زندگی تو سب کی اپنی اپنی ہوتی ہے لیکن۔) میرا لباس میری پسند ہے۔

(پہنوجک بھاتا) ایک تعلیم یافتہ (آہم) خود مختار بزنس وومن اور جہاں دیدہ خاتون (آہم۔۔۔ آہم۔۔۔؟) کی حیثیت سے مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں اپنی پسند کے بارے میں وضاحت کروں۔ (ضرورت ہے؟) ارے! دیکھنا تو عوام کو ہی ہوتا ہے۔ میں کیا بلکہ کسی کو بھی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

خواہش

بلال عباس خان کو آپ آج کل ڈراما سیریل رسم دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔ بلال اس سے پہلے متاب اکبر راشدی کی فیملی — فلم میں کام کر چکے ہیں۔ (در اصل یہ فلم متاب اکبر راشدی کی فیملی نے بنائی تھی، یعنی ہدایت کار، موسیقار، پروڈیوسر اور اداکار سب ان کی فیملی کے تھے تو۔۔۔؟) بلال عباس خان کا اس بارے میں کہنا ہے کہ ”فلم کی ناکامی پر افسوس ہے۔“ (کیوں۔۔۔؟) لیکن چار پانچ سالوں میں ہمارے فلم سازوں کو فلم بنانی آجائے گی۔ (مطلب۔۔۔ یعنی۔۔۔ اچھا؟) انہوں نے مزید کہا کہ فی الحال وہ صرف ڈراموں میں کام کر رہے ہیں۔ (کیوں، کیا فلم نہیں ملی؟) مگر وقت آنے پر فلموں میں ضرور کام کریں گے (مطلب فلمیں ملنے پر۔) کیونکہ ہر کوئی چاہتا ہے کہ وہ بھی بڑے بڑے پر جملگا گئے۔ (اور اگر فیوز ہو جائے تو۔۔۔؟)

پریشانی

لیجئے جناب! میرا پھر خبروں میں۔ خبر ہے کہ میرا کے سر (بھئی کیپٹن نوید پرویز کے ابا اور کون؟) راجا خالد پرویز نے میرا کے والد سے ملاقات کی ہے۔ راجا خالد پرویز اس بات پر سخت ناراض ہیں کہ میرا نے شادی کے حوالے سے میڈیا پر پھر بیان دینا شروع کر دیا ہے۔ (ارے میرا کی دھمکیاں۔۔۔ کام آگئیں کیا؟) اسی لیے وہ امریکہ سے پاکستان آئے ہیں۔ (ہیں۔۔۔ اچھا۔۔۔) راجا

کچھ ادھر کچھ ادھر سے

☆ میری سیاسی بصیرت کے مطابق میاں نواز شریف کسی بند کمرے یا بند گلی میں داخل نہیں ہوئے۔ اب بھی ان کے پاس کئی آہنشنز موجود ہیں اور وہ سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت آگے بڑھ رہے ہیں۔ ساڑھے تین دہائیوں پر مشتمل میرا مشاہدہ گواہ ہے کہ میاں نواز شریف نمائند خوش قسمت انسان ہیں۔ وہ مقدر کے سکندر ہیں۔ مشرف کی پھانسی سے انہیں محض مقدر نے بچایا تھا۔ (ن۔۔۔ بخیر۔۔۔ ڈاکٹر صفدر محمود)

درستیکہ

شایدین رشید



شہ روز سبزواری

”کیا حال ہے بر خودار؟“

”جی اللہ کا شکر ہے۔“

”زندگی کیسی گزر رہی ہے؟“

”آپ سب کی دعاؤں سے بہت اچھی۔ بہت

اعلا۔“

”بیٹی اور بیگم سائرہ کیسی ہیں۔ آپ زیادہ مصروف

رہتے ہیں یا بیگم؟“

”جی۔ دونوں بھی ٹھیک ٹھاک ہیں اور ہم دونوں

بی اپنے اپنے کام کے لحاظ سے مصروف رہتے ہیں۔

اس پر ذمہ داریاں کچھ زیادہ ہیں۔ کیونکہ ماشاء اللہ

ہماری بیٹی اپنی مل کے زیادہ قریب ہے۔ تو بس ڈیل

مصروفیات ہیں اس کی۔“

”بھی ایک ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا آپ دونوں

کو؟ اور ایک ساتھ کام کرنے کا تجربہ کیسا رہا؟“

”جی اتفاق بھی ہوا اور تجربہ اچھا بھی رہا۔ سیریل کا

نام ”پشیمان“ تھا جو کہ ماموں سلیم شیخ کی پروڈکشن میں

تھا اور پسند کیا گیا تھا۔ ہم دونوں نے لیڈ رول کیا تھا۔“

”اور والد بہر روز سبزواری کے ساتھ کام کرنے کا

اتفاق ہوا۔ ان کے ساتھ کام کرنا کیسا لگا؟“

”جی۔ نیا“ ”تمنا یاں“ ”کیا تھا اور قبائچہ (والد) کے

بیٹے کا رول کیا تھا۔ بہت مزہ آیا تھا۔“

”ماشاء اللہ پوری فیملی شو بیز سے وابستہ ہے تو کوئی نیا

کام لیتے وقت خود فیصلہ کرتے ہیں یا سب سے مشورہ

کرتے ہیں؟“

”سب سے تو خیر مشورہ نہیں لیتا۔ البتہ اپنی بیگم

سے ضرور مشورہ لیتا ہوں۔ اس کے ساتھ پروجیکٹ

کو ڈسکس بھی کرتا ہوں اور اپنے والد صاحب سے

بھی ضرور مشورہ کرتا ہوں کیونکہ ان کے بغیر تو میرا کوئی

کام مکمل ہی نہیں ہے اور میرے مشورے کے بعد پھر

وہ یہ بھی ضرور کہتے ہیں کہ ہر کام بہت خود اعتمادی کے

ساتھ اور اپنے پر بھروسے کے ساتھ کیا کرو۔“

”اچھا یہ بتائیں کہ جب ساری فیملی تھیماں

وہ خیال سب اکٹھے ہوتے ہیں تو موضوع گفتگو کیا ہوتا

ہے؟“

”ہر طرح کے موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے۔ کون

کیا کر رہا ہے، کس کو مزہ کیا کرنا چاہیے، کس کا ڈرامہ

پیارے بچوں کے لئے

سیرۃ نبوی ﷺ



حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں مشتمل
ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ
خود بھی پڑھنا چاہیں گے اور
اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

قیمت / 250 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

مقبول ہوا ہے۔ فیلڈ سے متعلق تو بات ہوتی ہے مگر
آج کل ”سیاست“ یہ ضرور بحث و مباحثہ ہوتا ہے۔
”چھالے کون کس کی طرف ہوتا ہے؟“
”کوئی کس کی طرف نہیں ہے بلکہ جتنی گفتگو ہوتی
ہے۔ کوئی کسی جماعت کو سپورٹ نہیں کرتا۔“
”کلم میں بیوں کی تنقید سے موڈ خراب تو نہیں
ہوتا؟“

”ارے نہیں۔ ہم آج جو کچھ ہیں وہ اپنے بیوں
کی رہنمائی کی وجہ سے ہی ہیں اور ہماری تربیت اس
انداز میں نہیں کی گئی کہ ہم بلاوجہ بیوں کی بات سے
اختلاف کریں۔ بلکہ ہم تو اپنے بیوں کی بات کو بہت
اہمیت دیتے ہیں۔ ہماری کامیابیاں ہمارے بیوں کے
دم سے ہی تو ہیں۔“

”شہ روزا آپ نے ”نندن اکیڈمی فلم اینڈ میڈیا“
سے اداکاری کی ڈگری حاصل کی۔ کتنی کام آ رہی
ہے۔؟ جب کہ آپ کو اداکاری ورثے میں ملی ہے؟“
”بالکل آپ نے ٹھیک کہا کہ مجھے اداکاری ورثے
میں ملی ہے۔ اس دنیا میں جب آنکھ کھولی تو والد اور
ماہوؤں کو اس فیلڈ میں کام کرتے دیکھا۔ تو ڈگری آپ
کے اندر اداکاری کی صلاحیت تو نہیں ڈال سکتی، البتہ
آپ کو اداکاری کے گز ضرور سیکھا سکتی ہے جدید
ٹیکنالوجی کا استعمال بتایا جاتا ہے، فلموں اور ڈراموں
میں کون سی ٹیکنیک استعمال ہوتی ہے۔ اس کے
بارے میں سب کچھ بتایا جاتا ہے۔ دورانِ تعلیم فلمیں
دکھائی جاتی ہیں۔ معروف ڈائریکٹرز کے انٹرویو دکھائے
جاتے ہیں۔ ڈگری حاصل کر کے تو انسان بہت کچھ
سیکھتا ہے یوں سمجھیں کہ ایک اداکار کو مزید پالش کر دیا
جاتا ہے۔“

”کچھ دیر پہلے سیاست پر بات ہو رہی تھی۔ آپ کا
دل چاہتا ہے کہ سیاست میں آئیں؟“

”ہتے ہوئے“ ارے نہیں۔ میں اداکاری ٹھیک
ہوں۔ اللہ نے جس فیلڈ میں روزی روزگلا باندھ دیا
ہے میں اس پر خوش ہوں۔“

”اس فیلڈ میں ماشاء اللہ بہت کام ہو رہا ہے۔ روز کوئی نہ کوئی آفر ضرور آتی ہے، مگر سب آفرز قابل قبول نہیں ہوتیں اور پھر میں ہر وقت اسکرین پر رہنے کے بجائے سلیکٹو کاموں کو ترجیح دوں گا۔ میرے اسکرین پر کم نظر آنے کی وجہ بھی جی پی ہے۔ جو زیر تکمیل ہیں ان میں ”زرد زانوں کا سویرا“، ”تیری رضا“ اور ”بے گانگی“ شامل ہے۔ سب میں میرے کردار بہت اچھے ہیں۔ اپنے ڈراموں میں مجھے ”دہوانہ“ بہت پسند ہے، ویسے مجھے اپنے سارے ہی سیریز بہت پسند ہیں۔“

”چلیں جی۔ بہت شکریہ بات کرنے کا“ بہت خوش رہو، ان شاء اللہ پھر بات کریں گے۔“

غزالہ جاوید

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے آپ کتنے ہی عرصے کے بعد ملیں، ایسا لگے گا کہ جیسے کل ہی ملاقات ہوئی ہو۔ باتوں میں محبت خلوص، پیار، اپنائیت، دوری کا احساس ہونے ہی نہیں دیتے۔

”جی غزالہ! کیا حال ہے؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”کہاں غائب ہیں؟“

”غائب کہاں ہوتا ہے اسی فیلڈ میں ہیں کام ہو رہا ہے اللہ کا شکر ہے۔“

””معین اختر““ صاحب کی برسی تھی۔ آپ نے ان کے ساتھ بہت کام کیا۔ کیا ان کی فیملی سے ابھی بھی آپ کے تعلقات ہیں؟“

”بالکل ہیں۔ آج بھی جب میں معین اختر کے گھر جاتی ہوں تو اس کے بچے اسی پیار و محبت کے ساتھ بات کرتے ہیں جس طرح وہ اپنے والد کی زندگی میں کرتے تھے۔ معین اختر کے ساتھ میں نے بے شمار

ڈراموں میں کام کیا۔ وہ ایک عظیم انسان اور عظیم فنکار تھے، لوگوں میں پیار و ايمان کا مشن تھا۔ بہت کمی محسوس ہوتی ہے ان کی۔“

”چھاپہ بتائیں کہ ”اداکار“ بڑے اداکار ہوتے ہیں سیاست دان بڑے اداکار ہوتے ہیں؟“

”ہم تو بہت چھوٹے اداکار ہیں۔ ہماری تو اداکاری کا دائرہ بھی بہت محدود ہوتا ہے۔ سیاست دان تو ماشاء اللہ بہت بڑے اداکار ہوتے ہیں۔ ان کا مقابلہ تو ان ہی کے فیلڈ کے لوگ کر سکتے ہیں۔ ان کا ”پلیٹ فارم“ بہت بڑا ہے۔“

”آپ کی ماشاء اللہ اپنی ایک پہچان ہے، مگر پھر بھی جب لوگ کہتے ہیں کہ یہ بہروز سبزواری کا بیٹا ہے تو کیا لگتا ہے؟“

”میں کتنا ہی بڑا آرٹسٹ کیوں نہ بن جاؤں۔ میری پہچان میرے والد ہی رہیں گے اور مجھے فخر ہے اپنے والد سے۔ اس لیے مجھے ہمیشہ یہی سنتا اچھا لگے گا کہ یہ ”بہروز سبزواری“ کے بیٹے ہیں۔“

”آپ سید نور صاحب کی فلم میں کام کر رہے ہیں جو کہ ابھی انڈیپنڈنٹ پروڈکشن ہے۔ سنا ہے آپ نے ان سے خود کام کرنے کی فرمائش کی تھی؟“

”جی سید نور صاحب مجھے بے حد پسند ہیں۔ میرے لیے بہت قابل احترام ہیں۔ میری یہ خواہش تھی کہ ان کے ساتھ کام کروں۔ چنانچہ جب ان کی کل آئی اور انہوں نے مجھے میرے رول کے بارے میں بتایا تو میں نے فوراً ”ہاں“ بھری۔ فلم کا نام ”چین آئے نہ“

”یو ایس اے“ 2015ء ساراش خان کو لیڈ رول میں لیا ہے۔ باقی سینئرز میں منیم بیگ، عتیقہ اوڈھو، مصطفیٰ قریشی اور بہروز سبزواری شامل ہیں اور ہاں ”عادل مراد“ صاحب بھی ہیں۔“

”آپ کا ارادہ ہے پروڈکشن یا ڈائریکشن میں آنے کا؟“

”فی الحال تو میرا سارا فوکس اداکاری کی طرف ہے۔ فیوچر کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ فیوچر میں پروڈکشن کی طرف آؤں۔“

”اب تک کیسے گئے ڈراموں میں بہترین ڈراما کیسے کہیں گے آپ؟ اور انڈیپنڈنٹ پروڈکشن کیا کیا ہے؟“



”بہت سے چینلز کے آجانے سے بہت کام بھی ہو رہا ہے۔ آپ کچھ کہیں گی اس بارے میں؟“
 ”ہاں کام تو بہت ہو رہا ہے اور اچھا برا دونوں طرح کا ہو رہا ہے۔ ہمارے دور میں کام کم ہوتا تھا مگر بہت اچھا اور بہت محنت کے ساتھ ہوتا تھا۔ آج محنت کم اور کام زیادہ ہو رہا ہے۔“

”کتنے سال ہو گئے ہیں آپ کو اس فیلڈ میں؟“
 ”مشاء اللہ سے تقریباً 20، 21 سال ہو گئے ہیں۔ 1996ء میں پہلی بار اقبال لطیف صاحب کی ڈائریکشن میں ڈرامہ سیریز ”ایک رات ایک کہانی“ کے ایک ڈرامے میں کام کیا تھا۔ بس اس کے بعد پھر آفرز آنا شروع ہو گئیں اور سلسلہ چل نکلا۔“
 ”اقبال لطیف صاحب نے ہی متعارف کرایا آپ کو؟“

کوئی رکاوٹ نہیں تھی مگر انہیں یہ فیلڈ پسند ہی نہیں ہے۔“
 ”شوہر کے بعد بچوں کی ساری ذمہ داری آپ پر آگئی۔ مشکل تو ہوتی ہوگی۔ آپ ایک خوش مزاج خاتون ہیں۔ مزاج میں بھی فرق آیا ہوگا۔“

”ظاہر ہے بچوں کی پرورش والدین کی ہی ذمہ داری ہوتی ہے۔ پھر اللہ نے یہ ذمہ داری مجھ پر ڈال دی اور میں نے تن تھا اسے نبھایا۔ شکر اللہ نے بہت دی۔ اور ایسے حالات ہوں تو مزاج چیز پڑا تو ہو جاتا ہے۔ مگر یہ قدرتی بات ہے کہ مجھے غصہ بہت کم آتا ہے۔ کوئی بات ایک شریمر پر پہنچ جائے تب غصہ آتا ہے ورنہ نہیں۔“

”آج کل جو نئے لوگ اس فیلڈ میں آرہے ہیں ان کے کام سے آپ مطمئن ہیں۔“
 ”ہاں۔۔۔ جو بچے یہ سوچ کر آتے ہیں کہ ہم نے آہستہ آہستہ محنت کے ساتھ اپنا مقام بنانا ہے، وہ واقعی اچھا کام کر رہے ہیں اور جو بچے شارٹ کٹ ڈھونڈ رہے ہیں وہ پھر کام بھی ایسا ہی کر رہے ہیں۔“

”جی۔۔۔ جی۔۔۔ انہوں نے ہی متعارف کرایا اور پہلا، دوسرا اور دیگر کئی ڈرامے میں نے ان کی پروڈکشن اور ڈائریکشن میں کیے پھر میں نے اس فیلڈ میں گھپ دیا بلکہ تقریباً ”چھوڑی دیا۔“
 ”کبھی؟“

”مجھے کچھ خاص مزہ نہیں آرہا تھا۔ اس لیے چھوڑ دیا۔“
 ”مزہ کیوں نہیں آرہا تھا؟ شہرت کا تو نشہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ بے شک شہرت کا نشہ کچھ اور ہوتا ہے۔ مگر سچ پوچھو تو مجھے شوق ہی نہیں تھا کام کرنے کا۔“
 ”پھر واپسی کیسے ہوئی؟“

”اس کا سہرا بھی معین اختر کے سر ہی جاتا ہے۔ ان کا فون آیا کہ آپ تو اچھی پرفارمر ہیں، کام کیوں چھوڑ دیا۔ بس انہوں نے بہت زیادہ فورس کیا تو میں نے ہاں بھری۔ اور ان کے ساتھ میرا ”سچ سچ“ بہت مقبول ہوا۔“

”بچے اس فیلڈ میں کیوں نہیں آئے؟“
 ”میرے بچوں کو اس فیلڈ سے دلچسپی نہیں ہے۔ میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ میری طرف سے تو

موسم کے پکوان

خالد جیلانی

چکن سینڈوچز

ضروری اشیاء :

مرغی کا گوشت (بون لیس) آدھا کلو

(اہل کربار ایک ریٹھ کریں)

آدھ کلو پنسن پیسٹ

1 کھانے کا چمچ

2 عدد (بے ہوئے)

1 عدد

پیاز (درمیانی باریک کٹی ہوئی)

1 عدد

گاجر (باریک کٹی ہوئی)

لیمونس کارس

نمک

انڈے

سیاہ مرچ پاؤڈر

ہر اوضیا

(باریک لٹا ہوا)

ہری مرچیں

لمحن

بریڈ سلائسز

کھن

ترکیب :

ایک پہلے میں گوشت کے ریٹھ لے لے ہوئے آلو

اور انڈے ڈال کر خوب اچھی طرح نمک کریں۔

اس کے بعد پنسن اور ک پیسٹ، لیمونس کارس،

نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، ہر اوضیا، ہری مرچیں، پیاز، گاجر

اور مکھن شامل کریں۔

بریڈ سلائس کو عین کی مدد سے تیل کر چنے اور ہموار

کریں اور ہر ایک پر تیار شدہ آمیزہ اتنی مقدار میں

رکھیں کہ دوسرا بریڈ سلائس رکھ کر دبائیں۔ کنارے

سے سلائسز کو دبائیں تاکہ آمیزہ باہر نہ گرے۔

ایک کڑاہی میں درمیانی آگ پر کھی گرم کر کے

سینڈوچز کو ہلکی آگ پر ٹیپ فرمائی کریں اور سنہرے

ہونے پر نکال لیں۔

مزید ارچکن سینڈوچز تیار ہیں۔ چلی گارلک سوس

کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

چکن اچاری جل فریزی

ضروری اشیاء :

چکن (چھوٹی بوٹی) آدھا کلو

3 عدد

پیاز (باریک کاٹ لیں)

نمک

3 عدد

نمک (باریک کاٹ لیں)

سرخ مرچ پاؤڈر

1 چائے کا چمچ

3 عدد

آدھا چائے کا چمچ

4 عدد

ہلدی پاؤڈر

آدھا چائے کا چمچ

1 کھانے کا چمچ

1 چائے کا چمچ

2 کھانے کے چمچ

3 کھانے کے چمچ

2 کھانے کے چمچ

آدھا کپ

تیل

ترکیب :

چکن اہل لیں۔ تیل گرم کر کے چکن، پنسن،

ادورک پیسٹ نمک، سرخ مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، گرم مسالا پاؤڈر، مسٹرڈ پاؤڈر، سفید مرچ پاؤڈر، سرکہ، فوسٹر ساس، نمٹائو کیچپ ڈال کر فرنی کر لیں۔ آدھا کپ پانی ڈال کر پکائیں۔ آخر میں پیاز، نمٹائو، شملہ مرچ، ہری مرچیں ڈال کر 2 منٹ دم پر رکھیں اور ڈش میں نکال کر چاول یا روٹی کے ساتھ پیش کریں۔

آلو انڈے کی بریانی

ضروری اشیاء :
انڈے

آلو (چھوٹے)

چاول

پیاز

ٹہسن، ادورک پیسٹ

ہری مرچیں

نمٹائو (قٹے کاٹ لیں)

دہی

ہر اودھیا (باریک کاٹ لیں) آدھا کھی

لیموں (ٹکڑے کاٹ لیں) 1 عدد

زرد رنگ

دودھ

نمک

بادیان کا پھول

ثابت گرم مسالا

بریانی مسالا

تیل

ترکیب :

انڈے ابل کر چھیل لیں۔ چاول میں نمک، بادیان کے پھول اور ثابت گرم مسالا ڈال کر 2 منٹ چاول ابل کر رکھ لیں۔ دہی میں تیل گرم کر کے پیاز سنہری کریں۔ اس میں ٹہسن، ادورک پیسٹ، ہری مرچیں اور بریانی مسالا ڈال کر بھون لیں اور آلو ڈال دیں۔ آلو ڈالنے کے کچھ دیر بعد نمٹائو اور دہی شامل کر دیں۔ جب دہی اور نمٹائو کاپانی خشک ہو جائے تو بھون کر اتار لیں۔ ایک دہی میں پہلے چاول کی تہہ لگائیں اس پہ آلو

کاسائن اور انڈے ڈالیں اس کے اوپر لیموں، نمٹائو کے قٹے اور ہر اودھیا چھڑک دیں۔ دوبارہ چاول کی تہہ لگا دیں۔ آخر میں دودھ میں زرد رنگ گھول کر اس پہ چھڑک دیں اور دم پر رکھ دیں۔ اچھی طرح مل کر کے سرونگ ڈش میں نکال کر راتھے کے ساتھ گرم گرم انڈے آلو کی بریانی پیش کریں۔

میوہ بھری پوریاں

ضروری اشیاء :

میوہ

دودھ

سوجی

تیل

پوری میں بھرنے کے لیے :

بادام

پتے

ناریل (کدو کش کیا ہوا)

کرکشمش

چینی

ترکیب :

1- ایک بڑے پیالے میں دودھ اور سوچی بھگو کر رکھ دیں۔ جب سوچی دودھ میں اچھی طرح بھیک جائے تو میوہ چھان کر سوچی میں ملا دیں اور کھی ملاتے ہوئے سخت آٹا گوندھ لیں کچھ دیر فریق میں رکھ دیں۔
2- ایک برتن میں کھی ڈال کر پتے، بادام مل کر نکال لیں 10 منٹ بعد تلے ہوئے پتے، بادام میں ناریل اور کرکشمش میں ملا دیں۔ ساتھ چینی بھی شامل کر دیں۔ میوہ جو گوندھ کر رکھا تھا اس کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنائیں اور D شیب کا سانچہ بازار میں آسانی سے مل جاتا ہے۔ پیڑے کو پھیلا کر ہلکا سا تیل لیں۔ سانچے میں روٹی رکھ دیں درمیان میں میوہ رکھ کر سانچے میں دبا کر شیب دیں ایک شرا کنارے کاٹ لیں۔ بغیر سانچے کے بھی انداز سے بنالیں۔
یہ غذائیت سے بھرپور ہے۔





رستم ہند

ادھر بہادر شاہ کا انتقال ہوا، ادھر تخت کے دعوے داروں میں رسائی شروع ہو گئی۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ شہزادوں کے درمیان جوتیوں میں دال بننے لگی۔ ایک شہزادہ جہاں دار شاہ تھا۔ تخت کے وارثوں میں اس کی حیثیت قوی تھی۔ جہاں دار شاہ کے مخالف نے ایک رات قلملق غلاموں کو بھیجا کہ وہ شہزادے کے خیمے میں جا کر اسے قتل کر دیں۔ قلملق گشتی پرے داروں کی نظر بچا کر جہاں دار کے خیمے تک پہنچ گئے۔ خیمے کا محافظ ان کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا۔ شور ہونے پر حرم کی ایک خادمہ ریمان جاگ اٹھی۔ ریمان بہت دیر عورت تھی۔ اس نے فوراً حرم سے نکل کے حملہ آوروں پر حملہ کیا اور ایک حملہ آور کو قتل کر دیا۔ باقی لوگ اس پر نوٹ پڑے۔ اس نے بڑی بے جگری سے سب کا مقابلہ کیا۔ نتیجہ اس مہم کا یہ نکلا کہ ریمان زخمی ہو گئی۔ مگر حملہ آور بھاگ نکلے جہاں دار کی جان بچ گئی۔ وقت آنے پر جہاں دار تخت پر بیٹھا تو ریمان کو اس نے رستم ہند کا خطاب دیا۔

ملوک

غزنی کے سلطان سبکتگین کے دو بیٹے تھے، محمود اور اسماعیل۔ باپ کی موت کے بعد محمود اور اسماعیل کے درمیان سخت جنگ ہوئی۔ میدان محمود کے ہاتھ رہا۔ اس نے شکست خوردہ اسماعیل کو معاف کر دیا۔ وہ دونوں ساتھ رہنے لگے۔ ایک دن محمود غزنوی نے باتوں باتوں میں اسماعیل سے پوچھا۔ ”برادر! فرض کرو اگر جنگ میں ہمیں شکست ہو جاتی تو تم ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتے؟“ اسماعیل

نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”محمود! اگر تم ہار جاتے تو میں تمہیں ایک قلعے میں نظر بند کر دیتا۔ لیکن نظر بندی میں تمہیں زندگی کی ہر آسائش فراہم کرتا۔“

دوسرے دن محمود نے اسماعیل کو جرجان کے قلعے میں نظر بند کر کے اسے زندگی کی ہر آسائش فراہم کر دی۔ آخر اسماعیل کا جنازہ اسی قلعے سے نکلا۔

جواب

محمود غزنوی خاصا بد صورت آدمی تھا۔ دنیا کے اس عظیم فاتح نے ایک دن اپنے میں اپنی شکل غور سے دیکھی۔ اسے بہت رنج ہوا، دوسرے روز اس نے اپنے وزیر سے کہا۔

”سنا تھا، بادشاہوں کا چہرہ دیکھنے سے آنکھیں خیر ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہمیں دیکھ کر لوگوں کو کوفت ہوئی ہوگی۔“ وزیر نے کہا۔

”غلطی، آپ کی صورت دیکھنے والے چند ہیں۔ مگر آپ کی سیرت دیکھنے والے بے شمار۔ انسان کی سیرت اچھی ہو تو اس کی صورت پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔“

دعا

محمود کا لشکر بلخ کے دروازے پر پڑا تھا اور صبح ترکستان سے مقابلہ تھا۔ محمود آدھی رات کو اٹھا اور غسل کے لیے گرم پانی منگوایا، مگر نہ ملا۔ اس رات برف باری ہو رہی تھی اور برفالی ہوا کے طوفان آرہے تھے اس کے باوجود اس نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور عبادت کرنے لگا۔ مصاحبوں نے کہا بھی کہ صبح معرکہ درپیش ہے عبادت کی رات آپ کو آرام کرنا

خیزران جیسے خواب غفلت سے بیدار ہو گئی، آگے
برہہ کرمنز کو محبت اور شفقت سے نگاہ کیا۔
فوزیہ علی۔ خیر پور سندھ

ایک دن کی بادشاہت

مغل بادشاہ ہمایوں اور شیر خان کے درمیان جنگ
ہوئی۔ شیر خان کو فتح ہوئی۔ اس نے ہمایوں کا پیچھا کیا۔
ہمایوں کو جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ راستے میں ایک دریا
حائل تھا۔ دریا کا پل توڑ دیا گیا تھا۔ دشمن پیچھا کر رہا
تھا۔ ہمایوں نے گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ گھوڑا اور سوار
دونوں موجوں کے تھیمڑوں کی تاب نہ لا کر ایک
دوسرے سے الگ ہو گئے۔ ہمایوں زہر بکتر بنے ہوئے
تھا۔ اس کے لیے تیرنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ
وہ ڈوب جاتا ایک مسقف ہمایوں کی مدد کو پہنچا۔ اس نے
اپنی مشک میں ہوا بھری اور ڈوبتے ہوئے بادشاہ کو مشک
پر بٹھا کر کنارے پر لے آیا۔
ہمایوں نے کنارے پر پہنچ کر سستے سے اس کا نام
دریافت کیا۔

نے کہا۔ ”میراثم نظام ہے۔“
ہمایوں نے کہا۔ ”میں سر اقتدار آیا تو تمہاری
ایک خواہش پوری کر دوں گا۔“
کچھ عرصے بعد ہمایوں پھر سر اقتدار آیا تو نظام مسقف
اس کے پاس پہنچا۔
ہمایوں نے اس کی خواہش پوچھی تو اس نے کہا۔
مجھے ایک دن کے لیے بادشاہ بنادو۔“
ہمایوں نے فوراً تخت سے نیچے اتر کر نظام کو تخت
پر بٹھا دیا۔ نظام نے ایک دن کی بادشاہت کی۔ اس نے
جو بھی حکم دیا اس کی تعمیل کی گئی۔ نظام مسقف نے ایک
حکم یہ بھی دیا کہ سلطنت میں اس کے نام کا سکہ جاری
کیا جائے چنانچہ اس کے نام کا سکہ جاری کیا گیا۔
نظام مسقف کے اس حکم کی وجہ سے اس کا نام تاریخ میں
بیشے کے لیے محفوظ ہو گیا۔
اور جب وہ ایک دن کی بادشاہت کے مزے لوٹ کر
واپس جانے لگا تو ہمایوں نے اسے نہایت قیمتی تحائف
دے دیے۔
نذایوسف۔ کراچی

چاہیے۔
محمود نے جواب دیا۔ ”میراکام آج ہی کی رات کا
ہے، کل کا کام تو خدا کا ہے، میرا نہیں۔“
چنانچہ صبح تک عبادت میں مصروف رہا، فجر ہوئی تو
اٹھا نماز پڑھی اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔
”یا الہی! ہم دو فریقوں میں سے جو فریق تیرے
بندوں کے حق میں بہتر ثابت ہو اسے فتح عنایت کر۔“
یہ دعا مانگ کر گھوڑے پر سوار ہو کر سیدھا لڑائی کے
میدان میں آیا، اس روز اسے جو فتح حاصل ہوئی وہ
بہت عظیم الشان اور حیرت انگیز تھی۔
(فوزیہ اسلام شمس۔ سیالکوٹ)

عروج و زوال

خلیفہ مہدی عباس کی بیوی خیزران ایک دن اپنے
محل میں بیٹھی تھی کہ کینز نے اطلاع دی کہ دیوڑھی پر
ایک قبول صورت خاتون بازیابی کی اجازت چاہتی
ہے۔

اجازت ملنے پر ایک معمولی لباس میں ملبوس خاتون
اندر آئی اور عنایت شاہنگی سے آداب بجالائی،
خیزران نے اسے دیکھا تو ناراض ہو کر بولی۔
”خدا تجھے غارت کرے، کیا تو مروان بن محمد کی بیٹی
مزنہ نہیں، تیرے دور اقتدار میں ابراہیم محمد بن عباس
کی لاش بے گور و کفن دو دن تک بڑی رہی، جب
عباسی خاندان کی بڑی بوڑھیوں نے تجھ سے کہا تھا کہ
اپنے ماں باپ سے سفارش کر کے لاش دفنانے کی
اجازت ملے دے تو تو انہیں مارنے دوڑی تھی اللہ تجھ
سے ناراض ہو گیا اور اس نے اپنی رحمتیں تجھ سے
چھین لیں تو فوراً ”میری نظر سے دور ہو جا۔“

یہ سن کر مزنہ زور سے ہنسی اور کہا۔
”ملکہ عالم! جو میں نے گناہ کیا تھا اس کی سزا مجھے مل
گئی۔ میرا قصرتاہ ہو گیا، میں ایک سولی کی حیثیت سے
آپ کے درود کھڑی ہوں، کیا آپ اس بات پر غور
نہیں کرتیں کہ ویسا ہی غور آپ کے دل و دماغ پہ
ہے۔“



بالوں کے مسائل اور ان کا حل

بے رونق۔ بے جان اور الجھے ہوئے بالوں کا مسئلہ آج کل ہر شخص کے لیے درد سر بننا ہوا ہے۔ کبھی کسی کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ اس کے بال بہت جلد پختے یعنی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تیل لگا ہوا ہے اور چپکے ہوئے لگتے ہیں اور نہانے کے دوسرے دن ہی بالوں کو دھونے کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور بہتیں یہاں غلطی کر جاتی ہیں کہ بالوں کو بہت زیادہ دھونے اور پھینک دینے سے بالوں کا استعمال کرتی ہیں جو بالوں کو متاثر کرتا ہے۔

آپ کو خشک و روکھے بالوں کی خوب صورتی بخال کرنے کے لیے انڈے کی زردی سے مدد لینی پڑے گی۔ کیونکہ خشک بالوں کی مرمت اور اس کی بدرونی بن کو دور کرنے کے لیے انڈے کی زردی نہایت بہترین معالج کا کام کرتی ہے۔

بالوں کو شیمپو کرنے سے پہلے ایک انڈے کو اچھی طرح پھینٹ لیں اور اس کو اپنے تمام بالوں میں اچھی طرح لگا لیں۔ انڈے لگانے کے بعد بالوں کو شاور کیپ یا کسی کپڑے سے ڈھانپ لیں۔ پھر 30 منٹ بعد تھم کر مہانی سے سر دھو کر اپنے بالوں کی ساخت کے مطابق شیمپو سے سر دھولیں۔

زیتون کا تیل بالوں کی صحت کے لیے بے حد مفید و اکیس ہے اور اس کا باقاعدگی سے استعمال بالوں کو مضبوطی فراہم کرنے میں معاون مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اگر آپ اڑے اڑے اور کھردری ساخت کے حامل بالوں کی مالک ہیں تو زیتون کا تیل آپ کے بالوں کو ریشم کی مانند ملائم اور چمکدار بنا سکتا ہے۔

4 کھانے کے چمچے زیتون کا تیل لیں اور اسے ہلکا سا تھم گرم کر لیں۔ اس کے بعد اس تیل کو انگلیوں کے پوروں کی مدد سے بالوں کی جڑوں پر ہلکا سا دواؤں کر مساج کریں اور تمام بالوں پر اچھی طرح لگا لیں۔ ایک تویہ گرم مہانی میں

بھگو لیں اور نچوڑ کر سر پر لپیٹ لیں۔ 15 منٹ بعد بالوں کو معمول کے مطابق دھولیں۔ بالوں کی یہ گھریلو آئینہ ٹرینمنٹ آپ کے بالوں کو ہموار و نرم کرنے میں بے حد کار آمد ثابت ہوگی۔ آپ مہینے میں تین سے چار دفعہ اپنے بالوں کو اس خصوصی ٹرینمنٹ سے خوب صورتی بخشیں۔ بے جان اور روکھے بالوں میں نئی زندگی اور چمک ڈالنے کے لیے ثابت موگ کی دال (جسے ہری دال بھی کہا جاتا ہے) ایک مٹھی یا آپ کے بالوں کے لیے جتنی درکار ہو بھگو کر گرائینڈر میں پیس لیں۔ پھر 1/2 کپ دہی میں گرائینڈ کی ہوئی دال شامل کر کے اچھی طرح مکس کر لیں اور اس آمیزے کو بالوں کی جڑوں سے سرے تک لگا کر سر کو ڈھانپ لیں۔ 30-35 منٹ تک لگا رہنے دیں اس کے بعد سادے پانی سے بالوں کو دھولیں۔ چند دن کے استعمال سے آپ بہترین نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

بالوں کے لیے چند کار آمد مشورے

☆ بالوں میں چمک و خوب صورتی اور لچک پیدا کرنے کے حوالے سے معیاری و اعلیٰ کوالٹی کا شیمپو استعمال کریں اور کوشش کریں کہ ایسا شیمپو خریدیں جس کے اجزاء میں انڈے کی صحت بخور ہو۔

☆ شیمپو کرنے کے بعد سیاہ سرکہ اور لیموں کے چند قطرے پانی میں ڈال کر مکس کر لیں اور اس پانی سے اپنے بالوں کو اچھی طرح دھولیں۔ آپ کے بال دھک اٹھیں گے۔

☆ ہفتے میں ایک دفعہ جوہا کپ نارل تیل میں ثابت موگ کی دال کا پاؤڈر مکس کر کے بالوں کی جڑوں اور بالوں پر 10 منٹ تک لگا کر چھوڑ دیں اور پھر معمول کے مطابق سر دھولیں۔

☆ اگلے ہونے پانی میں چائے کی تلی کے پتے ڈال کر چند سیکنڈ پکائیں اور چھان لیں۔ اس کے بعد اس میں 1 چمچ لیموں کا رس ملا لیں۔ بالوں کو شیمپو کرنے کے بعد اس مکسچر کو ٹھنڈا ہونے پر بالوں پر لگائیں اور 15-20 منٹ بعد دھولیں۔ اس سے آپ کے بال مضبوط ہو جائیں گے اور بالوں کا کھردرا پن بھی کم ہو جائے گا۔